دل گداز تحریریں ۰ زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

کراچی

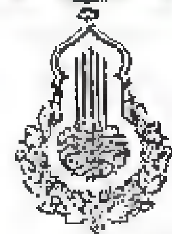
سچی کہانیاں

June
2014

اس شمارے میں:

فون 021-34930470 - 021-34939823 / پرنٹر حسام محی الدین عباسی ... پریس OB-7 ...

... 720 ... 65 ... 65 ... 55 ... 34939823



ممتا

کچھ دن قبل بڑے جوش وخروش سے ماؤں کا دن منایا گیا۔ صبح سے مختلف ٹی وی چینلز پر اکثر مائیں جن کا تعلق شوبزنس سے تھا اپنے بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔ جن کی مائیں حیات نہیں تھیں، وہ اپنی ماؤں کو نم آنکھوں سے یاد کررہے تھے۔ کچھ ایسی مائیں بھی موجود تھیں جن کو ان کی اولاد نے ایدھی ہوم میں بھجوادیا تھا اور وہ اپنی بوڑھی آنکھوں میں انتظار بسائے اپنے نامراد بچوں کی راہ تک رہی تھیں...... بہت سی خرافات کی طرح یہ دن منانا بھی ہم نے مغرب سے سیکھ لیا حالاں کہ ہماری ماؤں کے بغیر تو ہمارا ایک دن بھی نہیں گزرتا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی جنت ان کے پاس ہے...... لیکن جس دن ماؤں کو یاد کیا جارہا تھا اس دن ایک سفاک ماں نے اپنے تین بچوں کو زہر دے کر مار ڈالا...... معاملہ وہی شوہر سے رنجش، تین ننھے منے فرشتے اپنی ہی ماں کے ہاتھوں، قبر میں جا سوئے۔ اس سے پہلے لاہور میں بھی اس طرح کا اندوہناک واقعہ رونما ہو چکا ہے جس میں ماں نے شیر خوار بچوں کو گلا دبا کر اور پانی میں ڈبو کر مار ڈالا تھا...... میں ان سفاک ماؤں کی جرأت پر نوحہ کناں ہوں کہ ممتا تو زندگی کا نام ہے، ممتا چھاؤں کا نام ہے، ممتا تو قربانی دینے کا نام ہے...... بے شک یہ دنیا بہت عجیب جگہ ہے، روز نئے سے نئے تماشے دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن میری اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو اپنے والدین کی اچھی اولاد بننے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہماری اولاد بھی ہمارے لیے خوشیوں اور آسودگی کا سبب بنے (آمین)

منزہ سہام



کچھ اپنی باتیں

یہ کچھ دن پہلے ہی کی بات ہے۔ گرمی کا قہر برس رہا تھا، بالکل ایسے جیسے کوئی غضبناک دیو آگ اگلتا جا رہا ہو۔ میں ایک درخت کے سائے میں سڑک کنارے کھڑا تھا، جس کی ایک ڈالی پر گلہریوں کا جوڑا خرمستیاں کر رہا تھا۔ یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ ان میں سے مادہ کونسی تھی اور نر کون سا تھا۔ اجلی اجلی سرمئی سفید دھاریوں والی گلہری کے ہاتھ میں ایک کیک کا بوسیدہ سا ٹکڑا تھا، وہ اسے ذرا سا کترتی اور پھدپھدا اپنی دم ہلاتی کہ یک دم دوسری گلہری جھپٹ کر اس سے کیک چھین لیتی اور پھدک کر دوسری ڈالی جا پہنچتی۔ اس اثنا میں وہ کچھ کیک کترتی، صاحب کیک گلہری جست بھر کے آ پہنچتی اور کیک جھپٹ لیتی، خوب چیں چیں، ٹریں ٹریں ہو رہی تھی۔ ان دونوں کی چھینا جھپٹی میں صاف لگ رہا تھا کہ پیار بھری اٹھکیلیاں ہیں، انہیں کیک سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کرنے اور قہقہے لگانے میں انہیں مزہ آ رہا تھا۔ کافی دیر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے ان کا یہ پیار بھرا جھگڑا اتنا دل نشیں لگ رہا تھا کہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اس میں غلطاں تھا، ان کی ننھی ننھی آنکھوں اور ننھے ننھے چہروں میں وہ خوشی نظر آ رہی تھی جو کہ انسانوں کے چہرے پر آج کل مفقود ہے۔ وہ قلقاریاں مارتی پھر رہی تھیں۔ ''ٹریں ٹریں'' کرتے ایک دوسرے سے لپٹ جاتی تھیں! میں سوچنے لگا کہ یہ آخر اتنی خوش کیوں ہیں؟ یہ تہی داماں، یہ ذاغر و کمزور، یہ بے بس و مجبور جانور اتنے خوش کیسے ہیں؟ آج کا انسان اتنا خوش کیوں نہیں ہے؟ یہ بوسیدہ سا کیک کسی کچرے کے ڈھیر سے اٹھا کر اتنا اترا رہے ہیں، ہمارے پاس تو ہزاروں لاکھوں انواع و اقسام کے لذیذ کھانے ہیں، پھل میوہ جات ہیں حالاں کہ ان کے پاس نہ تو بجلی کی چکا چوند ہے، نہ موبائل فون جیسی جادو نگری، ان کے پاس نہ تو پختہ و محفوظ آرام دہ گھر ہیں، نہ سواری کے لیے گاڑیاں، ہوائی جہاز ہیں، ان کے پاس نہ تو فریزر ہیں کہ ٹھنڈے مشروبات کا مزہ لیں اور اپنی غذا کو محفوظ رکھ سکیں۔ ان کے پاس گرمیوں کا توڑ کرنے والے ایئر کنڈیشنڈ ہیں نہ ہی سردیوں کو نرم گرم بنانے والے جدید ہیٹر ہیں۔ ان کے پاس نہ تو پولیس ہے نہ فوج ہے، نہ خفیہ سیکورٹی ایجنسیاں ہیں جو ان کی حفاظت کریں۔ ان میں سے کسی کی کوئی جداگانہ شناخت نہیں، یہ تو سب گلہریاں ہیں، سب کی سب گلہریاں ہی کہلاتی ہیں۔ ان میں کوئی کاشی چوہان، اطہر حسیب، علی زبیر، اقبال زمان نہیں ہوتا، یہ تو سب بس گلہریاں ہی ہوتی ہیں۔ ان کے پاس نت نئے، رنگ رنگ ملبوسات بھی نہیں ہوتے، ان کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں ہوتے، ان کا کوئی ہیئر اسٹائل بھی نہیں ہوتا، یہ کسی بیوٹی پارلر میں بھی نہیں جاتیں، ان کے ہاں تو پارٹیز کا ہلا گلا بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں تو خوشی بھری پارٹیوں کی بھرمار ہوا کرتی ہے، شادی کی پارٹی، ولیمے کی پارٹی، سالگرہ پارٹی، عقیقہ پارٹیاں اور بے شمار پارٹیاں جن میں خوب ہلا گلا ہو۔ ارے ہاں ان کے پاس ٹی وی بھی تو نہیں ہے، ہمارے ہاں سیکڑوں چینل ہیں۔ ڈراموں کے چینل الگ، فلموں کے چینل الگ، چٹ پٹی سنسنی خیز خبروں کے چینل الگ، کھانا پکانے کے چینل الگ، صحت کے چینل الگ، اسپورٹس کے چینل الگ، شوبز کے چینل الگ، فیشن

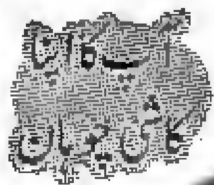
انڈسٹری کا چینل الگ، بیوٹیشن چینل الگ تو ملبوسات کے چینل الگ، موسیقی کے چینل الگ، کھانے پکانے کے چینل الگ، صحت کے چینل الگ، اسپورٹس کے چینل الگ، شوبز کے چینل الگ، فیشن انڈسٹری کا چینل الگ، بیوٹیشن چینل الگ تو ملبوسات کے چینل الگ، موسیقی کے چینل الگ، تحقیق و جستجو کے چینل الگ، ڈاکومینٹری چینل الگ، جانوروں کے چینل الگ، علاقائی زبانوں کے چینل الگ، مزاحیہ چینل الگ، ڈراؤنے چینل الگ، بچوں کے لیے چینل الگ، کارٹون چینل الگ تو کوئز پروگرام کا چینل الگ اور نہ جانے کتنی اقسام کے چینلز ہیں۔ ظاہر ہے ان سب کا مقصد انسان کی فلاح و بہبود اور خوشی ہی ہے۔ ہماری خوشی اور فلاح کے لیے ہزاروں چینلز میں لاکھوں کروڑوں لوگ کام کر رہے ہیں، جبکہ ان گلہریوں کو تو اگلے درخت کی خبر نہیں۔

ان کا تو یہ کوئی گھر ہے نہ در ہے۔ انہیں تو ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ کہیں کوئی شکرہ، عقاب نہ اچک لے یا کوئی کتا نہ دبوچ لے۔ سردی میں ان کے گرم بال ان کو سکون پہنچاتے ہوں گے، مگر گرمی میں تو ان کی جان لے لیتے ہوں گے۔ ان کے پاس ہمارے جیسی ایک بھی سہولت نہیں، ان کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں، مگر یہ پھر بھی اتنے خوش ہیں، بے فکرے ہیں۔

میں ان کی طرف دیکھ کر مسلسل اسی طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں سوچے جا رہا تھا کہ یک دم وہ دونوں ایک دوسرے سے بے طرح لپٹ گئے اور لپٹے لپٹے ہی ڈالیوں پر لڑھکنے لگے۔ ان کی ٹریں ٹریں سے پورا درخت گونجنے لگا اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ان میں سے ایک کا توازن شاید بگڑ گیا تھا۔ ایک گلہری درخت سے جدا ہوئی اور بیچ سڑک پر آن گری۔

اس کا گرنا تھا اور زن ن ن ن ن کر کے ایک سوزوکی کا پہیہ اس کے ننھے سے وجود پر سے گزر گیا۔ وہ بے چاری ''ٹریں'' بھی نہ کر سکی۔ بس ایک آواز آئی تھی ''پچک'' اور خون کے بہت تھوڑے سے چھینٹے سڑک پر بکھر گئے۔ میرا دل لہولہو ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں اشکبار ہو چکی ہیں اور چہرہ اشکوں سے تر۔ میں رومال سے آنسو پونچھ ہی رہا تھا کہ درخت سے دوسری گلہری ''ٹریں ٹریں ٹریں'' کرتے ہوئے، چیختے چلاتے ہوئے، بین کرتے ہوئے، آہ و بکا کرتے ہوئے، خدا سے فریاد کرتے ہوئے اتری اور سڑک پر چسپاں ہوئے اس بے گور و کفن لاشے کی طرف دوڑی جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ خرمستیاں کر رہا تھا۔ اسے شاید پتا ہی نہیں تھا کہ اس سڑک پر مسلسل ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔ گاڑی کے پیچھے گاڑی چلتی ہے۔ وہ تو بس اپنے ہمسفر کے قریب پہنچنے کی فکر میں تھی، میں نے بے اختیار ہاتھ بڑھائے کہ اس نادان کو روکوں، مگر ہاتھ بڑھا کا بڑھا ہی رہ گیا، ایک دوسری ''پچک'' کی آواز آئی اور کچھ اور لہو کے چھینٹے سڑک پر بکھر گئے۔ میں نے اردگرد دیکھا، شاید لوگوں کا دل غم سے پھٹ گیا ہوگا، مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہاں میرے علاوہ کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ دو گلہریاں سڑک کے بیچوں بیچ بچھی جا چکی ہیں۔

مجھے ان کی خوشی کا راز تو معلوم نہ ہو سکا مگر یہ ضرور جان لیا کہ ہماری ضرورتیں نہ صرف ہماری خوشیوں کی قاتل ہیں بلکہ یہ دوسروں کی صرف خوشیاں ہی قتل نہیں کرتیں، بلکہ انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہیں۔



احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب



بہت پیارے ساتھیو!

سدا خوش رہیں۔ یہ زندگی ایک بلبلہ ہے پانی کا۔ دنیا دکھ اور سکھ کے باہمی امتزاج کا نام ہے۔ ساتھیو! ہمیشہ سے میں یہی کہتا آیا ہوں کہ محبت کرو، محبت عام کرو، کیوں کہ محبت مقناطیس ہے اور جب ہم محبت کرتے ہیں تو ہم خود مقناطیس بن جاتے ہیں۔ ہم سے پیار کرنے والے جب ہمارے طرف آتے ہیں تو اس مقناطیسی محبت سے چپک جاتے ہیں اور وہ بھی مقناطیس بن جاتے ہیں، آپ کو معلوم ہے نا خدا تعالیٰ کا یہ نظام بھی مقناطیس کے اصولوں پر ہی Base کر رہا ہے۔ محور سورج ہے اور سب سیارے اپنے اپنے دائروں میں اس سورج کے گرد مقررہ اوقات میں اپنا سفر کرتے چلے جا رہے ہیں، خدا کا یہ نظام اربوں کھربوں سالوں سے بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا چلا جا رہا ہے تو کیا ہم اپنی زندگی، جو اس وقت صرف اوسطاً 50 یا 60 برس ہے، محبت کے ساتھ نہیں گزار سکتے؟؟

وعدہ کریں کہ آپ بھی آج سے لایعنی سوچوں اور تفرقوں سے دور رہ کر صرف ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔

ساتھیو! دوستو! مترو! چلتے ہیں احوال کی جانب......

✉ محمد اسماعیل بروہی۔ نواب شاہ سے احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں السلام علیکم کاشی بھائی کیسے ہیں آپ...... امید ہے کہ آپ منزہ آپی اور پورا اسٹاف خیریت سے ہوں گے، چار ماہ سے غیر حاضر تھا کیوں کہ ہمارے گھر میں بہت بڑی ٹریجڈی ہوگئی تھی، ہماری ماں جیسی بھابی ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئیں، کاشی بھیا ہم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ہماری ہنستی مسکراتی بھابی ایک دن ہمیں چھوڑ کے چلی جائے گی۔ بھائی کی شادی کو 15 سال ہوگئے مگر ایسا لگتا ہے جیسے 15 دن ہوئے ہیں۔ چھوٹی سی عمر کی بھابی کیا آئی کہ سارا گھر سنبھال لیا۔ بہو کے آتے ہی امی نے سب کچھ اس کے حوالے کر دیا اور خود بے فکری اور سکون کی زندگی گزارنے لگیں۔ بھابی کے پاس شاید کوئی جادو کی چھڑی تھی وہ ہر کام منٹوں میں کرتی تھیں، امی ابو کی دن رات خدمت کرنا، تینوں دیوروں کے لیے طرح طرح کے کھانے پکانا، بھائی کا خیال رکھنا، بچے سنبھالنا اور جب نندیں آتیں تو لگتا جیسے دعوت کا سماں ہے، سب کے لیے مزے دار کھانے تیار کرنا وہ بھی بھاگ بھاگ کر اور خوش دلی سے اس کے دم سے گھر جیسے جنت تھا، ہیپا ٹائٹس سی جیسا موذی مرض اچانک آیا اور اس کی جان ہی لے لی۔ اور وہ شائستہ، گلاب، زاہد، مریم، شاہدہ اور 2 سالہ فائزہ کو روتا ہوا چھوڑ گئیں۔ کاشی بھائی یہ خط لکھتے ہوئے بھی میں رو رہا ہوں۔ ہمارا پورا گھرانا اس غم سے نڈھال ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ ان کو صبر اور بھائی کو ہمت دے۔ تمام قارئین سے گزارش ہے کہ میری بھابی کے لیے دعائے مغفرت ضرور کریں، اس غم کے دوران آپ اور تمام قارئین مجھے ہر وقت یاد آئے۔ آپ نے میرے زخموں پر مرہم اس وقت رکھ دیا، جب میرا سالانہ خریداری کا سال پورا ہوا تھا، مارچ کو، پھر بھی آپ نے اپریل کا شمارہ بھیج کر میرا مان رکھا۔ مجھے عزت دی، حوصلہ دیا۔ میں اگلے سال کی خریداری کے لیے منی آرڈر بھیج رہا ہوں۔

☆ بہت پیارے اسماعیل۔ دُکھ اور سکھ سانجھے ہوتے ہیں، خدا آپ سب کو اس غم کو سہنے کا حوصلہ اور ہمت دے۔ قارئین سے التماس ہے کہ مرحومہ کے لیے ایک بار ضرور مغفرت کی دعا کیجیے۔



✉ بورے والا سے احوال میں یہ شرکت ہے رانا محمد شاہد کی۔ رانا جی لکھتے ہیں، اپریل کا شمارہ شوخ رنگ و انداز والی ماڈل کے ساتھ ملا۔ جاذب نظر سرورق ہی سچی کہانیاں کی پہچان ہیں۔ منزہ سہام کا اداریہ حکمرانوں کی بے حسی اور معاشرتی المیے کا احاطہ کر رہا تھا۔ منشی محمد عزیز ہے، الحمدللہ ابو کی طبیعت اب پہلے سے کافی بہتر ہے۔ میں تمام قارئین خصوصاً مور شاہد حسین، سدرہ انور علی کا تہہ دل سے مشکور ہوں، جنہوں نے ابو کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائی، مور شاہد حسین کا ذکر تو اکثر احوالی کرتے نظر آئے۔ یہ مور نام انہوں نے مور سے متاثر ہو کر رکھا ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟ سدرہ انور علی تصویر سے تو لگتا ہے کہ آپ کسی نہ کسی کھیل سے وابستہ رہی ہیں۔ آپ کی برتھ ڈے 9 مارچ ہے تو ہماری شادی کی برتھ ڈے 23 مارچ ہے۔ دو سال پہلے 23 مارچ کو ہی ہم نے یہ لڈو، پتا نہیں میٹھا تھا یا کڑوا، بہرحال چکھ لیا تھا۔ حیدرآباد کے خلیل جبار بھی آج کل غائب ہیں۔ زرینہ جونیجو یاد کرنے کا شکریہ۔ کہانیاں سبھی زبردست تھیں۔ غیر ملکی ادب، سرحد پار ادب اور ممتاز ادیبوں میں سے بھی ایک ایک شاہکار دیتے رہا کریں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ پیارے رانا محمد شاہد! کہانیاں جلد شائع ہوں گی، آپ کا تبصرہ اب لیٹ کیوں آنے لگا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے۔

✉ کراچی سے گل رعنا رقم طراز ہیں، ڈیئر کاشی چوہان بھیا! السلام علیکم 28 اپریل کو ماہنامہ سچی کہانیاں کا شمارہ گھر پر ملا۔ بے حد شکریہ کہانی شائع کرنے کا، ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھا ہے کیوں کہ ایک انار سو بیمار، سارے دوست احباب کہانی پڑھنے کو بے تاب ہیں اور گھر گھر رسالہ گھوم رہا ہے۔ بہرحال، نوٹاں والی سرکار، ملکھنی اور نا گن پڑھ لی ہیں، باقی تبصرہ ان شاء اللہ اگلے ماہ۔ رسالے کی تعریف میں الفاظ نہیں مل رہے، یہ سچی تعریف ہے یہ مت سمجھیے گا کہ کہانی شائع کر دینے کی وجہ سے تعریف کر رہی ہوں۔ آپ کی آمد کی وجہ سے رسالے میں ایک تنوع، ایک تبدیلی آ رہی ہے۔ آپ کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے یہ سب۔ میری باجی بھی بہت تعریف کرتی ہیں کہ آپ کی ادارت میں رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ باقی سب احوالی بہن بھائیوں کو میری طرف سے سلام۔

☆ بہت پیاری رعنا جی! سلامت رہیے۔ آپ کو شمارہ پسند آیا، ہماری محنت وصول ہوگئی، خوش رہیے۔ شکریہ کیا مثال ہوئی ”ایک انار سو بیمار“ کراچی میں رہ کر بھی آپ کے ”اپنے“ آپ کی محبت میں ایک پرچہ نہیں خرید سکے۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے نیر رضا ولی کی۔ لکھتے ہیں محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم، دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو حفظ و امان میں رکھے (آمین) اس سے قبل بھی تحریریں بھیجتا رہا ہوں لیکن زیادہ تر تحریریں شائع نہیں ہوسکیں، شاید کہ ”سچی کہانیاں“ کے معیار پر نہ اتری ہوں۔ ایک تحریر اور ارسال کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جلد شائع ہو جائے گی اور مزید اشاعت کا موقع میری تحریروں کو نصیب ہوتا رہے گا، عین نوازش ہوگی۔

☆ بھائی نیر! آپ کی تحریریں نظم اور غزل کی صورت ہم تک جیسے جیسے موصول ہوئیں، ہم نے شائع کیں آپ بھی تو غائب ہو جاتے ہیں۔ اگلے ماہ آپ کا بھرپور تبصرہ ہم تک پہنچ جائے، اسے ہماری محبت سمجھیں یا حکم۔



✉ بشیر احمد بھٹی قومی بستی بہاولپور سے لکھتے ہیں مدیرہ اعلیٰ، منزہ سہام صاحبہ مدیر کاشی چوہان صاحب، السلام علیکم! مئی 2014 کا سچی کہانیاں اعزازی شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ آپ نے سچی کہانیاں کا ہر شمارہ مختلف نمبرز سے نکالنے کا جو طریقہ اپنایا ہے، یہ اچھا ہے۔ اس طرح قارئین کو نت نئے موضوعات پر کہانیاں پڑھنے کا موقع ملے گا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ جناب کاشی چوہان صاحب، آپ سے گزارش ہے کہ یہ جو پراسرار نمبر، روحانی نمبر کا سلسلہ آپ نے چلایا ہے، خوب تر ہے، اسے جاری رکھیے۔

☆ پیارے بھائی بشیر بھٹی۔ احوال میں شرکت اور نمبرز کا سلسلہ پسند کرنے کا شکریہ۔



✉ یہ احوال میں آمد ہے ہماری بہت اچھی ثانیہ بھٹی کی سیالکوٹ سے، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم سب سے پہلے سرورق پہ نظر پڑی پلیز آپ ڈبل چیچ ختم کریں بہت مشکل ہوتی ہے، پڑھنے میں...... محترم منزہ سہام کا ”ٹھہریا سا ہے“ کچھ اپنی باتیں پڑھ کر احساس ہوا کہ اس دنیا میں اچھے بُرے دونوں لوگ موجود ہیں۔ ”پنچھی داس، ہم نام، کفارہ، ذرا سی بھول، کس پر اعتبار کریں، آخری خواہش، اب میں مطمئن ہوں، دل ایک شہر خوشاں، کملی، ستم“ وغیرہ زبردست رہیں۔ سخن آباد میں سب کی شاعری اچھی تھی پر ظفر اللہ رند کی ”منت“ پڑھ کر بے اختیار منہ سے واہ واہ نکلا...... باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ آخر میں منزہ سہام آنٹی کی خدمت میں بہت سی دعائیں سب اسٹاف کو بہت سلام...... تمام قارئین کو دعائیں، میرا ٹوٹا پھوٹا تبصرہ ضرور شائع کیجیے گا اللہ حافظ۔

☆ پیاری سدرہ! ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کا تبصرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا دعاؤں کو رائیگاں نہیں کرتا۔



✉ سہیل خان، کورنگی کراچی سے رقم طراز ہیں، جناب کاشی صاحب السلام علیکم۔ بعد سلام کہ عرض یہ ہے کہ میری اور میرے گھر والوں کی طرف سے آپ کو یہ نئی ذمے داری سنبھالنے پر بہت بہت مبارکباد۔ دیر اس لیے ہوگئی کہ میرا 17 سال کا جوان بیٹا ہے ایب نارمل اور معذور، نہ وہ چل سکتا ہے نہ بول سکتا ہے جس کی وجہ سے میں لیٹ ہوگیا خط لکھنے میں ورنہ میں آپ کو پہلے ہی مبارکباد دے دیتا۔ آپ کی اور میری پہلی ملاقات ہے سچی کہانیاں کے حوالے سے مگر میرا اور میری بیگم کا سچی کہانیاں کا ساتھ بہت پرانا ہے، وہ بڑے شوق سے یہ ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ جب یہ گھر میں ڈائجسٹ آنے لگا تو مجھے بھی شوق ہوگیا اگر میں تھوڑا بھی لیٹ لے کر آؤں تو ناراض ہو جاتیں کہ تم نے لیٹ کر دیا۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھی اچھی باتیں لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کے ایک ایک فرد کو سرپرست اعلیٰ سے نیچے عملے تک صحت اور تندرستی عطا فرمائے اور کسی کا محتاج نہ رکھے۔

☆ پیارے بھائی سہیل! آپ کا خط احوال میں شامل ہے اور امید ہے اب آپ احوال میں غیر حاضر نہ ہوں گے۔

✉ یہ احوال میں شرکت ہے حیدرآباد کی ایک نامور شخصیت اور مصنف ادیب سمیع چمن کی، لکھتے ہیں کاشی چوہان بھیا جی، منے جی جگ جگ جیو! امید ہے دل و دماغ سوچیں دو چیں سب کچھ اپنی جگہ فٹ اور خیر و خیریافت سے ہوں گے، ادیب سمیع چمن اکبرآبادی کا سلام پر سلام۔ آپ سے پہلے ہمارے ہی شہر کے ایک قلمدان، او دو سوری معاف کیجیے گا قلم کار بے ملک ملت جناب محترم راجہ جی کا سچی کہانیاں میں دور حکومت چل رہا تھا۔ ہر تحریر کے ماتھے پر اشعار کی بندیا لگاتے چلے جا رہے تھے، کہنے کو میرے ہم شہر اور ہم قلم تھے اور علیک سلیک بھی مجھ سے رسمار کھتے تھے مگر دل میں اپنے لنگوٹیا یار اپنے شہر کے دوست لمبو جی صاحب کالے صاحب کی عین خواہش کے تحت۔ کینہ بھی رکھتے تھے۔ لنگوٹیا یار کی ہدایت یہ تھی کہ راجہ مہاراجہ صاحب ان کی خواہش کے برخلاف کسی اور ان کے ناپسندیدہ رائٹرز کی اور خاص کر میری تو تحریر کا داخلہ بالکل بند کردیں اور فوراً خالہ ردی کی نوکری کی بھوک کا خیال کرتے ہوئے اس پر وار دیں۔ آہاہا کتنا شاندار، ایمانداری کا سلسلہ تھا، اب آپ کی بھی یقیناً حیرت سے آنکھیں تو ضرور پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں گی، کہ میں تو کافی دیر کے بعد آپ پر یہ شاخسانہ افشاں کر رہا ہوں، مجھ سے پہلے سچی کہانیاں کے متعدد لکھاریوں نے برملا ان ہی شکایات کا اظہار کر دیا ہے۔ بات ہو رہی تھی تحریروں کی، ہر تحریر فنی تحریر اور بڑی چابکدستی سے لکھی گئی ہے۔ سخن آباد میں تمام کاشی بھیا کے پسندیدہ شاعرات شاعروں کی بھرمار بلکہ گولیمار ہے نہیں ہے تو ہم جیسے ادنیٰ شاعرات شاعروں کی، افسوس دل کھنڈے میں، آخر میں پھر عرض ہے کہ ہم نے پہلی دفعہ بڑے ارمانوں کے ساتھ آپ کی محفل آپ کے رسالے میں قدم رنجہ فرمایا ہے ہم جیسے اور بھی صاحب اور صاحبان ہوں گے۔ اب دیکھتے ہیں یہ خط کب شائع ہوتا ہے، کب اس پر نظر کرم فرمائی کی عطریات خوشبویات کا چھڑکاؤ آپ فرماتے ہیں۔

☆ پیارے چچا میاں! لیجیے آپ بھی ہمارے پسندیدہ شعراء میں شامل ہوگئے، آپ کی نظم سخن آباد کا حصہ ہے۔ چچا جان! پلیز اب کچھ تحریر ایسی بھیج دیں کہ جو میں جلد سچی کہانیاں کا حصہ بنا سکوں۔

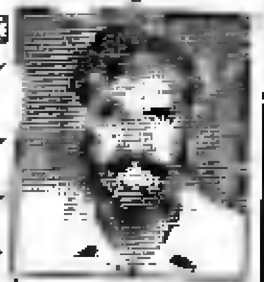
✉ احوال میں یہ پہلی بار آمد ہے سلمیٰ سید کی بہاول نگر سے۔ لکھتی ہیں محترم ایڈیٹر السلام علیکم! میں نے آپ کا میگزین اپنی دوست کے گھر دیکھا تھا، بہت پسند آیا تھا۔ میں اکثر میگزین میں لکھتی رہتی ہوں اور بچوں کے رسائل میں لکھتی ہوں نئی نسل کو رہنمائی کی ضرورت ہے۔ پچھلے دنوں میری آنکھ کا آپریشن ہوا ہے، تو میں زیادہ لکھ نہیں سکتی، لیکن یکم جون 2014 کو امی کی پہلی برسی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ کے میگزین میں امی کے لیے کہانی لکھوں گی، لیکن ڈاکٹر نے زیادہ لکھنے سے منع کیا ہے۔ یہ اپنی زندگی کی کہانی اپنی بھتیجی سے ڈکٹیٹ کروا کے بھیج رہی ہوں کہ امی کے بعد زندگی کیسی ہے! آپ کے رسالے کا معیار واقعی قابل تعریف ہے، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ اچھی سلمیٰ جی! خدا آپ کو صحت دے۔ آپ کی حوصلہ افزائی ہمارا فرض ہے۔

✉ یہ ہری پور سے ہمارے ساتھ ہیں محمد عمیر شہزاد، لکھتے ہیں۔ عزت مآب و قابل احترام جناب کاشی چوہان صاحب اور مدیر اعلیٰ منزہ سہام صاحبہ اور سچی کہانیاں کے تمام معزز اسٹاف کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مشکور ہوں، مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ 31 مارچ میرا جنم دن تھا اور اس موقع پر آپ کی طرف سے ایک خوب صورت سا تحفہ بصورت ”سچی کہانیاں“ موصول کر کے میری خوشی کو چار چاند لگ گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ میری ایک تحریر کو خوب صورت شمارے کی زینت بنا کر مجھے اپنا گرویدہ بھی بنا لیا۔ اب تو ہم ”سچی کہانیاں“ کے سگے قاری اور ممکنہ طور پر لکھاری بنے رہنے کی تادم مرگ کوشش جاری رکھیں گے۔ اپریل کا یہ شمارہ بے حد قیمتی تھا۔ سب سے پہلے تھر کے بارے میں جان کر دل افسردہ ہوا بحیثیت مسلمان ہمیں اپنے بھائیوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہیے اور کاشی صاحب آپ کی مثبت سوچ بھی اچھی لگی۔ مور شاہد حسین کی ”ذرا سی بھول“ ہمیں اچھا خاصا سبق سکھا گئی۔ اس کے بعد ”محمد عزیز مے“ صاحب نے بہت عمدہ لکھا، اس کے علاوہ کملی، بابا عمر دین اور کون بنے گا کروڑ پتی صف اول کی کہانیاں رہیں۔ بعدازاں سخن آباد پر نظر پڑی تو ذہن و دل خوشی سے

سرشار ہو گیا، پہلی بار کوئی ایسا ماہنامہ ملا ہے جو اپنوں سے بھی زیادہ اپنا ہے اور مجھے اپنوں کا ساتھ دینے میں خوشی ملتی ہے۔

☆ پیارے عمیر جیو۔ آپ کی دوسری کہانی کیوں نہیں آئی اب تک؟؟ اور ہاں احوال میں آمد کو مستقل بناؤ بھائی۔



✉ ڈاکٹر صغیر احمد عاجز، بڑا گواہ جہلم سے رقم طراز ہیں، ڈیئر چوہان السلام علیکم۔ امید واثق ہے کہ آپ بشمول مکمل اسٹاف بفضل خدا خیریت سے ہوں گے۔ ماہ اپریل کا شمارہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ اچھوتی تحاریر سے مزین میرے ہاتھوں میں ہے۔ اولین صفحہ جات پر منزہ سہام صاحب نے تھرپیاسا ہے کے حوالے سے اپنے جذبات کے جو موتی بکھیرے ہیں، کاش یہ حساس اور پُرسوز دل کی آواز بن جائے۔ بھٹی صاحب کی پچھی واس سطحی سوچ رکھنے والے لوگوں کی ذہنی اختراع ہے۔ سلمیٰ غزل کی تخلیق ''سزا کی جزا'' لاجواب تحریر ہے، اشفاق بٹ نے ''ہم نام'' میں معاشرے کی روایتی اقدار اور رویوں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مور صاحب کی ''ذرا سی بھول'' متنبہ کرتی ہے بعض اوقات ذرا سی بھول ایک بہت بڑے طوفان کا سبب بن جایا کرتی ہے۔ ''کس پر اعتبار کریں'' دوستی جیسے پاک رشتے اور جذبے کا خون ہے۔ بے رنگ حیات ایک اچھی کاوش ہے۔ ''سلگتے ارماں'' منشی صاحب کی زبردست تخلیق ہے۔ ''تجھ سا ڈھونڈوں کہاں، بابا عمرو ین، شہزاد صاحب کی ''دل ایک شہر خوشاں'' بہترین تخلیقات ہیں۔

تجھے اپنے دل سے میں کیسے بھلادوں
تیری یاد ہی تو میری زندگی ہے

اگر بابا عمرو ین جیسے کردار جو کہ انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز دل رکھنے والے ہیں اپنا کردار نبھاتے رہیں۔ سعید اور عابد جیسے سچے اور سچے لوگ محنت اور لگن میں جتے رہیں تو تنگدستی ختم ہو کر ہی رہتی ہے اور ایسی نیت رکھنے والوں پر اللہ تعالیٰ ضرور نظر کرم کرتا ہے۔ سلسلہ وار سلسلے بھی زبردست جا رہے ہیں، ناگن اپنے کلائمکس کی طرف بڑھ رہی ہے، غرض یہ کہ تمام قلمکار اور ان کی قلمکاریاں قابل تحسین ہیں، آخر میں اس دعا کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ ہم تمام لوگوں کا حامی و ناصر ہو اور ایک دوسرے سے نیکی اور آسانی بانٹنے کی توفیق سے نوازتا رہے۔

☆ ڈاکٹر صغیر عاجز! آپ کے تبصرے نے دل خوش کر دیا، سلامت رہیے۔ آپ کا تبصرہ لیٹ موصول ہونے کی وجہ سے مئی میں شامل نہ ہو سکا تھا۔ امید ہے اب شکایت رفع ہو گئی ہو گی۔

✉ یہ آمد ہے ملکۂ احوال ادی تحسین جونیجو کی بورڈی شریف، خیر پور ناتھن شاہ سے۔ لکھتی ہیں، اچھے بھیا کاشی اور تمام قارئین السلام علیکم! خداوند کریم آپ کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین) سرورق ماشاء اللہ زبردست رہا۔ اداریہ ''پختہ عزم'' منزہ آپی نے پاکستانی کھلاڑیوں کو خراج تحسین پیش کر کے سر بلند کیا۔ کچھ اچھی باتیں میں کاشی بھیا نے کمال لکھا، احوالیوں، اب احوال سن لیں، مور شاہد حسین بھائی یہ ''کوچ'' تو ہے ہی اپنی، تو کرایہ ملنے والا ابھی نہیں خیال رہے لیڈیز فرسٹ تو فرنٹ سیٹ تو بس...... پھر اس خیال کو ''کوچ'' ہی کرا دیجیے۔ زرینہ جونیجو میری بڑی بہن ہیں۔ باقی صنوبر جونیجو دوست لکھاری ہیں، اب کہاں ہیں ہم لاعلم ہیں۔ ان کا تعلق حیدر آباد سے ہے۔ شفقت حسین صاحب پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں، خوش رہیے۔ شائستہ جمال خوش آمدید جی بے انتہا مشکور ہوں سراہنے پر۔ شاد رہیں۔ اوئے سدرہ جی جھولے میں بیٹھنے کا شوق کیوں چڑھا، شکر کرو بچت ہو گئی، پتا ہے کیوں، اپنوں کی دعا میں میرا حصہ بھی شامل تھا نا، سچ میں دل سے پکارا تھا، تو وہ پکار آپ تک پہنچ گئی خوشی ہوئی، کیا ہے ناکہ کوے میں ملنے آئی تھی تو واپس کھینچ لائی دیکھ تو لیا ہی ہو گا تو پکچر کی ضرورت کہاں رہی اب اپنا بہت سا خیال رکھنا، آپی زرینہ بھی طبیعت کا پوچھ رہی ہیں۔ ویسے ثمینہ ناز جی، سدرہ اور ہم کیا شاندار پارٹی رہی، متحد حساب چکتا کر دیا جی...... عبدالغفار عابد صاحب ویلکم بیک، روحانی نمبر دیکھ کر روح سرشار ہوئی کہ ہمارے آس پاس کتنی ہی پہنچی ہوئی، بزرگ شخصیات مدفون ہیں کہ لوگ فیض یاب ہو کر مرادیں بر لاتے ہیں، یہ بھی اللہ سائیں کی طرف سے بھیجا ہوا انعام ہیں کہ ان کی رسائی سے اپنی حاجات پہنچاتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر

ایک لاجواب، اسرار سے بھرپور سبق آموز بہترین کہانیاں پڑھنے کو ملیں، خاص کر ''دعا'' صفدر علی حیدری۔ شان مولا، صدف آصف۔ پڑوسی گل رعنا۔ در توبہ کھلا ہے مجید احمد جائی۔ رتی اللہ والی تجمل میتلو۔ سبز پیر کنول عمران خان۔ کایا پلٹ مسز نوید ہاشمی اور مرشد کی دعا نسیم سکینہ صدف یہ تمام تحریریں زبردست اور شمارے کی جان رہیں۔ سخن آباد میں تمام کلام عمدہ رہا۔ اب اجازت بھائی (اللہ حافظ)



☆ ادی تحسین آپ کے تبصرے نے دل خوش کر دیا۔ سلامت رہو۔

✉ مور شاہد حسین قمر۔ شہدادکوٹ سے لکھتے ہیں ہر دل عزیز کاشی چوہان بھیا السلام علیکم امید ہے کہ آپ سمیت پورا اسٹاف، رائٹرز اور قارئین حضرات خدا کے فضل و کرم سے خوشی، صحت، سلامتی والی زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ مئی کا شمارہ حسب معمول 30 تاریخ کو موصول ہوا۔ شمارہ ملتے ہی ہم اس کی خوب صورتی میں اس طرح کھو گئے کہ جن صاحب نے پرچہ لا کر دیا اسے سلام کرنا بھی بھول گئے۔ روحانی نمبر کے لیے ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ یہی تو سچی کہانیاں کی خاص خوبی ہے۔ اشتہارات نظر انداز کرتے ہوئے مختلف اولیائے کرام کی مزاروں سے سجی فہرست دیکھ کر روح تک سرشار ہو گئی۔ آنٹی منزہ سہام نے ''پختہ عزم'' بہت ہی خوب صورت سبق دیا۔ کچھ اچھی باتیں لفظ لفظ سے آپ جھلک رہے تھے خدا آپ کو بہت سی کامیابیوں سے نوازے۔ محفل احوال میں جیسے ہی قدم رکھا، ارے یار واہ! بھیا آپ نے ہماری خواہش پوری کر دی۔ ''تھینک یو سوچ'' ارے غلام رسول گل تم نے تو کمال کر دیا چھوٹے بھائی کو بھی لے آئے، غلام حسین گلے لگ جاؤ یار۔ محفل میں باقی تمام لوگوں کی آمد بہت اچھی لگی Welcome ڈاکٹر ایس وفا اس حسین محفل میں آنے کی آپ کو بھی دل سے دعوت ہے۔ شاہد فراز اور طارق جاوید آپ کو محفل میں دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوا، انکل محمد اقبال زمان کی والدہ اور ایم اشفاق بٹ کی بھانجی کو خدا صحت کاملہ عطا فرمائے۔ سدرہ انور علی خدا کے کرم سے ہم ٹھیک ہیں، آپ سنائیں اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ انیل حسین یکم مئی کو سالگرہ مبارک ہو۔ ادی تحسین جونیجو آپ سمیت چند ہی خواتین کاشی بھیا کے پاس محفل میں شرکت کرنے کے لیے ٹکٹ بک کروانے آتی ہیں۔ سیٹیں تو ہم نے کب کی خالی کر دی ہیں مگر آپ گھر کے کاموں میں مصروف جو ہیں۔ ہاہاہا۔ پھر نوید شاہ صاحب آپ کے خط سے اندازہ ہوا کہ آپ 40 برس کے ہیں مگر تصویر میں تو 28-27 برس کے لگ رہے ہیں؟ کہانیوں میں سب سے پہلے سرور شاذ کی ''اکتفل'' کا دوسرا اور آخری منفرد حصہ پڑھا۔ اس کے بعد سخن آباد میں انٹری دی، عبدالعزیز جی آ انکل ایک آزاد نظم، بہت پسند آئی۔ انیل حسین قربان پٹھان، مزدور ڈے، مومنہ بتول اپنی دھرتی دل کو بھا گئی۔ ریحان آفاق، حکیم خان حکیم، تمثیلہ لطیف، فریدہ فری یوسف زئی کی غزلیں اچھی تھیں اور نظموں میں سب کے خیال اچھے تھے۔ غلام رسول گل تم نے پہلی بار شاعری کر کے کمال کر دیا۔ مبارکباد۔ مختصر کہانیاں مہر پرویز احمد اعجاز دعا، کنول عمران خان سبز پیر، تحسین کامل، ندا ہاشمی نور کا ہالہ، الماس فاطمہ ارمان، مجروح جھولی، مسز نوید ہاشمی، کایا پلٹ نسیم سکینہ صدف، مرشد کی دعا مختصر مگر جامع روحانی تحریریں تھیں۔ جلوہ جنوں جاوید راہی، نوٹاں والی سرکار، ممتاز احمد، چشمہ فیض ملک عاشق حسین ساجد ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سلیم فاروقی آتش جنوں اپنی مخصوص رفتار سے چل رہی ہے۔ صفدر علی حیدری دعا، بشیر احمد بھٹی وہ سورو پے، گل رعنا پڑوسی، مجید احمد جائی در توبہ کھلا ہے، صدف آصف شان مولا، تجمل میتلو رتی اللہ والی، حنا بشریٰ وہ میرا مہرباں، عہد تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ اعجاز احمد نواب ناگن اچھا سلسلہ ہے۔ ریاض حسین شاہد، صنم کدہ ہے جہاں، ایمان تازہ ہوا۔ منحنی ارشد علی ارشد پسندیدہ سلسلہ پڑھنے کو دے رہے ہیں۔

☆ مور سائیں! تبصرہ بھرپور کیا آپ نے۔ جئیں، بہت جئیں۔



✉ یہ ہیں احوال میں ہمارے نئے دوست غلام رسول گل۔ جیکب آباد سے عرض کرتے ہیں، کاشی چوہان بھیا امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، 28 اپریل کڑی دھوپ، سچی کہانیاں ملتے ہی ٹھنڈک ثابت ہوا۔ شمارہ ملتے ہی احوال کی جانب چھلانگ لگائی ارے یار واہ

مور شاہد حسین صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ ساتھ میں چھوٹے بھائی غلام حسین اور خود کو پا کر بڑا مزہ آیا۔ کاشی بھیا بے حد شکریہ۔ بہن سدرہ انور علی آپ کی صحت کے لیے دعائیں۔ شاہد فراز بھائی کیا حال ہے؟ ڈاکٹر ایس وفا کی خدمت میں سلام و دعائیں۔ ظفر اللہ رند اور صفیہ سلطانہ باجی آپ کہاں ہیں؟ آپ دونوں پڑوسی ہیں، تحسین جونیجو، عبدالعزیز حجی آ، ممتاز احمد، ظفر علی ابڑو سمیت تمام لوگوں کو سلام۔ کاشی بھیا سخن آباد میں میری نظم لگانے کا بے حد شکریہ۔ روحانی نمبر کی تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، اتنا معیاری پرچہ مہیا کرنے کا شکریہ۔ وہ میرا مہرباں، شان مولا، پڑوسی، کایا پلٹ اچھی تھیں۔ جلوہ جنوں، در توبہ کھلا ہے، رتی اللہ دالی، نوٹاں والی سرکار، چشمہ فیض، بہت پسند آئیں۔ مصروفیات کے باعث باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے انشاء اللہ اگلی بار بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گا، اب اجازت خدا ہم سب کا حامی و ناصر ہو (آمین)

☆ پیارے گل! خوش رہو۔ تبصرہ اچھا کیا تم نے، اب اگلے ماہ کوئی تحریر بھی تو لاؤ۔



✉ کراچی سے ہمارے شاعر، لکھاری اور قاری عادل حسین احوال میں براجمان ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔ محترم کاشی جی! السلام علیکم امید ہے مزاج بخیر ہوں گے، رخسانہ آنٹی اور منزہ آپی کو بھی سلام اور دعائیں! اللہ پاک اقبال زمان صاحب کی والدہ اور بہن سدرہ انور علی کو مکمل صحت و تندرستی عطا فرمائے (آمین) مئی کا تازہ شمارہ روحانی نمبر کی صورت جلوہ گر ہوا۔ فولڈنگ ٹائٹل کی تبدیلی پر بے حد شکریہ! دیر آید درست آید، یہ تبدیلی اگر دوشیزہ میں بھی ہو جائے تو بہت خوب۔ روحانی نمبر کے لیے اس سے بہتر اور خوب صورت ٹائٹل مشکل تھا۔ اچھا لگا۔ آپی کا لکھا سولہ آنے سچ ہے۔ کچھ اپنی باتیں پڑھ کر ہمیشہ ہی دل خوش ہو جاتا ہے۔ احوال میں داخل ہوئے تو دل باغ باغ ہو گیا۔ جس جس نے میری کہانی کی تعریف کی میں اُن سب کے لیے دعا گو ہوں۔ کاشی بھائی سمجھ نہیں آتا کیا تبصرہ کروں؟ ان بزرگانِ دین کی کرامات کسی سے ڈھکی چھپی بات تو نہیں ہے۔ جو لوگوں کے ساتھ بیتی، وہ لکھتے ہوئے یقیناً اُن کا دِل فرطِ جذبات سے ضرور رو پڑا ہوگا۔ پڑھتے ہوئے میرا بھی کئی بار یہی حال تھا۔ کاش کاشی بھائی بزرگانِ دین کی کرامتوں کے منکر یہ روحانی نمبر پڑھ لیں۔ یقین جانیے قائل ہو جائیں گے۔ جس کسی کی تحریر کو پڑھا دل عجیب سے کیف میں ڈوب گیا۔ کاشی بھائی میں سورج کو چراغ نہیں دکھا سکتا۔ یہ تمام تحریریں بھی سورج کی طرح چاروں طرف روشنی بکھیر رہی ہیں۔ میں تمام لکھنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دینا چاہتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بزرگانِ دین سے ہم سب فیض پاتے رہیں۔ میں نے روحانیت پر سیکڑوں رسالے پڑھے ہوں گے، مگر اتنا خوب صورت شمارہ صرف سچی کہانیاں کی صورت پڑھنے کو ملا ہے۔ مبارک صد مبارک! آتش جنوں، ناگن اور ملنگنی حسب روایت ٹھیک چل رہے ہیں، سرور شاذ صاحب کی غزل کا دوسرا اور آخری حصہ پڑھ کر مزا آ گیا۔ بہت خوب "مسئلہ یہ ہے" ایک بہت خوب صورت سلسلہ ہے۔ سخن آباد میں سب نے ہی بہت خوب لکھا ہے، اس بار غزلیں صرف 4 تھیں مگر کون سی زیادہ خوب صورت، یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ آخر میں سب کو ڈھیروں دعائیں۔ مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا، کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی! بشرطِ زندگی پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیارے عادل۔ تبصرہ شاندار کیا، تمہاری محبت کے لیے لفظ کم پڑ جائیں گے اس لیے فی الحال صرف اتنا۔ ویلڈن۔



✉ ایم جے قریشی، ڈی آئی خان سے پہلی بار احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کاشی بھائی اور سچی کہانیاں کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوں گے۔ ماہ مئی 2014 کا سچی کہانیاں کا تازہ شمارہ 29 مئی کو ہمارے گھر کی دہلیز پر اپنا قدم رکھ چکا تھا، روحانی نمبر کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ سچی کہانیاں کی ہر تحریر، ہر کہانی اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ کہانیوں میں، آتش جنوں سلیم فاروقی، دعا صفدر علی حیدری، یقین کامل تنویر خالد، مرشد کی دعا نسیم سکینہ صدف کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ سخن آباد میں سب دوستوں نے اچھا لکھا۔

میں عرصہ ایک سال سے سچی کہانیاں کا قاری ہوں، لیکن شرکت پہلی بار کر رہا ہوں امید ہے حوصلہ افزائی کریں گے۔ میں اور میرے دوست، جواد حسن، محمد سعید، محمد عرفان، جمشید حسین اور محمد عثمان کی دعا ہے کہ سچی کہانیاں آپ کی ادارت میں ہمیشہ پھلتا پھولتا رہے۔ کاشی بھائی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ پیارے بھائی ایم جے۔ سدا خوش رہو، تبصرہ! اچھا کیا آپ نے اور آپ کی تحریر بھی بہت خوش خط ہے۔ شاعری جلد سخن آباد کے صفحات کا حصہ بنے گی۔

✉ ساحل ابڑو بلوچستان سے کافی عرصے بعد احوال میں مہمان ہیں، لکھتے ہیں قابل احترام کاشی چوہان، سدا خوش رہو مسکراتے رہو۔ السلام علیکم بعد عرض ہے کہ میں یہاں بالکل خیریت سے ہوں اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم بھی خیر خیریت سے ہوگی۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ماہ اپریل کا تازہ شمارہ سچی کہانیاں میرے ہاتھوں میں ہے، آپ کی باتیں اور اس بار جو سچی کہانیاں پر محنت کی گئی ہے تو اس کا اندازہ شاید آپ کو قارئین کے خطوط سے ہوگا، کیوں کہ اس کی محنت سے تو سچی کہانیاں کے ورق سے ادبی خوشبو مہکنے لگی ہے اور گیلا کاغذ خشک نورانی کپڑے کی طرح چمکنے لگا ہے اور خطوط کی محفل میں سجے ہوئے موتیوں کے دانوں سے گلدستہ ہمارے ادیب حضرات ایک دوسرے کو خوشیوں بھرا تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ اللہ کرے ایسی محنت ہمیشہ کے لیے ہوتی رہے۔ کاشی کبھی کبھار آپ سے باتیں ہوتی ہیں تو اکثر آپ کو گلہ ہوتا ہے کہ ساحل کوئی کہانی تبصرہ لکھے۔ تو میں یہاں صرف یہ کہوں گا کہ ایک تو سچی کہانیاں مجھے (ڈیرہ اللہ یار) میں بہت دیر سے ملتا ہے جس پر تبصرہ کرنا ناممکن ہوتا ہے ہاں مگر کبھی کبھار جلدی پہنچ جاتا ہے تو حاضری دیتے رہتے ہیں۔ آپ ایک رائٹر کی حیثیت سے مدیر اعلیٰ تک پہنچ گئے ہیں! یہ آپ کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔

☆ بہت عزیز ساحل! تمہاری یہ امیر غریب کی تکرار نے مجھے پریشان کر دیا۔ اپنا ہی ایک شعر اس کے جواب میں۔

دل میں جھانکا تو یہ کھلا ہم پہ
بادشہ بھی غریب ہوتے ہیں

✉ ظفر علی ابڑو۔ ملیر کراچی سے رقم طراز ہیں، کاشی چوہان بھائی بہت سی دعائیں نیک تمنائیں آپ سمیت پورے اسٹاف اور تمام سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے نام۔ 2 مئی صبح جب مارکیٹ کا چکر لگایا تو سچی کہانیاں کو اسٹال پر دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی قدم رک گئے تمام شماروں میں منفرد اور ممتاز نظر آ رہا تھا ایک دم خرید لیا، روحانی نمبر دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی آپ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ آپ کی خدمت اور دم سے سچی کہانیاں عروج پر پہنچ چکا ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آمین۔ بس امید ہے آپ یونہی ہمیں اپنی محبتوں، شفقتوں سے نوازتے رہیں گے۔ 22 صفحہ پر 22 ویں سیٹ میری تھی۔ اپنا خط پڑھنے سے پہلے آپ کا محبت بھرا جواب پڑھا۔ بھائی واقعی سچی کہانیاں ہمارا ہی پرچہ ہے۔ اس کی ترقی ہماری ترقی ہے۔ احوال میں نئے لوگوں کی آمد بھلی لگی۔ سدرہ انور علی شکریہ۔ مور شاہد حسین آپ کی نظم "وہ" خوب رہی، بھائی ہم اشارہ نہیں سمجھتے؟ امجد علی بھیا، غلام رسول گل، شفقت حسین، فیض رسول کیا حال ہیں جناب؟ منزہ سہام کے اداریہ "پختہ عزم" سے لے کر ارشد علی ارشد کی لکھنی تک سب کی سب کہانیاں بے حد پسند آئیں۔ رائٹرز حضرات نے روحانی نمبر کے لیے اچھے موضوع پڑھنے کو دیے۔ مبارک باد۔



☆ ظفر بھیا! تم تو ہمارے پڑوسی ہو مگر تبصرہ T.C.S سے...... ؟ پھر بھی ہمیں تمہاری محبت پر مان ہے۔



✉ امجد علی۔ چیزل آباد سے شریکِ احوال ہیں، لکھتے ہیں مدیر اعلیٰ منزہ سہام اور مدیر کاشی چوہان سچی کہانیاں السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ تازہ شمارہ دلکش روحانی نمبر ہاتھوں میں ہے۔ آپ سچی کہانیاں کی ترقی کے لیے انتھک محنت کر رہے ہیں لیکن

اس کے باوجود بھی سچی کہانیاں 30-29 کو ملتا ہے اور آپ نے خط لکھنے کی 7-6 تاریخ مقرر کی ہے۔ پلیز بھائی اس پر خاص توجہ دیں۔ امید ہے آپ میری اس چھوٹی سی گزارش کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ سب سے پہلے کچھ اپنی باتیں پڑھی، یہ اچھا نہیں بہت اچھا سلسلہ ہے جاری رہنا چاہیے۔ مصروفیات کے باعث چند کہانیاں پڑھی ہیں جن پر تبصرہ پیش خدمت ہے۔ جلوہ جنوں جاوید راہی، چشمۂ فیض، ملک عاشق حسین ساجد، صفدر علی حیدری دعا، بشیر احمد بھٹی وہ سو روپے اچھی تھیں سب بے حد پسند آئیں۔ ارشد علی ارشد منکشفی، سلیم فاروقی آتشِ جنوں، اعجاز احمد نواب ناگن حیرت اور تجسس سے بھرپور پسندیدہ سلسلے ہیں۔ اب اجازت انشاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر آپ کے ساتھ ہوں گے۔ بشرط زندگی۔

☆ پیارے امجد۔ شمارہ پسند کرنے کا شکریہ، آپ کے اگلے تبصرے کا انتظار ہے۔

✉ سرگودھا سے عظمیٰ شکور رقم طراز ہیں، ایڈیٹر صاحب آداب، چھ چاندوں سا چمکتا سرورق لیے سچی کہانیاں آن پہنچا، میں نے دو چاندوں کا اضافہ کر دیا ہے کیوں کہ چار چاند کچھ کم لگ رہے تھے کہ سرورق تھا ہی اتنا حسین بالکل نورانی، سر پر ٹھیک سے دوپٹا جمالیا اور کھول کر لگے پڑھنے، منزہ سہام کے سچے جذبے اپنے ملک کے لیے ہمیشہ کی طرح کھرے تھے، کاشی چوہان صاحب کی بہت ساری باتیں پڑھنے کو ملیں، احوال میں آئے تو گویا گم ہو گئے بہت سے قارئین میں گھر کر اچھا لگا، آگے بڑھے کہانیاں پڑھنے کو ملیں، تمام کہانیاں پُرنور کرامات سے بھری پڑی تھیں ان کہانیوں پر کچھ رائے دینا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے پھر بھی جو محسوس کیا ہے لکھ ڈالا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آتے ہیں، ممتاز احمد کی لکھی تحریر ''نوٹاں والی سرکار'' پر یہ کہانی اصل میں ایک یقین کی عکاسی کرتی ہے۔ ''صفدر علی حیدر'' کی لکھی کہانی دعا میں ''دعا'' کی حقیقت کو بیان کیا گیا تھا۔ بشیر احمد بھٹی کا لکھا ''وہ سو روپے'' میں حضرت گنج بخش داتا ہجویریؒ کے مزار کے بارے میں بہت سی معلومات ملیں۔ گل رعنا کی ''پڑوسی'' بھی خوب رہی۔ مجید احمد جائی کی لکھی تحریر ''در توبہ کھلا ہے'' رُلا ہی تو ڈالا اس تحریر نے۔ ''رتی اللہ والی'' بھی زبردست تحریر تھی، اب آتے ہیں ریاض حسین شاہد کی لکھی کہانی کی طرف ''صنم کدہ ہے جہاں'' عشق مجازی سے عشق حقیقت تک لے جانے والی یہ کہانی اچھی تھی۔ یہ روحانی سفر تھا زبردست، بزرگوں کی کرامات، مزاروں پر لوگوں کا ہجوم سب کا ایک ہی مقصد کہ اللہ راضی ہو جائے۔ اس غرض کی دنیا سے ہٹ کر بالکل اک نئی دنیا کی سیر کرانے میں کامیاب رہے آپ۔ اپنی کوششوں میں، ویلڈن، ویری ویلڈن۔

☆ عظمیٰ شکور صاحبہ! سلامت رہیے۔ ہمیشہ کی طرح آپ کا تبصرہ شاندار رہا، اگلے ماہ کے لیے آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ ہماری بہت پیاری گڑیا سی سدرہ انور علی جھنگ صدر سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں، محترم کاشی چوہان بھیا، میرے پیارے مہربان برادرز اینڈ میری جان قدر دان سسٹرز، السلام علیکم! اسی امید کے ساتھ حاضر خدمت ہوں کہ تمام پڑھنے والے صحت وامان کی بہترین حالت میں ہوں گے اور اپنی زندگی رضائے الٰہی میں گزار رہے ہوں گے، چڑھتی گرمیوں کا پہلا شمارہ ملا جو کہ روحانی نمبر بھی تھا یقین کیجیے میں نے آج تک ایسا نمبر نہیں پڑھا۔ روحانی نمبر کے حساب سے ٹائٹل بہترین تھا۔ کچھ اپنی باتیں نے ہلا کر رکھ دیا۔ احوال میں تمام خطوط بہتر تھے لیکن ممتاز احمد بھیا، ثمینہ ناز اور ملکہ احوال تحسین جونیجو کے خطوط بہترین تھے۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو میں تو اور بھی کئی زبانوں سے واقف ہوں مثلاً خاص طور پر نفرت ومحبت کی زبان سے۔ ممتاز احمد بھیا جب آپ اتنا مان سمان دیتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ فیصل ندیم جی اللہ آپ کو زندگی کے ہر امتحان میں کامیابیوں سے نوازے۔ آمین، زرینہ جونیجو آپی، رانا شاہد بھیا، محمد عزیز بھیا، عزیز انکل، فہیم انکل، سلیم اختر انکل کو سلام پلیز اب آ بھی جائیے۔ منزہ سہام آنٹی کا اداریہ، پختہ عزم، دل کی آنکھ سے پڑھا۔ روحانی نمبر بہت پسند آیا، پہلی کہانی جاوید راہی کی جلوۂ جنوں، ممتاز احمد بھیا کی نوٹاں والی سرکار، ملک عاشق حسین کی فیض عشق، صفدر علی حیدر کی دعا، بشیر احمد بھٹی کی، سو روپے، گل رعنا کی پڑوسی، مجید احمد کی توبہ کا در کھلا ہے، حنا بشریٰ کی وہ

میرا مہرباں، مہر پرویز کی اعجاز دعا، روح کو تقویت پہنچانے والی بہترین کہانیاں تھیں۔ صدف آصف کی شانِ مولا، بہت پسند آئی، صنم کدہ ہے جہاں ریاض حسین شاہد کی کہانی بہت لاجواب تھی، سخن آباد میں تمام شاعروں کی شاعری پسند آئی۔ جن میں خاص طور پر غلام رسول گل، عبدالعزیز انکل اور زرینہ آپی کی۔ سلسلے وار کہانیوں میں انکل سلیم فاروقی کی آتش جنوں، اعجاز احمد نواب کی ناگن کا جواب نہیں۔ تبصرے میں کچھ رہ گیا ہو تو بہت معذرت، کسی کو کوئی بات بری لگی ہو تو دلی معذرت، سانسوں کا تسلسل اسی طرح قائم ودائم رہا تو پھر ہوگی ملاقات کب تک کے لیے اپنا اور اپنے ساتھ والوں کا خیال رکھیے گا، اللہ نگہبان۔

☆ سدرہ سسٹر! سلامت رہو۔ تبصرہ بہت اچھا کیا۔

✉ طارق جاوید، بہاول نگر سے لکھتے ہیں، محترم کاشی چوہان بھائی۔ السلام علیکم، خدا آپ کو سدا سلامت رکھے آمین احوال میں یہ میری دوسری شرکت ہے۔ اس کی خاص وجہ آپ کی محبت و اپنائیت ہے آپ کا خوب صورت جواب پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی، میں ہمیشہ آپ کا مشکور و ممنون رہوں گا کہ آپ نے اگلے ماہ بھی ان ہی صفحات پر ملاقات کرنے کا اظہار کیا۔ روحانی نمبر بہت اچھا تھا بے حد پسند آیا۔ سچی کہانیاں تمام ڈائجسٹوں میں منفرد ہے۔ میں پہلے اور رسالے پڑھتا تھا مگر ایک بار میں نے سچی کہانیاں پڑھا تب سے میں اس کا دل سے مداح ہو گیا۔ روزانہ انتظار کی سولی پر لٹک کر اس کا انتظار کرتا ملنے کے بعد اس میں کھو جانا اب عادت بن چکی ہے۔ پرچے کی شروعات آپ کی تحریر کچھ اپنی باتیں سے کی۔ آپ بہت خوب لکھتے ہیں بھائی مگر آپ کی کہانی کی کمی محسوس ہوتی ہے، اب اجازت۔

☆ طارق! آپ نے پرچے کو پسند کیا، ہمیں بہت اچھا لگا، اگلے ماہ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ شفقت حسین حب چوکی سے رقم طراز ہیں۔ پیارے بھائی کاشی چوہان خدا آپ کو سدا سکھی رکھے۔ آمین، ماہنامہ سچی کہانیاں روحانی نمبر شاندار ٹائٹل کے ساتھ شمارہ بھی نہایت ہی شاندار تھا۔ آپ نے بھیا جی کو فرنٹ سیٹ دے دی ہمیں بھی خوشی ہوئی، مبارک ہو بھائی۔ غلام رسول گل بھی نظم لائے خوشی ہوئی، سدرہ انور علی کیسی ہیں آپ؟ ممتاز احمد کی تحریر نوٹاں والی سرکار بے حد پسند آئی۔ گل رعنا کی پڑوسی، صدف آصف کی شانِ مولا، حنا بشریٰ کی وہ میرا مہرباں، ریاض حسین شاہد کی صنم کدہ ہے جہاں زیادہ پسند آئیں، ندا ہاشمی کی نور کا ہالہ، نسیم سکینہ صدف کی مرشد کی دعا بھی عمدہ تھی۔ اب اجازت آپ سے اس شعر کے ساتھ۔

سرخ آنکھوں سے جب وہ ہمیں دیکھتے ہیں
ہم گھبرا کے آنکھیں جھکا لیتے ہیں
ارے کاشی کیسے ملائیں ان کی آنکھوں سے آنکھیں
سنا ہے وہ آنکھوں سے اپنا بنا لیتے ہیں

☆ ارے واہ شفقت حسین! کیا بات ہے آپ کی۔ خوش رہیے، کبھی کبھی وہ آنکھیں بھی دکھا دیتے ہیں۔

✉ یہ احوال میں آمد ہے فیض رسول کی بہاولپور سے، لکھتے ہیں، جناب مدیر سچی کہانیاں کاشی چوہان صاحب بتائیے کیسے مزاج ہیں آپ کے، مجھے خدا کے فضل وکرم سے پوری امید ہے کہ آپ اور پورا اسٹاف بخیریت ہوں گے، سچی کہانیاں کی جتنی تعریف کریں اتنی کم ہے، ہمیشہ کی طرح ٹائٹل خوب رہا، محترمہ منزہ سہام 'پختہ عزم' اور کاشی چوہان بھائی آپ کی تحریر کچھ اپنی باتیں لاجواب سلسلہ ہے۔ ہر ماہ کوئی خوب صورت سبق پڑھنے کو ملتا ہے۔ احوال کی کیا بات ہے۔ بھائی اپنوں کی محبتوں سے سجی محفل بہت اچھی ہے۔ احوال میں اپنا خط اور تصویر دیکھ کر خوشی ہوئی ہر ماہ تھوڑی سی جگہ دینے

کا شکریہ۔ جھنگ صدر کی بہن سدرہ انور علی یاد کرنے کا شکریہ، خدا آپ کو دراز عمر عطا فرمائے۔ باقی تمام احوالیوں کو سلام۔ کاشی بھائی حسب معمول 3 تاریخ کو سچی کہانیاں ملا۔ احوال ہی پڑھ سکا ہوں اگر بروقت پرچہ ملتا تو بھرپور تبصرہ ضرور کرتا۔ بس خدا سے دعا ہے کہ آپ سدا مسکراتے رہو پیارے قارئین کے ساتھ دکھ سکھ اور خوشیاں بانٹتے رہو۔

☆ فیض رسول! بھیا یہ تو آپ کی محبت ہے۔ احوال میں آمد آپ کا حق ہے۔ مگر تبصرہ اب آپ نے بھرپور کرنا ہے۔



✉ ظفر اللہ رند، ڈیرہ مراد جمالی سے احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ محترم جناب مدیر اعلیٰ منزہ سہام آنٹی اور مدیر کاشی چوہان صاحب تمام اسٹاف اور لکھاری بھائیوں اور بہنوں آپ تمام اس ناچیز کی طرف سے سلام قبول ہو۔ السلام علیکم! کاشی بھیا یہ بات میں آپ کو بھی نہ کہوں تو کس کو کہوں آپ یقین کریں جب میں نے محمد اقبال زمان سے بات کی تھی تو صرف 3 مہینے مجھے ڈائجسٹ بروقت ملتا رہا ہے۔ اس کے بعد اب پھر وہی سسٹم ہے جیسے پہلے تھا۔ اب آپ یقین کریں ماہ اپریل کا ڈائجسٹ مجھے اپریل کی 13 تاریخ کو ملا اور اس وجہ سے میں شامل احوال نہ ہو سکا اور آج ماہ مئی 4 تاریخ کو آپ کو خط لکھ رہا ہوں اور ابھی تک سچی کہانیاں نہیں ملا ہے۔ آخر ہم پہ اتنا کیوں ستم کر رہے ہیں۔ چوں کہ ڈائجسٹ ملا نہیں ہے اس لیے مختصر لکھ رہا ہوں پلیز اگر ہو سکے تو شامل اشاعت کر دیں اور اس مسئلے کو حل کریں تا کہ ہر ماہ بروقت احوال میں شامل ہو جاؤں اور کاشی بھائی ماہ اپریل میں، میں نے اپنی شاعری دیکھی تو قسم سے خوشی کے مارے میں تو پاگل ہو رہا تھا اور خود یہ یقین نہیں تھا کہ یہ میری شاعری ہے اور وہ بھی سچی کہانیاں میں تہ دل سے میں آپ کا مشکور ہوں اور اب مزید شاعری بھیج رہا ہوں، اگر جگہ مل جائے تو کسی کونے میں شائع کر دینا۔ اب اجازت امید ہے کہ میرے اس مسئلے کو سنجیدگی سے حل کریں گے۔

☆ بھائی ظفر اللہ رند، آپ کا مسئلہ متعلقہ شعبے تک پہنچا دیا گیا ہے۔ مگر آپ سے ایک گزارش ہے کہ آپ اپنی منی آرڈر کی رسید کی فوٹو کاپی روانہ کر دیجیے۔



✉ عبدالعزیز جی آ چکوال سے بڑے دن بعد احوال میں موجود ہیں، لکھتے ہیں اچھے کاشی چوہان سلام عقیدت، سچی کہانیاں "روحانی نمبر" موصول ہوا دیدہ زیب ٹائٹل خوب صورت بائنڈنگ، قابل صد احترام قاری بھائی، بہنوں، بچے، بچیوں کی میٹھی میٹھی باتوں اور پیاری پیاری تصویروں، سبق آموز تحریروں عظمیٰ شکور کے نت کھٹ جملوں سے سجا احوال بندۂ نقیر کے ہاتھوں میں پہنچا ضرور مگر وہ چیز دیکھنے میں نہیں آئی جو ہمارے وقتوں میں محفل دوستاں احوال، چوپال کی زینت تھی۔ "جہاں جہاں شرارت وہاں وہاں تحسین" جیسے خوب صورت جملے کہیں نظر نہیں آتے۔ سدرہ بیٹی آپ نے ہمیں پچھلے شمارے میں آواز دی تھی، احتجاجاً سچی کہانیاں سے بائیکاٹ کیے بیٹھا تھا لیکن بیٹی کی آواز سن کر رہا نہ گیا اور چلا آیا۔ میلہ دیکھنے اور زخمی ہونے کا واقعہ آزردہ کر گیا۔ آپ نے لکھا مجھے قبر سے ڈر لگتا ہے، نماز پنجگانہ کی عادت ڈالو ہو سکے تو تہجد بھی پڑھو قبر کا خوف جاتا رہے گا۔ "یہ آزمایا ہوا نسخہ ہے" مور شاہد اور ممتاز احمد نے بھی ہمیں یاد کیا۔ جیتے رہو۔ ملک عاشق حسین ساجد، عبدالغفار عابد، ریاض حسین شاہد، مبشر حسن اور اشفاق بٹ کو سچی کہانیاں میں خوش آمدید۔ اشفاق جی اللہ بچی کو صحت کاملہ نصیب فرمائے۔ میری تمام نیو کمرز سے درخواست ہے کہ ادب کی دنیا میں بے ادبی سے گریز کرنا سینئرز کا احترام اور جونیئرز پر دست شفقت رکھنا۔ ہمیشہ سچ بولنا، عورت چھپانا۔ تصویر ہمیشہ فریش دینا۔ اس عمل سے آپ کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوگا۔ محبوب بنانے کا شوق چرائے تو جی آ انکل کی طرح سچائی کو محبوبہ بنالینا۔ انشاء اللہ ایک نہ ایک دن اصل محبوب کو پالو گے۔ میری دعائیں ہمیشہ آپ لوگوں کے ساتھ رہیں گی۔ کاشی میرے عزیز دوست نظم لگانے کا بہت شکریہ۔ نیک تمناؤں کے ساتھ محبت نامہ بند کرتا ہوں۔ ہر یاد کرنے والے کو سلام۔ آپ سب کا انکل جی آ۔

☆ بھیا جی! سلامت رہیے اب بڑے بن کر دکھائیں اور ہر ماہ احوال میں حاضری باقاعدہ بنائیں۔



✉ فیصل ندیم بھٹی چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے شامل احوال ہیں ۔ السلام علیکم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں محترمہ منزہ سہام صاحبہ اور مدیر جناب کاشی چوہان اور تمام معاون اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا۔ 30 اپریل کو ماہ مئی کا شمارہ پراچہ بک ڈپو سے ملا۔ شمارے کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ روحانی نمبر کی مناسبت سے اسلامی خواتین کی جھلک دیکھنے کو ملی اور دوسرا سرورق جو ڈبل ہوتا تھا شکر ہے کہ اس سے جان چھوٹی حسب روایت سب سے پہلے منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ ''پختہ عزم'' پڑھنے کو ملا۔ کاشی بھیا کی کچھ اپنی باتیں مختصر سی کہانی بہت بڑا سبق اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے بعد احوال پڑھتے پڑھتے جب سدرہ انور علی کا احوال پڑھا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ سدرہ جی اللہ نے آپ کو ایک نئی زندگی دی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ کے من کا آنگن ہمیشہ خوشیوں سے مہکتا رہے۔ آمین۔ ممتاز احمد صاحب آپ کا بڑا پن ہے مجھ ناچیز کی تعریف میں چند الفاظ جو آپ نے لکھے ہیں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں ہمیشہ خوش رہیں۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر سب سے پہلی کہانی جاوید راہی کی جلوہ جنوں پڑھ کر ایک زندہ ولی کی کشف و کرامات سے دل روشن ہوا۔ ممتاز صاحب کی نوتاں والی سرکار کی فضیلت و کرامات پڑھ کر اسی دن میں نوتاں والی سرکار پر حاضری دیے بغیر رہ نہ سکا۔ چشمہ فیض پڑھ کر بھی دل ایمانی جذبے سے سرشار ہوا اور روحانیت میں بے پناہ اضافہ ہوا سلیم فاروقی کا آتش جنوں بھی کامیابی کی طرف ایک نیا قدم ہر بار لیے جا رہا ہے۔ دعا صفدر علی حیدری بھی وسیلہ دعا کی عظیم مثال حقیقت ہے کہ دعا سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ بشیر احمد بھٹی صاحب کی وہ سو روپے۔ گل رعنا کی پڑوسی، مجید جاکی کی در توبہ کھلا ہے، صدف آصف کی شان مولا، جنجیل معتلو کی رتی اللہ والی، حنا بشریٰ کی وہ میرا مہربان، سبز پیر کنول عمران کی۔ یقین کامل تنویر خالد کی۔ ندا ہاشمی کی نور کا ہالا، الماس فاطمہ ارمان کی بھر دے جھولی، مسز نوید ہاشمی کی کایا پلٹ، مرشد کی دعا نسیم سکینہ صدف کی اور کھٹل کا دوسرا حصہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ تمام کہانیاں پڑھ کر ایک بار پھر دل نور ایمان سے منور ہوا اور روح کو سکون ملا۔ مبشر حسن ہیڈ بکائی سے احوال میں شریک ہونے پر خوش آمدید کہتا ہوں، مجھ ناچیز کے خط کی پسندیدگی کا شکریہ جناب یہ ہیڈ بکائی کس جگہ واقع ہے؟؟ SMS کے ذریعے احوال میں سرگودھا سے صائمہ شاہین نے شرکت کی ہے احوال میں شامل ہونے پر خوش آمدید اب اگلی بار بذریعہ خط احوال میں شامل ہونا چاہیے آپ کو۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ ملک پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے آمین۔ کاشی بھیا اب تو میری کہانی شائع کر ہی دیں نا۔

☆ پیارے فیصل۔ سدا سلامت رہو تبصرہ شاندار کیا تم نے واہ مزہ آ گیا۔ بس تمہاری کہانی شائع ہونے ہی والا ہے۔

✉ تحصیل کھپرو، ضلع سانگھڑ سے محمد علی خر پہلی بار احوال میں تشریف لائے ہیں، عرض کرتے ہیں محترمہ مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم، مجھے آپ کا ڈائجسٹ سچی کہانیاں بہت پسند ہے جو میں پہلے حیدرآباد رہتا تھا تو وہاں سے لیتا تھا۔ اب میں گاؤں چلا گیا ہوں۔ وہاں پر آپ کا رسالہ مجھے نہیں ملتا یہ بہت افسوس کی بات ہے۔ اگر آپ ہر مہینے وی پی پارسل سے ہر مہینے بھجوائیں گے تو میں پیسے دے کر وہ ڈاک ہاتھوں ہاتھ لے جاؤں گا۔ اگر آپ ایسی عنایت کریں گے تو بہت مہربانی ہوگی، میں بھی آپ کے ڈائجسٹ میں لکھنا چاہتا ہوں سچی کہانیاں مگر میں لکھ نہیں پا رہا ہوں کہ ڈائجسٹ نہیں ملتا تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ میری اسٹوری شامل ہے یا نہیں۔ مہربانی

☆ بہت پیارے محمد علی خر! جناب اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ VP پارسل کے ذریعے پرچہ پہنچایا جائے۔ آپ فوری طور پر 720 روپے کا منی آرڈر آفس میں بھجوا دیں پرچہ ہر ماہ وقت پر آپ کے [illegible] میں ہوگا۔

✉ کراچی سے ایک طویل عرصے بعد ہماری بہت اچھی رائٹر عروبہ عدنان احوال میں شامل ہیں، لکھتی ہیں قابل احترام کاشی چوہان صاحب! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گے اور آپ کی سربراہی میں سچی کہانیاں اور دوشیزہ بڑی تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔ کافی عرصے سے غیر حاضر ہوں، معذرت قبول

کیجیے۔ کچھ مصروفیات کی بناء پر عارضی طور پر لکھنے لکھانے کا سلسلہ رک گیا تھا مگر لکھاری کا لکھنا بند کرنا ایک ناممکن امر ہے، سو آپ کے دربار میں پھر حاضر ہوں۔ ایک چھوٹا سا شکوہ ہے آپ سے کہ ہماری ایک کہانی ''کشمیر جنت نظیر'' آپ کے پاس محفوظ ہے ابھی تک سچی کہانیوں میں چھپ نہ سکی، برائے مہربانی وجہ بیان فرما دیں۔ میرے خیال میں تحریر میں کچھ نقص نہیں بہرحال مرضی ہے صاحب..... آج تک ہمارے ساتھ ایسا ہوا نہیں۔

☆ پیاری بہن عروبہ! بس ''کشمیر جنت نظیر'' کا نمبر آیا ہی چاہتا ہے اور آپ احوال میں اتنی غیر حاضر کیوں ہیں؟

✉ ڈیرہ غازی خان سے ہماری بہن ارم خان لکھتی ہیں، السلام علیکم اچھے بھائی! امید ہے ٹھیک ہوں گے، آپ کی یہ بہن آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہے، بہت بہت شکریہ جو آپ ہر ماہ آپ میرے خط کو احوال کی محفل میں جگہ دیتے ہیں اور اس ماہ اپنی شاعری دیکھ کر بے حد خوشی ملی، میری شاعری کو شامل کرنے کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔ اس ماہ کا اپنا خط دیکھ کر تھوڑا چکر سا آ گیا کیوں کہ خط اور نام میرا تھا لیکن ایڈریس اور پھر غور سے دیکھنے کے بعد تسلی ہوئی۔ اس ماہ خط کے ساتھ ایک غزل بھی بھیج رہی ہوں۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے رسالے کی طرف جو میرے سامنے ہے۔ رسالہ اس بار بھی یکم کو ملا۔ بھیا جب لے کر آئے اور مجھے دے دیا میں نے رسالہ ہاتھ میں لیا دیکھا تو ٹائٹل والی لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کے میں بھی مسکرا دی، پھر کچھ آگے چلی تو آپی منزہ سے ملاقات ہوئی پھر کچھ آگے چل کے بھیا جی کی کچھ اپنی باتیں پڑھیں پھر آگے جا کے احوال کی محفل میں تانک جھانک کی جہاں اپنا نام بھی نظر آیا پھر اس کے بعد کہانیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پڑوسی، رتی اللہ والی، بھر دے جھولی، نور کا ہالہ یہ سب بہت اچھی تھیں، پھر ان کے بعد جہنم کدہ ہے جہاں پڑھی جسے پڑھ کے دل دکھ سے بھر گیا۔ باقی رسالہ ابھی نہیں پڑھا، کیوں کہ پورے ماہ اسے تھوڑا تھوڑا پڑھنا ہے، اگر اسے ایک دو دن میں ختم کر دیا تو پھر باقی دن کیسے گزریں گے۔ خط کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہے، سو اب چلتے ہیں اگلے ماہ پھر سے آنے کے لیے اس وقت خدا حافظ۔

☆ پیاری ارم! سلامت رہیں، شاعری جلد شائع ہوگی، تبصرہ شامل ہے۔

✉ کورنگی کراچی سے کشور وسیم صاحبہ احوال میں ہمارے ساتھ ہیں، لکھتی ہیں جناب محترم مدیر اعلیٰ صاحب السلام علیکم! اس سے پہلے ایک کہانی آپ کو ارسال کر چکی ہوں اور جس کے چھپنے کی امید ظاہر کی گئی تھی، اب یہ دوسری کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے، اب دیکھنا ہے کہ یہ کوشش کامیاب ہوتی ہے یا نہیں۔

☆ بہن کشور وسیم! پہلی کہانی بہت جلد ان صفحات پر نظر آئے گی۔ دوسری بھی جلد شائع ہو جائے گی، مگر یہ کیا؟؟ تبصرہ کہاں ہے پرچے پر..... یہ تو فاؤل ہوا نا ہمارے ساتھ۔



✉ سرگودھا سے ہمارے بہت عزیز بھائی ممتاز احمد رقم طراز ہیں، محترم المقام کاشی بھیا السلام علیکم۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اس دعا کے ساتھ اپنے خط کا آغاز کرتا ہوں کہ رب رحمٰن رحیم جس کی رحمتوں اور نعمتوں کا کوئی شمار نہیں وہ اپنے خزانہ خاص سے ہم سب کو نواز دے۔ ماہ مئی کا روحانی نمبر خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ہاتھوں میں ہے، آپ نے روحانی نمبر شائع کر کے سب کے دل جیت لیے ہیں، اداریہ میں منزہ سہام نے بہت عمدہ بات کہی یقیناً عزم ارادہ نیت اور لگن مضبوط ہوں، جذبے جواں ہوں تو جیت مقدر بن جاتی ہے۔ میں اپنے ان محترم دوستوں کا بھی بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے بابا عمر دین کو سراہا اور پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ ٹنڈو جام کے بھائی پیر نوید شاہ کو میرا احوال میں تبصرہ اچھا لگا بہت شکریہ۔ احوال میں چھا جانے والی عظمیٰ شکور جی یہ بھی تو ایک کلائمکس ہے کہ ''بابا عمر دین'' پڑھنے کے دوران آپ کو چائے کی طلب رہی۔ چلیں آپ کی چائے میری طرف اُدھار رہی۔ لالہ موسیٰ کے ایم اشتیاق بٹ صاحب [illegible] فرمائے۔ آمین۔ احوال میں سب لکھاریوں نے بہت خوب صورت الفاظ کے ساتھ تبصرے لکھے۔ مجھے بہت صدمہ ہوا

کہ بٹی سدرہ انور علی کو گرنے کی وجہ سے سخت چوٹ لگی۔ اللہ رب العزت کے فضل و کرم اور حضور نبی کریم ﷺ کے نعلین پاک کے تصدق سے اپنی اہلیہ کے ہمراہ عمرہ کی سعادت حاصل کرنے جا رہا ہوں، بے انتہا سرکاری اور نجی مصروفیات کے دوران ہی سچی کہانیاں ماہ مئی کے شمارے کا مطالعہ جاری ہے۔ جلوۂ جنوں، چشمۂ فیض، نور کا ہالہ، شانِ مولا، رتی اللہ والی، وہ میرا مہرباں، بھر دے جھولی، کایا پلٹ پڑھ چکا ہوں سبحان اللہ ایمان تازہ ہو گیا روح تر و تازہ معطر ہو گئی۔ تمام کہانیاں بہت خوب صورت تھیں۔ سب لکھاریوں نے اپنی محبت اور عقیدتوں کے پھول نچھاور کیے۔ کاشی بھیا گزارش ہے کہ سال میں اگر دو بار نہیں تو کم از کم ایک بار روحانی نمبر ضرور شائع کیا کریں۔ خوش رہیے۔ خوشیاں سمیٹے آباد رہیں شاد رہیں، انشاء اللہ ماہ اگست میں ملاقات ہو گی اگر بے وفا زندگی نے ساتھ دیا تو...... تب تک اللہ نگہبان۔

☆ بھیا! خدا تعالیٰ سب کو اُس مقدس سرزمین کی زیارت نصیب کرے (آمین) سلامتی کی ساری دعاؤں کے ساتھ عمرے کی سعادت کی ایڈوانس مبارک ہو۔



✉ مہر پرویز احمد دولو، میاں چنوں سے لکھتے ہیں، محترم جناب ایڈیٹر صاحب سلام مسنون! تبصرہ حاضر خدمت ہے، سرورق بہت خوب صورت تھا۔ پختہ عزم خوب حوصلہ افزائی تھی۔ اپنی باتیں بھی یقین کی قوت سے مالا مال تھیں۔ احوال میں سدرہ انور علی کے حال نے خوف میں مبتلا کر دیا۔ یقیناً آپ کی کوئی نیکی کام آئی اور اوپر والے نے خصوصی طور پر تم کو انعام صحت سے نوازا۔ جاوید راہی، ممتاز احمد، ملک عاشق ایمان افروز تحریریں لائے۔ صفدر علی حیدری کی کہانی کا کیا کہنا۔ اگر ادھار روٹی کھا لیتا، حرام کھاتا اور ایمان چلا جاتا کیا کہنے۔ بشیر بھٹی نے خوب کہانی لکھی، گل رعنا کی پڑدی خوب کہانی تھی، جبخل مینلو کی ”رتی“ لاجواب کہانی تھی۔ بے حد پسند آئی، حنا بشریٰ نے عورت ہو کر بڑے دل گردے کا کام کیا ہے اور روح پر ایک خوب صورت تحریر لکھ کر اپنی جواں مردی اور دلیری کا لوہا منوا لیا ہے۔ تنویر خالد کی داتا صاحب کی عنایتوں کی سوغات خوب تھی۔ نسیم سکینہ صدف کی مرشد کی دعا کتنے ہی بیڑے پار لگا دیتی ہے، سرور شاذ آپ کی کہانی پرچے کی سرپرستی تھی۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے، آپ نے لفظوں کے موتی خوبی کے ساتھ بکھیرے ہیں۔

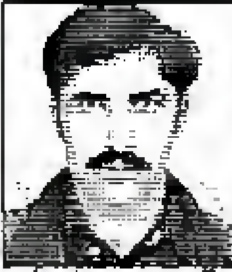
☆ بھائی مہر پرویز۔ دیر سے سہی آپ آئے تو صحیح، امید ہے اب آپ کو شکایت نہ ہو گی۔

✉ نسیم آراء صاحبہ، ملیر سٹی کراچی سے احوال میں پہلی بار شریک ہیں، لکھتی ہیں! مدیر اعلیٰ السلام علیکم، میں بہت عرصے سے سچی کہانیاں پڑھ رہی ہوں تقریباً بیس پچیس سال تو ہو گئے ہوں گے بہت سے پرانے رائٹر اب نہیں لکھتے کہاں چلے گئے، نئے رائٹر آ گئے ہیں یہ اچھا ہوا کہ آپ لوگ نئے لوگوں کو جگہ دیتے ہیں۔ میں ہمیشہ لکھنے کا سوچتی تھی لیکن چھوٹے بچوں کی وجہ سے نہیں لکھ سکی اب بچے بڑے ہوئے شادیاں ہوئیں تو فرصت ملی لیکن اپنی رائٹنگ کی وجہ آڑے آ گئی اور اب تو جوڑوں کے مرض کی وجہ بھی ہے پھر بھی کوشش کی ہے لکھنے کی، اگر آپ کو اچھی لگے تو شائع کر دیں بہت خوشی ہو گی امی بھی بہت بیمار ہیں ان کی کہانی زندگی میں شائع ہو جائے تو وہ بھی خوش ہو جائیں گی، اللہ امی کو زندگی دے (آمین) ویسے کہانیاں تو بہت ہیں، یہ شائع ہو گئی تو اور کہانیاں لکھنے کی ہمت کروں گی۔

☆ نسیم آرا صاحبہ! خدا آپ کی والدہ کو صحت اور لمبی عمر عطا کرے۔ کہانی ابھی پڑھی نہیں ہے، پڑھ کر جلد فیصلہ کریں گے۔

✉ نازیہ بتول رضا کراچی سے رقم طراز ہیں، محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم اس ماہ کا ”روحانی نمبر“ میرے سامنے ہے، تقریباً آدھا پڑھ چکی ہوں جتنا پڑھا پسند آیا ہاں لیکن ایک شکایت ہے، وہ یہ کہ چار مہینے ہو چکے ہیں اور میری کہانی آپ کے پاس ہے اس کا کیا بنا؟ میں ہر مہینے شریک نہیں ہو پاتی شاید اس لیے میری کہانی التواء میں پڑی ہے۔ ماشاء اللہ مارچ کے مہینے میں، میں نے اور میرے شوہر نے عمرے کی سعادت حاصل کی ہے۔ سچی کہانیاں سے رشتہ بہت پرانا ہے اور ہر ماہ میں باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کرتی ہوں اور اسی طرح رشتہ بنائے رکھنا چاہتی ہوں۔ امید ہے ایسا ہی ہو گا تمام احوالیوں کو سلام اور دعائیں اور مجھے سب دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ اچھی نازیہ جی! عمرے کی بہت بہت مبارک باد قبول کیجیے، کہانی جلد شائع ہو جائے گی۔



✉ لڈن ضلع وہاڑی سے منشی محمد عزیز مے رقم طراز ہیں، ڈیئر کاشی چوہان جی! السلام علیکم، کیسے ہیں آپ لوگ؟ اللہ تعالیٰ آپ سبھی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے (آمین) کاشی بھائی! پتا نہیں کیا بات ہے میں خط اور کہانیاں وغیرہ لکھنے کی کوشش کرتا ہوں، خط تو کرتے پڑتے مکمل ہو جاتا ہے لیکن کہانیاں مکمل کرنے کو جی نہیں چاہتا، سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ روحانی نمبر 28 اپریل کو ملا، اس ماہ کا سرورق بالکل ”نمبر“ کے مطابق تھا اور ہر لحاظ سے پسند آیا۔ فہرست سے گزرتے ہوئے کچھ اپنی باتیں میں پہنچے، واقعی کاشی جی! کبھی کبھی میں بھی اَپ سیٹ سا ہو جاتا ہوں اپنی روٹین لائف سے۔ محمد اقبال زمان کی والدہ محترمہ کے لیے دعا گو ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں تندرستی اور شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین) مور شاہد حسین، غلام رسول گل، عادل حسین، امجد علی، سدرہ انور علی، ممتاز احمد، تحسین جونیجو، صفدر علی حیدری، ثمینہ ناز کہانی ”سلگتے ارمان“ کی پسندیدگی پر بہت شکریہ۔ آپ کے حوصلہ افزائی کے یہ الفاظ میرے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ رانا محمد شاہد! اس مرتبہ آپ بھی تاخیر سے پہنچے، پیر نوید شاہ! وعلیکم اللہ آپ کی تنگدستی دور فرمائے۔ (آمین) بشیر احمد بھٹی صاحب! کیا حال ہے پیارے؟ ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، مسز نوید ہاشمی آپ نے تو مذاق مذاق میں ”تڑکا“ لگا دیا، تڑکے تڑکے۔ ریاض حسین شاہد! آپ کا نام کافی عرصے سے رسالوں میں دیکھتے آ رہے ہیں، کہانی پہلی دفعہ دیکھی ہے اور سچ میں بہت زبردست تحریر تھی آپ کی۔ سائیں دیوان غلام دستگیر، جاوید علی! آپ نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ انجم فاروق ساحلی! آپ کو بیٹھے بٹھائے ”دوشیزہ“ مل گیا اور کیا چاہیے، ننھی منی سی بہن سدرہ انور علی! اگر آپ سچ پوچھیں تو یہ خط ساٹھ فیصد (60%) میں آپ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ چالیس فیصد کاشی چوہان سمیت دیگر ساتھیوں کے لیے۔ ساتھیو! آپ ناراض تو نہیں ہیں ناں اس بات پر، اشفاق بٹ! اللہ آپ کی بھانجی کو تندرستی اور عمر خضر عنایت فرمائے (آمین) صفدر علی حیدری! خط اور کہانی کی پسندیدگی پر بہت شکریہ، ویسے آپ کی تحریر ”دعا“ بہت پسند آئی اور یہ حقیقت ہے میں آپ کا اُدھار نہیں لوٹا رہا ہوں، عبدالغفار عابد! بڑے بے مروّت ہو یار! فریدہ جاوید فری! ماشاء اللہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے چہرہ بھی ”شاعر“ ٹائپ کا دیا ہے، مور شاہد حسین، عادل حسین، سدرہ انور علی، ممتاز احمد، تحسین جونیجو، صفدر علی حیدری اور فریدہ جاوید فری کے بھرپور خطوط پسند آئے۔ سخن آباد میں عبدالعزیز جی آ کی آزاد نظم، زرینہ جونیجو کا ”عشق“ غلام رسول گل کی ”محبت“ اور مور شاہد حسین کی ”وہ“ بہت پسند آئے۔ اب اللہ حافظ، سوری! کہانیاں رہ گئیں، جلوۂ جنوں جاوید راہی، دعا صفدر علی حیدری، وہ سو روپے بشیر احمد بھٹی، در توبہ کھلا ہے مجید احمد جائی، رتی اللہ والی جبخل مینلو، وہ میرا مہرباں حنا بشریٰ اور صنم کدہ ہے جہاں ریاض حسین شاہد پسند آئی ہیں۔

☆ بھائی منشی! دوسری نوکری مبارک مگر یوں خالی خولی......!! مٹھائی کھلاؤ آپ اب۔



✉ لاہور سے ہماری ہردلعزیز شاعرہ فریدہ جاوید فری رقم طراز ہیں، پیارے بھائی کاشی اینڈ سویٹ منزہ جی السلام علیکم! مئی کا سچی کہانیاں ملا ٹائٹل اچھا لگا، تمام قارئین رائٹرز اور دوستوں کو فری کا پیار بھرا سلام قبول ہو۔ پختہ عزم منزہ جی نے خوب لکھا بلکہ سبق آموز لکھا۔ کاشی نے کچھ اپنی باتیں میں بہت اچھا لکھا۔ کہانیوں میں سلیم فاروقی صاحب کی آتش جنوں، سو روپے، دعا، شانِ مولا، در توبہ کھلا ہے، سبز پیر، اعجازِ دعا، یقین کامل، بھر دے جھولی اپنی پیاری دوست نسیم سکینہ صدف کی مرشد کی دعا بے حد پسند آئیں۔ نوٹاں والی سرکار اور سب بے حد اچھی کہانیاں لگیں، صنم کدہ ہے جہاں خاص کہانی تو بہت ہی اچھی تھی، سخن آباد میں اپنی غزل دیکھ کر خوشی ہوئی اور سب کی شاعری دل کو بھائی۔

☆ فریدہ جی! بہت بہت مبارکباد ایوارڈ کی آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔

✉ احوال میں یہ آمد ہے ہماری بہت اچھی رئیسہ خالد صاحبہ کی اسلام آباد سے، لکھتی ہیں بیٹے کاشی چوہان

السلام علیکم، پہلی بار احوال کی محفل میں شریک ہورہی ہوں، جب سے تم نے سچی کہانیاں سنبھالا ہے یہ روز بروز بہتری کی جانب رواں دواں ہے، ہماری طرف سچی کہانیاں کافی دیر سے پہنچتا ہے اس لیے احوال میں شرکت کا موقع نہیں ملا، لیکن اتفاق سے مئی کا رسالہ 2 تاریخ کو ہی مل گیا تو میں نے سوچا کہ احوال میں شرکت کر ہی لی جائے ۔۔ میں ایک کہانی بھیج رہی ہوں شاید سچی کہانیاں کے قابل ہو۔ یوں تو اس بار کی کہانیاں سبھی بہت اچھی ہیں۔ اگرچہ وقت کی کمی کے باعث آخر کی کچھ کہانیاں نہیں پڑھ سکی ہوں، لیکن جو پڑھ سکی ہوں اس میں مجید احمد جائی کی در توبہ کھلا ہے۔ ممتاز احمد کی نوٹوں والی سرکار، ملک عاشق حسین کی چشمۂ فیض، بشیر احمد کی وہ سو روپیہ بہت پسند آئیں، ان سب لوگوں کا بہت شکریہ جنہوں نے میری کہانی بے جڑ کے پودے کو پسند کیا۔

☆ رئیسہ خالد جی! خدا آپ کو صحت اور درازی عمر سے سرفراز کرے۔ آپ کو پرچہ پسند آیا ہماری ساری محنت وصول ہوگئی۔



✉ احوال میں یہ شرکت ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست ایم اشفاق بٹ لالہ موسیٰ سے رقم طراز ہیں السلام علیکم کاشی چوہان بھیا اللہ تعالیٰ آپ کو اچھی زندگی اور صحت وتندرستی عطا فرمائے آمین۔ کاشی بھائی 28 اپریل کو ہم اپنی بھانجی کائنات کو لے کر گھر واپس آئے۔ آپ اور سچی کہانیاں پڑھنے والوں کی دعائیں رنگ لائیں کائنات پہلے سے کافی بہتر ہے۔ مئی کا سچی کہانیاں دیکھا دل خوش ہوگیا۔ روحانی نمبر دیکھ کر دو گلاس ٹھنڈے جام شیریں کے پیئے اپریل سے کپڑے دھوئے ڈان بریڈ سے صبح کا ناشتا کیا اور آپ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ کاشی بھائی آپ ہر ماہ سچی کہانیاں میں تبدیلی لے کر آرہے تھے بہت خوشی ہورہی تھی لیکن اس دفعہ جو آپ نے تبدیلی کی ہے وہ سب سے بڑھ کر ہے۔ پہلے تو سرورق مُڑتُڑ جاتا تھا بہت بُرا لگتا تھا ویلڈن۔ منزہ سہام کا پختہ عزم، کیا انداز ہے آپ کا بہت خوب، کاشی بھائی آپ کے بھی کیا کہنے آپ کا بھی جواب نہیں۔ احوال میں مور شاہد حسین، عادل حسین، نوید شاہ، عمران علی، سدرہ انور علی، عظمیٰ شکور، ممتاز احمد، مبشر حسن، شہزادو کنول ان سب نے میری کہانی ہم نام کے لیے دو لفظ تعریف کے لکھے ان سب کا بہت بہت شکریہ۔ روحانی نمبر اس دفعہ دل میں اُتر جانے والی تحریریں لے کر آیا، جاوید راہی کی تحریر جلوۂ جنوں کی کیا ہی بات ہے۔ ممتاز احمد کی تحریر نوٹوں والی سرکار، ملک عاشق حسین ساجد کی پرنور تحریر چشمۂ فیض، صفدر علی حیدری کی دعا، بشیر احمد بھٹی کی تحریر وہ سو روپے، گل رعنا کی پڑوسی، حنا بشریٰ کی تحریر وہ میرا مہربان، مہر پرویز احمد کی اعجاز دعا، تنویر خالد کی پُر اثر تحریر یقین کامل داتا دربار سے واقعی کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبوب ہستی ہیں، حضرت علی ہجویریؒ سمیت الماس فاطمہ ارمان کی بھروے جھبولی، مسز نوید ہاشمی کی کایا پلٹ، روحانی نمبر کی خاص کہانی صنم کدہ ہے جہاں، ریاض حسین شاہد کی تحریر سچے عاشق حقیقی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سخن آباد میں اس دفعہ زرینہ جونیجو، شاہد فراز، ارم خان، ملک عاشق حسین ساجد، مومنہ بتول، ثانیہ ثانی، مہر تسیم، تمثیلہ لطیف، مور شاہد حسین، فریدہ فری یوسف ان سب نے خوب محفل جمائی ہوئی تھی۔ سدرہ انور علی آپ کے بارے میں پڑھا تو دلی دکھ ہوا اور پھر یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صحت وتندرستی عطا فرمائی اللہ جس کو زندگی دینے پہ آئے تو کون ہے جو کم کرسکتا ہے...... مجھے کاشی بھائی آوازیں دے رہے ہیں کہ بٹ صاحب اب بس بھی کرو، ارے کاشی بھائی آپ کی بات مان لی میں نے اپنا احوال مکمل کیا اس شرط پر کہ اگلی دفعہ پھر حاضری کا موقع دیں گے، سب کو سلام ودعا۔

☆ پیارے اشفاق بٹ آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا مگر اب احوال میں غیر حاضری نہیں چلے گی۔

✉ یہ ہنستی مسکراتی احوال میں آمد ہے یسریٰ تالپور کی میرپور خاص سے، لکھتی ہیں سچی کہانیاں کا ”روحانی نمبر“ دیکھا۔ زبردست ہے۔ تفصیلی تبصرہ اس لیے نہیں کرسکتی کہ میں دو کام بہت آہستہ آہستہ کرتی ہوں، کھانا کھانا اور کہانیاں پڑھنا کھانا پورے ذائقے سے لطف لے لے کر کھاتی ہوں اور کہانیاں بھی مزے لے لے کر پڑھتی ہوں، یہ نہیں کہ فٹا

فٹ فاسٹ کہانیاں آدھی پڑھیں اور آدھی چھوڑ دیں اور آخر میں تبصرہ کردیا کہ فلاں کہانی کمال کی تھی مگر......اور فلاں کہانی بڑی زبردست تھی لیکن...... جب تک میں اس مہینے کا رسالہ ختم کروں گی اگلے ماہ کا رسالہ آچکا ہوگا پھر تبصرہ باسی ہوجائے گا، اس لیے اسے رہنے دیتی ہوں۔

☆ بہت اچھی یسریٰ! کہانی کے بارے میں ہم آپ کو جلد بتائیں گے مگر پہلے تبصرہ تازہ کرو۔

✉ یہ احوال میں اولین آمد ہے ہمارے بہت پسندیدہ شاعر دوست حکیم خان حکیم کی کالا پور موسیٰ، تحصیل حضرو سے عرض کرتے ہیں، محترم جناب کاشی چوہان صاحب! السلام علیکم، اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ سے 1997 سے قلمی رشتہ قائم ودائم ہے، محترم محسن بھوپالی صاحب مرحوم میرا کلام ہر ماہ باقاعدگی سے لگا دیا کرتے تھے اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) سچی کہانیاں ایک معیاری ادب کا ترجمان ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر ماہ باقاعدگی سے خریدتا ہوں اور مجھ سے بہت سے دوست احباب ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں، آپ نے منظوم کلام کے لیے جو الگ گوشہ ترتیب دیا ہے، خوب صورت ہے، اس سے نہ صرف نئے ابھرتے ہوئے شعراء کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ پڑھنے والے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ خطوط کا بڑھتا ہوا سلسلہ ”سچی کہانیاں“ کے معیاری ہونے کی دلیل ہے ”سچی کہانیاں“ شروع سے اب تک نوآموز تخلیق کاروں کی جس انداز سے حوصلہ افزائی کررہا ہے قابل رشک ہے اور سچی کہانیاں کے لیے ایک اعزاز بھی ہے کہ آج بہت سے نامور تخلیق کار ایسے بھی نظر آتے ہیں جو سچی کہانیاں کے پلیٹ فارم سے تربیت پاکر آج مشاہیر کے ساتھ کھڑے ہیں، خدا آپ کو اور آپ کے ادارے کے دیگر احباب کو سلامت رکھے (آمین) تاکہ آپ ادب کی خدمت کے لیے اسی طرح کوشاں رہیں، والسلام۔

☆ حکیم خان حکیم صاحب! یقین جانیے آپ کی احوال میں آمد نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی ہے، خدا آپ کو صحت وسلامتی دے، آپ جیسی قدآور شخصیات تو ہمارا مان ہیں۔ امید ہے حوصلہ افزائی کا یہ سلسلہ برقرار رہے گا۔



✉ صفدر علی حیدری اپنی محبت لیے اُچ شریف سے شامل احوال ہیں۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ! سہام فیملی، سچی کہانیاں کی ٹیم، قلم کار ساتھیوں اور قارئین کی خیریت کی امید اور دعا کے ساتھ عرض خدمت ہے کہ اعزازی پرچہ 29 اپریل کو ملنا کسی اعزاز سے کم نہیں لگا۔ پچھلا شمارہ تین دن میں ختم کرنا خاصا مہنگا پڑا کہ باقی کے دن شدت انتظار میں گزرے۔ من پسند چیز کو بچا بچا کر رکھنے کی بیماری بہت پرانی ہے، اس سے انحراف بھاری پڑا۔ ویسے اس بار تو حد ہی ہوگئی، کسی محبوب سے بڑھ کر مئی کے شمارے کا انتظار رہا۔ بیتابی کا اندازہ اس امر سے لگائیں کہ رسالہ دو ہی دن میں پڑھ ڈالا۔ سرورق کے بارے میں یونہی خیال آیا کہ کیا یہ کچھ منفرد ہوسکتا ہے؟ کیا یہ روحانی نمبر سے مماثلت رکھتا ہوگا؟ اور پھر نظر پڑی تو روح سرشار ہوگئی۔ عام سے نقوش کی ایک لڑکی جس نے اسکارف سے خود کا ڈھانپ رکھا تھا، واقعی بہت بھلی لگی۔ ساتھ ہی کسی اللہ والے کا مزار، کاشی بھائی آپ نے واقعی کمال کر ڈالا۔ بہت خوب۔ منزہ آپی کا ”پختہ عزم“ اختصار کے باوجود خاصے کی چیز تھا۔ ”کچھ اپنی باتیں“ پڑھا تو ایک ہی فقرہ ذہن میں ابھرا ”تغیر زندگی ہے اور جمود موت“ آپ نے سوچ کو ایک نیا زاویہ، نیا رخ دے ڈالا۔ ”روحانی نمبر نے آج ایک بہت پرانی غلط فہمی دور کردی۔ اکثر ہم جیسے دور افتادہ اور چھوٹے علاقوں کے لکھاریوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ہمارے ساتھ سوتیلوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ نے یہ تاثر زائل کرتے ہوئے یہ بات ثابت کی کہ ”سچی کہانیاں“ کسی گھر کی طرح ہے۔ اور گھر میں نہ کوئی چھوٹا ہوتا ہے اور نہ بڑا۔ اس میں ہر فرد کی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور اپنا ایک خاص اور منفرد مقام بھی۔ برادرم عاشق حسین ساجد، مجید احمد جائی، راقم الحروف، مبشر حسن اور سب سے بڑھ کر استاد مکرم ریاض حسین شاہد کی تحاریر اور خطوط دیکھ کر یوں لگا جیسے یہ ”جنوبی پنجاب“ نمبر ہو۔ اگر مبشر حسن اور سید مبارک شمسی کی تحریریں بروقت مل جاتیں تو پھر تو واقعی کمال ہوجاتا۔ پھر بھی سچی بات ہے یہ نمبر بھلائے نہیں بھولتا۔ یہ بلاشبہ کسی دستاویز سے ہرگز کم نہیں۔ جو ہمیشہ یادوں میں بسا رہے گا۔ اول

تا آخر پڑھ کر ایک ہی روایتی جملہ لکھنے کو دل کرتا ہے ”شاندار، زبردست، بہت اعلیٰ، بہت خوب“۔ ویل ڈن کاشی بھائی۔ آپ کی محبت اور محنت نے باہم مل کر اسے یادگار بناڈالا۔ مور شاہد بھائی اور ممتاز صاحب کا شکریہ کہ میرے والد کے لیے دعائے مغفرت کی۔ سدرہ انور علی کو حادثہ پیش آیا پڑھ کر دکھ ہوا۔ لیکن یہ دیکھ کر تسلی بھی ہوئی کہ وہ اب روبہ صحت ہیں۔ اللہ انہیں شفائے کلی عطا فرمائے، آمین۔ ڈیئر سسٹر سوچنا نہیں تو لکھنا نہیں۔ ایم اشفاق بٹ کا خط کیا تھا ایک دکھ بھری داستان تھی اللہ انہیں اس آزمائش سے جلد سرخرو فرمائے۔ ممتاز بھائی کا تبصرہ کافی جاندار تھا۔ ویسے آپس کی بات ہے اس بار سارے ساتھی مکمل فارم میں تھے اور احوال کی رونق کو آٹھ بلکہ سولہ چاند لگا رہے تھے۔ بحیثیت مجموعی اس بار یہ محفل کچھ زیادہ ہی شاندار و جاندار رہی۔ استاد مکرم کا محبت نامہ بطور تبرک پڑھا۔ اللہ انہیں سلامت رکھے، آمین۔ جاوید راہی کی ”جلوۂ جنوں“ پڑھ کر اپنے اندر ایک کمی کا احساس ہوا۔ ممتاز احمد ہمیشہ کی طرح متاثر کن تحریر کے ساتھ تشریف لائے۔ ”نوتاں والی سرکار“ زبان وبیان کے لحاظ سے خاصے کی چیز تھی۔ انہیں بہت سی داد۔ ”وہ سو روپے“ جاندار تحریر تھی۔ جناب عاشق حسین ساجد کی ”چشمہ فیض“ اپنی طرز کی ایک انوکھی کاوش تھی۔ گل رعنا کی مختصری تحریر ”پڑوسی“ کو مئی کے روحانی نمبر کی خوشبو کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ مجید احمد جائی ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز سے آئے۔ اس بار تحریر مختصر تھی لیکن کافی پراثر۔ ہمارے محترم دوست سلیم اختر صاحب بہت دنوں سے منظر سے غائب ہیں۔ شانِ مولا اچھا افسانہ تھا۔ ”رتی اللہ والی“ بہت جاندار تحریر تھی۔ آپ بیتی کے رنگ میں لکھی اس داستان نے خوب رنگ جمایا۔ جیجل آپی کو بہت سی داد۔ یقینِ کامل سے پیوستہ سچ بیانیاں مختصر مگر پراثر تھیں۔ لکھنے والوں کو مبارک باد! استاد مکرم کی تحریر ”صنم کدہ ہے جہاں“ بجا طور پر روحانی نمبر کی روح بھی تھی اور حسن بھی۔ پہلی بار تشرف لائے اور آتے ہی چھا گئے۔ کاشی بھائی ایک دن لگا کر کمپوز کیا ہے، پلیز قینچی کی پہنچ سے دور رکھیں۔ جزاک اللہ!

☆ بہت پیارے صفدر۔ تبصرہ شاندار تھا۔ قینچی کی پہنچ سے دور کیسے رہ سکتے تھے؟؟ مکمل پڑھ کر انصاف کرنا۔



✉ اسامہ ندیم کراچی سے پہلی بار شاملِ احوال ہیں۔ لکھتے ہیں! السلام وعلیکم۔ کاشی بھیا! آپ کا مئی کا شمارہ روحانی نمبر زبردست رہا میں نے میٹرک کلاس کے پرچے دیے ہیں لیکن سچی کہانیاں چوں کہ میرے والدین پڑھتے ہیں تو مجھے بھی شوق پیدا ہوا۔ کاشی سر آپ کے پرچے میں اس بار صنم کدہ ہے جہاں، نوتاں والی سرکار، وہ سو روپے، دعا، مرشد کی دعا، یقینِ کامل، رتی اللہ والی حاصلِ مطالعہ کہانیاں رہیں، ایمان تازہ کرتی یہ کہانیاں بے مثال رہیں، اس کامیابی پر آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں، اپنا خیال رکھیے گا۔ اگلے ماہ پھر انشاءاللہ حاضر ہوں گا۔

☆ پیارے اسامہ! منے میاں جم جم آؤ مگر پہلے پڑھ تو لو۔ یہ تو تمہارا بھی اپنا ہی پرچہ ہوگیا نا اب۔ خوش رہو۔



✉ ہمارے بہت پیارے شاعر اور لکھاری دوست عامر زمان عامر، بورے والا سے شاملِ احوال ہیں۔ لکھتے ہیں قابلِ قدر محترمہ منزہ سہام۔ پیارے کاشی آداب، مئی کا شمارہ ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے سرورق کی پالیسی تبدیل کر کے تو آپ نے ہمارے دل جیت لیے خدارا اب ٹائٹل کے اس حسن کو برقرار رکھیے گا۔ روحانی نمبر اپنی مثال آپ ہے ایمان افروز، روح پرور دل ودماغ سرشار ہوگیا۔ بزم احوال میں اپنے بڑے بھائی محترم عبدالغفار عابد کو پا کے عہدِ رفتہ کے کتنے باب کھل گئے۔ منزہ جی آپ کا ”پختہ عزم“ قابلِ تقلید ہے ہمیشہ خوش رہیے، کاشی چوہان کی اپنی باتیں ہمیشہ کی طرح اپنی باتیں لگتی ہیں بہت خوب غلام حسین، کاشف عبید، سلیم شاہد، محترم ریاض حسین شاہد، شفقت حسین حب چوکی اور شائستہ جمال سمیت تمام نئے نویلے چہروں کو خوش آمدید۔ ممتاز قلمکار جاوید راہی کا جلوہ جنوں دل کو چھو گیا زبردست روحانی تحریر ہے۔ ممتاز احمد بھائی معروف برگزیدہ ہستی المعروف نوتاں والی سرکار

روحانیت میں قلم ڈبو کے لکھا بہت پسند آیا۔ عاشق حسین ساجد چشمہ فیض، ناقابلِ فراموش تحریر ہے۔ اُچ شریف سے دعا کے ساتھ محترم صفدر علی حیدری ایمان تازگی کا سامان لائے ہیں۔ بشیر احمد بھٹی نے خوب صورت تحریر سے فیوض و برکات گنج سے روشناس کرایا ہے۔ گل رعنا کی پڑوسی مدینۃ الاولیاء سے پیارے دوست مجید احمد جائی کی تحریر، صدف آصف کی شانِ مولا، رتی اللہ والی، بشریٰ حنا کی وہ میرا مہرباں، مہر پرویز ودلو کی اعجازِ دعا، کنول عمران کی سبز پیر، خالد تنویر کی یقین کامل۔ ندا ہاشمی کی نور کا ہالہ، الماس فاطمہ ارباب کی بھر دے جھولی، مسز نوید ہاشمی کی کایا پلٹ، سکینہ تسنیم کی مرشد کی دعا حیران کن کہانیاں لگی ہیں۔ ناگن کی چھٹی کڑی اچھی تھی، سرور شاذ کی کھٹل ہمارے جدید معاشرے کی واضح جیتی جاگتی تصویر ہے۔ انتہائی نامور رائٹر محترم ریاض حسین شاہد کی صنم کدہ ہے جہاں نہ صرف روحانی نمبر کی خاص کہانی ہے میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں آپ کی تحریر پرچے کی تمام تحاریر سے ٹاپ آف دی لسٹ ہے، سخن آباد ہمارے کلام کے بغیر کچھ ویران سا ہے، کاشی چوہان سخن آباد کی آبادکاری کے لیے تازہ غزل بھیج رہا ہوں۔ تمام اہل قلم، قارئین کے لیے ڈھیروں دعائیں، خیر اندیش۔

☆ پیارے عامر! ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا والا معاملہ ہے۔ خیر تم کیا سمجھوگے؟؟ ہمارے لیے تو بس یہ اہم ہے کہ تمہارا تبصرہ ہمارے احوال کی زینت بنا۔ خوش ہو۔

ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصہ بننے والے قارئین

☆ زاہدہ کنول۔ گلستان جوہر ☆ وسیم۔ پی آئی بی کالونی ☆ شہباز۔ ڈیفنس ☆ نعیم وارثی۔ گلستان جوہر ☆ مقبول مغل۔ آزاد کشمیر ☆ ہارون امان۔ اسلام آباد ☆ سلیم خان۔ ڈرگ روڈ ☆ امبرین نعیم۔ گلشن اقبال ☆ جاوید خان۔ حیدرآباد ☆ آصف شاہ۔ میر پور خاص ☆ اشفاق احمد۔ ملتان ☆ ملک سجاد۔ گجرانوالہ ☆ عاشق حسین بھٹی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ ☆ ظہیر گل۔ حویلیاں ☆ لیاقت تنولی۔ ایبٹ آباد ☆ الفتاح۔ کوٹلی ☆ ارباب مہر بلوچ۔ کوئٹہ ☆ مشتاق کھوکھر۔ سبی ☆ عمران ملک۔ سکھر ☆ امان خان۔ مردان ☆ یعقوب خان۔ پشاور ☆ خلیل احمد۔ نیو کراچی ☆ سجاد قریشی۔ کورنگی ☆ شاہد رفیع۔ قائد آباد ☆ رستم خاصخیلی۔ ٹھٹھہ ☆ مہر عباس۔ لیاقت آباد ☆ سلیم یزدانی۔ سرگودھا

☆ پیارے ساتھیو! ان شاءاللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر پھر ملاقات ہوگی۔ آپ کی دعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

توجہ طلب

اپنی نگارشات کے حوالے سے بات کرنے کے لیے آپ 0307-2089080 پر رابطہ کر کے معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ اپنی نگارشات ہمیں ای میل کے ذریعے بھی روانہ کرسکتے ہیں

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

ڈاک سے بھیجنے کے لیے: 110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

نوٹ: قارئین اور لکھاری دوستوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف، ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور اپنا نام، پتا اور مقام واضح طور پر تحریر کیا کریں۔ (شکریہ)

ایڈیٹر

اس ماہ کی سچ بیانیاں

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوشبو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

حلالہ

م۔ص۔ایمن

ایک دوشیزہ کے فریب سے مرصع سچ بیانی، کراچی سے

میرا تعلق ایبٹ آباد سے ہے، اپنے علاقے میں مناسب روزگار نہ ہونے کے سبب میں نے راولپنڈی میں کرائے کی ایک دکان لے کر کپڑے کا کاروبار شروع کیا، دکان کے قریب ہی ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان بھی کرائے پر لے لیا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں اکیلا ہی رہتا تھا۔

جمعرات کی شام دکان ذرا دیر پہلے بند کرتا اور بذریعہ بس، اپنے گھر اپنے بچوں میں چلا جاتا اور ہفتے کی صبح وہیں سے سیدھا دکان پر آجاتا۔

میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے بھی ہیں۔ بیوی بھی ماشاء اللہ بہت سگھڑ ہے۔ میرے والدین کی بہت اچھی طرح خدمت کرتی ہے۔ انہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیتی، اس لیے گھر سے اپنے بچوں سے طویل دوری مجھے ناگوار نہیں گزرتی۔ میں نے دکان پر ایک ملازم بھی رکھا ہوا تھا، جو میرا ہاتھ بٹاتا۔

بلال، یعنی ملازم کی ضرورت کی اہم وجہ نماز تھی۔ دکان کے باہر بھی ڈسپلے کے لیے مال رکھا ہوتا تھا، نماز کے لیے بار بار دکان بند کرنے سے بہتر تھا کہ ایک سے بھلے دو ہو جائیں۔

جمعہ کے دن دکان بند ہوتی اور بلال کی بھی چھٹی ہی ہوتی، حالانکہ دیگر دکان دار حضرات، جمعہ کے دن بھی دکان کھولتے تھے اور خود چھٹی کر کے تمام دن کے لیے دکان ملازموں کے حوالے کر جاتے تھے۔

ہفتے کی صبح میری دکان قدرے تاخیر سے کھلتی تھی کہ مجھے ایبٹ آباد سے آتے آتے اکثر دیر ہو ہی جاتی، البتہ اس کے علاوہ روزانہ فجر کی نماز کے فوراً بعد میں دکان کھول لیا کرتا تھا، جبکہ مارکیٹ بھر کی تمام دکانیں ہنوز بند ہی ہوتی تھیں۔

نماز فجر کے بعد گھر پر میرا کوئی کام تو ہوتا نہیں تھا، بلال جب آتا تو میں کبھی قریبی ہوٹل میں ناشتا کرنے چلا جاتا، کبھی اسے بھیج کر دکان پر ہی منگوا لیتا تھا۔ دوپہر کا کھانا البتہ اکثر ہم دونوں اکٹھے کھایا کرتے تھے۔ رات کے کھانے کا معمول یہ تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد دکان بند کرتے۔ بلال اپنے گھر چلا جاتا اور میں ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتا اور پھر گھر جاتا، برسوں سے میرا یہی معمول چلا آرہا تھا۔

ایک صبح حسب معمول فجر کی نماز پڑھ کر میں اپنی دکان پر پہنچا تو دور سے ہی مجھے اپنی دکان کے تھڑے پر کوئی سویا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سوچا کہ "لو بھئی اب اسے جگانا بھی پڑے گا"

یہ چرسی موالی یا فقیر قسم کے لوگ عموماً رات کے وقت جہاں موقع دیکھتے ہیں، سو جاتے ہیں اور صبح اٹھ کر کہیں نہ کہیں چلے جاتے ہیں۔

دکان کے تھڑے پر سوئے ہوئے شخص کو دیکھ کر دل سے یہی دعا نکلی کہ "یا خدا! یہ کوئی فقیر نہ ہو!"

قریب جا کر جب اسے جھنجوڑنے کا ارادہ کیا تو کچھ عجیب سا لگا۔

یہ کوئی فقیر یا موالی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے قیمتی شال اوڑھ رکھی تھی۔ یقیناً یہ کوئی مسافر ہوگا جو رات اپنے علاقے

کی گاڑی نہ ملنے کے سبب یہیں سو گیا ہوگا، چند ہی لمحوں میں بے شمار خیالات میرے دماغ میں آئے اور گئے، بہر کیف میں کب تک اس کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا؟ دکان تو کھولنا ہی تھی۔ میں نے نرمی سے اس کا گھٹنا ہلایا اور کہا۔

''اٹھو بھئی اپنا بستر کہیں اور لگاؤ مجھے دکان کھولنی ہے!''

مسافر یا جو کوئی بھی وہ تھا اس نے کروٹ بدلی اور اٹھ بیٹھا۔

یکا یک میرے پسینے چھوٹ گئے۔

وہ عورت تھی بھر پور اور انتہائی خوبصورت جوان عورت۔

میں نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا، دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا، البتہ اسٹریٹ لائٹ روشن تھیں، چند دکانوں کے اشتہاری بورڈ بھی روشن تھے، لیکن ان کی روشنی ماند پڑ رہی تھی، کیونکہ سورج طلوع ہونے والا تھا، اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔

اس ملگجی روشنی میں اس عورت کا خوابیدہ حسن عجیب رومان پرور تھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو میں نے گھبرا کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

میرا ملازم بلال بھی دیر سے ہی آیا کرتا تھا۔ بلال کے آنے سے پہلے پہلے میں جھاڑ پونچھ کا کام خود ہی کر لیا کرتا تھا۔ ڈسپلے کا مال ٹانگتا، جھاڑو لگاتا، اور بیٹھ کر تلاوت کیا کرتا تھا، دکانداری کی حالت یہ تھی کہ بعض اوقات تو پہلا گاہک ہی سہ پہر تین بجے کے بعد آتا۔

''یہ آپ کی دکان ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

میں نے ہمت کر کے اسے دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ گول چہرہ، گال جیسے دو سیب رکھے ہوئے ہوں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، دوپٹے سے سر اور پیشانی کو ڈھکا ہوا تھا۔

''جی...... جی...... میری ہے'' میں ہکلایا۔

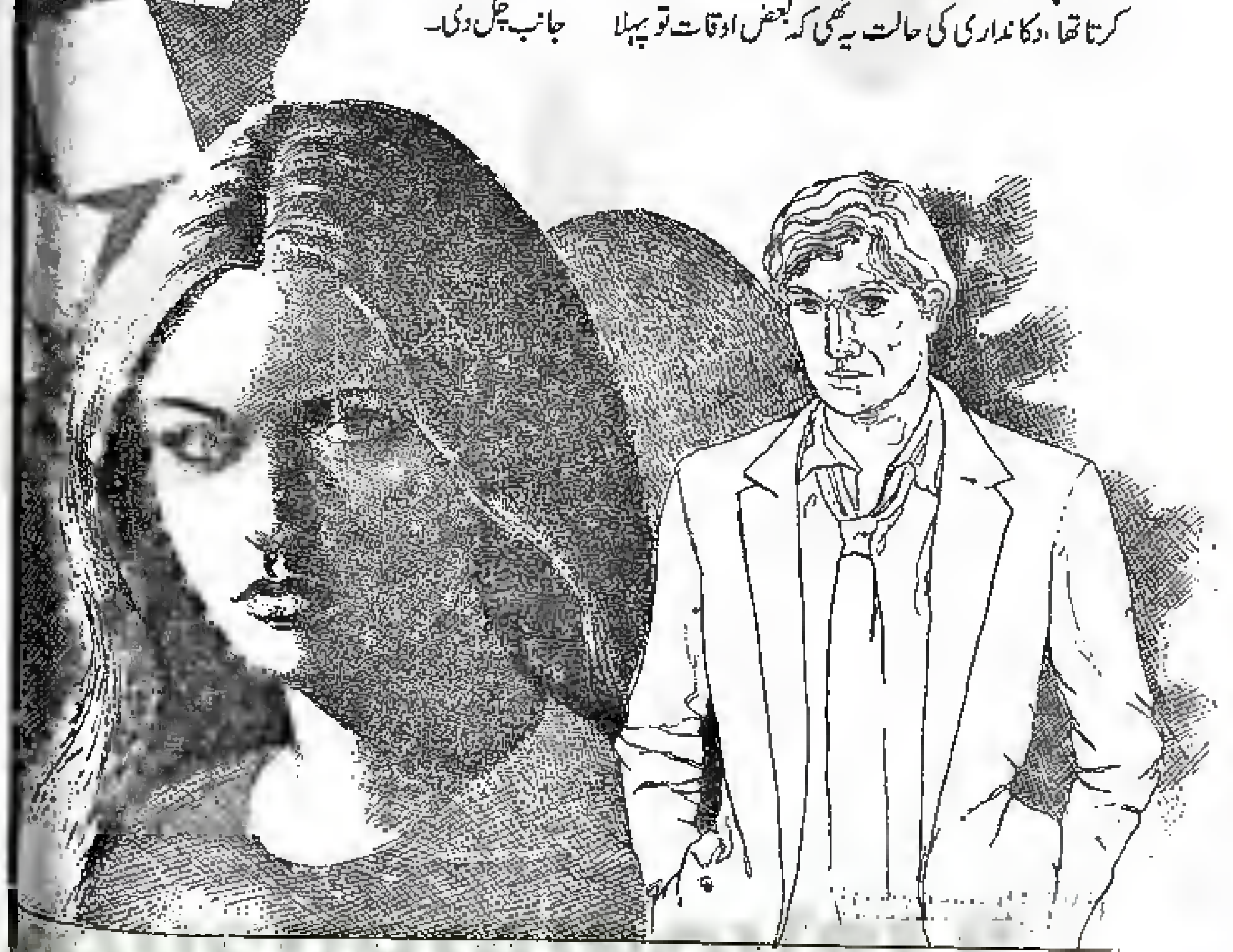
وہ مسکرائی، شاید میری ہکلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی ''معافی چاہتی ہوں۔ میں پوچھے بغیر آپ کی دکان کے آگے سو گئی تھی''

''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں'' مجھے سمجھ نہیں آئی کہ مجھے اس موقع پر کیا کہنا چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

وہ تھڑے سے اتر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ''آپ دکان کھولیں، میں کہیں اور جا کر سو جاتی ہوں''

''آپ کون ہیں؟ کہاں رہتی ہیں؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''میں بھی کہیں رہتی تھی۔'' اس نے ایک گہری یاسیت سے پُر سانس خارج کی۔ ''میرا بھی کوئی گھر تھا، اب دیکھیے قسمت کہاں لے جائے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ایک جانب چل دی۔



''جانے دو...... میرا کیا ہے؟'' میں نے سر جھٹک دیا۔ میں شٹر اٹھا کر دکان میں داخل ہوا۔ دکان کے اندر ابھی اندھیرا ہی تھا۔ میں نے پنکھے کے سوئچ آن کیے پچھلے حصے کے بلب جلائے، شوکیس پر رکھا ہوا مال باہر لٹکانے کے لیے اٹھایا۔ حسب عادت ساتھ ہی ساتھ تلاوت بھی کرتا رہا۔

☆......☆

اچانک ہی وہ عورت دوبارہ آگئی۔

اب کے اس نے شال کا ایک کونا ایک ہاتھ سے اپنی ناک پر روک رکھا تھا، صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

''سنیے!...... اس مارکیٹ میں کوئی بیت الخلاء نہیں ہے؟ مجھے ذرا......'' اس نے ٹکڑوں میں بات کی، تاہم جملہ پورا ہوئے بغیر میں اس کی بات سمجھ گیا۔

''یہاں قریب ہی سیڑھیاں ہیں۔ ان کے نیچے ایک بیت الخلاء ہے تو سہی، لیکن اس وقت وہ بند ہوگا، پہلے کھلا رہتا تھا، لیکن چرسی اسی گند پھیلا دیتے تھے، اس لیے اب رات کو بند کر دیا جاتا ہے''

''اگر آپ کو ضرورت پڑ جائے تو کیا کرتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں...... تو تھوڑی دیر میں کھل جائے گا۔ جس کے پاس چابی ہوتی ہے، اس کی دکان نزدیک ہی ہے۔ نو بجے تک آجائے گا'' میں نے کہا۔

''پھر میں کہاں جاؤں؟'' اس نے کہا

''جی ی ی ی......'' میں نے حیران ہو کر کہا، کیونکہ میرے خیال میں اس کا یہ سوال بے تکا تھا۔ ''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تم اپنے گھر جاؤ۔''

''گھر......؟'' وہ ہنسی۔ ''میرا کوئی گھر ہوتا تو ساری رات آپ کی دکان کے تھڑے پر نہ گزارتی؟''

مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ واقعی اگر اس کا گھر ہوتا تو ایک ہی شال میں میری دکان کے تھڑے پر سوئی ہوئی نہ پائی جاتی۔ چوکیدار نے بھی اگر اسے سویا ہوا دیکھا ہوگا تو چرسی، اسی یا بھکاری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہوگا کہ اکثر چرسی موالی دکانوں کے آگے سوئے رہتے ہیں۔ اسٹیشن نزدیک ہونے کی باعث بسا اوقات دوسرے شہر سے آئے ہوئے مسافر بھی یہی کرتے ہیں۔ اسٹیشن سے نکل آتے ہیں اور جب انہیں اپنے علاقے کی کوئی گاڑی نہیں ملتی تو کسی دکان کے آگے سو جاتے ہیں اور دکانیں کھلنے سے پہلے پہلے خود ہی اٹھ بھی جاتے ہیں یا پھر دکاندار آ کر اٹھا دیتے ہیں۔

''تو تمہارا کوئی گھر نہیں ہے؟'' میں نے کہہ دیا۔

''نہیں! میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ میرے تین بھائی ہیں۔ شادی شدہ، ان کی بیویاں مجھے نوکرانی سے زیادہ نہیں سمجھتیں۔ میں سارا سارا دن ان کے آگے سارے کام کرتی ہوں، ان کے، ان کے بچوں کے اور جب رات ہوتی ہے تو سب اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتی ہیں۔ میں صحن میں پڑی رہتی ہوں، بارش اگر ہو جائے تو ساری میرے اوپر ہوتی ہے، ٹمٹی سکڑی بیٹھ کر رات گزار دیتی ہوں، کوئی بھی مجھے اپنے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ بھائی بھی مجبور ہیں۔ پرائی عورتوں کے آگے یتیم سگی بہن کی بات سننے کی بھی انہیں فرصت نہیں۔ میں بھائیوں کا گھر چھوڑ آئی ہوں، ان سب کو سوتا ہوا چھوڑ آئی ہوں۔'' اس کا لہجہ دل پگھلا دینے والا ہوتا گیا۔

''کہاں ہے تمہارے بھائیوں کا گھر؟''

''میں نے کہا نا کہ میں چھوڑ آئی ہوں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ میں...... چھوڑ آئی ہوں، میں وہاں دوبارہ جانا نہیں چاہتی۔'' اس نے سر ہلایا تو اس کی ناک کی نوک پر ٹکا شال کا کونہ ڈھلک گیا اور اس کا دلکش چہرہ نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ اس نے بھی دوبارہ چہرہ ڈھانپنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

''پھر بھی کون ہیں تمہارے بھائی۔؟ کہیں قریب ہی رہتے ہیں؟ کیا میں انہیں جانتا ہوں؟''

''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں، کیا مجھے ان کے حوالے کریں گے، مجھے یقین ہے مجھے کوئی بھی تلاش نہیں کرے گا''

''نہیں نہیں میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا''

''مجھے اس وقت بیت الخلا کی شدید ضرورت ہے، آپ کو پتا ہے صبح جاگنے کے بعد سب سے پہلے کیا کام کیا جاتا ہے؟'' وہ زیر لب مسکرائی

''میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہاں تو ایسا کوئی بندوبست نہیں ہے، میں نے بتایا نا کہ جس دکاندار کے پاس اس مارکیٹ کے بیت الخلاء کی چابی ہے، وہ نو بجے تک آئے گا، بلکہ زیادہ تر دکاندار نو بجے کے بعد ہی آتے ہیں''

''تو میں نو بجے تک بیٹھی رہوں؟ میں کیسے سمجھاؤں میں؟'' وہ بے بسی سے بولی۔

میں اس کی حالت سے بے خبر نہیں تھا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔

''میں یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ اگر اس وقت' آپ کو بیت الخلا جانا پڑ جائے تو کیا کریں گے؟''

''اول تو میں نمٹ نمٹا کر آیا ہوں، پھر بھی کوئی ضرورت پڑ ہی جائے تو میرا گھر دور نہیں ہے۔''

''پھر مہربانی کریں مجھے اپنے گھر لے چلیں صرف ایک لوٹا صرف ایک لوٹا پانی مجھے چاہیے ہوگا بس!''

''لیکن میں...... میں کیسے؟'' میں ہکلا کر بولا۔

صورت حال میرے لیے مزید سنگین ہوگئی تھی۔ میں یہاں 'چھڑا' رہتا تھا، چھڑوں کو ویسے بھی کوئی مکان کرائے پر نہیں دیتا۔ یہ تو مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے بیوی بچے ایبٹ آباد میں ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میں شریف آدمی ہوں۔ اب تک میرے گھر پر کوئی محلے دار، کوئی رشتے دار تک نہیں آیا، جسے کوئی کام ہوتا ہے وہ دن میں کسی بھی وقت دکان پر آ جاتا ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ میرے گھر نہ ٹی وی ہے نہ کوئی باتیں کرنے والا۔ رات کو عشاء کے بعد میں صرف سوتا ہوں۔ اور صبح سویرے اٹھ کر مسجد اور وہاں سے سیدھا دکان پر۔۔۔۔ ایسے میں کسی محلے دار نے میرے گھر سے کسی عورت کو نکلتا یا داخل ہوتا دیکھ لیا تو مکان ہی خالی کروا دیں گے۔

''نہیں! میں تمہیں اپنے گھر نہیں لے جاسکتا۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ پتا نہیں کون عورت ہے؟ میں اس کے ساتھ ذرا سی نیکی کروں اور محلے بھر میں بدنام ہو جاؤں۔

''پھر کسی ایسی جگہ کا پتا بتائیں جہاں میں......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر چپ ہوگئی۔ میں سب سمجھ رہا تھا لیکن کیا کرتا؟

''مسجد کے استنجا خانے ہیں، لیکن وہ بھی بند کر دیئے گئے ہوں گے۔'' میں نے بات کی، لیکن اس بات پر مجھے خود ہی افسوس بھی ہوا کہ ایک عورت مسجد کے استنجا خانے میں کیسے جاسکے گی؟

''میرے پاس کپڑوں کا یہی ایک جوڑا ہے جو میں پہنے ہوئے ہوں اور کچھ بھی نہیں ہے، اگر یہ بھی گندا ہو گیا تو ۔'' اس نے خوفناک صورت حال کا نقشہ کھینچا۔

اس عورت کا میری دکان میں زیادہ دیر تک موجود رہنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اگر چوکیدار نے اسے یہاں صبح ہی صبح دیکھ لیا تو بھی بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔

''مجھے تکلیف ہو رہی ہے...... یہاں کوئی اسپتال وغیرہ بھی قریب نہیں ہے جہاں......'' اس نے جملہ پھر ادھورا چھوڑ دیا اور میرا خیال ہے کہ وہ سمجھتی تھی کہ میں ادھورے جملے سے ہی اس کا موقف سمجھ رہا ہوں۔

''نہیں......! اسپتال دور ہے۔ اسپتال جانے کے لیے گاڑی کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔''

وہ دکان سے باہر نکلی، دائیں بائیں دیکھ کر بولی ''یہاں دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا، کسی دکان کی آڑ میں بیٹھ جاؤں؟''

وہ ایک 'مذموم' سے کام کے لیے میری اجازت مانگ رہی تھی۔ یہ اس سے بھی برا تھا، کیونکہ سب دکاندار جانتے تھے کہ میں سب سے پہلے آتا ہوں، سب مجھ سے ہی پوچھتے اور مجھے جھوٹ بولنا پڑتا۔

''ادھر آؤ!'' میں نے اسے دکان کے اندر بلایا۔ ''دیکھو! میں ایک عزت دار آدمی ہوں''

''تو کیا عزت دار آدمی بیت الخلا کبھی نہیں جاتا'' وہ تیزی سے بولی۔

''میرا مطلب ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں اور کسی نے دیکھ لیا تو میں......''

''کون دیکھے گا؟ کسے اتنی فرصت ہے کہ آپ کی نگرانی کرے۔ آپ چلیں، آپ کی بیوی سے میں خود ہی بات کر لوں گی، اسے اپنی مجبوری بتا دوں گی''

''میں اپنے گھر میں چھڑا رہتا ہوں، بیوی بچے نہیں ہیں میرے ساتھ۔''

''پھر کیا ہوا۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو آپ کے گھر نہیں جا رہی۔''

''یہ بات نہیں ہے......'' میں جلدی سے بولا۔ ''اچھا سنو! یوں کرتے ہیں تم یہاں سے سیدھی چلی جاؤ بینک تک۔ بینک تک پہنچو گی تو میں تمہارے قریب سے گزروں گا، ہم راستے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ تم مجھے دیکھتی رہنا اور میرے پیچھے پیچھے آتی رہنا۔ میں جس گھر میں داخل ہوں گا تو تم بھی اپنے آگے پیچھے دیکھ کر اس گھر میں گھس جانا۔ اگر اس وقت کوئی تیسرا شخص گلی میں موجود ہوا تو تم میرے گھر داخل نہ ہونا آگے نکل جانا، سمجھیں؟''

''سمجھ گئی'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے تم نکلو! میں چند منٹ میں دکان بند کر کے آتا ہوں۔''

''زیادہ منٹ نہ لگا دینا میرا مثانہ پھٹ جائے گا۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

وہ سست روی سے چلتی ہوئی کچھ آگے نکل گئی تو میں نے

جلدی سے ہینگر دوبارہ شوکیس پر رکھ دیے، ایک ہی تالا اٹھایا اور شٹر کو حتیٰ الامکان بے آواز نیچے کیا، لیکن وہ شٹر ہی کیا جو آواز نہ کرے۔ وہ عورت پیچھے مڑ کے دیکھے بغیر آہستہ آہستہ چلی جارہی تھی۔ شٹر بند کر کے بھی میں دھڑکتے دل کے ساتھ چند لمحے وہیں کھڑا رہا کہ شٹر کی آواز سن کر ہی شاید چوکیدار آنکلے، لیکن شاید چوکیدار کسی اور جانب نکل گیا تھا یا شاید مسجد سے ہی نہ نکلا ہو۔ بہر کیف میں تیزی سے چلتا ہوا اس عورت سے آگے نکل گیا۔ دو گلیاں چھوڑ تیسری گلی میں میرا گھر تھا۔ چند بچے بستے لٹکائے اسکول کی جانب رواں دواں تھے۔ کچھ کے ساتھ ان کی مائیں، کسی کے ساتھ باپ یا بھائی بھی تھے، لیکن میری گلی خالی ہی تھی۔

میں نے جلدی سے تالا کھولا اور اندر گھسنے میں قطعی دیر نہیں لگائی، کیونکہ اس وقت میرا گھر میں گھسنا بھی خلاف معمول تھا۔ کوئی پڑوسی دیکھ لیتا تو سوال کرسکتا تھا۔ اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

میرا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ابھی میری سانسیں اعتدال پر بھی نہیں آئی تھیں کہ وہ عورت گھر میں داخل ہوگئی۔

”تمہیں دیکھا تو کسی نے نہیں؟“ میں نے عجلت سے پوچھا۔

”نہیں کوئی بھی نہیں تھا گلی میں“ کہتے ہوئے وہ بیت الخلا میں گھس گئی۔

☆......☆

میں نے صراحی سے پانی انڈیلا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

پانی کا گلاس میرے ہاتھ میں تھا لیکن منہ تک لے جانا مشکل ہو رہا تھا، خدشہ تھا کہ پانی سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔

میرے نتھنوں سے شائیں شائیں کی آواز نکل رہی تھی اور دل مجھے اپنے کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

پانی کا گلاس میں نے قریب رکھی تپائی پر رکھ دیا۔

وہ عورت بیت الخلا سے باہر نکلی۔ میری جانب دیکھتے ہوئے خجالت سے مسکرائی۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے بے حد احسان کیا ہے مجھ پر۔“

”تمہارے شکریے کو میں چاٹوں یا فریم کروا کر دیوار پر لٹکاؤں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ درشت ہوگیا تھا۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟“ اس کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔

”ہیجڑے آدمی کو کوئی بھی شریف آدمی اپنا مکان کرائے پر نہیں دیتا اور شریف محلے میں تو ہیجڑے آدمی کو مکان کا ملنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ یہ میری شرافت ہے کہ مجھے یہاں مکان مل گیا ہے“ میں نے کہا۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکی“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”میں کوئی انگریزی تو نہیں بول رہا۔ تم ہیجڑے کا مطلب نہیں سمجھتیں۔“ میرا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ ”میں یہاں اکیلا رہتا ہوں، اکیلا۔ تم میرے گھر آتو گئی ہو، فارغ بھی ہوگئی ہو۔ تمہیں آتے ہوئے تو کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ جونہی تم باہر قدم نکالو، میرا کوئی پڑوسی بھی عین اسی وقت گھر سے باہر نکلے، یہ سمجھو کہ میری عزت کا جنازہ نکل گیا“

”آپ، آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ میں خود بہت پریشان ہوں۔ ان شاء اللہ آپ کی عزت پر میری وجہ سے کوئی حرف نہیں آئے گا، یہ میرا وعدہ ہے۔“ وہ ایک عزم سے بولی۔

”تم نہیں سمجھو گی میری پریشانی!“ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ آدھے کمرے میں چارپائی بچھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک تپائی تھی جس پر روزمرہ ضرورت کے چند برتن بے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے، اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی میز تھی جو چارپائی سے قدرے اونچی تھی۔ اس پر قرآن مجید اور چند اسلامی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔

”آپ نے سچ کہا، میں واقعی آپ کی پریشانی نہیں سمجھ پارہی تھی، لیکن اب سمجھ آگئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ گھر بار والے ہیں، آپ کی فیملی ہوگی۔ بیوی بچے ہوں گے، ان کا مسئلہ ہوگا، لیکن آپ صحیح سوچ رہے ہیں۔ اگر مجھے کسی نے آپ کے گھر سے نکلتا ہوا دیکھ لیا تو آپ ہی کی نہیں میری عزت بھی“ پتا نہیں، اس کی یہ بیماری تھی یا عادت کہ جملہ ادھورا چھوڑ دیتی تھی۔

”بہرحال آپ پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا۔“

”پریشان کیسے نہ ہوں۔ مجھے دکان پر جانا ہے، میرا ملازم آنے والا ہے۔ اگر دکان بند ہوئی تو وہ سیدھا گھر آجائے گا اور اسے میں دروازے سے واپس نہیں بھیج سکتا، وہ اندر ضرور آئے گا، اس لیے کہ میں ہیجڑا ہوں، لیکن تم نہیں سمجھو گی 'ہیجڑے' کا مطلب۔“

''اگر آپ کو دکان پر جانا ہے نا، تو چلے جائیں۔ میں رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکلوں گی، جب مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں اپنی وجہ سے محلے میں آپ کی عزت خراب نہیں ہونے دوں گی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ترکیب اچھی تھی۔ ''لیکن دن بھر میرے دروازے کو تالا لگا رہتا ہے، کیونکہ میں رات کو گھر پر ہوتا ہوں اور دن کو دکان پر۔ جمعہ کے دن دکان کی چھٹی ہوتی ہے تو میں اپنے بیوی بچوں میں چلا جاتا ہوں۔ اگر کسی نے دن دہاڑے میرا دروازہ کھلا دیکھا تو بغیر دستک دیے ہی اندر آ جائے گا، اس لیے کہ۔''

''آپ چھڑے ہیں۔'' اس نے میری بات کاٹ کر جملہ پورا کر دیا ''آپ دکان پر جائیں اور باہر سے تالا لگا جائیں، میں آپ کے آنے تک یہیں رہوں گی، بلکہ اپنی نیند بھی پوری کر لوں گی اور پھر رات کے اندھیرے میں چلی جاؤں گی۔''

''کہاں جاؤ گی؟''

''جہاں بھی منہ اٹھا، آپ جائیں آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ میری وجہ سے اپنا نقصان نہ کریں۔ مجھے شرمندگی ہے کہ میری وجہ سے آپ دکان بند کر کے گھر آئے ہیں۔''

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گھر میں بند کر کے تالا لگا کر دکان پر چلا گیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔

دکان پر جا کر بھی مجھے بار بار یہ خیال ستاتا رہا کہ میں ایک غیر عورت کو گھر میں بند کر آیا ہوں۔ عورت ہے، آخر زندہ جان ہے، چھینک کھانسی پر انسان کو اختیار نہیں ہے۔ اگر کسی نے اس کی آواز سن لی اور دروازے پر تالا دیکھا تو یہ بھی میری بدنامی ہوگی۔ لوگ کہیں گے، پتا نہیں کب سے عورت کو اندر قید کر رکھا ہے۔ کس مقصد کے لیے قید کیا ہوا ہے۔

بلال آیا اور جب اس نے ناشتے کی بات کی تو یکا یک مجھے خیال آیا کہ ناشتا تو اس عورت نے بھی نہیں کیا ہوگا؟ میں نے بلال سے کہا کہ تم دکان پر بیٹھو میں ناشتا گھر پر ہی کر آتا ہوں۔ تھوڑی دیر کر بھی سیدھی کر لوں گا۔ یہ میرا معمول نہیں تھا لیکن کبھی کبھی میں اس طرح گھر چلا جایا کرتا تھا اور ایسا عموماً ہفتے کے دن کیا کرتا تھا کہ سفر کی تھکن ہوتی تھی۔

☆......☆

میں نے نانبائی سے دو افراد کا ناشتا لیا دودھ، انڈے، چینی، چائے کی پتی لی اور گھر کی راہ لی۔

اتنی ہی دیر میں اس عورت نے گھر کا نقشہ ہی بدل رکھ دیا تھا۔ بستر جھاڑ دیا تھا، نئی چادر بچھا دی تھی، دیوار صاف کر کے پورے گھر میں جھاڑو بھی لگا دی تھی۔ گھر میں کبھی میں نے پونچھا نہیں لگایا تھا اس نے اندر پونچھا لگا کر ساری دھول مٹی دھو ڈالی تھی۔

یہ سب کچھ اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کر لیا تھا۔ مجھے ناشتے سے لدا پھندا دیکھ کر وہ مسکرائی ''یہ کس لیے''

''تمہارے لیے۔'' میں نے کہا۔ ''اپنے لیے، ہم دونوں کے لیے''

''چلیں حساب برابر ہو گیا۔ آپ نے میرا خیال رکھا، میں نے آپ کا خیال رکھا کہ ایک 'چھڑا' آدمی اپنے گھر کی صفائی نہیں کرتا، تو میں سارا دن اس گھر میں بند رہ کر کچھ نہیں تو صفائی ہی کر ڈالوں۔''

گھر میں گھستے ہی ہمیشہ عجیب سی بساند میرا استقبال کیا کرتی تھی، آج سب کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ مجھے عورت کچھ اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔

''چلو ہاتھ دھو لو! ناشتا کریں''

''ضرور کروں گی، میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔'' وہ بولی

''ارے تو بتایا کیوں نہیں؟ میں جاتے جاتے دے جاتا!'' مجھے افسوس سا ہوا کہ یہ پوچھنا تو میرا کام تھا۔

''آپ کو دکان سے دیر ہو رہی تھی۔ آپ کہہ رہے تھے کہ دکان بند ہوئی تو ملازم گھر آ جائے گا!''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس وقت مجھے بلال کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔

بہر کیف ہم نے ایک ہی، بلکہ واحد چارپائی پر بیٹھ کر ناشتا کیا۔ اجنبیت ختم ہو گئی تھی۔

''آپ مجھے کپڑے دھونے کا صابن لا دیں، میں بستر کی چادر دھو ڈالوں۔ دیکھیں کتنی گندی ہو رہی ہے؟ آپ کو کیسے نیند آ جاتی ہے اس گندے بستر میں؟'' وہ بولی

''میں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے صابن لا دیں۔''

اس نے دوبارہ کہا تو میں نے تکلفاً منع کرنے کی بجائے اس کے کہے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

جا کر قریبی دکان سے کپڑے دھونے کا صابن لے آیا۔

''کوئی سبزی وغیرہ بھی لے آتے، میں پکا دیتی، فارغ ہی تو ہوں'' ایک اور فرمائش تیار تھی۔

میں سبزی بھی لے آیا۔ اس نے نہ جانے کہاں کہاں سے میلے کپڑے کھینچ نکالے تھے۔ میں نے کہا ''باقی کے کپڑے رہنے دو، صرف بستر کی چادر دھو ڈالو بس! صابن کم پڑ جائے گا، پھر اور منگواؤ گی۔''

''منگوا دیں نہیں تو کیا خود جا کر لاؤں گی؟'' وہ مسکرائی تو جانے کیوں میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکتا گویا سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔

میں نے کہا ''ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں دکان پر، کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو دوپہر میں لے آؤں گا۔''

''کپڑے دھونے کے برتن نہیں ہیں تمہارے ہاں، اس چھوٹے سے برتن میں مشکل سے دھلیں گے'' اس نے غسل خانے کا ٹب دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

''تم چند گھنٹوں کی مہمان ہو، پھر چلی جاؤ گی۔ ایسی چیز خریدنے کا مجھے کیا فائدہ؟ جو تمہارے بعد میرے کام نہ آئے؟''

وہ پھر مسکرائی ''میں خرید کر لانے کا نہیں کہہ رہی، میں تو یہ کہہ رہی ہوں، کچھ کہتے ہوئے وہ رکی۔ گویا الفاظ تول رہی ہو۔'' پھر تندرے توقف سے بات بدل کر بولی۔ ''چلیں میں گزارا کر لوں گی''

ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو میں نماز پڑھ کر گھر چلا گیا وہ بھی نماز پڑھ رہی تھی۔ اسے نماز پڑھتا دیکھ کر مجھے یک گونہ روحانی تسکین ہوئی کہ یہ عام عورتوں کی طرح نماز ٹرخانے والی نہیں ہے۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا اور اسے نماز پڑھتے دیکھتا رہا۔

''ترکاری تو میں نے بنا دی ہے'' وہ نماز سے فارغ ہوئی ابھی جائے نماز پر ہی تھی کہ مسکراتے ہوئے بولی ''چمچ سے کھائیں گے؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''مطلب یہ کہ پکانے کے لیے سبزی مسالہ تو آپ نے لا دیے۔ میں نے سالن بنا دیا۔ ہمارے ہاں سالن کو روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے'' وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ ہوٹل سے پکا پکایا کھانا لا لا کر کھانے کا عادی تھا، کبھی گھر میں آٹا گوندھنے اور پکانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، میں فوراً اٹھا، قریبی ہوٹل سے چند روٹیاں لے آیا۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے گھر کی واحد چارپائی پر آمنے سامنے بیٹھ کر کھایا، اس نے سالن بھی بہت عمدہ بنایا تھا، یا شاید میں نے پہلی بار اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھایا تھا۔

رات کو جب میں گھر کی جانب جا رہا تھا تو میرے پاس پھلوں کے دو تھیلے بھی تھے۔

☆......☆

مطلع شام سے ہی ابر آلود تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی لگتا تھا۔ قریب ہی کہیں بارش ہو رہی ہو، رات کھانا کھا کر ہم فارغ ہوئے تو بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

''لو! بارش بھی شروع ہو گئی''

''تو کیا ہوا؟ یہ تو قدرتی کام ہیں۔''

''قدرتی کام تو ہیں۔ تمہارے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔ تم کیسے جاؤ گی؟ برستی بارش میں؟''

''میں؟ میں کل چلی جاؤں گی۔ مجھے کون سی جلدی ہے۔'' وہ اتنی آسانی سے بولی گویا بارش اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔

''تو کیا رات بھی یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟'' مجھے تھرتھری سی آ گئی۔

''مجبوری ہے! اب بارش میں کہاں جاؤں گی؟ خود سوچیں آپ؟''

''میری بھی مجبوری کو دیکھو نا! میرے گھر میں ایک ہی چارپائی ہے۔ اس پر تم سوؤ گی یا میں''

''آپ ہی سو جانا، میں فرش پر ہی لیٹ جاؤں گی۔ مسافر ہوں مجھے تو کہیں بھی نیند آ جائے گی۔''

میں دعا کر رہا تھا کہ بارش تیز نہ ہو، بلکہ ختم ہو جائے تو یہ عورت میری جان چھوڑے، ورنہ کل پھر اسے 'قید' کر کے دکان پر جانا پڑے گا۔ بارش تیز تو نہ ہوئی، لیکن ختم بھی نہ ہوئی ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی تھی۔

اس نے اپنے لیے فرش پر ہی ایک چادر بچھا لی تھی اور اپنی شال لے کر لیٹ بھی گئی تھی۔ اسے لیٹے دیکھ کر مجھے غصہ آ رہا تھا کہ یہ عورت مجھے بدنام کرنے کے پروگرام پر پوری طرح عمل کر رہی ہے۔ یہ کب جائے گی اور میری جان میں جان آئے گی۔

''ابھی سو جاؤ! لیکن صبح سویرے تمہیں نکلنا ہوگا جس طرح اندھیرے میں آئی ہو اسی طرح۔ میں اپنی بدنامی نہیں چاہتا۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے صبح اذان کے وقت جگا دیجئے گا۔ میں نماز پڑھ کر نکل جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے

کروٹ بدل لی۔

میں نے بھی بتیاں بجھا دیں اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

"آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟" اندھیرے میں اس کی آواز ابھری۔

"وہ ایبٹ آباد میں ہیں۔"

"انہیں آپ نے ساتھ کیوں نہیں رکھا؟"

"ایبٹ آباد میں میرا ذاتی گھر ہے۔ میرے والدین ہیں، میرے بچے پڑھ رہے ہیں۔ میں جمعرات کی شام کو چلا جاتا ہوں اور دو راتیں اور جمعہ کا ایک دن اپنے بچوں میں گزار کر ہفتے کی صبح واپس آجاتا ہوں۔"

"آپ کی بیوی یہاں نہیں آتی؟"

"کیسی بات کرتی ہو؟ اسے کیا ضرورت ہے یہاں آنے کی؟ یہاں سارا دن اکیلی رہے گی، خود میں دکان پر رہوں گا، اس کی فرمائشیں کون پوری کرتا پھرے گا؟ اور پھر یہ گھر کوئی دو افراد کے رہنے کا ہے؟"

کچھ دیر خاموشی رہی۔

"ایک بات کہوں آپ سے؟" اسی نے خاموشی کو توڑا۔

"اب تک ساری باتیں بغیر پوچھے کرتی رہی ہو اور اب ایسی کیا بات ہے، جو مجھ سے پوچھ کر کرنا چاہتی ہو؟"

وہ خاموش ہو گئی، پھر یہ خاموشی طول پکڑ گئی۔

"آپ نے اب تک مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے یہ پوچھنے کی، جہاں تمہاری مرضی ہو چلی جاؤ!" میں نے فوراً کہا۔ "یہاں سے جاؤ، جہاں جی چاہے۔" اس نے شاید میرے لہجے میں بیزاری محسوس کی ہو گی۔

چند منٹ خاموشی رہی۔ میں سمجھا کہ اب سو گئی ہو گی میں نے بھی حسب معمول آیت الکرسی کا ورد شروع کیا، میری عادت سی ہو گئی ہے کہ نیند آنے تک میں آیت الکرسی پڑھتا رہتا ہوں۔

بارش کی وجہ سے ٹھنڈ کا احساس بڑھ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے تو اسے بھی ٹھنڈ لگ رہی ہو گی۔ وہ تو ٹھنڈے فرش پر لیٹی ہوئی ہے۔ سوچا کہ اٹھ کر بتی جلاؤں اور کمبل نکال کر اسے بھی دوں اور خود بھی کوئی چادر وغیرہ لے لوں، ورنہ ٹھنڈ کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔

ہاتھ بڑھا کر میں نے بلب کا سوئچ آن کیا۔ دیکھا تو وہ چارپائی سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ کیا؟ میں سمجھا کہ تم سو گئی ہو گی۔"

"نیند آئے گی تو سو جاؤں گی۔" اس نے قدرے رکھائی سے کہا۔

میں نے اس کے لہجے کی قطعی پروا نہیں کی۔ بکس میں سے کمبل نکالا میرے پاس وہ ایک ہی کمبل تھا۔ اسے دیتے ہوئے کہا "یہ لو! سردی بڑھتی جا رہی ہے" ایک چادر اپنے لیے بھی نکال لی۔

کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ بارش اگرچہ کمرے میں نہیں آتی تھی، تاہم تیز ہوا کے ساتھ کبھی کبھی بوچھار آ ہی جاتی تھی۔ نمی کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے دوبارہ بتی بجھا دی اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

"آپ نے میرا نام بھی نہیں پوچھا ابھی تک؟" وہ شاید ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند کرنے سے گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔

"نام پوچھ کر کیا کروں گا ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"مجھے بتائیں میں کہاں جاؤں؟"

"کہیں بھی جاؤ گی تو پچھتاؤ گی۔ بہتر یہ ہے کہ جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ اپنے بھائیوں کے پاس۔"

"بھائی۔" وہ ہنسی۔ "میرے بھائی! بھائی نہیں رہے۔ وہ اپنی بیویوں کے شوہر ہیں اور میری بھابیوں کو یہ احساس ہے کہ اگر میں ان کے پاس رہی تو میرے بھائی میری شادی کی فکر کریں گے۔ انہوں نے میری شادی کہیں کرنے کی کوشش کبھی کی تو اس میں کچھ نہ کچھ خرچہ ضرور ہو گا۔ اس لیے بھابیاں مجھے اپنے میاؤں کے نزدیک نہیں دیکھنا چاہتیں۔ میں اپنے گھر میں رہتے ہوئے اپنے بھائیوں سے بات کرنے کو ترستی رہی۔ مجھے یقین ہے کہ آج کی رات میری بھابیاں سکون سے سوئیں گی، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں نے کہیں اپنا منہ کالا کر لیا ہو گا اور ایک رات گھر سے باہر گزار کر دوبارہ ان کے گھر بھی نہیں آسکتی۔ انہوں نے میرے بھائیوں کو خوب خوب بھڑکا دیا ہو گا، میرے خلاف۔"

میں خاموش رہا۔ میں کہتا بھی تو کیا؟

"ایک بات کہوں، اگر برا نہ مانیں تو؟" وہ بولی۔

میں خاموش ہی رہا۔ "آپ کا کوئی جاننے والا کوئی دوست ہے تو اس سے میرا نکاح کروا دیں۔"

میں اٹھ بیٹھا۔ کتنی مشکل بات اس نے کس قدر آسانی سے کہہ دی تھی، وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی، لیکن میں نے اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا "میں چاہتا ہوں کہ میرے جاننے والوں کو خبر ہونے سے پہلے پہلے تم میرے گھر سے چلی جاؤ اور تم چاہتی ہو کہ میں جان بوجھ کر اپنے دوستوں کو تمہارے وجود سے آگاہ کروں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بالکل چپ ہو گئی

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی تو میں پھر لیٹ گیا۔ میرے پاس سونے کا یہی وقت ہوتا تھا، میں دن میں نہیں سو سکتا تھا۔

☆......☆

فجر کی اذان سے کچھ پہلے میری آنکھ کھلی تو میں نے اٹھ کر بتی جلائی۔

دیکھا تو چارپائی سے نیچے کمبل گرا ہوا تھا اسے اٹھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ کوئی ہے۔ معاً یاد آیا کہ یہ تو وہی عورت ہے جو کل صبح سے میرے گھر میں 'قید' ہے۔

پھر ساری باتیں یاد آ گئیں۔ کمبل اٹھانے سے وہ بھی بیدار ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی، جواباً میں بھی دھیرے سے مسکرا دیا۔ میں سیدھا مسجد چلا گیا۔

نماز پڑھ کر واپس آیا تو وہ بھی نماز سے فارغ ہو چکی تھی۔

"ناشتا میں گھر میں ہی بناؤں گی" وہ بولی صرف سامان لا دیں۔

"ابھی تو تمام دکانیں بند ہیں۔ دیر سے کھلیں گی، ناشتا کرتے کرتے دیر ہو جائے گی۔ اس وقت سب لوگ گھروں میں بند ہیں۔ اکا دکا نمازی ہیں، وہ بھی تھوڑی دیر میں اپنے اپنے گھر پہنچ جائیں گے، تم اب دیر بالکل نہ کرو۔ رات تو بارش کی وجہ سے رک گئیں، لیکن اب رکنے والی بات نہ کرنا، جتنا جلدی ہو نکل لو۔" میں نے دوٹوک کہا۔

"کیسے آدمی ہیں آپ؟ کوئی گھر سے جا رہا ہو تو کہتے ہیں۔ ٹھہرو ناشتا کر کے جانا یا چائے پی کر جانا، کھانا کھا کر جانا اور آپ ایسے وقت میں گھر سے نکال رہے ہیں جب کہ ناشتے کا وقت ہے۔"

"تمہیں میرے گھر آئے ہوئے چوبیس گھنٹے ہو چلے ہیں اور یہ چوبیس گھنٹے میرے لیے بڑے بھاری گزرے ہیں، اس لیے کہتا ہوں کہ دیر کیے بغیر نکل لو، ورنہ کل والا مسئلہ پھر پیدا ہو جائے گا۔"

"اگر میں نہ جانا چاہوں تو آپ زبردستی کریں گے؟"

"زبردستی تو نہیں نکال سکتا لیکن تم میری پوزیشن کو سمجھو، کل کوئی نہیں آیا تو آج ضرور کوئی نہ کوئی آجائے گا، آخر کب تک تم میرے گھر پڑی رہو گی۔ مجھے سکون سے کوئی کام کرنے دو۔ میرے لگے بندھے معمولات ہیں۔"

"میں نے آپ کو اپنی مجبوری بتا دی ہے، پھر بھی آپ مجھے اپنے گھر سے نکال رہے ہیں۔"

"تم میری ذمے داری نہیں ہو!" میں نے فوراً کہا "مجھ پر تمہاری کوئی ذمے داری نہیں ہے۔"

"ایک بات کہوں اگر اجازت ہو تو" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"بولو جلدی بولو"

"مجھے اپنے گھر سے نہ نکالیں! میں آپ کی خدمت کروں گی"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں تمہیں کیسے اپنے گھر رکھ سکتا ہوں ایک جوان عورت کو؟ ایک ہی رات میرے لیے عذاب سے کم نہیں تھی اور تم مستقل رہنے کی بات کر رہی ہو؟"

"دیکھیے میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بھائیوں سے مجھے قطعی بھی امید نہیں ہے کہ وہ مجھے تلاش کریں گے یا میرا گھر بسائیں گے۔ آپ شریف النفس آدمی ہیں۔ آپ کے گھر رات بھر رہ کر مجھے انوکھے تحفظ کا احساس ہوا ہے۔ میں آپ کے گھر سے جانا نہیں چاہتی۔ آپ جیسا شخص مجھے پوری دنیا میں نہیں ملے گا"

"لیکن میں تمہیں اپنے گھر کیسے رکھ لوں، کیوں میری عزت کا جنازہ نکال رہی ہو؟"

"آپ مجھے اپنی ذمے داری میں لیں، مجھ سے خود نکاح کر لیں۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا؟ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ اس مہنگائی میں ایک بیوی کا صحیح طور پر بھی حق ادا کرنا مشکل ہے، دو کا کیسے ادا ہو گا؟"

"میں کچھ بھی نہیں مانگتی صرف پناہ مانگتی ہوں آپ سے" وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"میں کوئی شیطان ہوں جو مجھ سے پناہ مانگ رہی ہو" مجھے یہی سمجھ آئی۔

"میں آپ 'کی' پناہ مانگتی ہوں۔ معاشرے میں بکھرے ہوئے شیطانوں سے۔" اس نے 'کی' پر زور

دے کر وضاحت کی۔

میں نے کہا۔ ”ایسے کیسے ہوسکتا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں اسلام میں کسی غیر مرد کے ساتھ عورت کا بغیر نکاح کے اکیلے رہنا، کتنا قبیح فعل شمار ہوتا ہے؟“

”اسی لیے کہتی ہوں کہ مجھ سے نکاح کرلیجیے!“

”نہیں نہیں یہ مجھ سے نہیں ہوگا، سو مسئلے پیدا ہوجائیں گے، تم جاؤ! بس کہیں اور چلی جاؤ، کسی ایسے شخص کا گھر بساؤ جسے بیوی کی ضرورت ہو، میری ایک بیوی ہے۔ کافی است ومعافی است“ میں نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔

”تو آپ ہی اپنے کسی دوست عزیز سے میرا نکاح پڑھوادیں، میرا کون ہے یہاں جاننے والا، کون ہے میرا سرپرست؟“

”پھر وہی بات ۔ میں لوگوں کے سوالات سے بچنا چاہتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ جہاں سے گزروں لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں۔ مجھے دیکھ کر آپس میں چہ میگوئیاں کریں۔“

”آپ کو کیا اندیشہ ہے؟ لوگ کیا سوال کریں گے آپ سے اور آپ کو کس سوال کا جواب دینے میں مشکل پیش آرہی ہے؟“

”کئی سوال ہیں، تم نہیں سمجھوگی۔ چھوڑو ان باتوں کو“

”دیکھیے میں آپ کو اپنی آپ بیتی سناتی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنی زوجیت میں خود رکھیں یا اپنے کسی دوست کی زوجیت میں دے دیں۔ خود نکاح کرلیں گے تو فائدے میں رہیں گے، سوچیے! صبح اٹھتے ہیں ناشتا اس وقت تک نہیں کرسکتے جب تک ہوٹلوں یا نانبائی کی دکان پر تیار نہ ہوجائے، کپڑے دھوبی سے دھلواتے ہیں۔ وہی استری کرکے دیتا ہے، دوپہر کا کھانا بھی ہوٹل پر رات کا کھانا بھی ہوٹل سے! میرے ہوتے ہوئے آپ کی یہ پریشانیاں ختم ہوجائیں گی آپ صبح سویرے ناشتا کرکے دکان پر جائیں گے، دوپہر کا کھانا تیار ملے گا، رات کو گھر آئیں گے تو میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھائیں گے، لباس تیار ملے گا گھر صاف ستھرا ملے گا“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن......“

”ابھی کچھ نہ کہیں میری بات پوری سن لیں۔ میرے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ سب کی شادی ہوگئی ہے، بہنیں لاہور بیاہی گئی ہیں۔ میری شادی سے پہلے ہی میرے والدین کا انتقال ہوگیا، اب میں اپنے بھائیوں پر بوجھ ہوں۔ بھابیاں یہ چاہتی ہیں کہ میں سارا سارا دن ان کے کام کروں، ان کے بچوں کا خیال رکھوں، انہیں کھلاؤں لیکن نہ ان سے کھانا مانگوں نہ لباس۔ یعنی کسی نوکرانی کی طرح صبح سے شام تک ان کے کام کروں اور شام ہوتے ہی گھر سے نکل جاؤں۔ اگر میں ان کے گھر رہی تو میرے بھائی میری شادی کی فکر کریں گے، انہیں کچھ نہ کچھ جہیز میں بھی دینا پڑے گا، رہیں میری بہنیں تو اول انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ میری بھابیوں کا میرے ساتھ کیا سلوک ہے؟ دوسرے یہ کہ میں ان کے پاس بھی نہیں جاسکتی جب بھائی اپنے نہیں ہیں تو بہنوئی کیا کرسکیں گے؟ ۔۔میری قسمت اچھی ہے کہ رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلی اسٹیشن پہنچی، بے ٹکٹ سفر کرکے یہاں پہنچی۔ چلتے چلتے تھکی تو ایک دکان کے تھڑے پہ لیٹ گئی، دن بھر کام کرکے بھی تھکی ہوئی تھی اور بھوکی بھی، رات بھر کی جاگی ہوئی بھی تھی آنکھ لگ گئی، پھر آپ نے مجھے جگایا۔ میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ آپ کے گھر مجھے سکون مل رہا ہے، میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میں لوگوں کو کیا جواب دوں گا، تمہارے بارے میں؟“

”کچھ بھی نہیں، آپ کسی دوسرے سے ان کے گھر کے بارے میں ان کی بیوی کے بارے میں کیا سوال کرتے ہیں؟ مجھے بتائیں، لوگ آپ کو کیا جواب دیتے ہیں۔ وہی جواب آپ بھی دے دینا۔“

”دیکھو تم میرے گھر بیت الخلا کے لیے آئی تھیں، اسے ”بیت الخلا“ نہ سمجھو۔ جاؤ میری جان چھوڑو۔ تم میری بیوی نہیں ہو۔ لوگ جانتے ہیں کہ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ یہ مکان دو افراد کے رہنے کے قابل نہیں ہے، اس کمرے میں دوسری چارپائی کی جگہ بھی نہیں ہے، باورچی خانہ نہیں ہے۔ بس صحن میں ایک چولہا رکھا ہوا ہے وہ بھی کھانا پکانے کے لیے نہیں، بلکہ سردی کے موسم میں پانی گرم کرنے کے لیے“

”آج مجھے میرے کہنے پر اپنے گھر دن گزارنے دیں ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جیسے ہی رات کو آپ گھر آئیں گے، میں چلی جاؤں گی، وہ بھی آپ نے اجازت دی تو۔“

”میری طرف سے تمہیں ابھی اجازت ہے“ میں فوراً بولا۔

”ساری رات میں اس بات پر غور کرتی رہی ہوں، آج دن میں آپ غور کرلیں، پھر جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا“ وہ بولی ”میں نے سوچا ہے کہ آپ مجھے اپنے نکاح میں لے لیں، جیسے آپ رہتے رہے ہیں، ویسے ہی اپنے معمولات رکھیں، دکان جاتے ہوئے باہر سے تالا لگا جائیں، میں گھر کے اندر ہی رہوں گی۔ کہیں آنا جانا تو ہوگا نہیں۔“

”نکاح اتنا بھی خاموشی سے نہیں ہوتا کہ کسی کو خبر نہ ہو، لوگوں کو محلے داروں کو گواہ بنانا پڑتا ہے۔“

”نکاح کے لیے اپنے دو دوستوں کو رازدار بنالیں، انہیں بتائیں کہ مجھے پریشانی ہے۔ پہلی بیوی میرے ماں باپ کی خدمت کررہی ہے، تو دوسری کو یہاں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ ہوٹلوں کا کھانا کھا کھا کر بیزار ہوگیا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ بس ان دو افراد کو ہی یہ معلوم ہو کہ میں آپ کی دوسری بیوی ہوں، ورنہ دوسروں کو صرف یہ بتائیں کہ میری بیوی ہے، میرے ساتھ رہتی ہے۔ کسی کو کیا خبر کہ میں آپ کی پہلی بیوی ہوں یا دوسری۔“

”تمہیں پتا ہے دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا پڑتی ہے۔“

”میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں رکھتی، جس طرح آپ اپنے بیوی بچوں میں جمعرات کے دن جاتے ہیں، جاتے رہیں۔ باہر سے تالا لگا کر جاتے رہیں۔ میں گھر کے اندر ہی بند رہوں گی، میرا کون ہے؟ کس کے پاس جاؤں گی؟ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی بیوی یہاں نہیں آتی اسے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس صورت میں بھی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کی پلاننگ مکمل تھی۔ وہ ہر طرح سے مجھے گھیر رہی تھی کہ میں اس سے عقد ثانی کروں ہی کروں۔ مجھے سوچتا دیکھ کر بولی۔ ”آج آپ سوچ لیں کہ مجھے یعنی ایک بے بس و بے سہارا لڑکی کو اس طرح بے آسرا اکیلے اپنے گھر سے نکالنا بہتر ہے یا مجھے سہارا دینا، اپنا گھر بسالینا۔ حق مہر کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے بس واجبی سا رکھیں میری کوئی شرط نہیں ہے، مجھے صرف ٹھکانہ چاہیے۔“

☆......☆

میں ناشتے کا سامان لے آیا، اس نے ناشتا بنایا، ہم دونوں نے مل کر ناشتا کیا، پھر میں حسب معمول گھر کو تالا لگا کر دکان پر چلا گیا۔ اس کی پیش کش پر خوب غور کیا۔ مجھے عقد ثانی میں کوئی خرابی دکھائی نہ دی، میں نے سوچا کہ جس طرح میں پہلے جاتا رہا ہوں، اسی طرح اب بھی دو راتوں اور ایک دن کے لیے چلا جایا کروں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی کہ میں نے دوسری شادی کرلی ہے۔ میرا ملازم بلال ہی ایک ایسا شخص ہے جو میرے گھر بے کھٹکے آتا جاتا ہے۔ اسے بتانا ضروری ہے کہ اب میرے گھر میری بیوی ہوتی ہے، اس طرح بے دھڑک اندر نہ آئے۔

ایک فیصلے پر پہنچ کر میں پرسکون ہوگیا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ گھر جاکر میں نے اس کے سامنے اپنا پلان رکھا، اس نے اتفاق کیا۔ راولپنڈی میں کوئی بھی میرا رشتہ دار یا ”گرائیں“ نہیں تھا۔

جمعرات کے دن میں نے بلال کو ہوشیار کردیا۔

کچھ سامان تو میں نے جمعرات کے دن ہی خرید کر دکان میں رکھ دیا اور یہ کہہ دیا کہ یہ میں پرسوں گھر لے جاؤں گا، اس سے اسے یہ تاثر دیا کہ میں دکان سے رخصت ہوکر سیدھا بس اسٹاپ پر جاؤں گا۔

میں نے اس کے دو دن کے کھانے کا بندوبست یہ کیا کہ چند پیکٹ بسکٹ، دودھ اور جوس کے چند ڈبے خرید کر اس کے حوالے کیے کہ بھوکی نہ رہے۔

اس رات میں خلاف معمول رات تاخیر سے بس میں بیٹھا اور ظاہر ہے کہ ایبٹ آباد بھی دیر سے ہی پہنچا۔ گھر والے پریشان ہوگئے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ کام زیادہ ہے، ہفتے کی صبح کی بجائے میں جمعہ کی نماز کے فوراً بعد ہی چلا جاؤں گا تاکہ ہفتے کی صبح جلدی دکان کھول سکوں۔

اس تاخیر کو جواز بنا کر میں نے دو مقصد حاصل کرلیے تھے۔

چنانچہ ہفتے کی صبح آنے کی بجائے میں رات کو ہی راولپنڈی پہنچ گیا۔

کمرے میں داخل ہوکر بتی جلائی تو وہ چارپائی پر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سونے دیا اور خود فرش پر سوگیا، رات جانے کب اس کی آنکھ کھلی اس نے بتی جلائی تو میں اسے فرش پر ہی دکھائی دیا۔ اس نے مجھے اسی وقت بیدار کردیا اور اصرار کرکے مجھے چارپائی پر سلادیا اور خود فرش پر لیٹ گئی۔

صبح ناشتا کرکے میں دکان پر گیا۔ بلال آیا تو اس نے آتے ہی پوچھا کہ بچے آگئے ہیں؟ میں نے کہا۔ ”بچے نہیں آئے، ان کی پڑھائی کا مسئلہ تھا۔ البتہ تمہاری بھابی آگئی ہے۔“ نکاح سے پہلے اسے بلال کی بھابی بتانا کچھ عجیب سا تھا، لیکن کیا کرتا کیا کہتا۔؟

میں نے اس کے لیے سلے سلائے تین سوٹ لیے ایک

برقعہ لیا۔ دکان میں رکھے ہوئے برتن اٹھائے اور گھر چلا گیا، وقت ضائع کیے بغیر اس عورت کو لباس بدلنے کا کہا اور کہا 'اب تم مجھے اپنا نام بھی بتاؤ اور اپنے باپ کا نام بھی۔'

''میرا نام شریف زادی ہے، باپ کا نام فرہاد ہے۔ اپنے گاؤں کا نام نہیں بتاؤں گی۔ بتانا ہی نہیں چاہتی، اس لیے پوچھیں بھی نہیں۔''

مجھے اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی۔ میں نے شریف زادی کو ساتھ لیا اور عدالت پہنچ گئے۔

وہاں نکاح ہو گیا تھا۔ اب وہ میری منکوحہ تھی۔ میں نے کسی کو خبر بھی نہ ہونے دی کہ یہ میری دوسری بیوی ہے۔

اب میرے معمولات یکسر بدل گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی میں گھر جا کر کھاتا، بلال کو پہلے بھیج دیتا وہ ہوٹل سے کھا آتا تھا۔

بدھ تک تو خیریت گزری۔ اب ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، جو میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ اب میں ایبٹ آباد جانے کا کیا کہوں گا؟ کیونکہ بیوی ساتھ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اب میں اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں۔؟

اس کا حل یہ نکالا کہ بلال سے کہا کہ وہ دکان اپنے وقت پر ہی بند کرے، میں ذرا جلدی جاؤں گا۔ تمہاری بھابی بھی ساتھ ہوگی، تا کہ روشنی روشنی میں گاؤں پہنچ جاؤں۔'' اس طرح میں عصر کے وقت دکان سے رخصت ہو کر شریف زادی کے دو دن کے کھانے کا بندوبست کیا اور گھر آ گیا، رات کو حسب معمول گھر کو تالا لگایا، شریف زادی اندر ہی 'قید' تھی۔

اس بار بھی میں ہفتے کی صبح آنے کی بجائے رات کو ہی آ گیا تھا۔

روزمرہ کے معمولات یہی ہو گئے تھے۔

☆......☆

اس 'عقد ثانی' کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ میری دکان پر دو افراد آئے، یہ دونوں ہی میرے لیے اجنبی تھے، سلام کرنے کے بعد ایک بولا۔

''ہم لاہور سے آئے ہیں، ہمیں آپ سے کوئی بات کرنی ہے''

یہ کہہ کر انہوں نے بلال کی جانب دیکھا۔ بلال سمجھ گیا کہ میری موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتے۔ وہ دکان کے دروازے تک جا پہنچا جہاں تک اسے ہماری آواز سنائی نہ دے۔

''بڑی مشکل سے پتا چلایا ہے آپ کا۔'' ایک بولا ''میرا نام سلیم الزماں ہے اور یہ فیاض ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کی بیوی ہماری سالی ہے۔ وہ اپنی بھابیوں سے ناراض ہو کر آ گئی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ غلط ہاتھوں میں پڑنے کی بجائے وہ آپ کے پاس آ گئی ہے اور آپ نے اس سے نکاح کر کے عزت دی ہے، اگر مناسب سمجھیں تو ہمیں اس سے ملوا دیں، ہم اس سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

شریف زادی نے بتایا تھا کہ لاہور میں اس کی دو بہنیں رہتی ہیں۔ وہ ان کے پاس بھی نہیں جانا چاہتی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری بیوی کے کسی رشتہ دار سے رابطہ ہوا۔

میں انہیں لے کر گھر آ گیا۔ ان سے مل کر شریف زادی نے کوئی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا، جبکہ وہ دونوں اسے پا کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ہم چار افراد تھے۔ چارپائی پر ہم تینوں مرد بیٹھے تھے اور سامنے تپائی پر شریف زادی 'ٹکی' ہوئی تھی۔

وہ اس سے گلہ کر رہے تھے کہ اسے یوں نہیں آنا چاہیے تھا، یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ہمیں اپنا سمجھ کر ہم سے اپنا مسئلہ کہا ہوتا، وغیرہ وغیرہ۔

میں انہیں یونہی باتیں کرتا چھوڑ کر بازار گیا۔ ان کی خاطر مدارات کے لیے کچھ بسکٹ وغیرہ لیے، چائے کا سامان لیا، شریف زادی نے چائے بنائی۔ ہم سب نے پی۔ میں نے کہا کہ ''آپ لوگ بیٹھیں باتیں کریں میں دکان پر جا رہا ہوں۔ دوپہر کے کھانے پر بات چیت کی جائے گی۔''

وہ بولے ''نہیں ہمارے پاس بھی وقت نہیں ہے، ہم جا کر اس کی بہنوں کو خوش خبری سناتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوں گی اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ ایک شریف النفس شخص نے اس سے نکاح کر لیا ہے تو اور بھی خوش ہوں گی۔''

میں انہیں اصرار با تکرار روکتا رہا، لیکن وہ جلد ہی رخصت ہو گئے۔

''انہیں گھر نہیں لانا چاہیے تھا'' ان کے جانے کے بعد شریف زادی بولی۔

''کیوں بھئی؟ تمہارے رشتے دار ہیں، کیوں نہ گھر میں لاتا؟''

''میں اب اپنے کسی رشتے دار سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ آج یہ ہمارے گھر آئے ہیں تو کل ہمیں بھی جانا پڑے گا۔ آج یہ آئے ہیں تو کل کسی اور کو پتا بتا دیں گے۔

آپ کا پتا تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس لیے کہتی ہوں، میرا کوئی بھی رشتے دار آئے تو اسے گھر لانے کی بجائے دکان سے ہی رخصت کر دیں۔''

دن حسب معمول گزرتے رہے، میرے عقد ثانی کو یہ دوسرا مہینہ پورا ہونے کو تھا۔

ایک دن صبح ہی صبح شریف زادی کا ایک بہنوئی فیاض آیا، اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ فیاض بولا ''آپ کے گھر جانا ہے۔ یہ شریف زادی کی بڑی بہنیں ہیں، اس سے ملنا چاہتی ہیں۔''

میں مجبور ہو گیا، یہ ہمت ہی نہ ہو سکی کہ انہیں دکان سے ہی چائے بسکٹ کھلا پلا کر رخصت کر دیتا۔ ان کے ساتھ عورتیں اور وہ بھی 'میری سالیاں' نہ ہوتیں تو شاید میں ایسا کر بھی ڈالتا۔ ناچار میں انہیں گھر لے آیا۔

شریف زادی کے رویے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے میری یہ حرکت بے حد ناگوار گزری ہے۔

طوعاً و کرہاً اس نے انہیں برداشت کیا، لیکن ان کے رخصت ہونے کے بعد وہ مجھ سے خفا خفا سی ہو گئی، میں نے منانے کی کوشش کی تو بولی'' میں نے کہا تھا کہ میرے ان رشتے داروں کو منہ نہ لگائیں۔ ان سے رکھائی سے پیش آئیں، آپ انہیں پھر گھر لے آتے ہیں''

''میں کیا کرتا؟ وہ تمہاری بہنیں ہیں۔ لاہور سے اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہیں، صرف تم سے ملنے! انہیں دکان سے ہی کیسے ٹہلا دیتا۔ خود ہی سوچو!''

''بہرحال آئندہ کوئی بھی میرا رشتے دار آئے تو اسے گھر لانے سے پہلے مجھے ضرور بتائیں۔ میں ان سے ملنا چاہوں گی تو گھر میں لائیں، ورنہ صاف انکار کر دیں۔ میرا ان رشتے داروں نے بہت جی جلایا ہے، میں ان سے سخت بیزار ہوں۔''

میں نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ ایسا ہی ہوگا، اسے بتائے بغیر اس کا کوئی رشتے دار گھر پر نہیں لاؤں گا۔

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سلیم الزماں اور فیاض دونوں آئے، ان کے ہاتھ میں کچھ تحائف بھی تھے۔ ایک بولا ''یہ ہمیں آپ کی سالیوں نے تحفہ دیا ہے، ہمارے عزیزوں میں شادی ہے آپ دونوں کو دعوت ہے، اگلے جمعہ کو شادی ہوگی۔ آپ لوگ اول تو ابھی چلیں ہمارے ساتھ، وگرنہ بدھ کے دن لازمی پہنچیں، تا کہ مہندی، مائیوں وغیرہ میں بھی شرکت کر سکیں۔ ہم خود آئیں گے اور بدھ کے دن آپ دونوں کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے تا کہ آپ کو انجان راستوں کی پریشانی نہ ہو۔''

اب مجھے پھر مسئلہ درپیش ہوا، واقعی شریف زادی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، اگر آج وہ ہمارے گھر آئے ہیں تو کل ہمیں بھی جانا پڑے گا۔ غنیمت ہوا کہ انہوں نے گھر تک جانے اور شریف زادی سے ملاقات کا کہا بھی نہیں، میں نے رسماً بھی انہیں گھر آنے کی دعوت نہیں دی۔ بلال کو بھیج کر دکان پر ہی چائے سموسے منگوا لیے تھے۔ وہ رخصت ہوئے تو میں اسی وقت وہ تحفے لے کر گھر پہنچا۔

شریف زادی نے دیکھا تو پھر ناراضی کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''اسی لیے میں کہہ رہی تھی کہ میرے رشتے داروں کو گھر تک آنے کی مہلت ہی نہ دیں۔''

تحفے کے پیکٹ کھول کر دیکھے تو وہ قیمتی لباس ثابت ہوئے وہ بجائے خوش ہونے کے بولی ''اب یہ تحفہ وصول کر لیا ہے تو کچھ دینا بھی پڑے گا؟''

''ہاں تو کیا ہوا؟ دے دیں گے، کوئی کمی ہے ہمارے پاس؟''

''ایسا ہے تو آپ چلے جایئے گا۔ میں بتا دوں! میں نہیں جانا چاہتی، اپنے رشتے داروں میں۔''

میں نے سوچا کہ رشتہ داری تو رکھنا پڑے گی جانا ہی پڑے گا، یہ سوچ کر میں نے ایبٹ آباد فون کر دیا کہ 'اس ہفتے ایک دوست کی شادی ہے میں نہیں آسکوں گا' دوسری جانب میں نے اندر ہی اندر تیاری کر لی تھی۔ بلال سے بھی کہہ دیا تھا کہ میرے عزیزوں میں شادی ہے، شاید مجھے بدھ کے دن جانا پڑے۔

☆......☆

بدھ کے دن وہ دونوں ہی آ گئے۔ میں انہیں دکان پر بٹھا کر کسی کام کا کہہ کر گھر گیا۔ شریف زادی کو سمجھایا کہ ''یہ عزت کی بات ہے کہ وہ ہمیں خود لینے آئے ہیں، چلو تیار ہو جاؤ۔'' لیکن وہ کسی صورت نہ مانی۔ یہی کہتی رہی کہ ''مجھے شوق ہے شادی میں شرکت کا تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں۔ اسے مجبور نہ کروں''

''دیکھو رشتے دار تمہارے ہیں اور تم ہی انکار کر دو گی تو مجھے وہاں کون پہچانے گا؟ تمہاری وجہ سے تو مجھے بھی دعوت دے رہے ہیں ورنہ مجھے کون پہچانتا ہے؟''

''میرا ایک ہی فیصلہ ہے کہ میں اپنے رشتے داروں میں نہیں جاؤں گی'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''مجھے روکنا بھی

آپ کی ذمے داری ہے، آپ کہہ دیں کہ میں اسے اجازت نہیں دیتا۔"

"کیسی بات کررہی ہو؟ دعوت قبول کرنا تو سنت ہے، میں کیسے منع کردوں"

"میری خاطر منع کردیں، یہ سوچ کر منع کردیں کہ میں گئی تو واپس نہیں آسکوں گی۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے شادی پر جارہے ہیں کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں جارہے؟" میں نے کہا۔

"آپ نہیں سمجھیں گے اس بات کو۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو، وہ دونوں دکان پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بڑی معیوب سی بات ہے کہ میں تمہارے رشتے داروں کو گھر لانے کی بجائے دکان میں بٹھائے رکھوں۔"

"آپ تو پتا نہیں کیا ہیں، آپ کو فیصلہ کرنا بھی نہیں آتا!" وہ مجھے سمجھانے لگی۔ "یوں کریں آپ انہیں گھر لائیں اور ان سے رکھائی سے پیش آئیں، میرے بارے میں صاف صاف کہہ دیں کہ اس نے یہ کہہ کر مجھ سے شادی کی تھی کہ میں اپنے رشتے داروں سے نہیں ملوں گی، اس لیے میری اجازت نہیں ہے کہ یہ اپنے رشتے داروں میں جائے۔ اگر یہ میری اجازت کے بغیر اس گھر سے قدم باہر نکالے گی تو اس پر تین طلاق۔"

"شریف زادی! ہوش میں ہو تم؟ یہ کیا کہہ رہی ہو۔" میں لرز کر رہ گیا۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں، آپ انہیں بلا کر اسی طرح کہیں۔ انہیں میری بھلائی منظور ہوئی تو خاموشی سے چلے جائیں گے، اگر نہیں تو پھر مجھے اور آپ کو ساتھ لے جانے پر اصرار کریں گے۔ کمال ہے! رشتے دار میرے ہیں، میں ان کی اتنی فکر نہیں کررہی تو آپ کو کیوں اتنی فکر ہے؟"

میں خاموش ہوگیا میں نے سوچا کہ واقعی جب وہ اپنے رشتے داروں میں خود ہی نہیں جانا چاہتی تو میں کیوں اصرار کررہا ہوں؟

میں فیاض اور سلیم الزماں کو اپنے گھر لے آیا، ان کی خاطر مدارات بھی نہیں کی انہیں چائے پانی کا پوچھا تک نہیں! گھر پہنچتے ہی میں نے اپنا رویہ بدلا اور بولا

"سلیم صاحب! میں نے اس عورت کو بالکل بے سہارا سمجھ کر سہارا دیا ہے۔ شادی سے پہلے اس نے کہا تھا کہ وہ کبھی بھی اپنے کسی رشتے دار کے گھر نہیں جائے گی اور نہ ہی ان سے ملے گی۔ اس کے بقول یہ اپنے رشتے داروں سے بیزار ہے، اگر یہ اپنی بہنوں کے گھر بھی جائے گی تو وہاں ایسے لوگ بھی ہوں گے جن سے یہ نہیں ملنا چاہتی بلکہ ان کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ آپ ایک بار آئے، میں کچھ نہ بولا، آپ کو عزت دی دوسری بار اس کی بہنیں آئیں، میں نے انہیں بھی عزت دی کہ گھر آئے مہمان سے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ آپ تیسری بار آئے تحفے تحائف لے کر آئے۔ ہمیں دعوت بھی دی اپنے گھر آنے کی اور آج ہمیں لینے بھی آگئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں ہے کہ میں اپنا کاروبار چھوڑ کر کہیں جاؤں۔ میری رشتے داری ویسے ہی بہت ہے وہاں جانا مشکل ہوجاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شریف زادی نے جیسا کہا تھا کہ میں اپنے کسی رشتے دار سے نہیں ملوں گی تو اسے اپنے وعدے کا پاس کرنا ہوگا۔ آپ لوگ آکر اس سے مل لیے، وہ بات الگ تھی، لیکن یہ خود جا کر اپنے کسی رشتے دار سے نہیں ملے گی، اس کی میں اجازت نہیں دے سکتا، اگر یہ میری اجازت کے بغیر اس گھر سے قدم باہر نکالے گی تو اس پر تین طلاق۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ ہکا بکا ہو کر کھڑے ہوگئے

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں"

"آپ ٹھیک نہیں کہہ رہے، آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں" سلیم بولا۔

"میں بالکل ہوش وحواس میں ہوں اور آپ لوگوں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ شریف زادی میری اجازت کے بغیر اس گھر سے باہر قدم نکالے گی تو اس پر تین طلاق۔"

وہ کھڑے ہوئے تو تھے ہی، بغیر سلام کیے چلے گئے۔

شریف زادی کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی تھی "اب یہ کبھی بھی نہیں آئیں گے نہ ہی کسی کو آپ کا پتا بتائیں گے۔ یہی میں کہہ رہی تھی کہ خود میں جرأت پیدا کریں۔ خوامخواہ آپ نے انہیں ڈھیل دے رکھی تھی" میں دکان پر چلا گیا۔

☆......☆

اگلی صبح میں سو کر اٹھا تو شریف زادی بستر پر نہیں تھی، میں سمجھا کہ وہ بیت الخلا میں ہوگی، چارپائی پر پیر لٹکا کر کچھ دیر انتظار کیا۔ فجر کی نماز کا وقت جارہا تھا اور شریف زادی بیت الخلا سے نکل ہی نہیں پارہی تھی، قریب پڑی تپائی پر تہ شدہ ایک کاغذ نظر آیا۔ اس کے اوپر پانی کا خالی گلاس سیدھا رکھا ہوا تھا۔ میں نے بے خیالی میں ہی وہ کاغذ اٹھا لیا۔ پڑھنا

شروع کیا تو میرے پیروں تلے سے زمین کھسکتی چلی گئی۔ شریف زادی نے ہی لکھا تھا۔

"پیارے!

میں تمہارے قریب ہی رہتی ہوں اسی محلے میں ہی، تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی تھی اور اب کچھ دن ساتھ رہ کر مجھے یقین ہوگیا کہ تم میری توقع سے بھی زیادہ شریف النفس ہو۔ سچ کہتی ہوں اگر تم شادی شدہ نہ ہوتے تو میں ساری زندگی تمہارے ساتھ گزار دیتی۔ بات یہ ہے کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ میرا ایک پیارا سا بچہ بھی ہے، میں جب تک تمہارے گھر رہی اپنے بچے سے دور رہی۔ اب میں اپنے بیٹے سے ملنے جارہی ہوں۔

میں اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میرا شوہر مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے وہ مجھے لینے گیا تو میں نے کچھ دن اور رکنے کی فرمائش کی وہ نہ مانا اور مجھے ساتھ لانے پر اصرار کرنے لگا۔ میرے بہنوئی اور بہنوں نے بھی اسے کہا لیکن وہ اپنی ضد پہ اڑا رہا۔ بس میرے شوہر نے اس ذرا سی بات پر مجھے طلاق دے دی تھی اور فوراً ہی پچھتایا تھا، اس وقت ہمارے گھر کے یہی افراد تھے، جو تم سے ملے اور یہی گواہ ہیں میری طلاق کے۔

مجھے طلاق ہوگئی تھی۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے ان سب سے کہا کہ یہ بات کسی سے نہ کہیں میں خود سنبھال لوں گی۔ اپنا گھر اجڑنے نہیں دوں گی، اپنے بیٹے کو رلنے نہیں دوں گی۔ شریعت کی رو سے کوئی دوسرا شخص مجھ سے نکاح کر کے طلاق دیتا تو اس کے بعد ہی میں اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی تھی۔ اپنے حسن پر مجھے اتنا ہی ناز ہے کہ کوئی بھی شخص مجھ سے نکاح کر کے طلاق نہیں دے سکتا تھا، میری نظر انتخاب تم پر پڑی، میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھ سے نکاح کیا ہم لوگوں کو گواہ بنایا، میرے دو بہنوئیوں کے سامنے مجھے طلاق بھی دے دی، میں تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے گھر سے، تمہاری زندگی سے نکل آئی ہوں۔ مجھ پر تمہاری دی ہوئی تینوں طلاقیں لاگو ہوگئی ہیں۔ اب میں عدت گزار کر اپنے سابقہ شوہر کے گھر دوبارہ جاسکوں گی۔ جو اخراجات تم نے مجھ پر کیے وہ میرا شوہر، میرے بچے کا باپ تمہیں لوٹا دے گا یا میں خود عدت گزار کر تمہاری دکان میں آکر دے جاؤں گی۔

اور ہاں! میرا اصل نام شریف زادی ہی ہے، لیکن تمہارے محلے میں مجھے کسی اور عرفیت سے پہچانا جاتا ہے، میں نے کوشش کی تھی کہ تمہاری عزت بھی قائم رہے اور میرا کام بھی ہوجائے۔ تمہارے ساتھ گزارا ہوا میرا وقت کم سے کم لوگوں کو معلوم ہو اور کسی کو خبر نہ ہونے پائے کہ میں نے تم سے حلالہ نکلوایا ہے۔ شکریہ میرے معیار پر پورا اترنے کا۔

والسلام۔ شریف زادی"

☆......☆

میرے لیے جمعہ کا وہ دن گزارنا مشکل ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے گھر بھی اطلاع دے دی تھی کہ میں شادی کی وجہ سے نہیں آؤں گا، دکان بھی بند، گھر پر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اسلام آباد چلا گیا اور رات گئے واپس آیا۔

اس واقعہ کے تین یا چار مہینے گزرے تھے۔ میں ظہر کی نماز پڑھ کر آیا تو بلال نے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا "کوئی خاتون یہ دے گئی ہیں۔"

لفافہ کھولا تو اس کے اندر رقم تھی پتا نہیں کتنی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ میں نے رقم بلال کو دے دی اور خط خود سنبھال لیا۔ بلال حیرت سے مجھے دیکھتا رہ گیا میں نے اشارے سے کہا کہ وہ عیش کرے۔ میں نے چاہا کہ اس خط کو گھر جا کر تسلی سے پڑھوں گا، یہ تو سمجھ آگئی تھی کہ یہ شریف زادی ہی تھی جسے معلوم تھا کہ میں اس وقت دکان پر نہیں ہوتا۔ اس نے وہ قیمت چکائی تھی جو میں نے اس پر خرچ کی تھی اور میری دانست میں یہ رقم میرے لیے حلال نہیں تھی۔ بلال کے سامنے خط پڑھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ میرے چہرے کے تاثرات سے کوئی نتیجہ اخذ کرسکتا تھا۔ میں نے اس خط کا مطالعہ رات تک کے لیے مؤخر کردیا۔

رات کا انتظار نہ کرسکا، بلال کسی کام سے دکان سے باہر نکلا تو میں نے خط نکال کر پڑھ لیا۔ لکھا تھا۔

"پیارے!

تمہاری خرچ کی ہوئی رقم لوٹا رہی ہوں۔ سابقہ شوہر سے میرا نکاح فی الحال نہیں ہوسکتا کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ یہ فیصلہ میرا شوہر ہی کرے گا کہ وہ اس بچے کو 'میرا بچہ' سمجھ کر پرورش کرے یا تمہارا بچہ سمجھ کر تمہارے حوالے کردے، اگر میرے شوہر نے وہ بچہ رکھنے سے انکار کردیا تو میں تمہارے حوالے کرجاؤں گی۔ اس کے لیے تیار رہنا۔ خدا حافظ" والسلام شریف زادی۔"

اب مجھے انتظار ہے کہ کب میرا بچہ مجھے ملتا ہے، میرا مطلب ہے کہ "شریف زادی کا بچہ"

☆......☆

خواہشات ناآسودہ

کرن بشیر

مایوس زندگی میں رنگ بھرتی ایک اچھوتی سچ بیانی

میری آنکھ کھلی تو ابا بری طرح اماں پر چیخ رہے تھے، اماں آنسو بہا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی چل رہی تھی۔ ”روز روز کے مرنے سے تو اچھا ہے کہ تم ہمیں ایک ہی دفعہ قتل کر دو۔“

”ایک دن یہی ہوگا زینت!“ ابا نے چیخ کر کہا: ”اگر تیری زبان اسی طرح چلتی رہی تو میں تم تینوں کو مار کے خود کو بھی مارلوں گا۔“

”تو پھر مار کیوں نہیں دیتے؟ گھر کے خرچے کے لیے، تم سے پیسے نہیں مانگوں گی تو کیا باہر بھیک مانگوں گی؟“ اماں نے تڑخ کر کہا۔ ”میری تو زندگی عذاب ہوگئی ہے۔ اماں باوا نے نہ جانے کیا سوچ کر میری شادی تمہارے ساتھ کی تھی؟“

”ہاں، تیرے لیے تو کوئی شہزادہ آنے والا تھا نا؟“ ابا نے طنزیہ لہجے میں کہا: ”تجھے اپنے حسن پر بہت ناز تھا، سمجھتی تھی کہ میں کسی گھر کی رانی بنوں گی۔“

روز کا یہی معمول تھا، کبھی بات صرف تو تو، میں میں تک محدود رہتی تو، کبھی اس حد تک بڑھ جاتی کہ ابا بہت بری طرح چیخنے لگتے، لیکن مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ابا نے کبھی اماں پر ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا۔ ہم جس پس ماندہ آبادی میں رہتے تھے، وہاں کی عورتیں تو آئے دن اپنے شوہروں کے ہاتھوں پٹتی تھیں، لیکن صبح تک سب کچھ بھول بھال کر وہ پھر شوہر اور بچوں کی خدمت میں لگ جاتی تھیں۔ جب بات زیادہ بڑھی تو میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور اماں سے کہا۔ ”اماں! آپ ہی خاموش ہوجائیں۔“

”ہاں، تو بھی مجھے ہی چپ کرا۔ سب کا زور مجھ ہی پر چلتا ہے۔“ اماں نے کہا۔ ابا نے جیب سے مڑا تڑا پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اماں کو دینے کے بجائے مجھے دیتے ہوئے بولے۔

”صائمہ بیٹی! یہ پیسے رکھ لے، ان سے دال، چاول اور گھی لے آنا۔“

”اگر یہ پہلے ہی دے دیتے تو......“

”بس خاموش ہوجا!“ ابا نے درشت لہجے میں اماں کی بات کاٹ دی اور کہا۔

”تو تُو پیسے بھی یوں مانگتی ہے جیسے قرضہ وصول کر رہی ہو، بس مجھے غصہ آجاتا ہے۔“ یہ کہہ کر ابا لپک چھپک گھر سے نکل گئے۔

اماں نے ایک مرتبہ پھر بڑبڑانا شروع کیا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اماں! دال چاول کے ساتھ تھوڑا سا اچار بھی لے آؤں؟“

”بیٹی! ان پانچ روپے میں کیا کیا آجائے گا؟

تو پہلے ضروری چیزیں لے لینا پھر جو پیسے بچیں، وہ مجھے دے دینا۔“

اب سے تیس سال پہلے پانچ روپے بھی بہت ہوتے تھے، دال چاول اور گھی خریدنے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ پیسے بچ ہی جاتے تھے۔ میں نے تو اماں کا دھیان بٹانے کو یہ تذکرہ کیا تھا، ورنہ اچار سے مجھے بھی کوئی دل چسپی نہیں تھی۔



ابا راج کا کام کرتے تھے، کبھی تو وہ دو دو مہینے کام کرتے رہتے، کبھی پورا پورا مہینا بے کاری میں گزر جاتا، بقول ابا کے ”یہ تو ہوائی روزی ہے ملی ملی، نہ ملی نہ ملی، اس لیے کہتا ہوں ہاتھ روک کر خرچ کیا کرو؟“

اماں بے چاری ہاتھ تو جب روکتیں، جب ہاتھ کھلا ہونے کی نوبت آتی، اس کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ بچا ہی لیتی تھیں جو بے کاری کے دنوں میں کام آتا تھا۔

اتنی غربت اور تنگ دستی کے باوجود ابا مجھے اور بلال کو پڑھا رہے تھے، میں ان دنوں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی اور بلال پہلی میں تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ابا کا تعلق ایک کھاتے پیتے خاندان سے تھا۔ انہوں نے آٹھویں تک تعلیم بھی حاصل کی تھی، پھر ہمارے دادا کا انتقال ہوگیا تو بھائیوں اور بھابیوں نے ابا کو گھر سے نکال دیا۔ ابا بہت چھوٹی عمر میں محنت مزدوری کرنے لگے۔ آٹھویں پاس لڑکے کو بھلا کہاں ملازمت ملتی۔

ابا بتاتے تھے کہ جس راج نے کبھی ان کا گھر بنایا تھا، وہ ایک دن ابا کو مل گیا۔ ابا کی حالت دیکھ کر اسے بہت

افسوس ہوا، وہ ابا کو اپنے ساتھ لے گیا، اس نے ابا کو راج مستری کا کام سکھایا، پھر بعد میں اپنی بیٹی سے شادی کردی۔

وہ راج مستری میرے نانا تھے۔ میں نے بہت بچپن میں انہیں دیکھا تھا، بہت محبت کرنے والے شفیق انسان تھے۔

☆......☆

ابا کی رگوں میں شریف اور اعلیٰ خاندان کا خون تھا۔ اسی لیے نہ تو میں نے کبھی ان کے منہ سے گالی سنی تھی، نہ کبھی انہوں نے اماں پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب حالات پر تو کسی کا بھی بس نہیں چلتا۔ وہ بے چارے اپنی سی تو ہر ممکن کوشش کرتے تھے، لیکن افلاس اور غربت تھی کہ ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تھی۔

مجھے اپنی بے بسی پر رونا آتا تھا، میں نے اماں کو ایک ایک پیسے کے لیے سسکتے اور ترستے دیکھا تھا۔ اس لیے اب پیسا ہی میری ترجیح بن گیا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ میٹرک کرنے کے بعد میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ کر کہیں ملازمت کرلوں گی اور اپنی تمام نہیں تو کم سے کم کچھ خواہشات تو پوری کر ہی لوں گی۔

ہمارے گھر میں ہر طرف غربت و افلاس کے ڈیرے تھے، نہ کھانے کو اچھا ملتا تھا نہ پینے کو، اس کے باوجود میں انتہائی پرکشش اور حسین تھی۔ اس کا احساس مجھے اکثر میری اسکول کی سہیلیاں اور محلے کے لڑکوں کی نظروں سے ہوتا تھا، لیکن میرے نزدیک اس وقت اپنے حسن کی کوئی اہمیت نہیں تھی، پیسے کی طلب اور خواہش سب سے بڑھ کر تھی۔

میں ان دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی تھی، بقول خالہ سعیدہ کہ "صائمہ نے تو ایسا رنگ روپ نکالا ہے کہ بس دیکھو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ۔"

خالہ سعیدہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور اماں کی بہترین سہیلی تھیں۔

وہ اکثر اماں سے کہتی تھیں۔ "زینت! اب تم صائمہ کی شادی میں دیر مت کرو، مجھے تو اس کے حسن اور خوب صورتی سے خوف آنے لگا ہے۔"

ان کا یہ جملہ سن کر مجھے بہت حیرانی ہوتی تھی، بھلا حسن اور خوب صورتی سے بھی کوئی خوف کھاتا ہے؟ میں نے تو کہانیوں میں بھی یہی پڑھا تھا کہ بدصورت اور خوف ناک چہروں کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ خالہ سعیدہ کو میری خوب صورتی سے کیوں خوف آتا ہے؟

ان کی اس بات کا مطلب تو بہت بعد میں میری سمجھ میں آیا۔

اس دن میرا رزلٹ نکلا تھا اور میں آٹھویں پاس ہوکر اب نویں کلاس میں آ گئی تھی۔ بلال بھی ساتویں کلاس میں آ گیا تھا۔

میں خوش خوش گھر آئی اور ابا کا انتظار کرنے لگی، اماں کو تو ان خبروں سے کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی، البتہ ابا بہت خوش ہوتے تھے۔

ابا شام ڈھلے گھر لوٹ آتے تھے لیکن اس دن انہوں نے بہت دیر کردی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی، میں بھاگ کر دروازے پر پہنچی کہ ابا آ گئے۔

دروازے پر ایک اجنبی کو کھڑا دیکھ کر میں نے حیرت سے پوچھا۔ "جی فرمایئے؟"

"مستری عبدالرحمٰن کا گھر یہی ہے نا؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔

"بیٹا! تمہارے گھر میں کوئی بڑا ہے تو اسے بھیجو۔"

"اماں ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا اور اماں کو جا کر بتایا کہ باہر کوئی آدمی آپ کو بلا رہا ہے۔

اماں دروازے پر پہنچیں، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔

اس اجنبی نے امی سے کہا۔ "میں ٹھیکے دار ہوں اور عبدالرحمٰن میرے ہی لیے کام کر رہا تھا۔ وہ کام کرتے ہوئے بہت بلندی سے نیچے گر گیا ہے، وہ اسپتال میں ہے تم چل کر دیکھ لو۔" اماں کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔

وہ گھبرا کر خالہ سعیدہ کے گھر کی طرف جانے لگیں تو ٹھیکے دار نے کچھ نوٹ اماں کی طرف بڑھا دیے اور بولا۔

"ان پیسوں میں عبدالرحمٰن کی دیہاڑی کے علاوہ اس کے علاج کے لیے کچھ رقم بھی ہے۔"

میں بھاگ کر خالہ سعیدہ کو بلا لائی۔ ان کے ساتھ خالو ابراہیم بھی آ گئے، وہ کسی سرکاری دفتر میں چپراسی تھے۔ انہوں نے ٹھیکے دار سے پوچھا۔ "عبدالرحمٰن کس اسپتال میں ہے؟"

"جناح اسپتال میں......؟" ٹھیکے دار نے جواب دیا۔

"ٹھیکے دار صاحب، اصولی طور پر تو آپ کو عبدالرحمٰن کے علاج معالجے کا تمام خرچ اٹھانا چاہیے۔"

"ہاں تو میں نے کب انکار کیا ہے؟" ٹھیکے دار نے جلدی سے کہا۔ "سارا خرچ میں ہی اٹھاؤں گا۔"

اماں اسی وقت خالہ سعیدہ اور خالو کے ساتھ اسپتال چلی گئیں۔

میں ان کے جانے کے بعد بلک بلک کر رونے لگی۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ مجھے ابا سے شدید محبت تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ کل صبح میں بھی اماں کے ساتھ اسپتال جاؤں گی۔

صبح ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی، ایک گھنٹے بعد اماں، خالہ سعیدہ اور خالو لوٹ آئے، وہ لوگ اپنے ساتھ ابا کو بھی لائے تھے، لیکن ابا اب کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں رہے تھے۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے تھے۔

ذرا سی دیر میں ہمارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ میں دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ اماں تو پہلے ہی پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ہمیں روتے دیکھ کر بلال بھی رونے لگا۔ محلے کی عورتیں ہمارے گھر میں جمع ہوگئیں اور وہ مجھے اور اماں کو تسلی دینے لگیں۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ اس ٹھیکے دار نے ابا کے علاج کی ہامی اتنی آسانی سے کیسے بھرلی؟ وہ جانتا تھا کہ ابا اتنے شدید زخمی ہیں کہ اب نہیں بچیں گے، پھر جب زخمی رہے گا ہی نہیں تو اس کا علاج معالجہ کیسا؟

☆......☆

ابا کی موت کے بعد تو غربت اور افلاس کے ساتھ ساتھ فاقے بھی ہمارے اس تنگ و تاریک گھر میں اتر آئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ابا ہمارے لیے کتنا بڑا سہارا تھے۔ ان کی موجودگی میں ہم نے کبھی فاقے نہیں کیے تھے۔ روکھی سوکھی ہی سہی، وہ کم سے کم پیٹ بھر کے کھلا تو دیتے تھے۔

اب اماں بے چاری ہی کو کچھ کرنا تھا۔

ہماری اس کچی آبادی سے کچھ فاصلے پر بڑے بڑے بنگلے تھے، اماں کام کی تلاش میں ان ہی بنگلوں کی طرف نکل گئیں۔

انہیں بنگلوں میں جھاڑو پونچھا اور کپڑے وغیرہ دھونے کا کام مل گیا۔

اماں نے مجھے اسکول سے اٹھا لیا۔ وہ تو بلال کو بھی اٹھانا چاہتی تھیں، لیکن میں نے ہی اس کی مخالفت کی، یوں بلال اسکول میں پڑھتا رہا۔

گھر کی دال روٹی پھر کسی نہ کسی طرح چلنے لگی، بلکہ اب تو ہم کچھ اچھی غذا کھانے لگے۔ اماں بنگلوں میں کام کر کے لوٹنے لگتی تھیں تو کسی نہ کسی بنگلے سے انہیں روٹی سالن، کبھی بریانی اور کبھی کبھی مرغی بھی مل جاتی تھی۔ وہ بچا کچھا کھانا گھر لے آتی تھیں۔

اماں کے جانے کے بعد میں دن بھر گھر میں اکیلی رہتی تھی، میں نے اماں سے کہا۔ "اماں! اس سے تو اچھا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ کام کروں، اس سے آمدنی بڑھے گی تو میں بھی پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے تعلیم حاصل کرلوں گی۔"

اماں پہلے تو ہچکچائیں پھر مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہوگئیں۔

کام پر جاتے ہوئے راستے میں انہوں نے مجھ سے کہا۔ "صائمہ! تو کئی گھروں میں کام کرنے کے بجائے صرف ایک ہی گھر میں کام کرنا، وہ گھرانا بہت اچھا ہے جہاں میں تجھے لے کر جا رہی ہوں۔ ایک بڑی بی ہیں اور ان کے دو بیٹے ہیں، بڑی بی کے شوہر کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور کاروبار اب بڑا بیٹا سنبھالتا ہے۔"

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ کاروبار کون سنبھالتا ہے، مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اب میں بھی چار پیسے کمانے لگوں گی۔

بڑی بی کا گھر کیا تھا محل تھا۔ بڑے بڑے کشادہ کمرے، ان میں بچھے ہوئے دبیز اور خوب صورت قالین کہ پاؤں رکھو تو اندر دھنس جائیں، بہت بڑا لان، ہر کمرے میں ایئر کنڈیشنر، غرض دنیا کی ہر نعمت ان کے پاس تھی۔

بڑی بی انتہائی نرم دل اور شفیق تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ "کوئی اتنی امیر کبیر عورت اتنی نیک بھی ہوسکتی ہے؟"

انہوں نے اماں سے کہا "جوان اور اتنی خوب

صورت بیٹی کو لے کر یوں گھر گھر مت گھوموزینت! آج کل ماحول بہت خراب ہے۔ ویسے تو تمہیں اسے گھر سے لے کر نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں اسے پچاس روپے مہینا، کھانا اور کپڑے دے دوں گی۔‘‘

اماں کی تو باچھیں کھل گئیں، انہوں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ ’’آپ کی بہت مہربانی بیگم صاحبہ! آپ نے مجھ غریب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔‘‘

یوں میں اس گھر میں کام کرنے لگی۔ وہاں کام زیادہ نہیں تھا، گھر میں کل تین ہی تو افراد تھے، مجھے صرف جھاڑ پونچھ کرنا پڑتی تھی۔ کھانا پکانے کے لیے الگ سے ایک خانساماں تھا۔ وہ ابا کی عمر کا ہوگا۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتا تھا۔

میں صبح سویرے گھر پر آجاتی۔ بیگم صاحبہ کے گھر ناشتا کرتی، پھر جھاڑ پونچھ میں مصروف ہوجاتی۔ صبح سے لے کر شام تک تو بڑی بی بالکل اکیلی ہوتی تھیں۔ ان کا بڑا بیٹا عامر نو ساڑھے نو بجے تک دفتر چلا جاتا تھا، چھوٹا بیٹا یاسر انجینئرنگ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ وہ عامر سے بھی پہلے نکل جاتا تھا۔

☆......☆

دونوں لڑکے انتہائی نیک اور شریف تھے، اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ میری طرف تو ان دونوں نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

مجھے کبھی کبھی اپنی توہین کا احساس ہوتا تھا کہ وہ دونوں کیسے مرد ہیں؟ گلی محلے میں تو لڑکے اور اچھے خاصے مرد بھی مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے جیسے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائیں گے۔

لوگوں کے اس رویئے سے مجھے بھی اپنے حسن پر کچھ زیادہ ہی ناز ہوگیا تھا، لیکن یہ عامر اور یاسر نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ ان پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا تھا۔

بیگم صاحبہ کے گھر میں رہنے اور اچھا کھانے سے میرے حسن میں مزید نکھار پیدا ہوگیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے کئی اچھے اچھے جوڑے بھی بنوا دیے تھے۔

زندگی خاصی پرسکون ہوگئی تھی۔ بلال اب بہت دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔ گھر میں اب پہلے جیسی غربت اور تنگ دستی نہیں تھی۔ ہر طرح سے سکون تھا، لیکن مجھے ابھی تک سکون نہیں ملا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ پیسا حاصل کرنا چاہتی تھی۔

میں نے ایک دن بیگم صاحبہ سے کہا۔ ’’بیگم صاحبہ! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنی کتابیں بھی یہاں لے کر آیا کروں؟‘‘

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولیں ’’تم پڑھتی ہو؟‘‘

’’جی ہاں، میں نے آٹھویں کلاس پاس کی ہے، اب سوچ رہی ہوں کہ پرائیویٹ طور پر میٹرک کرلوں۔‘‘

’’یہ تو بہت اچھی بات ہے۔‘‘ بیگم صاحبہ خوش ہوکر بولیں۔ ’’تم اپنی کتابیں شوق سے یہاں لاؤ، بلکہ اگر کوئی کتاب نہ ہو تو مجھے بتانا، میں منگوا دوں گی۔‘‘

میں نے آٹھویں کلاس کا رزلٹ آنے سے پہلے ہی اپنے اسکول کی ایک لڑکی سے پرانا کورس خرید لیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اب مجھے اسکول آنا نصیب نہیں ہوگا۔

اس میں ایک دو کتابیں کم تھیں، میں نے بیگم صاحبہ سے کہا تو وہ بولیں ’’تم ایسا کرو، علی شیر کے ساتھ چلی جاؤ اور تمہیں جو کچھ خریدنا ہے خرید لو۔‘‘ انہوں نے مجھے سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

’’لیکن یہ پیسے......‘‘

’’تمہاری تنخواہ میں سے نہیں کاٹوں گی، یہ تمہارا انعام ہے۔‘‘ وہ مسکرا کر بولیں۔

علی شیر ان کا ڈرائیور تھا۔ وہ نوشہرہ کا رہنے والا تھا۔ لمبا تڑنگا، سرخ سفید اور انتہائی وجیہ نوجوان تھا، میں نے اکثر اسے گاڑی کے پاس دیکھا تھا۔ عامر نے اسے بیگم صاحبہ کے لیے رکھا تھا کہ اگر انہیں کہیں جانے کی ضرورت ہو تو کسی قسم کی پریشانی نہیں۔

میں نے علی شیر کو نزدیک سے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے بھی مجھے گہری نظروں سے دیکھا پھر میرے لیے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا۔

’’کہاں جائیں گی آپ؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’مجھے کچھ کتابیں اور کاپیاں لینا ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

علی شیر نے گردن ہلائی اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کردیا۔ راستے بھر وہ مجھے عقبی آئینے میں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ میں ان میں ڈوبتی جارہی

تھی۔ اس کی گردن پر بکھرے ہوئے بھورے بال انتہائی خوب صورت لگ رہے تھے۔

مارکیٹ پہنچ کر میں نے کتابیں اور کاپیاں خریدیں، ایک پین اور روشنائی بھی خریدی اور واپس گاڑی میں آبیٹھی۔

’’گرمی بہت ہے۔‘‘ علی شیر نے کہا ’’کچھ پئیں گی آپ؟ شربت یا ٹھنڈی بوتل یا......‘‘

’’ہاں پیاس تو مجھے بھی لگ رہی ہے لیکن......‘‘

’’چلیے، میں آپ کو ٹھنڈی بوتل پلاتا ہوں۔‘‘ اس نے مسکرا کر کہا اور گاڑی کولڈ ڈرنک کی ایک دکان کے سامنے روک دی، وہاں سے وہ بھاگ کر دو ٹھنڈی بوتلیں لے آیا، مجھے بوتل دیتے ہوئے اس نے میری آنکھوں میں جھانکا تو میں بالکل ہی پگھل گئی۔

’’کیا نام ہے تمہارا؟‘‘ وہ آپ سے تم پر آگیا۔

’’میرا نام صائمہ ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’صائمہ......! بہت خوب صورت نام ہے، بالکل تمہاری طرح۔‘‘

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، کسی مرد نے پہلی دفعہ میرے حسن کی تعریف کی تھی۔

میں نے جلدی جلدی بوتل ختم کی اور اس سے کہا۔ ’’اب واپس چلو، بیگم صاحبہ پریشان ہورہی ہوں گی۔ ہمیں کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی ہے۔‘‘

میں واپس پہنچی تو بیگم صاحبہ واقعی پریشان تھیں، مجھے دیکھ کر انہوں نے سکون کا سانس لیا اور بولیں۔ ’’میری بھی عقل پر پتھر پڑگئے ہیں کہ میں نے ڈرائیور کے ساتھ تمہیں اکیلا بھیج دیا۔ علی شیر قابل اعتبار لڑکا ہے، لیکن برا وقت کہہ کر نہیں آتا بیٹی!‘‘

’’علی شیر تو بہت شریف آدمی ہے بیگم صاحبہ!‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں، میں نے تمہارے لیے لاؤنج کی ایک الماری خالی کردی ہے، تم اپنی کتابیں اور دوسرا سامان اس الماری میں رکھ دو۔‘‘

☆......☆

اب میں کام کے بعد پڑھنے بھی لگی، لیکن جب سے علی شیر سے ملاقات ہوئی تھی، میری راتوں کی نیند اڑ گئی تھی، علی شیر کا کوارٹر دہیں تھا۔ وہ زیادہ وقت اپنے کوارٹر ہی میں رہتا تھا، صبح یاسر کو کالج چھوڑ کر آتا، پھر چھٹی کے وقت اسے لینے چلا جاتا یا پھر بیگم صاحبہ کو باہر کا کوئی کام ہوتا تو وہ خانساماں کو اس کے ساتھ بھیج دیتی تھیں۔

میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ علی شیر سے ملاقات کروں، لیکن میری ہمت نہ پڑی۔

ایک دن میں کام پر آئی تو پیچھے سے کسی نے مجھے آواز دی۔ ’’صائمہ!‘‘

میں نے چونک کر دیکھا، وہ علی شیر تھا اور بظاہر گاڑی کی صفائی میں مصروف تھا۔

میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہاں اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ میں آہستگی سے اس کے پاس پہنچ گئی۔

’’کیا بات ہے؟‘‘

’’تم تو پھر اس دن کے بعد ملیں ہی نہیں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’میں کیسے مل سکتی ہوں علی شیر!‘‘ میں نے کہا۔ ’’مجھے بیگم صاحبہ سے بہت ڈر لگتا ہے۔‘‘

’’اچھا، آج تم جب چھٹی کے بعد گھر جاؤ گی تو میں تمہیں بنگلے کے باہر ملوں گا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ پھر گاڑی چمکانے میں مصروف ہوگیا، میں تیزی سے اندر چلی گئی۔

میں بار بار خود سے یہی سوال کرتی رہی کہ آخر علی شیر مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ مجھے اس سے نہیں ملنا چاہیے، لیکن پھر میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ ایک دفعہ ملنے میں کیا حرج ہے؟

میں چھٹی کے بعد باہر نکلی تو علی شیر بنگلے سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا، وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور بولا۔ ’’صائمہ، میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے، مجھے پتا نہیں کیا ہوگیا ہے؟‘‘

’’کیسی باتیں کرتے ہو علی شیر!‘‘ میں نے کہا۔ ’’اگر بیگم صاحبہ کو معلوم ہوگیا تو......‘‘

’’تو کیا، وہ زیادہ سے زیادہ مجھے ملازمت سے نکال دیں گی نا؟‘‘ علی شیر نے کہا۔ ’’تو نکال دیں۔‘‘

’’وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں گی علی شیر!‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں بہت غریب لڑکی ہوں اور......‘‘

’’صائمہ! بیگم صاحبہ کو کبھی معلوم نہیں ہوگا۔‘‘ علی شیر نے کہا۔ ’’اور کبھی معلوم ہو بھی گیا تو میں سارا الزام اپنے سر لے لوں گا۔‘‘

اس دوران میں ہم گھر تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے علی شیر سے کہا۔ ''میرا گھر آ گیا ہے۔''

''تم کل مجھے ملو گی صائمہ؟'' علی شیر نے پوچھا۔

''کل کی کل دیکھی جائے گی۔'' میں نے شوخ لہجے میں کہا اور تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

پھر تو میں روز ہی علی شیر سے ملنے لگی، روزانہ کی یہ ملاقاتیں رنگ لائیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

پھر ہم نے ملاقات کا ایک اور ذریعہ تلاش کر لیا۔ میں چھٹی کے بعد بنگلے سے نکلتی اور گھر جانے کے بجائے بنگلے کے عقبی گیٹ پر پہنچ جاتی، وہ دروازہ ہمیشہ بند ہی رہتا تھا، علی شیر اندر سے دروازہ کھول دیتا اور میں خاموشی سے اس کے کوارٹر میں چلی جاتی، پھر ڈھیروں باتیں کرتے۔

علی شیر اپنے گاؤں کی باتیں سناتا، ان پہاڑوں کی کہانیاں سناتا جن میں بھاگتے دوڑتے اس کا بچپن گزرا تھا۔

☆......☆

میں اب پور پور اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے وہاں رہتے ہوئے نویں کا پرائیویٹ امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی۔

اس موقع پر پہلی دفعہ عامر نے مجھے بلایا۔ لاؤنج میں اس وقت بیگم صاحبہ اور یاسر بھی موجود تھے۔

عامر نے مجھے پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا۔

''صائمہ!'' یہ تمہاری محنت کا انعام ہے، اگر تم نے میٹرک بھی اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تو میں تمہیں اپنے دفتر میں جاب دے دوں گا۔''

''بیٹا! یہ جوڑے اور کچھ چیزیں میری طرف سے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔ ''ہاں، آج سے تمہاری تنخواہ بھی سو روپے ہو گئی ہے۔''

مارے خوشی کے میں رونے لگی، میں نے اپنی زندگی میں کبھی یک مشت پانچ سو روپے نہیں دیکھے تھے۔

''رو کیوں رہی ہو بیٹی!'' بیگم صاحبہ نے محبت بھرے انداز میں پوچھا۔

''بیگم صاحبہ! مجھے اپنے ابا یاد آ گئے تھے، آج اگر وہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے؟''

''تمہارا باپ واقعی بہت اچھا آدمی تھا صائمہ!'' بیگم صاحبہ نے کہا۔ ''ورنہ اتنی غربت اور تنگ دستی میں کون اپنی اولاد کو پڑھاتا ہے۔''

اس دن میں مارے خوشی کے علی شیر سے بھی نہیں ملی اور سیدھی گھر پہنچی۔

بیگم صاحبہ کے دیے ہوئے تحائف دیکھ کر اماں بھی خوشی سے نہال ہو گئیں، ان تحائف میں دو تین قیمتی جوڑے بھی تھے، بہت خوب صورت سینڈل تھی، ایک چین تھا، سونے کا چھوٹا سا ایک لاکٹ تھا اور ایک لفافے میں پانچ سو روپے تھے، مٹھائی کا ایک ڈبا بھی تھا۔

میں نے جلدی سے مٹھائی کا ڈبا کھولا اور مٹھائی کا ایک ٹکڑا نکال کر اماں کے منہ میں رکھ دیا۔

اماں کو میرے کپڑوں اور جوتوں سے زیادہ اس نقد رقم کی خوشی تھی جو لفافے میں سے نکلی تھی۔

پانچ سو روپے بھی اس وقت بہت بڑی رقم تھی، مجھے جو پانچ سو روپے عامر نے دیے تھے، میں نے اس کا تذکرہ اماں سے نہیں کیا تھا۔

رات کو میں نے وہ روپے خاموشی سے بلال کو دے دیے اور کہا۔ ''تم اپنے لیے اچھے سے دو چار جوڑے اور جوتے وغیرہ خرید لو، اماں کو مت بتانا۔''

زندگی ایک دم ہی خوب صورت ہو گئی تھی۔ گھر میں ڈھنگ کی چیزیں آ گئی تھیں، روپے پیسے کی بھی اب کوئی تنگی نہیں تھی۔ میں اور بلال دونوں پڑھ بھی رہے تھے۔

☆......☆

مجھے بیگم صاحبہ کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ بیگم صاحبہ اب مجھ پر بہت اعتماد کرنے لگی تھیں۔ میں اب ایک طرح سے ان کی معتمدِ خاص تھی۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے سیف کھولنے کو کہا۔ میں نے سیف کھولا تو میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اس میں زیورات کے کئی سیٹ، چوڑیاں، لاکٹ اور کڑے وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ زیورات کے بہت سے ڈبے بھی تھے۔

ان ہی ڈبوں میں سے بیگم صاحبہ نے زیور کا ایک ڈبا نکالا، اس میں بھی خاصا بھاری سیٹ تھا، وہ ڈبا نکال کر انہوں نے سب بند کرا دیا اور اس کی چابی اپنے کمر بند میں باندھ دی۔ وہ زیورات کا یہ سیٹ خانساماں کو دینا چاہتی تھیں، کیوں کہ اس کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔

میں نے اس کا تذکرہ علی شیر سے کیا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے کہا۔

''صائمہ! اگر تم ہمت کرو تو وہ ساری دولت اور زیورات ہمارے ہو سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''بھئی مطلب صاف ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بڑی بی اتنا زیور اور سونا اپنے ساتھ قبر میں تو نہیں لے جائیں گی۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے دونوں بیٹے اسے بیچ ڈالیں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ......''

''ہاں صائمہ!'' علی شیر نے میری بات کاٹ دی۔ ''میرا یہی مطلب ہے، زیور لے کر ہم دونوں یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے اور شادی کر لیں گے۔''

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اچھی طرح سوچ لو صائمہ! قسمت میں ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔''

میں اس وقت تو خاموشی سے گھر چلی آئی، لیکن میری آنکھوں میں ابھی تک تجوری ہی کا منظر تھا۔ اس وقت بھی ان زیورات کی قیمت لاکھوں میں ہو گی، اس دولت سے میرے تمام خوابوں کو تعبیر مل سکتی تھی، میری بہت سی خواہشات پوری ہو سکتی تھیں، میں جتنا اس پر غور کرتی گئی، میرا ارادہ اتنا ہی پختہ ہوتا گیا۔

انسان کے پاس لاکھوں روپے ہوں تو وہ ان سے جو چاہے خرید سکتا ہے، میں نے سوچا کہ ہم وہ زیورات لے کر ملک بھی چھوڑ دیں گے اور امریکا جا کر وہاں زندگی نئے سرے سے شروع کریں گے۔ ان دنوں امریکا جانا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا آج ہے، وہاں کا ویزا بہت آسانی سے مل جاتا تھا۔

اس کے دوسرے ہی دن ایک واقعہ اور ہوا، عامر دفتر سے واپسی پر آیا تو اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اس نے وہ بریف کیس بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیا اور بولا۔ ''امی! مجھے ایک پارٹی کو پے منٹ کرنا تھی، لیکن ان کا آدمی پرسوں آئے گا۔ میں نے بینک سے رقم نکال لی تھی اس لیے اسے گھر لے آیا، اسے آپ احتیاط سے سیف میں رکھوا دیں'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

بیگم صاحبہ نے مجھے آواز دی اور بولیں۔ ''صائمہ! یہ بیگ ذرا سیف میں رکھ دو۔'' انہوں نے اپنے کمر بند سے چابیوں کا گچھا نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

میں نے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پایا اور سیف کھول کر بریف کیس اس کے نچلے خانے میں رکھ دیا، پھر سیف بند کر کے اس کی چابی بیگم صاحبہ کو لوٹا دی۔

میں گھر جانے سے پہلے علی شیر سے ملی تو نقد رقم کا سن کر تو وہ پاگل ہی ہو گیا۔

''صائمہ! اب تو تمہیں ہمت کرنا ہی ہو گی، دیکھو تقدیر بھی زندگی میں صرف ایک موقع دیتی ہے، اگر یہ موقع گنوا دیا جائے تو پھر زندگی بھر کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے۔''

''لیکن علی شیر......''

''ذرا سوچو صائمہ!'' ہمارے پاس بھی اتنی ہی دولت ہو گی جتنی بیگم صاحبہ کے پاس ہے، ہمارے پاس بھی بہترین گاڑی اور بنگلہ ہو گا، ہمارے بچے بھی شہر کے بہترین اسکولوں میں پڑھیں گے۔ بیگم صاحبہ کو زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ ان کا نقصان تو سال بھر میں پورا ہو جائے گا۔''

''میری ایک شرط ہے علی شیر!'' میں نے کہا۔ ''ہم پھر اس ملک میں نہیں رہیں گے، پکڑے جانے کی صورت میں بیگم صاحبہ سے نظریں نہیں ملا سکوں گی میں۔''

''ارے یہی تو میں بھی چاہتا ہوں جان!'' علی شیر پرجوش لہجے میں بولا۔ ''ہم اس وقت تک کہیں چھپے رہیں گے جب تک ہمارے پاسپورٹ وغیرہ کا بندوبست نہیں ہو جاتا، لانڈھی مل ایریا کے علاقے میں میرا ایک دوست رہتا ہے، ہم کچھ دن اپنے گھر میں رہیں گے پھر ملک سے فرار ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، کل صبح عامر اور یاسر کے جانے کے بعد میں کسی نہ کسی بہانے سے بیگم صاحبہ سے تجوری کی چابیاں لے لوں گی، تم سامنے ہی موجود رہنا، میں تمہیں اشارہ کر دوں گی، تم فوراً اندر آ جانا۔''

علی شیر کے ساتھ پورا منصوبہ طے کرنے کے بعد میں گھر آ گئی۔

رات بھر بے چینی کے باعث مجھے نیند نہیں آئی، میرا ضمیر بار بار مجھے ملامت کر رہا تھا کہ جس گھر سے مجھے اتنی محبت ملی ہے، میں اس گھر کو اجاڑنے جا رہی ہوں۔

بیگم صاحبہ مجھے بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتی ہیں، میں ان کے اعتماد کا خون کرنے جارہی ہوں، لیکن دولت کی ہوس اور علی شیر کی محبت، ان سب خیالات پر غالب آ گئی اور میں نے علی شیر کے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆......☆

میں ان دنوں میٹرک کا امتحان دے چکی تھی اور رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔

میں بنگلے پر ناشتا کرنے کے بعد کام میں مصروف ہوگئی۔

بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا۔ ”صائمہ بیٹا! رات کو عامر کہہ رہا تھا کہ صائمہ میٹرک کرے تو میں اسے اپنی فرم میں ملازمت دے دوں گا، مجھے امید ہے کہ تم وہاں بھی اسی محنت اور دیانت داری سے کام کروگی۔“

”میں پوری کوشش کروں گی۔“ میں نے کہا اور برآمدے میں نکل آئی۔

مجھے گاڑی کے پاس علی شیر نظر آیا، وہ اشارے سے پوچھ رہا تھا کہ ”کیا ہوا؟“ میں نے اسے صبر کرنے کا اشارہ دیا اور اندر آ گئی۔

میں سوچ رہی تھی کہ چابی مانگنے کے لیے بیگم صاحبہ سے کیا بہانہ بناؤں؟

اچانک علی شیر اندر داخل ہوا اور اس کی آنکھوں میں اس وقت نہ جانے کیا تھا کہ میں خوف زدہ ہوگئی۔

”کیا بات ہے علی شیر؟“

بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ ”کیا چھٹی چاہیے؟“

”جی بیگم صاحبہ!“ علی شیر نے کہا۔ ”مجھے چھٹی بھی چاہیے اور تجوری کی چابیاں بھی۔“

”کیا مطلب......؟“ بیگم صاحبہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

”بڑبڑ مت کر بڑھیا؟“ علی شیر نے کہا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔

اس کے ہاتھوں میں چاقو دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔

”سیدھی طرح چابیاں نکال بڑھیا!“ علی شیر نے غرا کر کہا۔ ”ورنہ ابھی تجھے کاٹ کر پھینک دوں گا۔“

بیگم صاحبہ کا چہرہ خوف سے زرد ہوگیا۔ وہ بری طرح کانپنے لگیں اور بولیں ”دفع ہوجاؤ یہاں سے ورنہ میں پولیس کو بلاؤں گی۔“

”چابیاں نکالتی ہے یا نہیں؟“ علی شیر نے چاقو ان کی گردن پر رکھ دیا۔

”صائمہ!وہ شکستہ لہجے میں بولی، پولیس کو فون کرو۔“

”چابیاں دے دیں بیگم صاحبہ!“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ورنہ علی شیر آپ کی جان لے لے گا۔“

”صائمہ! تم چابیاں نکالو۔“ علی شیر نے کہا۔

بیگم صاحبہ نے ہمت کرکے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن علی شیر نے انہیں دھکا دے کر دوبارہ بیڈ پر گرادیا۔ وہ دھان پان سی خاتون تھیں۔ اس کے دھکیلنے سے وہ اس بری طرح گریں کہ ان کا سر بیڈ کی پشت سے ٹکرایا اور وہ ایک طرف لڑھک گئیں۔

میں نے جلدی سے چابیاں نکالیں اور سیف کھول لیا، زیور بھرنے کے لیے علی شیر نے تکیے کا غلاف اتار لیا اور اس میں جلدی جلدی زیورات بھرنے لگا۔ تکیے کا غلاف لبالب بھر گیا لیکن زیورات اب بھی موجود تھے، علی شیر نے دوسرے تکیے کا غلاف بھی اتار لیا اور اس میں زیور بھرنے لگا۔

اس وقت بڑی بی کو پھر ہوش آ گیا۔ وہ بری طرح کراہنے لگیں، علی شیر نے چونک کر انہیں دیکھا، پھر جھنجلا کر چاقو ان کے سینے میں اتار دیا، انہوں نے ایک ہچکی لی اور ان کی گردن ڈھلک گئی۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ میں نے سہم کر پوچھا۔ ”تم نے...... تم نے......“

”جلدی کرو صائمہ!“ علی شیر چیخا۔ ”ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“ اس نے جلدی جلدی دوسرا غلاف بھی بھرا، سیف میں اس بریف کیس کے علاوہ بھی اچھی خاصی نقدی تھی۔

سب کچھ سمیٹنے کے بعد علی شیر وہاں سے نکلا اور ہم لوگ تیزی سے بنگلے سے باہر آ گئے۔

ہم لوگ تیز تیز قدموں سے تھوڑی دور پیدل چلتے رہے، پھر ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی، علی شیر اس میں سوار ہوگیا اور ٹیکسی والے سے صدر چلنے کو کہا۔

صدر پہنچ کر اس نے بوہری بازار سے بڑا سا ایک سوٹ کیس خریدا اور دونوں تکیے کے غلاف اور بریف کیس اس سوٹ کیس میں رکھ دیے، پھر اس نے دوسری ٹیکسی پکڑی اور ہم لوگ وہاں سے لانڈھی کے صنعتی علاقے میں آ گئے۔

☆......☆

صنعتی علاقے کی ایک کچی آبادی میں علی شیر کا دوست رہتا تھا، ٹیکسی ہم نے روڈ پر ہی چھوڑ دی اور پیدل روانہ ہوگئے، یوں بھی ان پتلی پتلی گلیوں میں ٹیکسی داخل نہیں ہوسکتی تھی۔

علی شیر کا دوست گل زمان گھر میں موجود تھا۔ شاید علی شیر نے اسے پہلے ہی اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی، اس لیے وہ اس وقت گھر میں موجود تھا۔

علی شیر نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اس کے گھر والے بھی راضی نہیں تھے اور میرے بھی، اس لیے میں اسے اپنے ساتھ بھگا کر لے آیا ہوں اور کچھ دن یہیں چھپنا چاہتا ہوں۔

گل زمان کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

سیف میں سے نکلنے والی نقدی میں سے علی شیر نے چھ سات ہزار روپے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے، اس نے گل زمان کو پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے لیے بہترین کھانا لے آؤ۔

گل زمان نوٹ لے کر چلا گیا، علی شیر نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پلنگ پر تکیے کے سہارے نیم دراز ہوگیا۔

گل زمان کے اس مکان میں صرف ایک ہی کمرا تھا۔ اس نے کہا کہ تم لوگ آرام سے یہاں رہو، میں اپنے ایک دوست کے گھر جا کر سو جاتا ہوں۔

رات کے کھانے کے بعد گل زمان چلا گیا، علی شیر نے مکان کے دروازے کو اچھی طرح بند کیا، پھر کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد زیورات نکال کر سوٹ کیس میں الٹ دیے، لالٹین کی زرد روشنی میں بھی وہ زیورات دمک رہے تھے، علی شیر ایک ایک زیور کی مالیت کا اندازہ لگا کر اسے الگ رکھتا رہا، پھر اس نے نقد رقم گنی وہ پورے ایک لاکھ چوالیس ہزار تھے۔

میں اس رقم اور زیورات کو سانس روکے دیکھ رہی تھی، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ علی شیر نے کہا ”تقریباً چھ لاکھ روپے کا یہ زیور ہے اور ایک لاکھ چوالیس ہزار یہ ہوگئے تقریباً سات لاکھ چوالیس ہزار!“

میں نے زیورات دوبارہ احتیاط سے تکیے کے غلافوں میں بھر دیے، جو زیورات ڈبوں میں تھے، علی شیر نے ان کے ڈبے وہیں چھوڑ دیے تھے اور زیور نکال کر الگ رکھ لیا تھا۔

زیور رکھنے کے بعد علی شیر نے بریف کیس کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ مقفل تھا، علی شیر باورچی خانے سے سبزی کاٹنے کی چھری لے آیا اور بریف کیس کا تالا توڑ دیا، وہ بریف کیس پانچ پانچ سو کے نوٹوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

وہ نوٹ دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

وہ پچیس لاکھ روپے تھے، علی شیر کے ساتھ ساتھ میری بھی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اتنا روپیہ آج بھی کافی وقعت رکھتا ہے، اس زمانے میں تو لکھ پتی ہونا بہت دولت مندی کی نشانی تھی۔ بڑے بڑے افسروں اور اہل کاروں کی تنخواہیں چار ہندسوں میں ہوا کرتی تھیں وہ بھی ابتدائی چار ہندسے! اتنی نہیں ہوتی تھی کہ اس میں دو چار، یا دس بیس ہزار ملانے سے وہ پانچ ہندسوں میں ہوجائے۔

اس زمانے میں میڈیا بھی اتنا برق رفتار نہیں تھا، آج تو کہیں کسی کا معمولی سا جھگڑا بھی ہوجاتا ہے تو خبر فوراً چینل پر آ جاتی ہے۔

ہمیں دوسرے دن کے اخبار سے علم ہوا کہ ہمارے بعد کیا واقعات پیش آئے تھے، وہ اخبارات بھی گل زمان لے کر آیا تھا، علی شیر تو زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، اس لیے سارے اخبارات میں نے ہی دیکھے تھے۔ ان میں بڑی بڑی سرخیاں تھیں ”مالدار بیوہ کو بے دردی سے قتل کردیا گیا۔“ دولت نے ایک بوڑھی، نیک دل خاتون کی جان لے لی۔ وغیرہ وغیرہ......

خبر کی تفصیل کچھ یوں تھی کہ ناہید بیگم اپنے دو بیٹوں عامر اور یاسر کے ساتھ اس وسیع و عریض بنگلے میں رہتی تھیں۔ انہیں پہلے زدوکوب کیا گیا پھر چاقو مار کے ہلاک کردیا گیا۔ مقتولہ کا سیف کھلا ہوا ملا ہے، اس میں کچھ بھی نہیں ہے، عامر خان کا ایکسپورٹ اور امپورٹ کا خاصا بڑا بزنس ہے، وہ گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس، دوائیں

اور مشینری امپورٹ کرتے ہیں۔ انہوں نے پولیس کو بتایا کہ ان کی والدہ کی تجوری میں تقریباً چھ لاکھ روپے کی مالیت کے زیورات تھے، خاصی نقدی بھی تھی، لیکن اس کے بارے میں وہ حتمی طور پر نہیں بتا سکتے۔ گھر کی ملازمہ اور ڈرائیور غائب ہیں، پولیس کو ان ہی دو افراد پر شک ہے اور ان دونوں ملازمین کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔

ایک دوسرے اخبار کی خبر تھی کہ پولیس نے مبینہ ملزمہ صائمہ کی ماں اور بھائی کو حراست میں لے لیا ہے اور ان سے تفتیش کر رہی ہے۔

یہ خبر پڑھ کر میں بے چین ہو گئی، میں نے علی شیر سے کہا۔ ''پولیس نے اماں اور بلال کو گرفتار کر لیا ہے...... میں...... میں واپس جاؤں گی۔''

''پاگل مت بنو صائمہ!'' علی شیر نے کہا۔ ''پولیس ان لوگوں کو تو پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دے گی لیکن تمہیں قتل اور ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کرے گی اور پھانسی پر لٹکا دے گی۔''

''بیگم صاحبہ کو میں نے تو قتل نہیں کیا ہے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''تم بھی اس واردات میں برابر کی شریک ہو، تمہارے یہ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ تم نے بیگم صاحبہ کا قتل نہیں کیا ہے۔''

میں نے بری طرح روتے ہوئے کہا۔ ''پھر میں...... کیا کروں......؟ کیا کروں میں؟''

''ذرا حوصلے سے کام لو صائمہ!'' علی شیر نے کہا۔ ''ہم نے جان خطرے میں ڈال کر یہ کام کیا ہے، تمہاری بزدلی سے سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، میں رو دھو کر خاموش ہو گئی۔

''بس، اب تو ہمیں کسی نہ کسی طرح پولیس سے بچنا ہے۔''

''اچھا ہے۔''

''پاسپورٹ اتنی آسانی سے نہیں بنتا صائمہ!'' علی شیر نے کہا۔ ''اگر پیسے خرچ کر کے پاسپورٹ بنوایا بھی جائے تو اس کے لیے ہم دونوں کو باہر نکلنا ہو گا اور باہر نکلنے کا مطلب ہے کہ گرفتاری اور جیل؟''

''پھر...... پھر کیا سوچا ہے تم نے؟'' میں نے کہا۔

''جب تک یہ معاملہ گرم ہے، ہمیں اس وقت تک یہیں چھپنا ہو گا، پھر موقع ملے گا تو ہم علاقہ غیر کی طرف نکل جائیں گے۔''

''علاقہ غیر کی طرف؟'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ میں نے پڑھا تو تھا کہ صوبہ سرحد سے آگے کوئی علاقہ ایسا ہے جو علاقہ غیر کہلاتا ہے، لیکن اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔

''ہاں، علاقہ غیر!'' علی شیر نے کہا۔ ''بس ہم ایک دفعہ وہاں پہنچ جائیں، پھر پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

''کیوں، وہ علاقہ پاکستان میں نہیں ہے؟''

''پاکستان میں شامل ہے، لیکن وہاں ان کا اپنا قانون چلتا ہے۔ پاکستان کی پولیس وہاں نہیں جا سکتی، اس وقت بھی بہت سے ایسے لوگ وہاں موجود ہیں جو قانون سے بچ کر وہاں پہنچے ہیں اور ان لوگوں کو علاقہ غیر میں پناہ مل گئی ہے۔''

''تو کیا ہم زندگی بھر اسی پہاڑی علاقے میں رہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھئی، وہاں جا کر ہم پاسپورٹ بھی آسانی سے بنوا لیں گے اور ہمارا ملک سے فرار ہونا بھی آسان ہو گا۔'' علی شیر نے کہا۔

میں مطمئن ہو گئی۔ وہ سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا اور علاقہ غیر کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

☆......☆

دوسرا دن بھی ہمیں وہیں گل زمان کے مکان میں چھپے ہوئے گزر گیا، اب علی شیر کے کہنے پر گل زمان گھر میں باہر سے تالا ڈال دیتا تھا تا کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ ہم بھی بات چیت کرنے اور چلنے پھرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ وہ تو اچھا تھا کہ سردیوں کا زمانہ تھا ورنہ ٹین کی چھت والے اس کمرے میں شاید میں دم گھٹ کر مر جاتی۔ ہمارا مکان بھی کچی آبادی میں تھا، لیکن ہمارا علاقہ اس بستی سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ وہاں بجلی و پانی کی سہولت تھی، کچھ گھروں میں بجلی کے پنکھے بھی موجود تھے۔ یہ تو کچھ زیادہ ہی پسماندہ بستی تھی، پتلی پتلی تنگ و تاریک گلیاں جن میں تعفن زدہ پانی رستا رہتا تھا، چھوٹے چھوٹے ڈربے نما مکانات تھے، جہاں نہ بجلی تھی نہ پانی تھا۔

گل زمان ہماری ہر طرح سے مدد کر رہا تھا، وہ ہمیں کھانا پہنچاتا تھا، ہمارے لیے پانی بھر کے لاتا تھا اور اخبارات لاتا تھا۔

اس گھٹن زدہ تعفن ماحول میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں برسوں سے اس تنگ و تاریک کمرے میں قید ہوں۔

میں جب سے فرار ہوئی تھی، میں نے کپڑے نہیں بدلے تھے، کپڑے تھے ہی نہیں تو بدلتی کہاں سے؟ کپڑے بدلنا تو دور کی بات ہے میں تو نہائی بھی نہیں تھی۔

میں نے ایک دن علی شیر سے کہا۔ ''گل زمان سے کہہ کر میرے لیے ریڈی میڈ کپڑوں کا ایک جوڑا تو منگا لو۔''

''ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں، میرے کپڑے بھی بہت میلے ہو رہے ہیں، میں کل ہی گل زمان کو صدر بھیج کر اپنے اور تمہارے لیے کچھ جوڑے منگا لیتا ہوں، ایسا کرو، تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہے، گل زمان کو ایک پرچے پر لکھ کر دے دو، وہ پڑھا لکھا نہیں ہے، لیکن دکاندار تو پڑھنا جانتا ہو گا، گل زمان کہہ دے گا کہ میں کسی بنگلے پر ملازم ہوں، وہاں کے لیے یہ سامان لے کر جا رہا ہوں۔''

دوسرے دن میں نے گل زمان کو سامان کی لسٹ دے دی۔ اس میں ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، کنگھے، صابن، شیمپو، پرفیوم وغیرہ سب کچھ تھا۔ شام تک گل زمان وہ سامان لے آیا اس زمانے میں ریڈی میڈ کپڑے آج کل کی طرح عام نہیں تھے، لیکن صدر میں مل جاتے تھے۔ وہ کپڑے میرے جسم پر کچھ ڈھیلے تھے، لیکن کام چل سکتا تھا۔ اس دن میں نے خوشامد کر کے گل زمان سے نہانے کے لیے پانی بھی منگوا لیا۔

نہا دھو کر جب میں نے صاف ستھرے کپڑے پہنے تو مجھے ایسا لگا جیسے مجھ میں نئی زندگی آ گئی ہو۔

گل زمان اخبارات بھی لایا تھا، بیگم صاحبہ کے قتل کی خبر ابھی تک اخباروں میں تھی، کراچی جیسے شہروں میں ایسی وارداتیں کبھی کبھار ہی ہوتی تھیں، اس لیے اخبارات بھی ایسی خبروں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

پولیس نے علی شیر کے کوارٹر کی تلاشی لی تھی اور اسے وہاں سے کچھ سراغ ملا تھا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں ایک اور دھماکا خیز خبر تھی، پولیس نے ''سن رائز انٹر پرائزز'' کے مالک اور معروف بزنس مین عامر خان کو گرفتار کر لیا تھا۔

پہلے تو میں نے اس خبر پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اچانک میری نظر عامر کے فوٹو پر پڑی تو میں سکتے میں رہ گئی۔ یہ بیگم صاحبہ کا بڑا بیٹا عامر تھا۔ تفصیلات کے مطابق عامر علی ایکسپورٹ، امپورٹ کی آڑ میں منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ میں ملوث تھا، خبر کے آخر میں تھا کہ واضح رہے کہ یہ وہی عامر خان ہے جس کی والدہ کو ایک ہفتہ پہلے قتل کر دیا گیا تھا۔

میں نے وہ خبر علی شیر کو سنائی تو وہ بھی حیران رہ گیا۔

''اب میں سمجھا!'' علی شیر نے کہا۔ ''عامر صاحب نے نوٹوں سے بھرے ہوئے اس بریف کیس کی رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی؟ وہ پیسا ضرور غیر قانونی ہو گا۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ سونے کی اسمگلنگ بھی کرتا تھا۔''

''وہ چور ہیں یا ڈاکو!'' علی شیر نے کہا۔ ''اس سے ہمیں کیا فرق پڑے گا۔''

''ہاں، اس سے ہمیں کیا فرق پڑنے والا تھا۔''

مزید ایک ہفتہ گزرنے والا تھا، اس وقت تک معاملہ خاصا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اب تو اخباروں میں بھی اس واردات کے بارے میں کچھ شائع نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے ایک دن علی شیر کی خوشامد کی کہ تم گل زمان یا کسی اور آدمی کو ہمارے محلے میں بھیج کر اماں اور بلال کی خیریت تو معلوم کر ہی سکتے ہو؟

پہلے تو وہ راضی نہ ہوا لیکن جب میں رونے لگی تو اس کا دل بھی پسیج گیا، اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں گل زمان کو تمہارے محلے بھیجوں گا، وہ وہاں سے ساری معلومات کر کے لے آئے گا۔

دوسرے دن شام کو گل زمان آیا اور اس نے بتایا کہ پولیس نے اماں اور بلال سے دو دن تفتیش کرنے کے بعد انہیں چھوڑ دیا تھا، اماں بے چاری کو تو معلوم ہی نہیں تھا تو وہ پولیس کو کیا بتاتیں، پولیس نے بلال پر بہت تشدد کیا تھا، لیکن وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اب اماں اور بلال گھر پر تھے۔

یہ سن کر مجھے بہت سکون ملا، میں تو ان کو کچھ پیسے بھی بھیجنا چاہتی تھی لیکن علی شیر نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم بعد میں منی آرڈر کے ذریعے اماں کو پیسے بھیج دیں گے۔ ابھی انہیں پیسے بھیجنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

ایک دن علی شیر نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے گل زمان سے ایک برقع منگوالیا۔ ہمیں وہاں سے فرار ہوئے چوبیس دن ہو چکے تھے۔ اس دوران میں علی شیر کی شیو اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ پہلی نظر میں پہچانا ہی نہ جاتا تھا اس نے سیفٹی ریزر لے کر خود ہی اپنا خط بنا لیا تھا اور اب اس کے چہرے پر باقاعدہ داڑھی نظر آرہی تھی۔ گھیر دار شلوار قمیص اور واسکٹ کے ساتھ سر پر سرحدی علاقے والوں کی مخصوص ٹوپی اور پشاوری چپل پہن کر تو اس کا حلیہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔

ہم دونوں رات کے وقت اس آبادی سے باہر نکل آئے۔ علی شیر نے گل زمان کو اس خدمت کے عوض پانچ ہزار روپے دیے تو وہ کھل اٹھا۔ وہ بس ہمیں باہر چھوڑنے آیا تھا اور اس کے ہاتھوں میں وہ سوٹ کیس تھا جس میں ہمارے کپڑوں کے علاوہ تقریباً بیس لاکھ روپے، زیورات اور نقد رقم کی صورت میں موجود تھے، لیکن گل زمان کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہیں تھا ورنہ اس کی نیت خراب ہوتے کتنی دیر لگتی۔ اسے تو صرف یہ معلوم تھا کہ علی شیر مجھے بھگا کر لایا ہے اور اب پولیس کے خوف سے یہاں چھپا ہوا ہے، علی شیر نے گل زمان کو بتایا تھا کہ اس نے فرار ہونے سے پہلے اپنی جمع پونجی بھی نکال لی تھی، وہی پیسا اس کے کام آرہا ہے۔

کچھ راستہ پیدل چلنے کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی، علی شیر، گل زمان سے گلے مل کر ٹیکسی میں سوار ہو گیا، میں پہلے سے ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔

علی شیر یہاں سے ایک مرتبہ پھر صدر پہنچا اور وہاں ٹیکسی چھوڑنے کے بعد دوسری ٹیکسی پکڑی اور اس سے کینٹ اسٹیشن چلنے کو کہا۔

ٹیکسی والے نے میٹر سے دو روپے زیادہ لے کر ہمیں کینٹ اسٹیشن پہنچا دیا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پشاور جانے والی گاڑی تو کب کی جا چکی ہے، اس وقت پنڈی اور لاہور کے لیے بھی کوئی ٹرین نہیں تھی، البتہ ایک پسنجر ٹرین حیدرآباد اور میرپور خاص جا رہی تھی، علی شیر نے حیدرآباد ہی کے ٹکٹ خرید لیے اور ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔

ٹرین آنے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ ان دنوں ایک اچھی بات یہ تھی کہ سب ٹرینیں وقت پر چلتی تھیں۔ کبھی آدھا، پون گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی تھی تو مسافر پریشان ہو جاتے تھے۔

ہم پلیٹ فارم پر آ کر کسی قدر تاریکی میں ایک بینچ پر بیٹھ گئے، اس وقت اسٹیشن پر بہت کم مسافر تھے، گنتی کے جو چند مسافر تھے، وہ بھی شاید اس پسنجر ٹرین کے انتظار میں تھے۔

مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی کیوں کہ ہم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

میں نے علی شیر سے کھانا لانے کو کہا تو وہ بولا "اسٹیشن پر تو اس وقت تو چائے بسکٹ اور پیسٹری وغیرہ ہی ملے گی، میں وہی لے آتا ہوں، کھانے کے لیے مجھے اسٹیشن سے باہر جانا پڑے گا۔ میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا، پھر تمہارے پاس یہ سوٹ کیس بھی تو ہے۔"

"پھر تم یہیں سے کچھ لے آؤ۔" میں نے کہا۔

وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر چائے کا ایک اسٹال تھا، علی شیر وہیں سے باسی بسکٹ، کیک پیس اور چائے وغیرہ لے آیا ہر چیز بدمزہ تھی، لیکن پیٹ تو بھرنا ہی تھا۔

آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر مسافروں کی تعداد بڑھ رہی تھی، لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی جو دن کے وقت ہوتی ہے۔

اچانک میں نے دیکھا کہ دو پولیس والے ہر مسافر کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے آرہے ہیں۔

پولیس والوں کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے، میں نے علی شیر سے کہا۔ "دو پولیس والے ہماری طرف آرہے ہیں۔"

"ہاں، میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن تم گھبراؤ مت اب تک تو پولیس بھی اس واردات کو بھول چکی ہے۔"

پولیس والے آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھے اور ہمیں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

اچانک علی شیر مجھ پر پشتو میں چیخنے چلانے لگا۔ ایسا

لگ رہا تھا جیسے اسے کسی بات پر شدید غصہ آ گیا ہو، میں اس کے جواب صرف ہوں، ہوں کر رہی تھی، میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آرہا تھا۔

"کیا بات ہے خان صاحب!" ایک پولیس والے نے پوچھا۔ "اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟"

"یہ امارا بی بی اے، ہم غصہ کرنے یا ہنسے، تم لوگ کیوں پوچھتا اے؟" علی شیر نے سرحدی علاقے کی طرح بگڑی اردو میں کہا، حالاں کہ وہ بہت صاف اور اچھی اردو بولتا تھا۔

"او یار! تم تو ہم پر ہی ناراض ہونے لگا۔" دوسرا پولیس والا ہنس کر بولا۔

"تو پھر امارے گھر کے معاملے میں دخل مت دیو۔" علی شیر نے اکھڑ مزاجی سے کہا اور ایک مرتبہ پھر مجھ سے پشتو میں مخاطب ہو گیا۔

پولیس والے ہنستے ہوئے چلے گئے، ان میں سے ایک بولا۔ "او چھڈ یار! اے تے بالکل الٹی کھوپڑی کا بندہ ہے۔" ان کے جانے کے بعد علی شیر ہنس کر بولا۔

"کیسا رہا؟ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس برقع میں ایک خوب صورت لڑکی چھپی ہوئی ہے جو پشتو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتی۔"

میں بھی علی شیر کی ذہانت پر ہنسنے لگی۔

وہ مسکرا کر بولا۔ "بس یہ ترکیب اچانک ہی مجھے سوجھ گئی۔ اگر پولیس والوں کو کسی بھی قسم کا شک بھی ہوگا تو اب دور ہو گیا ہوگا۔"

علی شیر بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ریلوے کے ایک ملازم سے پوچھا۔ "بھائی صاحب! یہ ابھی تک حیدرآباد کا گاڑی کیوں نہیں آیا؟"

"گاڑی پندرہ منٹ لیٹ ہے خان صاحب!" اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

ابھی ہم پوری طرح سکون کا سانس لینے بھی نہیں پائے تھے کہ وہاں مجھے اچانک پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی نظر آئے، وہ خاص طور پر لوگوں سے کچھ پوچھ رہے تھے۔

اس دفعہ علی شیر بھی پریشان ہو گیا، وہ آہستہ سے بولا۔ "صائمہ! لگتا ہے ان لوگوں کو کسی کی تلاش ہے۔"

"پھر......؟" میں گھبرا کر بولی۔

"پریشان مت ہو۔" اس نے مجھے تسلی دی اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگا لی۔

"تم سگریٹ کب سے پینے لگے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی سے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

اس وقت تک پولیس والے ہمارے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

اتفاق سے پولیس کا سب انسپکٹر بھی سرحدی علاقے کا تھا۔ اس نے علی شیر سے پشتو میں کچھ کہا، علی شیر نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "گل زمان!" شاید انسپکٹر نے اس کا نام پوچھا تھا۔

علی شیر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بخت بی بی!"

انسپکٹر نے براہ راست مجھ سے کچھ پشتو میں پوچھا۔

"میں خاموش رہی۔"

علی شیر نے پشتو میں کچھ کہا جو سب انسپکٹر تو سمجھ گیا لیکن اس کے ساتھ آنے والا حوالدار نہیں سمجھا۔

وہ مجھ سے بولا۔ "بی بی، نام کیا ہے تمہارا؟"

"یہ بے چاری گونگی ہے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"صاحب جی! وہ بکنگ کلرک تو بتا رہا تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی اس کے سامنے باتیں کر رہے تھے، سب انسپکٹر نے چونک کر علی شیر کی طرف دیکھا، پھر پشتو کے بجائے اردو میں بولا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں حیدرآباد جا رہا ہوں۔" علی شیر نے گویا جھلا کر کہا۔

"پہلے تم نے پشاور کی ٹرین کے بارے میں معلوم کیا، پھر پنڈی اور لاہور کی ٹرینوں کے بارے میں پوچھا، جب تمہیں یہ معلوم ہوا کہ اس وقت صرف ایک پسنجر ٹرین حیدرآباد جائے گی تو تم نے اس کا ٹکٹ خرید لیا، کیوں؟" سب انسپکٹر کا لہجہ سخت تھا۔

"جناب عالی! کیا حیدرآباد جانا جرم ہے یا دوسری ٹرینوں کا ٹائم پوچھنا جرم ہے؟" علی شیر بہت اعتماد سے بول رہا تھا، البتہ سردی کے باوجود میں پسینا پسینا ہو رہی تھی۔

"تمہارے انداز سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم فوری

طور پر کراچی سے جانا چاہتے ہو، ایسی کیا ایمرجنسی ہے؟''
''مجھے جانا تو مردان ہے۔'' علی شیر نے کہا لیکن حیدرآباد میں میرا ایک دوست رہتا ہے، میں نے سوچا کہ اس سے میں ملاقات کرتا جاؤں۔''
''تم مردان میں رہتے ہو؟'' سب انسپکٹر نے پوچھا۔
''جی ہاں، میں مردان میں رہتا ہوں، کراچی اپنے ایک دوست کے پاس آیا تھا۔''
''اس سے پہلے کب کراچی آئے تھے؟'' انسپکٹر مسلسل جرح کر رہا تھا۔
''میں تمباکو کی تجارت کرتا ہوں اس لیے اکثر کراچی، حیدرآباد لاہور آتا رہتا ہوں۔'' علی شیر جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔
''اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ پشاور کی گاڑی کس وقت یہاں سے جاتی ہے؟''
''معلوم ہے جناب...... بس اس دفعہ کچھ دیر ہوگئی۔''
''اس سوٹ کیس میں کیا ہے۔'' سب انسپکٹر نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔
''ہمارے کپڑے ہیں صاحب!'' علی شیر آہستہ آہستہ اعتماد کر رہا تھا۔
''اسے کھولو۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔
یہ سن کر مجھے چکر سا آ گیا۔ سوٹ کیس کھلتے ہی پولیس والوں کو معلوم ہو جاتا کہ اس میں لاکھوں روپے کی نقد رقم اور زیورات ہیں۔
''یہ تمہاری بیوی ہے؟'' سب انسپکٹر نے پوچھا۔
''جی ہاں صاحب!'' علی شیر نے جواب دیا لیکن اب ان کا لہجہ کھوکھلا تھا۔
''یہ بھی مردان کی رہنے والی ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں صاحب! یہ تو کراچی کی رہنے والی ہے؟''
''اس سوٹ کیس کو کھولو۔'' اس مرتبہ سب انسپکٹر کا لہجہ بہت درشت تھا۔
''لاؤ چابی دو۔'' علی شیر نے شکستہ لہجے میں مجھ سے کہا۔
''چابی تو تمہارے ہی پاس ہے۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔
علی شیر نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اس نے چابی نکال کر سوٹ کیس کھولنے کی کوشش کی لیکن گھبراہٹ میں چابی نہیں لگ رہی تھی۔
سب انسپکٹر نے خود اس سے چابی لے کر سوٹ کیس کھول دیا۔ پھر اس نے اپنے ایک ماتحت سے ٹارچ مانگی کیوں کہ روشنی وہاں ناکافی تھی۔ اس نے اوپر کے کپڑے ہٹا کر اندر نظر ڈالی اور چیخ کر بولا۔
''گرفتار کرلو ان دونوں کو۔''
ایک پولیس والے نے جھپٹ کر علی شیر کو پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اس نے مجھ سے کہا۔
''بی بی! اگر تم بھاگنے کی کوشش کرو گی تو بھاگ نہیں سکو گی۔ ہمارے ساتھ اس وقت لیڈی پولیس نہیں ہے ورنہ تمہیں بھی ہتھکڑی لگا دیتے، چلو اٹھو۔''
میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے میری ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی ہو۔ میں بمشکل تمام اٹھ کر کھڑی ہوئی اور گرتی پڑتی ان لوگوں کے ساتھ چلنے لگی۔
سب انسپکٹر علی شیر سے کہہ رہا تھا ''تم اگر بکنگ کلرک سے ساری گاڑیوں کے بارے میں نہ پوچھتے تو اسے ذرا بھی شک نہیں ہوتا، لیکن تمہاری گھبراہٹ اور جلد بازی دیکھ کر اس نے ہمیں اطلاع دے دی۔ ہم نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ ایسے جوڑوں پر نظر رکھے جو تنہا ہوں یعنی ان دونوں کے سوا ان کے ساتھ کوئی نہ ہو۔
وہ لوگ ہمیں ٹیکسی میں بٹھا کر پولیس اسٹیشن لے گئے۔ اب پکڑے ہی گئے تھے تو جھوٹ بولنا فضول تھا۔
میں نے پولیس کو اپنا بیان دیا تو شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ میرا بیان لینے کے فوراً بعد پولیس والوں نے مجھے جیل بھیج دیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ پولیس کی حراست میں عورتوں کو نہیں رکھا جاتا، انہیں فوراً جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پھر پولیس نے علی شیر کا کیا حشر کیا۔
میں نے تو جیل میں تین دن تک شدید اذیت برداشت کی، وہاں کی زنانہ پولیس بھی مردوں سے زیادہ سخت اور بدنام تھی۔
پھر ایک سال تک کیس چلتا رہا۔
مجھ سے ملنے نہ اماں آئیں، نہ بلال آیا، میں نے انہیں بلوایا تھا، لیکن انہوں نے کہہ دیا کہ میری کوئی

بیٹی نہیں ہے، صائمہ تو اسی روز مر گئی تھی جس روز بیگم صاحبہ کا قتل ہوا تھا۔
وکیل بھی مجھے سرکار کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔ وہ بہت ذہین اور اچھا آدمی تھا۔ اس نے جج کو قائل کر لیا تھا کہ اصل قصوروار علی شیر ہے، اس نے صائمہ کو ورغلایا بلکہ زبردستی اس سے یہ کام کروایا، اس نے بیگم صاحبہ کو قتل بھی کیا، ان کے سینے میں جو چاقو پیوست تھا، اس پر علی شیر کی انگلیوں کے نشانات تھے۔
عدالت نے علی شیر کو عمر قید اور مجھے اعانتِ جرم میں سات سال کی قید بامشقت سزا سنادی۔
اخباروں نے اس خبر کو بھی بہت اُچھالا لیکن اماں پھر بھی نہ آئیں۔
میرے فرار ہونے کے بعد میٹرک کا رزلٹ بھی آ گیا تھا۔ میں میٹرک میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی تھی۔
میں قیدی عورتوں میں پڑھی لکھی تھی اس لیے جیل کے عملے نے مجھے لکھنے پڑھنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ میرا طرزِ عمل جیل میں بہت اچھا رہا تھا اس لیے میں سات سال کے بجائے ساڑھے پانچ سال ہی میں رہا ہو گئی تھی۔
رہا ہونے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں؟
پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کسی بنگلے میں جھاڑو، برتن کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔
میں پیدل ہی اک طرف روانہ ہو گئی۔
اچانک ایک موٹر سائیکل میرے نزدیک آ کر رکی۔
میں نے حیرت سے موٹر سائیکل سوار کو دیکھا اور پہلی ہی نظر میں اسے پہچان گئی...... وہ سرکاری وکیل اعجاز احمد تھا، جس نے میرا مقدمہ لڑا تھا اور مجھے کم سے کم سزا ہوئی تھی۔
میں نے جلدی سے اسے سلام کیا۔
اس نے پوچھا۔ ''مس صائمہ! کیسی ہیں آپ؟''
''مس صائمہ!'' میں نے تلخ لہجے میں دہرایا۔
''ایک سزا یافتہ عورت اتنی عزت کے قابل کب ہوتی ہے وکیل صاحب!''
''تم نے جو گناہ کیا تھا، اس کی سزا بھگت چکی ہو، اب تو تم قابلِ عزت ہو، کہاں جا رہی ہو؟''
''کسی ٹھکانے کی تلاش میں۔'' میں نے جواب دیا۔
''اگر مجھ پر اعتماد ہے تو میرے ساتھ چلو۔''
مجھے تو اس وقت معمولی سا سہارا بھی بہت تھا، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو گئی۔
اعجاز وہاں سے مجھے شاہ فیصل کالونی لے گیا۔ وہ ان دنوں وہیں رہتا تھا۔
اس نے مجھے اپنی ماں سے ملوایا۔ اس کی والدہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔
پھر شاید اللہ نے بھی مجھے معاف کر دیا تھا، اس کے بعد میری زندگی میں کبھی خزاں نہیں آئی۔
میں آج مسز اعجاز ہوں، ہم اب ڈیفنس کے ایک بنگلے میں رہتے ہیں۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے، میں بیٹی کی شادی کر چکی ہوں اور دونوں بیٹے امریکا میں پڑھ رہے ہیں۔
اعجاز نے بعد میں اپنی محنت اور صلاحیت سے اتنی ترقی کی کہ ہائی کورٹ کے جسٹس کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔
بس میرے سینے میں ایک ہی خلش ہے کہ اماں نے اس کے بعد کبھی میری شکل نہ دیکھی، میں نے ایک دفعہ ان سے ملنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن انہوں نے مجھے بری طرح دھتکار دیا۔
اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں، بلال بھی مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں گریڈ سترہ کا ملازم ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے اور مجھے معاف فرمائے کہ بیگم صاحبہ کا قتل ابھی تک ذہن پر سوار ہے میرے۔ حالاں کہ میں نے انہیں قتل نہیں کیا اور ایسا سوچا بھی نہیں تھا، اس کے باوجود میں ان کی امانت میں خیانت کی گنہگار تو ہوں۔
میں نے اپنے دل کا بوجھ اعتراف کی صورت کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔ شاید اس طرح مجھے کچھ قرار آ جائے۔

☆......☆

تیسری سچ بیانی

ایک ہی راستہ

مریم شاہ بخاری

سرگودھا سے، ایک معصوم بچی کے انتقام کی جاگتی کہانی



یہ میری بیٹی سارہ ہے...... بیگم شہباز اعوان نے نہایت محبت سے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے اپنی سہیلی بیگم مصطفیٰ کمال سے متعارف کروایا تھا۔ دونوں خواتین کے ہونٹوں پر تبسم بکھرا ہوا تھا، جب کہ بیگم شہباز اعوان کی بانہوں میں مقید ننھی سارہ کو اس پل بہت حیرت ہو رہی تھی...... آخر یہ عنایت آج کس لیے......؟ اس کے دل و دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ وہ حال سے ماضی میں پہنچ گئی۔ اسے ایک پل لگا تھا کہ جیسے بیگم شہباز اعوان کی بانہوں سے نکلنے میں...... اُس کے چہرے پر اس قدر نفرت کے آثار تھے کہ بیگم مصطفیٰ کمال بھی ٹھٹک گئیں...... میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں...... نہیں ہوں آپ کی بیٹی...... سُنا آپ نے...... وہ زور سے چلائی اور وہاں سے دوڑ کر باہر نکل گئی۔ بیگم مصطفیٰ کمال نے حیرت سے اپنی دوست کو دیکھا تھا، جس کے چہرے پہ اذیت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ دیکھا تم نے...... میں اس سے جس قدر قریب ہونا چاہتی ہوں، یہ اس قدر ہی مجھ سے دور ہوتی جاتی ہے۔ اس کا رویہ مجھے بہت تکلیف دیتا ہے...... بیگم شہباز کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ بیگم مصطفیٰ کمال اپنی جگہ سے اُٹھ کر بیگم شہباز اعوان کے پاس آ گئیں...... حوصلہ رکھ...... خود ہی سنبھل جائے گی...... بچی ہے نا...... شاید ابھی اس پر صدمے کے اثرات باقی ہیں، ٹھیک ہو جائے گی...... وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولی تھیں...... ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... بیگم شہباز اعوان نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی سے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

☆......☆

قریبی مسجد سے مغرب کی اذان کی صدائیں بلند ہوئیں تو گورکن رحمان بابا نے بھی قبرستان کے بیرونی گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ابھی وہ گیٹ سے چند قدم دور ہی تھے کہ ان کے کانوں میں رونے کی آواز پڑی۔ انہوں نے آواز کے تعاقب میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو بیرونی گیٹ کے دائیں جانب دو پختہ قبروں کے بیچ ایک چھوٹی سی بچی انہیں روتی ہوئی نظر آئی۔ اُس کی عمر تقریباً دس برس کے قریب تھی۔ اپنے لباس سے وہ کسی اچھے خاندان سے لگ رہی تھی، رحمان بابا حیرانی اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات لیے اس کی طرف بڑھے تھے...... بیٹی شام ہو گئی ہے...... گھر نہیں جاؤ گی، دیکھو تو اندھیرا پھیل رہا ہے...... رحمان بابا کی پکار پر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا، اُس کی آنکھوں میں عجیب خالی پن سا تھا...... کسی کو کھو دینے کا دکھ اس کی

آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ کیا بات ہے بیٹی؟ تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ رحمان بابا کے شفقت بھرے انداز سے اس کی وحشت میں ذرا کمی ہوئی تھی۔ سارہ...... وہ مختصر سا بولی تھی...... ارے یہ نام تو بہت پیارا ہے بالکل آپ کی ہی طرح...... اچھا اب بتاؤ آپ کے بابا کا کیا نام ہے؟ شہباز اعوان...... ایک بار پھر مختصر سا جواب ملا تھا...... رحمان بابا کے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔ سارہ ہنوز اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔



اچھا وہی شہباز اعوان، جو جیم میں ہوتے ہیں...... ڈاکٹر فیروز اعوان کے صاحبزادے...... رحمان بابا نے گویا اس سے تائید چاہتی تھی۔ جی ہاں...... وہ خفگی سے بولی تھی، چلو آؤ میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں...... آپ کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے، آؤ میرے ساتھ شاباش...... انہوں نے اسے محبت سے پچکارا تھا، نہیں میں خود ہی چلی جاؤں گی...... وہ خود سری سے کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی، مگر بیٹی...... اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے، سارہ دوڑتی ہوئی قبرستان سے نکل گئی، اس کا گھر قبرستان سے قریباً دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا...... وہ پھولی سانسوں سے گھر میں داخل ہوئی تو اس کا سامنا بیگم شہباز اعوان سے ہوا، جو نہایت غصے اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات لیے اس کی طرف بڑھی تھیں، کہاں تھیں تم...... جانتی ہو کس قدر پریشان تھی میں...... میری جان عذاب میں ڈال رکھی ہے تم نے...... باپ باہر بیٹھا عیاشیاں کر رہا ہے اور مجھے چھوڑ گیا ہے اپنی بیٹی کی نگرانی کے لیے...... کہاں گئی تھی تم...... بولو...... وہ سختی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے بولی، مگر سارہ کے ہونٹوں پہ تو قفل پڑ گئے تھے، البتہ آنکھوں اور چہرے سے خوف صاف ظاہر ہو رہا تھا...... تبھی ملازمہ چلی آئی، بی بی جی آپ کا فون ہے۔

بیگم شہباز اعوان نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ساریہ کو کچا چبا جائیں...... وہ خون کے گھونٹ پیتی وہاں سے چلی گئیں تو ساریہ بھی اپنے روم میں آ گئی، جبکہ بوڑھی ملازمہ سکینہ بی نے ایک سرد "آہ" بھری تھی۔

☆......☆

رحمان بابا "اعوان فیملی" کو شہباز اعوان کے مرحوم والد ڈاکٹر فیروز اعوان کے توسط سے جانتے تھے۔ فیروز اعوان کو وہ اپنا محسن مانتے تھے۔ انہیں نے ہی رحمان بابا کو بیروزگاری کے وقت میں یہاں گورکن کی حیثیت سے رکھ دیا تھا، جس سے ان کی زندگی کی گاڑی کھینچنے لگی تھی۔ کم میں ہی سہی لیکن گزارا ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر فیروز اعوان کا انتقال ہو گیا تھا۔

رحمان بابا کو ان کی موت کا بہت صدمہ پہنچا تھا، مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ جب شہباز اعوان مقیم روانہ ہونے لگے، تو انہوں نے خاص طور پر رحمان بابا کو بلا کر اپنے والدین کی قبروں کی دیکھ بھال کی ذمے داری سونپی تھی، جس کے بدلے میں انہیں ہر ماہ معقول معاوضہ بھی ملتا تھا۔ وہ اپنی پوری دیانت داری سے اپنے فرائض سر انجام دے رہے تھے، جس قبر پہ انہوں نے ساریہ کو آنسو بہاتے دیکھا تھا، وہ شہباز اعوان کی دوسری بیوی "تہنیت بی بی" کی قبر تھی، جن کا انتقال دو سال قبل حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ "تہنیت" کون تھی؟ کہاں سے آئی؟ یہ تو وہ نہیں جانتے تھے، ہاں مگر تہنیت بی بی جب سے شہباز اعوان کی زندگی میں آئی تھیں، انہوں نے اسے بہت خوش دیکھا تھا، پھر نہ جانے ان کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی...... "تہنیت بی بی" خاموشی سے ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

رحمان بابا نے سُنا تھا کہ شہباز اعوان اور تہنیت بی بی کی ایک بیٹی بھی ہے، جو کہ اس وقت قریباً 6 برس کی تھی۔ انہوں نے ساریہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا، وہ بھی اپنی ماں کی قبر پر آنسو بہاتے......!! شہباز اعوان کی پہلی بیوی "صہبا امروز" تھی، جو کہ فیروز اعوان کے چچا زاد بھائی کی اولاد تھی۔

"صہبا" ایک خود سر اور مغرور عورت تھی جو اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتی۔ یونیورسٹی کے زمانے میں وہ کسی "آفتاب خان" نامی شخص کو دل دے بیٹھی، مگر امروز اعوان کو آفتاب خان ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ایک تو وہ ان کے اسٹینڈرڈ کا نہیں تھا، دوسرا وہ شکل ہی سے خباثت سے پُر اور لالچی شخص لگتا تھا، سو امروز خان نے بیٹی کی مرضی کے خلاف اس کی شادی شہباز اعوان سے طے کر دی۔ "صہبا" کو انہوں نے خود کو ختم کرنے کی دھمکی دے کر راضی کر لیا، یوں وہ دُلہن بن کر "اعوان پیلس" آ گئی۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ شہباز اعوان کو اولاد کا تحفہ نہ دے سکی۔ شوہر کی دوسری شادی نے انہیں دھچکا ضرور لگایا تھا، مگر وہ حالات سے سمجھوتا کر گئی تھی...... رحمان بابا نے اڑتی اڑتی یہ خبر بھی سنی تھی کہ وہ شہباز سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ وہ بے خبر تھے...... اب ساریہ کی آنکھوں میں آنسو انہیں بے چین کر گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں انہوں نے عجیب خالی پن سا محسوس کیا تھا، جانے کیوں ان کے دل میں خدشات سر اُبھارنے لگے تھے۔

☆......☆

"ہیلو ہاں...... کیسے ہو آفتاب ڈارلنگ!" بیگم شہباز اعوان کی آواز میں خود بخود خمار اُتر آیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں تم سناؤ...... خوب عیش ہو رہے ہیں، مجھے تو تم بالکل بھول ہی گئی ہو......" دوسری جانب سے شکوہ کیا گیا تھا۔ بیگم شہباز اعوان کے ہونٹوں پہ بڑی دلفریب سی مسکراہٹ اُبھری تھی۔ اوہو بھئی...... تم تو خفا ہونے لگے...... ایسی بات نہیں ہے میری جان...... میں بھلا تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں، بس اس کمبخت کے کاموں میں لگی رہتی ہوں...... سچ میرا بس چلے تو میں اُڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں...... بیگم شہباز اعوان نے محبت سے چُور لہجے میں کہا تو آفتاب خان کا زوردار قہقہہ بلند ہوا تھا۔ تو پھر چلی آؤ نا...... دیر کس بات کی ہے؟ ویسے بھی شہباز سے تو تم پیچھا چھڑانے والی ہو...... جیسے اپنی سوتن سے چھڑوایا تھا...... ہے نا...... جواب میں بیگم شہباز اعوان بھی ہنسنے لگی...... اوڈیئر...... تم بھی تو اس پلان کا حصہ تھے، پھر تمہیں تو پتا ہے میں شراکت داری کسی کی

معاملے میں پسند نہیں کرتی، خواہ وہ شوہر ہو یا پھر...... اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ میں خوب سمجھتا ہوں صہبا ڈارلنگ...... بس اب تم اس ڈرامے کو جلد سے جلد ختم کرو...... میں تو کہتا ہوں شہباز سے طلاق لے لو...... بجائے اس کے کہ...... ہرگز نہیں...... بیگم شہباز نے تیزی سے اس کی بات کاٹی تھی، نہیں...... آفتاب...... طلاق کی صورت میں تو میرے حصے میں صرف چند لاکھ اور صرف ایک بنگلہ آئے گا، جب کہ میں تو سب کچھ حاصل کرنا چاہتی ہوں...... سب کچھ...... ویسے بھی فکر مت کرو...... شہباز کے لیے بھی وہی حربہ استعمال کروں گی، یعنی اولڈ ٹو ڈراپس پوائزن...... ڈاکٹر بیچارے وجہ جان ہی نہ پائیں گے کہ یہ موت زہر سے ہوئی ہے یا پھر حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے...... جیسے بیچاری تہنیت کے ساتھ ہوا۔ آہا...... آئی تھی میرے ساتھ مالکن بن کر رہنے...... لیکن اسے کیا پتا تھا کہ موت اس کے تعاقب میں ہے...... میں نے بھی تو شہباز کو رام کیا تھا کہ وہ تہنیت کو یہاں لے آئے، میری ذات سے اسے کوئی تکلیف نہ ہو گی...... ہائے رے قسمت، بے چاری تہنیت...... صہبا نے ایک سرد آہ بھری تھی جب کہ مہتاب خان کا قہقہہ بہت بلند تھا۔

☆......☆

سکینہ کے قدموں سے زمین نکل گئی تھی...... اوہ میرے خدا...... اتنا سب کچھ ہو گیا اور خبر تک نہ ہو سکی...... یہ مکروہ عورت...... وہ جلدی سے ڈرائنگ روم کے دروازے سے پیچھے ہٹ گئی، مبادا وہ دیکھ نہ لے...... سکینہ بی اور بیگم شہباز اعوان کے باہر نکل جانے کے بعد صوفے کے پیچھے سے ساریہ بھی حق دق سی برآمد ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا ٹیپ ریکارڈر بھی موجود تھا......

☆......☆

رات کے پچھلے پہر ساریہ ایک دم گھبرا کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پہ خوف و بے بسی کے تاثرات تھے، وہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش میں ہی سسک اُٹھی تھی...... اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے...... مما...... مما...... مم مم...... مجھے کیوں تنہا کر گئیں آپ......؟ مجھے ڈر لگتا ہے...... وہ...... وہ مجھے بھی مار ڈالے گی...... اس نے آپ کو بھی مار دیا...... وہ بابا کو بھی نہیں چھوڑے گی...... مم...... مم، میں کیا کروں...... اس کی نظروں میں اپنی "ماں" کا چہرہ گھوم گیا، جس کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ شہباز اعوان کی شریک حیات بن کر اس گھر میں آئی تھی اور انہیں وہ سب کچھ دیا تھا جو "صہبا" انہیں بارہ برسوں میں نہ دے سکی تھی......

وہ رو رہی تھی پھر ایک دم نہ جانے کیوں اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے...... مما...... اب میں بالکل نہیں روؤں گی...... ہاں...... میں بہادر بیٹی ہوں آپ کی...... نہیں روؤں گی...... بالکل نہیں...... مم مم...... میں بدلہ لوں گی آپ کی موت کا...... اپنے بابا کو بچاؤں گی...... وہ ناگن ہے...... وہ قاتل ہے...... وہ سسکتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی...... اس کی آنکھوں میں اب آنسوؤں کی جگہ عجیب سی چمک آن ٹھہری تھی......

☆......☆

اسکول سے گھر آنے کے بعد وہ بہت بے چین تھی...... بیٹی کھانا کھا لو...... سکینہ نے اسے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے دیکھا تو کھانے کا پوچھ لیا...... نہیں مجھے بھوک نہیں...... آنٹی کہاں ہیں؟ اس کا اشارہ بیگم شاہنواز کی طرف تھا...... وہ تو گاڑی لے کر باہر گئی ہیں...... سکینہ نے بتایا تو اس نے سر ہلا دیا...... ٹھیک ہے آپ جائیں...... سکینہ بی کے جانے کے بعد وہ چپکے سے بیگم شہباز اعوان کے کمرے میں آئی تھی، وہ تیزی سے الماری کی طرف بڑھی اور جلدی جلدی اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگی، آخر جلد ہی اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ اس کے نازک سے لبوں پہ بڑی زہریلی مسکراہٹ اُبھری تھی۔

☆......☆

شام کو بیگم شہباز اعوان شاپنگ بیگز سے لدی پھندی گھر آئی تھیں...... راستے میں انہیں شہباز اعوان کی کال آئی تھی کہ وہ کل شام کی فلائٹ سے واپس آ رہے ہیں...... اس کا ذہن ان میں اُلجھا ہوا تھا۔ اتنی جلدی حالاں کہ انہیں ابھی ایک ماہ مزید رُکنا تھا......

پھر...... خیر چھوڑو...... جتنا جلدی یہ قصہ ختم ہو اتنا ہی اچھا ہے...... ان کا ذہن منصوبہ تیار کر چکا تھا...... سکینہ بی سکینہ بی...... پلیز چائے بنا کر لے آیئے...... آج تو میں بہت تھک گئی ہوں...... سر میں درد بھی ہے...... سکینہ بی کو آرڈر دے کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئیں...... سکینہ بی آپ کیا کر رہی ہیں...... ساریہ نے کچن میں جھانکا...... وہ بڑی بیگم صاحبہ نے چائے مانگی ہے، انہیں دینے جا رہی تھی...... اچھا یہ چائے میں دے آتی ہوں، آپ ذرا میری کتابیں سیٹ کر کے رکھ دیں اور ہاں میری پرپل کلر کی فراک بھی نکال کر پریس کر دیں۔ ساریہ نے چائے کی ٹرے سکینہ بی کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا تھا...... جی بہت اچھا...... سکینہ بی چلی گئیں تو ساریہ نے تیزی سے اپنی پاکٹ سے شیشی نکالی اور چائے میں دو بوند ٹپکا دی......

لو بیگم شہباز اعوان...... تمہاری چال تم ہی پر الٹ دی...... ایسے ہی مارا تھا نا تم نے میری ماں کو...... اس نے نفرت بھرے انداز میں سوچا تھا اور چائے کا کپ اٹھا کر بیگم شہباز اعوان کے سامنے آ کھڑی ہوئی، وہ اپنی خریدی ہوئی اشیاء کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کی نظر ساریہ پہ پڑی تو اس نے جلدی سے چائے کا کپ آگے کر دیا...... یہ چائے......

اچھا ٹھیک ہے رکھ دو...... انہوں نے لاپروا سے انداز میں کہا تو ساریہ نے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل پہ کپ رکھ دیا اور بیگم شہباز اعوان کو عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس کے جانے کے بعد بیگم شہباز اعوان نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆......☆

چند ہی گھنٹوں بعد بیگم شہباز اعوان کی طبیعت بگڑ گئی۔ انہیں فوراً ایمرجنسی میں لے جایا گیا، جہاں ڈاکٹرز کی سر توڑ کوششوں کے باوجود وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ رپورٹ میں موت کی وجہ ”حرکت قلب“ بند ہونے کی تحریر کی گئی۔ شہباز اعوان اگلی شام کو واپس آ گئے تھے۔ کوئی بھی نہ جان سکا کہ بیگم شہباز اعوان مری نہیں، بلکہ انہیں مارا گیا ہے...... دوسری طرف ان کا آشنا مہتاب خان ان کی موت کی خبر سن کر ذہنی توازن کھو بیٹھا، بہر حال وہ جیسا بھی سہی، مگر ”صہبا“ کا سچا عاشق تھا۔

☆......☆

ملک شہباز اعوان ساریہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹے بلک رہے تھے، خود ساریہ بھی رو رہی تھی...... بابا...... وہ قاتل تھی اور قاتل کی سزا موت ہی ہوتی ہے...... سو میں نے مار دیا...... بالکل ویسے ہی جیسے انہوں نے آپ کی ”تہنیت“ اور میری ماں کو مارا تھا...... اگر ایسا نہ کرتی وہ آپ کو بھی مار دیتی اور کوئی کچھ نہ کر سکتا...... بابا مجھے معاف کر دیں...... ساریہ نے ملک شہباز اعوان سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ صہبا بیگم کے چالیسویں کے بعد وہ خود پر اختیار کھو بیٹھی تھی...... آخر تھی تو وہ معصوم بچی نا...... اس نے قتل کیا تھا...... سہم گئی تھی...... اس نے ملک شہباز اعوان کو صہبا بیگم اور مہتاب خان کی ریکارڈ شدہ گفتگو بھی سنائی تھی، پھر سکینہ بی نے بھی ملک شہباز اعوان کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ میں بھی قاتل ہوں نا...... آپ...... آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے...... وہ روتے ہوئے بولی۔ نہیں...... نہیں میری جان...... میری بیٹی...... ہرگز نہیں...... وہ تڑپ اٹھے تھے...... میں تمہیں یہاں سے دور لے جاؤں گا، کوئی کسی کو کچھ نہیں بتائے گا...... وہ اس کا ماتھا اور سر بار بار چوم رہے تھے...... ہاں صاحب...... یہ راز راز ہی رہے گا...... آپ بے بی کو اپنے ساتھ لے جائیں...... سکینہ بی روتے ہوئے بولی تھی۔ ملک شہباز اعوان نے فوراً فیصلہ کر لیا اور یوں کچھ روز بعد ساریہ ہمیشہ کے لیے اپنے بابا کے ساتھ بیلجیئم روانہ ہو گئی۔

جاتے جاتے وہ اپنی ماں کی قبر پہ کچھ دیر کے لیے رکی تھی اور رحمان بابا کو ماں کی قبر کی دیکھ بھال کی خصوصی تاکید کی تھی......

ساریہ چلی گئی...... رحمان بابا آج بھی ”تہنیت“ کی قبر کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور ساریہ کے لیے دعا گو رہتے ہیں...... انہیں یقین ہے کہ وہ بہت جلد آئے گی اپنی ماں سے ملنے...... آپ بھی ساریہ اور اس کی ماں کے لیے ضرور دعا کیجیے گا۔

☆......☆

چوتھی سچ بیانی

خارزار ہے زندگی

اُمّ مناہل

خارزار سے بھرپور، دکھوں کی گود میں پلتی ہوئی ایک سچ بیانی

آج جو میں آپ کے لیے کہانی لائی ہوں، وہ ہزارہ ڈویژن کی ایک عام سی اور ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے، مگر اس میں بہت بڑا اور خاص سبق ہے۔ یہ کہانی صرف میری ہی نہیں ہے، بلکہ سرحدی قبیلوں کی ہر اس لڑکی ہے، جسے ماں باپ کمائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اپنی کہانی سنانے سے پہلے میں سرحد کے قبائلی علاقوں کے رسم و رواج بتادوں، تاکہ آپ کو میری اس کہانی کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

سرحد کے بہت سے علاقوں میں اب بھی قبائلی رسم و رواج قائم ہیں اور یہ واقعات زیادہ تر ان ہی قبائلوں میں پیش آتے ہیں۔ ان قبائلوں میں مختلف قبائلوں اور قومیت کے لوگ آباد ہیں۔ ان میں دو کی اکثریت ہے، مقامی اور کابلی۔

کابلی افغانستان سے آئی ہوئی قوم ہے اور مقامی میں زیادہ تر ہندکو اور پشتو بولنے والے لوگ ہیں۔ ہندکو میں اعوان، ملک، جدون، تنولی، سید آتے ہیں شامل ہیں، جب کہ پشتو میں زئی قبائل، مہمند، خٹک، بھوئی، دل آزاق پٹھان ہیں۔ ان میں دل آزاق وہ پٹھان ہیں، جب نادر شاہ نے دلی کو لوٹا تھا، تو یہ اپنی جانیں بچا کر وزیرستان کی پہاڑیوں میں آکر چھپ گئے تھے اور اب صدیاں بیتنے کے بعد یہاں کے قبائلیوں میں شامل ہوگئے ہیں۔

ان قبائلیوں میں شادی ایک طرح کا سودا ہوتی ہیں۔ شادی کے موقع پر حق مہر کے نام پر تولوں کے حساب سے سونا اور کنال کے حساب سے زمین لکھوائی جاتی ہے۔ جائداد کا یہی عالم جہیز کے نام پر بھی ہوتا ہے۔

بہرحال بَری جہیز کی وبا تو اب ہر جگہ ہی پھیلی ہوئی ہے اور ہندوستان کے رواج کے مطابق بھاری بھرکم جہیز نہ لے کر آنے والی لڑکی کو کھانا پکاتے ہوئے آگ لگنے اور فرش دھوتے ہوئے کرنٹ لگنے کی روایت تو پاکستان کے ہر دوسرے گھر میں عام ہوگئی ہے۔

بعض قبائل میں وہ حق مہر لڑکی کے ماں باپ کی ملکیت ہوتا ہے اور بھاری بھرکم جہیز لے کر جانے والی لڑکی اپنے سسرال میں بھاری رہتی ہے۔ زمین اور جائیداد کی مالکن کی نظر میں اپنے مجازی خدا کی حیثیت گھر کے نوکر کی طرح ہوتی ہے۔ یہاں پر لڑکی کی بجائے لڑکے کا رشتہ دیا جاتا ہے اور لڑکی کی پیدائش سے لے کر شادی تک اس کے نان نفقہ پر جو رقم خرچ ہوئی ہوتی ہے، وہ سب نکاح کے وقت





لڑکے کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے سرحدی علاقوں میں زیادہ تر ازدواجی زندگی بدحال ہوتی ہے اور میاں بیوی میں اَن بَن رہتی ہے۔ گھر بھی بہت کم بس پاتے ہیں۔ بات لڑائی دنگوں کے بعد طلاق کی نوبت تک آ جاتی ہے۔ اب جس لڑکی کا حق مہر زیادہ ہوتا ہے، اسے تو طلاق میں فائدہ ہی فائدہ نظر آتا ہے، کیوں کہ حق مہر کا وہ مال اس کے دوبارہ شادی کرنے پر جہیز کے طور پر کام آتا ہے، مگر لڑکے کو طلاق دینا مشکل ہو جاتا ہے، کیوں کہ شادی کر کے وہ بے حال تو ہو ہی چکا ہوتا ہے، طلاق کے بعد بالکل ہی کنگال ہو جاتا ہے۔ شادی کر کے جب لڑکا کنگال ہوتا ہے تو اس کا خراج ساری زندگی اپنی بیوی کو تنگ کر کے وصول کرتا ہے، جو سیدھی سادی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ روز کے طعنے تشنے ان کا مقدر بن جاتے ہیں اور شوہر انہیں اپنی جوتی کی نوک پر رکھتا ہے۔ اس طرح کسی معاملے میں عورت مرد کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جاتی ہیں تو کہیں مرد اپنی بیوی کا زر خرید غلام۔

ان تمام باتوں کا اثر ان کے بچوں پر بھی پڑتا ہے یا تو وہ جوانی کی حدود میں داخل ہونے تک اپنے ماں باپ کو جھگڑا کرتے دیکھتے رہتے ہیں یا پھر ساری زندگی ماں سے اپنے باپ کے بارے میں اور باپ سے اپنی ماں کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ یونہی زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے اور وہ ایسے ہی بڑے ہو جاتے ہیں، مگر یہ صرف قبائلی علاقوں میں ہوتا ہے اور کوہستان تو ہے ہی مختلف قبائلوں میں بٹا ہوا۔

بہت سے خاندانی لوگ ایسے بھی ہیں جو جان تو دے دیتے ہیں، مگر عزت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کا وہی طریقہ ہے جو اسلام کے اصولوں پر قائم ہے۔ میرا تعلق بھی اسی قبائل فیملی کے خاندان مُلک سے تھا۔

☆......☆

میں ہزارہ ڈویژن کے شہر حویلیاں کے ایک رہائشی خدا بخش علی داد کے گھر 1960ء میں پیدا ہوئی۔ میں اپنے والدین کی گود میں چوتھی بیٹی تھی۔ امی بتاتی تھیں کہ میری پیدائش پر میری پھوپھی بہت روئی تھی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم صرف چار بہنیں ہی تھے، بلکہ مجھ سے بڑے چار بھائی بھی تھے، مگر ابو کی پتلی حالت، کسمپرسی میں گھر کا خرچہ چلنے کی وجہ بچوں کی کثرت اور

پھر چار بیٹیوں کا بوجھ ابو کے ناتواں کندھوں پر آ گیا۔ اس بات کے کارن میری پیدائش میرے والدین کے لیے کوئی خوشی کا باعث نہیں بنی۔ میں اکثر اپنے آپ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ ہمیشہ غریب کے ہی بچے کیوں زیادہ ہوتے ہیں۔

میری آمد میری پھوپھی کے لیے اتنے بڑے غم کا سبب بنی کہ وہ یہ صدمہ دل سے لگائے سال بھر کے اندر دنیا سے چل بسی، شاید یہ ان کے حق میں بہتر ہی ہوا، ورنہ میرے بعد چھوٹی بہن کی خبر تو ان کے لیے مزید باعث زحمت بنتی، پھر اسے زیادہ اذیت سے مرنا پڑتا۔ چھوٹی بہن کے بعد میرا ایک اور بھائی دنیا میں آیا، اس طرح دس بہن بھائی کی طویل لائن اور ایک تنہا باپ کمانے والا کھینچ تان کر زندگی کی کہانی چلتی رہی۔

☆......☆

اسی کسمپرسی کی حالت میں گزارا کرتے ہوئے میری دوسرے نمبر کی بہن شبانہ باجی کا رشتہ بہت امیر گھرانے سے آ گیا۔ اگر عالم بھائی حسین، خوبرو اور دولت مند تھے تو شبانہ باجی بھی کم حسین نہیں تھیں۔ عالم بھائی نے انہیں برادری کی ایک شادی کی تقریب میں دیکھا اور دل ہار بیٹھے۔ ان دنوں شبانہ باجی آٹھویں کلاس میں اور شاہانہ باجی انٹر میں پڑھتی تھیں۔ ابو نے اچھا رشتہ دیکھ کر فوراً ہاں کر دی۔ سب سے پہلے شاہانہ باجی اس رشتے کے خلاف ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ شبانہ کی عمر ابھی بہت کم ہے۔ اس سال وہ تیرہ سال کی ہوئی ہے، مگر ابو کا کہنا تھا کہ جس کا اچھا رشتہ آ جائے، اس کا کر دوں گا۔ میرے اوپر ابھی چار اور بیٹھی ہیں۔ یہاں ابو کی ضد کے آگے باجی ہار گئیں اور شبانہ باجی رخصت ہو کر عالم بھائی کے گھر چلی گئیں، مگر باجی کو سکون نہیں ملا۔ وہ ہر پل اپنی ہار پر کڑھتی رہتی تھیں، کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان سے پہلے چھوٹی بہن گھر سے رخصت ہو۔ وہ ہر وقت شبانہ باجی کو تنگ کرنے کے منصوبے بناتی۔ جب بھی شبانہ باجی میکے آتیں، باجی لڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ شبانہ باجی پر طنز کے تیر چلاتیں۔ بات بے بات امی سے لڑتیں۔ گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیتیں۔

عالم بھائی کے سامنے شبانہ باجی کی ذات کو نشانہ بنا کر انہیں سسرال کے طعنے مارتیں۔ عالم بھائی یہاں تو سن کر چلے جاتے، مگر گھر جا کر شبانہ باجی کو سخت سناتے۔ ظاہر ہے لاکھ شبانہ باجی خوب صورت سہی، مگر عالم بھائی بھی ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان تھے اور پھر غیرت مند بھی۔ وہ کیسے سسرال میں اپنی تذلیل برداشت کرتے۔ بے چاری شبانہ باجی دہری مصیبت میں گرفتار ہو جاتی۔ میکے آتیں تو باجی ان کا بیٹھنا دوبھر کر دیتیں اور سسرال میں عالم بھائی کی باتیں برداشت کرتیں، پھر جب چار سال گزر جانے کی باوجود بھی شبانہ باجی ماں نہ بن سکیں تو ساس نندوں نے بھی انہیں ستانا شروع کر دیا۔ شادی کے پانچویں سال اولاد نہ ہونے کی وجہ سے شبانہ باجی طلاق کا داغ لگائے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں واپس باپ کی دہلیز پر آ بیٹھیں، تو بھی باجی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور مسلسل اپنے جملہ بازی سے انہیں ستاتے رہتیں۔

☆......☆

شبانہ باجی کی طلاق میں کچھ تو ان کے اولاد نہ ہونے کا قصور تھا اور بہت کچھ باجی کی حرکتوں کا، کیوں کہ باجی کی باتوں سے تنگ آ کر عالم بھائی نے تو سسرال آنا چھوڑ ہی دیا تھا، مگر باجی بہانے سے شبانہ باجی کے گھر جانا شروع ہو گئی تھیں، پھر جب سال بھر بعد ہی شبانہ باجی چھولے کا ٹھیلا لگانے والے جلیل بھائی کے ساتھ ان کے کچی مٹی کے بنے ہوئے گھر میں بیاہ کر چلی گئیں، تب باجی کے ماتھے کے بل کچھ کم ہوئے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

مگر انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ خدائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون، نمرود اور شداد کو غرق کرنے والی صرف ایک اللہ کی ذات تھی، جس کی طاقت کے آگے کسی طاقتور کا زور نہیں چلتا۔

☆......☆

شبانہ باجی کی پہلی شادی کے بعد ہی ابو نے اپنے ایک دوست کے مشورے پر کاروبار کرنے کا سوچا اور بینک سے لون لے کر ایک بھینس خرید لی اور اس کے دودھ سے کاروبار کرنا شروع کیا۔ ”نیت

ثابت منزل آسان" والی کہاوت ابو کو بڑی موافق آئی۔ اللہ نے کاروبار میں برکت دی، یوں اک سے دو اور دو سے چار بھینسیں ہوئیں اور ایک دن ہمارا بھینسوں کا باڑہ ہوگیا۔ باجی نے انٹر کے بعد قریبی پرائیویٹ اسکول میں ٹیچری کی جاب کرلی، جس سے ہماری گزر اوقات اچھی ہونے لگی، اس کے ساتھ ساتھ نرسنگ کا کورس بھی کرتی گئیں۔ گھر کے حالات میں بہتری آئی تو ابو کاروبار کے ساتھ ساتھ زمینیں بھی خریدنے لگے، جو اس زمانے میں بہت سستی ہوا کرتی تھیں۔ گھر میں فراوانی آئی تو ہماری ماں کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی چڑھ گئی۔ انہوں نے اچھے دنوں میں کھو کر اپنے برے دنوں کو فراموش کردیا۔ غرور کا نشہ ان کے سر چڑھ کر بولنے لگا۔ خاندان میں اپنے آپ کو بہت اعلیٰ تصور کرنے لگیں اور اپنے بچوں کے رشتے کے لیے ایسے گھرانے دیکھنے لگیں، جو ان کے مد مقابل سے بھی کہیں بڑھ کر ہوں۔

☆......☆

ابو نے اپنی حیثیت کے مطابق اپنی اولاد کو تعلیم دلوائی، مگر بڑے بھائی ابو کے لیے ہمیشہ مصیبت کا سبب بنے رہے، کیوں کہ ابو جو پیسا ان کی پڑھائی لکھائی پر لگاتے، وہ ان کی محنت سے کمایا ہوا ہوتا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود بھائی میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ آج کل کے دور میں جب اعلیٰ تعلیم یافتہ کو کوئی نوکری نہیں دیتا تو میٹرک پاس کو کیا ملنی ہے، مگر اس وقت بھی میٹرک پاس کو نوکری میرٹ کی بنیاد پر ملتی تھی اور بھائی نے تو میٹرک بھی بس رو دھو کر کیا تھا۔ نوکری کی طرف سے مایوس ہو کر ابو نے بھائی کو کاروبار کرایا، مگر ہر دفعہ بھائی نے کاروبار میں لگایا ہوا پیسا پانی میں ڈبو دیا، نتیجہ وہی لکیر کے فقیر۔

بھائی کو پیسے کی اہمیت اس وقت پتا چلی جب ابو نے ان کی حرکتوں سے عاجز آکر مجبوراً انہیں گھر سے نکال دیا، تب انہیں احساس ہوا کہ پیسا کتنی محنت سے کمایا جاتا ہے۔ جب اپنے سر پر سورج کی تپش پڑی تو باپ کے محنت سے بنائے ہوئے سائبان کا احساس ہوا، مگر گھر سے نکالے جانے کی وجہ سے بھائی ابو سے ہمیشہ خائف رہتے۔ انہوں نے کراچی جا کر اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ خوش قسمتی سے کراچی پہنچ کر بھائی کو میٹرک کی ڈگری کی بنیاد پر ایک اچھے اور بڑے ادارے میں چپراسی (نائب قاصد) کی نوکری مل گئی۔ ان کی گزر اوقات اچھی ہونے لگی تو انہوں نے وہیں کراچی کی لڑکی سے شادی کرکے اپنا گھر بسا لیا، یوں امی ابو کی ان کی طرف سے فکر ختم ہوگئی، مگر بھائی ہمیشہ امی ابو کے خلاف رہے اور امی بھائی کے خلاف رہیں، کیوں کہ وہ اپنی پسند کی بہو نہ لاسکیں۔

☆......☆

امی نے پانچ بیٹیوں کے ساتھ پانچ بیٹے بھی پیدا کیے تھے، یوں وہ اپنے سسرال اور میکے دونوں میں بھاری رہیں اور ابو پر ان کا زور بھی بہت چلتا تھا۔ امی کے فیصلے کے آگے ابو کی ایک بات نہیں چلتی تھی، جس کی وجہ سے امی نے اپنے بچوں کے رشتے کرتے وقت اپنی من مانی کی۔ امی کی ضد اور لالچی طبیعت کی وجہ سے ان کے بچوں کی زندگی ہمیشہ جہنم بنی رہی۔ بھائیوں کی شادیاں ان کی مرضی کے خلاف امی نے اپنی منشاء سے اپنی ان بھانجی بھتیجیوں سے کیں، جو جہیز کے نام پر ٹرک کے ٹرک اور زمین و جائیدادیں لے کر آئیں۔ اب چاہے وہ بھائیوں سے دس دس سال بڑی تھیں، امی کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہاں وہ اسلام کی ہدایت دیتیں کہ ہمارے پیارے رسول ﷺ نے بھی تو بڑی عمر کی عورت سے شادی کی تھی۔ اس معاملے میں انہیں اسلام خوب نظر آتا، مگر جب اولاد کی مرضی معلوم کرنے کا وقت آتا تو نہ جانے ان کا اسلام کہاں سو جاتا۔ انہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ ہمارے رسول ﷺ نے بے سہارا عورت کو سہارا دینے کے لیے بڑی عمر کی عورت اور بیوہ، طلاق یافتہ سے شادی کی تھی، نہ کہ ان کی دولت کے لالچ میں اور اسلام نے نکاح کے لیے لڑکی کی ہاں کو کتنی اہمیت دی ہے کہ پہلے لڑکی کی مرضی معلوم کی جاتی ہے، پھر لڑکے سے اقرار لیا جاتا ہے۔

جب باجی کا نرسنگ کا کورس مکمل ہوا تو انہوں نے پشاور کے ریڈی لیڈنگ اسپتال میں نرس کے فرائض انجام دینے کے لیے ٹیچری کو خیرباد کہہ دیا۔ اسی جاب کے دوران باجی کی ملاقات اشتیاق نامی ڈاکٹر سے ہوئی۔ وہ زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے ماں باپ کی دو اولادوں میں بڑا تھا۔ اس سے چھوٹا اشفاق تھا۔ باجی اور اشتیاق محبت کے رشتے سے گزر کر شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ باجی نے دس برس نوکری کی، یوں گھر کے حالات میں بہتری آئی تو باجی کی اہمیت ماں کی نظر میں اور بھی اعلیٰ ہوگئی، پھر جب باجی نے اشتیاق سے شادی کی ضد کی تو ابو باجی کی شادی کے خلاف ہوتے ہوئے بھی بے چوں و چرا مان گئے، کیوں کہ پیسا اچھے اچھوں کی زبان بند کردیتا ہے۔ باجی کی شادی کے ابو اس لیے خلاف تھے کہ اشتیاق غیر برادری سے تعلق رکھتا تھا، مگر پھر بھی باجی کا پیسا ابو کے ارادوں پر حاوی ہوگیا اور امی کو تو نہ غیر برادری پر اعتراض تھا اور نہ ہی پسند کی شادی پر، کیوں کہ امی کو صرف اشتیاق بھائی کا پیسا نظر آیا تھا۔ امی کا خیال تھا کہ اتنے پیسے والے آدمی کو پاکر شاہانہ یقیناً خوش رہے گی، مگر امی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ماں باپ اپنی اولاد کو پیسے سے ہر چیز خرید کر دے سکتے ہیں، مگر ان کا نصیب نہیں خرید سکتے۔ باجی تو شادی کے وقت سولہ سال کی نوخیز کلی تھی اور میٹرک کا امتحان دے رہی تھی۔ میرے کچے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے پیسا بہت اہمیت کا حامل ہے، جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی، میرے دماغ میں یہ بات جڑ پکڑتی گئی۔

شادی کے پانچ سال بعد اشتیاق بھائی کو ان کے دوست کے توسط سے دبئی میں اعلیٰ عہدے پر جاب مل گئی۔ اشتیاق بھائی نے یہ سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا، فوراً ہی اس آفر کو قبول کرکے پاکستان کی نوکری چھوڑ کر دبئی چلے گئے۔ ان پانچ سالوں میں باجی دو بیٹیوں کی ماں بن چکی تھیں اور ان دنوں تیسرے بچے کی آمد کے انتظار میں تھیں کہ انہیں اشتیاق بھائی کی دوسری شادی کی خبر ملی اور اس بیوی سے ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔ دو بیٹیوں کے بعد شاید اشتیاق بھائی کو بیٹے کی خواہش ہو اور ان کی خواہش ضرورت بن گئی ہو۔ بہر حال باجی پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ دن رات روتی رہتیں۔ ابو امی انہیں سمجھاتے، مگر ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ "مجھے ہر حال میں دبئی جانا ہے۔" بہر حال ابو اور بھائیوں نے کوشش کرکے باجی کو دبئی بھیج دیا۔ وہاں جا کر واقعی یہ بات درست ثابت ہوئی کہ اشتیاق نے وہاں دوسری شادی کی ہوئی ہے۔ اگر باجی چاہتی تو دل سے اس عورت کو قبول کرسکتی تھیں، مگر یہ عورت کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ ہر چیز برداشت کرلیتی ہے، مگر اپنے شوہر کی محبت کی تقسیم برداشت نہیں کرپاتی۔ باجی بھی ایک عورت تھیں، وہ بھی دوسری عورت کو برداشت نہیں کرپائیں۔ دوسری عورت بھی وہ جو ان کی سوتن ہو، لہٰذا باجی نے ابو اور بھائیوں کے رعب و دبدبہ کو بنیاد بنا کر اشتیاق پر اپنی دوسری بیوی کو طلاق دینے کے لیے زور ڈالا۔ اشتیاق بھائی نے باجی سے کہا۔

"میں اس عورت کو طلاق نہیں دوں گا۔ وہ میرے بیٹے کی ماں ہے۔ تم ساتھ رہنا چاہتی ہو تو رہو، میں تمہارا بھی خرچہ برداشت کروں گا۔ اگر نہیں رہنا چاہتیں تو بے شک طلاق لے لو۔"

جب اشتیاق بھائی نہیں مانے تو باجی نے دھمکیوں سے کام چلانا چاہا، مگر ان دھمکیوں کا بھی اشتیاق بھائی پر کوئی اثر نہیں ہوا، آخر تھک ہار کر باجی خاموش ہوگئیں، کیوں کہ بچیوں کی خاطر طلاق کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اس وجہ سے دبئی جانے کے بعد بھی سکون سے بیٹھ نہ پائیں۔

میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں، جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا دونوں میں سے کسی ایک میں لچک آجائے تو پھر گاڑی اپنی روانی سے نہیں چلتی۔ اس طرح میاں بیوی میں سے کوئی ایک دوسرے کو دھوکہ دے دے تو پھر دوسرے کا اس پر سے اعتبار ختم ہوجاتا ہے، یہی کچھ باجی کے ساتھ ہوا۔ اشتیاق بھائی کی اس حرکت کے بعد وہ پاکستان آنا نہیں چاہتی تھیں، مگر بچیوں کی تعلیم کا مسئلہ تھا، کیوں کہ وہاں رہ کر وہ پاکستانی ماحول اور زبان سے بالکل ہی کٹ جاتیں۔

جب امی نے اشتیاق بھائی کو اتنا پیسے والا دیکھا تو لالچ میں آکر میری تیسری بہن رضوانہ کا رشتہ

اشتیاق بھائی کے چھوٹے بھائی اشفاق کے لیے دے دیا۔ رضوانہ اس بات کے لیے بالکل تیار نہیں تھی اور نہ ہی اشفاق سے شادی کرنا چاہتی تھی، مگر وہی امی کی لالچی طبیعت جس کے آگے رضوانہ کی ایک نہ چلی۔ اشتیاق بھائی کی حقیقت معلوم ہوجانے کی باوجود امی نے رضوانہ کا سودا کرنے میں دیر نہ کی۔ اشفاق کو نوکری ملے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ وہ شادی کا اتنا خرچہ برداشت نہ کرسکا۔ شادی پر کنگال ہوجانے کی باعث وہ رضوانہ کو تنگ رکھتا۔ رضوانہ کو طعنے دیتا کہ ''تمہاری ماں نے تمہارے بدلے حق مہر کے نام پر لاکھوں روپے مجھ سے اینٹھ لیے۔'' کیوں کہ وہ بھی امی کی لالچی طبیعت کو سمجھ گیا تھا۔ بات لڑائی دنگوں کے بعد طلاق تک جا پہنچی۔ ایک دن غصّے میں آکر اشفاق نے رضوانہ کو ایک طلاق دے ڈالی، جس سے ناراض ہوکر رضوانہ واپس میکے آ بیٹھی۔ رضوانہ نے امی کے خوب لتے لیے۔ اپنی زندگی برباد ہوجانے کی وجہ سے رضوانہ امی سے خائف رہنے لگی تھی۔ شادی کا بندھن اس کی زندگی میں بھی کوئی خوشی کا پیغام لے کر نہیں آیا اور یہ سب کچھ امی کی لالچی نظر کی وجہ سے ہوا تھا، پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ بھی اتنے عرصے میں دو بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی۔ ایسی حالت میں طلاق لینا اور شوہر کے ساتھ رہنا، دونوں ہی عذاب ہوتے ہیں۔ مرد کی قسمت سے اولاد ہوتی ہے اور قصوروار عورت کو ٹھہرادیا جاتا ہے۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ اشفاق بھی اشتیاق کا ہی بھائی تھا، وہ کیسے بیٹے کی چاہ نہیں رکھتا، مگر رضوانہ کی فطرت باجی کی طرح نہیں تھی۔ باجی کے بعد رضوانہ کی یہ حالت دیکھ کر مجھے امی پر بہت غصّہ آتا۔ باجی نے تو اپنی پسند سے شادی کی تھی اور پھر شبانہ باجی کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا، شاید اس کی انہوں نے سزا بھگتی، مگر رضوانہ کا کیا قصور تھا کہ امی نے اسے بھی اپنی خواہش کی بھینٹ چڑھادیا۔ رضوانہ کی حالت دیکھ کر میں نے دل میں تہیہ کرلیا تھا، کہ ''میں اپنی زندگی کو امی کے ہاتھوں برباد نہیں ہونے دوں گی اور اپنی پسند سے ہی شادی کروں گی، چاہے مجھے امی کے کتنا ہی خلاف جانا پڑے۔'' رضوانہ نے اشفاق سے عارضی طور پر علیحدہ ہوکر پشاور کے ریڈی لیڈنگ اسپتال میں ریسپشنسٹ کی جاب کرلی تھی، ساتھ ہی دو نرسنگ کا کورس بھی کرتی گئی، تاکہ بعد میں اگر اشفاق کی طرف سے کوئی پریشانی ہو تو اپنا اور اپنی بچیوں کا پیٹ تو پال سکے۔ اس کی قسمت کہ اسے رہنے کے لیے اسپتال کے اندر ہی جگہ مل گئی تھی۔

☆......☆

زندگی کے اتنے سال میں، میں ماسٹرز میں پہنچ چکی تھی۔ میرے سامنے گھر کے سارے حالات تھے۔ میں بچپن سے ہی اپنی ماں کی جو حالت دیکھ رہی تھی، وہ میرے لیے ناقابلِ قبول تھی۔

اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور سے ماسٹرز کرنے کے بعد جب میں نکلی تو میرے پاس ماسٹرز کی ڈگری کے ساتھ ساتھ شاہ زیب کی محبت کی یادیں بھی تھیں اور ساتھ ہی جینے کے وعدے اور ساتھ مرنے کی قسمیں بھی تھیں۔ شاہ زیب اور میرا شعبہ ایک ہی تھا۔ اسے بھی پولیٹیکل سائنس بہت پسند تھی اور میرا فیورٹ سبجیکٹ بھی یہی تھا۔ ہم لوگ گھنٹوں اس موضوع پر بحث کیا کرتے تھے۔ کبھی اس کی جیت ہوتی اور کبھی میری، اسی ہار جیت کی وجہ سے میرے من میں شاہ زیب کی محبت کی میٹھی میٹھی انگڑائیاں جنم لیتیں۔ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ شاہ زیب میرا دور پرے کا رشتے دار تھا، مگر ایک ہی محلّے میں رہنے اور ساتھ اسکول آنے جانے کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ ہماری یہ بچپن کی دوستی کب محبت میں بدلی پتا ہی نہ چلا۔ جب انٹر کرنے کے بعد ہم نے ایک ساتھ یونیورسٹی میں قدم رکھا تو ہمیں احساس ہوا ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے، یوں ہماری دوستی محبت کے مظبوط بندھن میں بندھ گئی۔ ہمارا ماسٹرز تک ساتھ رہا۔ ماسٹرز کرنے کے بعد میں نے ایل ایل بی میں ایڈمیشن لے لیا، جب کہ شاہ زیب نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرلی اور اسلام آباد شفٹ ہوگیا، یوں ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ کم ہوگیا، مگر فون پر بات روزانہ ہوتی تھی۔

☆......☆

شاہ زیب کو جب بھی مجھ سے ملنا ہوتا، وہ ویک اینڈ پر پشاور چلا آتا۔ میرے گھر والے تو حویلیاں میں تھے، اس لیے شاہ زیب کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ان دنوں میں ایل ایل بی کے دوسرے سال میں تھی کہ مجھ پر شاہ زیب کی شادی کا انکشاف ہوا۔ مجھ پر تو غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں نے غم وغصّہ کی حالت میں کئی مرتبہ شاہ زیب کا نمبر ملایا، مگر ہر دفعہ یا تو انگیج ملتا یا پھر کوئی اٹھاتا نہیں۔ اس کے بعد کافی مرتبہ میں نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، مگر کبھی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ سال پر سال بیتتے رہے۔ میں اپنی محبت کا ماتم کرکے دل پر جبر کرتی رہی۔ اس کے بعد میرے کافی رشتے آئے، مگر میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اپنی زندگی کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کردیا۔ شاہ زیب کے دھوکہ دینے اور امی کا اپنی اولاد سے ایسا رویہ رکھنے کی وجہ سے میرا رشتوں پر سے اعتبار ہی اُٹھ گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میری ایجوکیشن اتنی متاثر ہوئی کہ کہاں کا ایل ایل بی اور کیسی ڈگری، پڑھائی سے دل ہی اچاٹ ہوگیا۔ ذہن ہر وقت مختلف سوچوں کی طرف بھٹکتا رہتا۔ زندگی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ میری زندگی میں ایسا آندھی طوفان آیا کہ میرا سب کچھ اڑا کر لے گیا۔ ان مسائل میں گھر کر میری تعلیم ادھوری رہ گئی۔ زندگی کے پانچ برس یوں بیت گئے کہ پتا ہی نہ چلا، مگر یہ پانچ برس میرے لیے پانچ صدیاں ثابت ہوئے۔ میں لحہ لحہ مرتی اور لحہ لحہ جیتی۔ ان پانچ برسوں میں شاہ زیب دو بچوں کا باپ بن چکا تھا، مگر میں نے سنا تھا وہ اپنی زندگی سے خوش نہیں ہے۔ میں نہ اس بات سے خوش ہوئی تھی اور نہ افسردہ، مگر خاموش ہوکر رہ گئی اور اپنی زندگی سے سمجھوتا کرلیا تھا کہ ان ہی دنوں ہمارے یہاں ٹیلی فون لگ گیا۔ یہ بھی باجی نے اپنے خرچے سے لگوایا تھا۔ ٹیلی فون کی آمد نے ہماری بچھڑی ہوئی محبت کو دوبارہ ملا کر پرانی یادوں کو تازہ کردیا اور اسی طرح محبت کی وہ چنگاری جو پانچ سال کی گرد میں دب کر ٹھنڈی ہوچکی تھیں، بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ ہوا کچھ یوں کہ اس دن میں ناشتے سے فارغ ہوکر چھت پر بیٹھی اپنے ماضی کو کرید رہی تھی کہ چھوٹی بہن نے آکر کہا۔ ''شرمین تمہاری سہیلی کا فون ہے۔'' میں سوچوں کے تانے بانے بنتی ہوئی نیچے آئی کہ اتنے سال بعد میری کس سہیلی نے مجھے یاد کیا ہے، لیکن دوسری طرف کی آواز سن کر میرے ہونٹوں کی روٹھی ہوئی ہنسی دوبارہ آباد ہوگئی اور میرے مردہ وجود میں ایک دفعہ پھر جان آگئی۔ اس آواز کو تو میں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی، کیوں کہ وہ آواز کسی اور کی نہیں، شاہ زیب کی تھی۔ شاہ زیب اپنے کیے پر بہت شرمندہ تھا۔ اس نے مجھ سے معافی تلافی کی۔ گلے شکوے کے بعد اس نے بتایا کہ ''میں اپنی بیوی سے خوش نہیں ہوں۔ میرے ماں باپ نے یہ شادی زبردستی کردی تھی۔ اب میں تم سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ اگر تم راضی ہوجاؤ تو میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔''

☆......☆

ملنے کا راستہ کھلا تو پھر کھلتا ہی چلا گیا اور میں اپنے انجام اور اس بات سے بے نیاز کہ شاہ زیب اب شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے، اپنی محبت کی اندھی راہوں پر چلنا شروع ہوگئی، مگر اس کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے گھر سے نکلنا پڑتا، کیوں کہ روزانہ تو میں گھر سے اسے فون نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے کبھی گھر سے اور کبھی پی سی او سے کرتی۔ کبھی وہ گھر کے نمبر پر خود ہی فون کرلیتا۔ ایک دن امی نے مجھے اس سے باتیں کرتے ہوئے میری باتیں سن لیں۔ انہوں نے مجھے بہت بُرا بھلا کہا۔ اس واقعے کے بعد میں محتاط ہوگئی اور کچھ عرصہ اس سے بات نہیں کی، تاکہ امی کا مجھ پر سے اعتبار ختم نہ ہو۔ جب امی کو اطمینان ہوگیا تو میں آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگی اور ایسے منصوبے بنائی، جس میں مجھے مسلسل گھر سے باہر رہنا پڑے یا پھر صبح سے شام تک کی کوئی ایسی جاب ہو، جس میں گھر کر میں گھر پہ کم ٹائم دے سکوں، پھر میں نے اپنی ایل ایل بی کی تعلیم مکمل کرنے کا سوچا، تاکہ ساتھ میں پریکٹس کے بہانے زیادہ سے زیادہ باہر رہ سکوں۔

یہ میری تقدیر کہ ان ہی دنوں باجی کی بچیوں کا مسئلہ درپیش آگیا۔ اس طرح مجھے اپنے مسئلے کا حل نظر آیا، مگر میں اپنے دل کی بات زبان تک نہ لاسکی، پھر جب امی نے باجی کے مسئلے کو حل کرتے ہوئے کہا کہ ''تم اپنے

خرچ پر اپنے بھائیوں کو دبئی شفٹ کراؤ اور بدلے میں شرمین تمہاری بچیوں کی ذمے داری اٹھائے گی۔ تم بچیوں کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ امی کی اس بات سے ایک طرف تو مجھے اپنا منصوبہ کامیاب ہوتا نظر آیا، دوسری طرف امی پر بے انتہا غصہ آیا کہ یہاں پر بھی امی نے لالچ کی ہی بات کی۔"

میری عمر تیس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ اس عمر میں مائیں اپنی بیٹیوں کی شادی کی بات سوچتی ہیں نہ کہ انہیں کمائی کا ذریعہ بنانے کا۔ امی نے اپنے بچوں کی اگر پروا کی بھی تو صرف پیسے کے حصول کے لیے اور اولاد کو صرف پیسا بنانے کی مشین سمجھا۔ میرے لیے امی نے یہ نہیں سوچا کہ اس کی عمر نکل گئی تو کون ہوگا جو مجھے قبول کرے گا۔ مائیں تو بیٹیاں پیدا کرتے ہی ان کے بیاہ کے خواب دیکھنے لگتی ہیں اور لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی ماؤں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں، مگر یہ ہماری کیسی ماں تھی جسے صرف پیسے کی ہوس تھی۔ اولاد کی خوشی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ امی کے اسی رویے کی وجہ سے میں نے شاہ زیب کی خاطر اپنی ماں سے ٹکر لینے کا سوچ لیا تھا اور کیوں ٹکر نہ لیتی۔ جب ماں کو ہمارا خیال نہیں تو پھر اولاد کو تو باغی ہونا ہی تھا۔ گھر میں جوان بیٹیاں بیٹھی تھیں اور ہماری ماں مزے سے خواب خرگوش کی نیند لے کر امیر بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ میں نے امی کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں امی کے اس فیصلے کو خوشی خوشی قبول کر کے بچیوں کو لے کر پشاور باجی کے اس گھر میں شفٹ ہو گئی، جو باجی نے اپنی جاب کے درمیان بنایا تھا۔ وہاں میں نے ایل ایل بی میں داخلہ بھی لے لیا اور شاہ زیب سے ملنے کا راستہ بھی نکال لیا۔

☆......☆

میں یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ کبھی تو امی کا دل میری خدمات دیکھ کر پسیج جائے گا، مگر امی بھی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں کہ انہیں پیسے کے آگے اور نوٹوں کے پیچھے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اب شاہ زیب اسلام آباد سے ہر ویک اینڈ کی رات کو مجھ سے ملنے آتا اور چھٹی گزار کر صبح چلا جاتا۔ یہ لمحات میرے لیے عید سے کم نہیں ہوتے۔

ہمیں اس طرح ملتے ہوئے تقریباً دو سال ہو چکے تھے۔ ایک دن میں نے امی سے شاہ زیب کے لیے بات کی تو امی یہ بات سن کر آگ بگولہ ہو گئیں۔ انہیں اعتراض اس بات پر تھا کہ شاہ زیب شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔ میں نے امی کو ہر ممکن طریقے سے یقین دلایا کہ شاہ زیب میری خاطر اپنی پہلی بیوی کو چھوڑنے کے لیے تیار ہے۔ اس کی شادی ماں باپ نے زبردستی اس کی مرضی کے خلاف کر دی تھی، مگر امی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ "کسی بھی طرح سے کی تھی، اب وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے، اس لیے تمہیں اس کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔" مگر میں اپنی ہاری ہوئی محبت کو، جو جیت کی صورت میں ایک بار پھر مجھے ملنے والی تھی، اسے دوبارہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ امی کے منع کرنے کے باوجود میں نے اپنی روش قائم رکھی اور باتوں باتوں میں امی کو شاہ زیب کے لیے راضی کرتی، مگر امی بھی اپنی ضد کی پکی عورت تھیں۔ وہ میری باتیں سنی اَن سنی کر دیتیں، بلکہ میرے رشتے کے لیے ایسے گھرانوں میں ہاتھ پیر مارتیں، جہاں سے انہیں حق مہر میں لاکھوں کی جائیداد ملے، شاید وہ اپنے فیصلے میں صحیح ہوں، کیوں کہ بیوی بچے والے مرد کو تو کوئی بھی اپنی بیٹی نہیں دے سکتا، لیکن میں امی کی ہی اولاد تھی۔ میں بھی اپنی ضد سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ میرا امی سے صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ "میری شادی کروا دو اور وہاں کرو جہاں میں چاہتی ہوں۔" امی کسی قیمت پر بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھیں۔ میری باتیں سن کر کہتیں کہ "تمہاری ابھی اتنی عمر نہیں ہوئی ہے کہ تم ماں کو مشورے دو۔ جب وقت آئے گا تو ہم خود تمہارے لیے رشتہ دیکھ لیں گے۔" امی تو یہ کہہ کر چھوٹ جاتیں، مگر میں ہر پل انگاروں پر لوٹتی رہتی۔

☆......☆

وقت گزرتا رہا میں اپنی روش پر قائم رہی۔ میں نے اپنے منصوبے میں رضوانہ اور بڑے بھائی کو بھی شامل کر لیا تھا۔ وہ دونوں تو تھے ہی امی کے خلاف، فوراً میرے منصوبے میں شامل ہو گئے اور ایک دن میں نے امی ابو سے چھپ کر رضوانہ اور بھیا کی ہمراہی میں خفیہ طور

پر شاہ زیب سے نکاح کر لیا، کیوں کہ اس کے بعد امی کو انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ بڑے بھائی صرف میری خاطر کراچی سے آ گئے، مگر انہوں نے میرے نکاح کا گواہ بننے سے انکار کر دیا، شاید اب تک ان کے دل میں امی ابو کا خوف تھا، لہٰذا گواہوں کا انتظام بھی رضوانہ نے ہی کیا، یوں رضوانہ پر میرا اعتماد مزید بڑھ گیا۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ اگر امی نے مجھے شاہ زیب کے ساتھ قبول نہیں کیا، تو میں اپنے گھر میں سوائے رضوانہ کے کسی سے رشتہ نہیں رکھوں گی۔ رضوانہ نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ اس کے مشورے پر ہی میں نے باجی سے کہا! "مجھے کچھ رقم بھیجو، میں یہاں گھر کی مرمت کروانا چاہتی ہوں۔" باجی نے دبئی سے مجھے 50 ہزار درہم بھیجے، جو پاکستانی تقریباً لاکھوں میں بنے۔ میں نے ان پیسوں سے اپنے جہیز کے لیے مختلف چیزیں خریدیں، کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ جب امی کو میرے اس اقدام کا پتا چلے گا تو وہ کسی بھی قیمت پر مجھے جہیز نہیں دیں گی اور جہیز کے بغیر لڑکی کی سسرال میں کیا عزت ہوتی ہے، یہ تو سب ہی جانتے ہیں، پھر میں کا ہے بگاہے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے باجی سے پیسے اینٹھتی اور اپنا اچھے سے اچھا جہیز بناتی، اس طرح کچھ وقت اور آگے سرکا۔

☆......☆

میں جب بھی شاہ زیب سے پہلی بیوی کو طلاق دینے کی بات کرتی، شاہ زیب کہتے میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہوں، کوئی بات ہو تو میں اسے طلاق دے دوں۔ اِدھر میں یہ سوچتی کہ کسی صورت سے بھائی میرے نکاح کی بات امی ابو کو بتا دیں، مگر بھائی بھی ایک ڈرپوک مرد ثابت ہوئے۔ میں نکاح کر کے بڑی مشکل میں پھنس گئی تھی۔ نہ میں شاہ زیب کو چھوڑ سکتی تھی اور نہ وہ مجھے عزت سے مل سکتا تھا۔ اُدھر شاہ زیب کے گھر والوں کو جب اس کے نکاح کا پتا چلا تو انہوں نے کہرام مچا دیا۔ اس کی بیوی روٹھ کر میکے چلی گئی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور شاہ زیب سے طلاق کی بات کی، مگر نہ جانے کیوں شاہ زیب ٹال مٹول کرتا رہا، پھر شاہ زیب کے سمجھانے پر گھر والے راضی ہو گئے اور بیوی بھی واپس آ گئی۔ نہ جانے شاہ زیب نے کس طرح انہیں منایا اور آئندہ کا کیا لائحہ عمل سوچا ہوا تھا۔ جب امی کسی طور نہیں مانیں تو میں نے شاہ زیب کی بات پر عمل کرنے کا سوچا۔ اس کا مشورہ تھا کہ نکاح تو ہو ہی چکا ہے۔ بچیوں کو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر میرے ساتھ اسلام آباد شفٹ ہو جاؤ، مگر میں چاہتی تھی کہ امی کے ساتھ صلح کی کوئی صورت نکل آئے۔ مجھے اپنی ناؤ کنارے لگتے نظر نہیں آتی تھی۔ میں بیچ بھنور میں تھی اور چاروں طرف طوفان تھا۔ جب مجھے بات کسی صورت بنتی نظر نہیں آئی تو میں نے ایک دن بچیوں کو اسکول بھیج کر شاہ زیب کو فون کیا کہ "تم آ جاؤ، میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔"

شاہ زیب اسلام آباد سے کئی گھنٹے کی مسافت طے کر کے جب پشاور پہنچا تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے، میں نے کھانا اور اپنے جانے کی تیاری تو پہلے ہی کر لی تھی۔ اپنے جانے کی اطلاع رضوانہ کو دی اور گھر کو تالا لگا کر پڑوس میں چابی دے کر کہا۔ اگر بچیاں آئیں تو کہنا میں بازار تک گئی ہوں، تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی اور شاہ زیب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر حالات اور مستقبل کی پروا کیے بغیر اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گئی۔ یہاں پر بھی رضوانہ نے ہی میرا ساتھ دیا اور میرے جہیز کا سامان اسپتال کے پیون سے کہہ کر ٹرک پر لاد کر اسلام آباد پہنچا دیا۔ اسلام آباد پہنچ کر میں نے پی سی او سے فون کر کے گھر پر اپنے نکاح اور شاہ زیب کے ساتھ جانے کی اطلاع دے دی۔ میں آنے والے حالات سے مطمئن تھی، کیوں کہ میں نے اسلام آباد کی بجائے جان بوجھ کر لاہور کا نام لیا تھا، تاکہ گھر والے مجھ تک نہ پہنچ سکیں، مگر میرے نکاح میں جو دوسرا گواہ تھا، اس نے میرے والدین کو میرے اسلام آباد میں قیام کا بتا دیا۔

امی ابو میرے گھر آئے، اس وقت میں بھی ہمت و جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے والدین کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی اور مضبوط لہجے میں بولی۔ "امی جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے عزت سے شاہ زیب کے ساتھ رخصت کر دیں، مگر آپ اپنی ضد پر اڑی رہیں، اب میں اپنی ضد سے نہیں ہٹ سکتی۔ میں نے شاہ زیب سے نکاح کر لیا ہے۔ اگر آپ کا دل چاہے تو مجھے قبول کر لیں۔ اگر نہ چاہیں تو یہ آپ کی مرضی، میں شاہ زیب کو

نہیں چھوڑ سکتی۔"

میری وہ دوٹوک بات سن کر امی نے بھی دوٹوک جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم نے جو چاہا، وہ کرلو۔ اب میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں، کبھی ملنے کا دل چاہے تو خوابوں میں ملاقات کرلینا۔ آج سے ہم اور تم ایک دوسرے کے لیے مر گئے، ہم تمہیں مار کر قتل کا گناہ نہیں کر سکتے، مگر بد دعا ضرور دیتے ہیں کہ تم کبھی سکھ چین نہ پاسکو اور اولاد کے ہاتھ اسی طرح رسوا ہو، جس طرح تم نے ہماری عزت مٹی میں ملائی ہے۔ تم بھی ماں بنو اور وہ بھی بیٹے اور بیٹی دونوں کی، تب تمہیں احساس ہوگا کہ ماں کی ممتا کیا ہوتی ہے۔" امی تو کہہ کر چلی گئیں، لیکن میرے لیے آزمائش کے دروازے کھول گئیں۔

تقدیر انسان کے لیے کیا سوچے بیٹھی ہے، اس کی مجھے تو کیا کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ ہم سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے۔ اپنے غرور اور بدلے کی آگ میں جل کر یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وقت کی لگام ہمارے ہاتھ میں دے رکھی ہے، لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دردِ زہ کی تکلیف کو برداشت کر کے ایک عورت جو ایک انسان کو جنم دیتی ہے اور ایک تخلیق کار بن جاتی ہے، وہ بھی اپنی اولاد کی تقدیر اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتی۔

ہوا کچھ یوں کہ شاہ زیب نے میرے لاکھ کہنے کی باوجود اپنی پہلی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ شادی کے بعد اس نے تو اپنا رنگ ہی بدل لیا۔ جو محبت اور مٹھاس شادی سے پہلے ان کے لہجے سے ٹپکتی تھی، وہ نہ جانے کہاں سو گئی تھی، شاید اس وقت انہیں احساس ہوا ہوگا کہ وہ کتنی بڑی حماقت کر بیٹھے ہیں۔ میں شاہ زیب سے جب بھی اپنی سوکن کے متعلق بات کرتی، تو وہ کہہ کر خاموش کرا دیتے کہ تم بھی رہو اور وہ بھی رہے گی۔ میں اسے طلاق دے کر بچوں کی زندگی برباد نہیں کرسکتا۔" شاہ زیب کی وہ بات جو انہوں نے مجھ سے کہی تھی کہ میں اپنی بیوی سے خوش نہیں ہوں، مگر میں یہ نہ جان سکی اور نہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا شاہ زیب اپنے بچوں سے بھی خوش نہیں ہے۔ میں جب بھی اپنے سسرال جاتی، وہاں ہر کوئی مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتا۔ کسی کے بھی دل میں میرے لیے نہ تو کوئی عزت تھی نہ ہی کوئی احترام۔ تنگ آکر میں نے سسرال جانا ہی چھوڑ دیا۔ ویسے بھی میرے جانے یا نہ جانے سے کسی پر کون سا فرق پڑتا تھا۔ میری حیثیت ایک ایسی عورت کے جیسی تھی، جسے مرد صرف اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ مجھے نہ رات کو سکون تھا نہ دن کو چین۔ ایسی حالت میں مجھے اپنی ماں بہت یاد آتی تھی۔ اس کی وہ بددعا کہ "تم کبھی سکھ چین نہ پاسکو" میں ہر پل روتی، اپنے کیے پر نادم ہوتی، مگر "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

☆......☆

ایک دن میں نے شاہ زیب سے حتمی بات کرنے کا سوچا۔ وہ جب آفس سے گھر آئے تو اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے اتنی دیر سے گھر آنے کی وجہ پوچھی تو کام کی زیادتی کا بہانہ بنا کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میں نے کھانے کا پوچھا تو بولے کہ "آفس کے کولیگ کے ساتھ کھالیا تھا۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا کہ "بہانہ تو بہت اچھا بنایا ہے تم نے۔" تب وہ بھی غصے سے بولے۔ "مطلب کیا ہے تمہارا۔" مجھے بھی بہت شدید غصہ آیا اور میں چلا کر بولی۔ "آفس کے کولیگ کے ساتھ کھایا یا پھر رخسار کے ساتھ۔" تب وہ بڑے اطمینان کے ساتھ بولے۔ "اگر رخسار کے ساتھ کھالیا تو کون سی قیامت آگئی، وہ میری پہلی بیوی ہے اور تم دوسری اور دو نمبر کبھی بھی ایک نمبر کی جگہ نہیں لے سکتا۔" میں نے بھی دُوبدو جواب دیا۔ "اور پہلی محبت کون ہے۔" وہ میری بات کو اگنور کرتے ہوئے بولے۔ "محبت کوئی بھی ہو، بس یہ سمجھ لو کہ وہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ اس کے آگے میں اب کچھ سننے کا روادار نہیں ہوں۔ اگر تم نے زیادہ زبردستی کی تو تمہیں طلاق دینا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ ویسے بھی جو غلطی میں کر بیٹھا ہوں، اس کی بہت بڑی سزا بھگت رہا ہوں۔" اس دن ہمارے درمیان بہت تلخ کلامی ہوئی۔ جب بات طلاق تک پہنچی تو میں نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔ اس دن کے بعد سے میں نے چپ رہنا سیکھ لیا۔ اس موضوع پر یہ گفتگو ہمارے درمیان آخری تھی۔ شاہ زیب کی یہ بات

سن کر میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ وہی شاہ زیب تھا، جو میری محبت کا بھرم بھرتا تھا، آج کیسے منہ پھیر کر بات کر رہا تھا۔ میرے من میں شدت سے یہ خواہش جاگی، "کاش اللہ مجھے بھی ایک بچہ عطا کردے۔" اس کے لیے میں نے جدوجہد کرنی شروع کردی۔ اپنی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے شاہ زیب کو اپنے اعتماد میں لینا بہت ضروری تھا۔ شاہ زیب کے ساتھ تلخ کلامی کے بعد میں یہ تو جان ہی چکی تھی کہ آج تک میں ان کو امپریس نہیں کرسکی ہوں۔ میں نے ان سے الجھنا چھوڑ دیا تھا اور ان کی روزمرہ کی روٹین کو بھی اگنور کرنا شروع کردیا۔

☆......☆

شاہ زیب تو دو کشتیوں میں سفر کر ہی رہے تھے، مگر مجھے بھی اپنی کشتی کنارے لگتی نظر نہ آتی تھی۔ میں بیچ بھنور میں تھی اور چاروں طرف شدید طوفان، جس کی زد میں آکر مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ ان دنوں میری حالت جلے پیر کی بلی جیسی تھی، جسے کسی کل چین نہیں ہوتا۔

رضوانہ سے جب بھی بات کرتی، وہ بھی صبر کرنے کا مشورہ دیتی۔ اسی سے مجھے امی کے گھر کے حالات کا پتا چلتا رہتا کہ وہاں کوئی بھی میرے لیے اچھے تاثرات نہیں رکھتا اور اس گھر میں میرے لیے اب کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایسے حالات میں، میں صبر کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی، تب میں نے نماز اور روزے کا سہارا لے کر اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا شروع کی اور اولاد کے حصول کے لیے ہر وقت دعائیں مانگا کرتی، لیکن ماں باپ کو ناراض کرنے والے سے تو اللہ بھی ناراض رہتا ہے، اس لیے مجھے اولاد ملی بھی تو سزا کی صورت میں۔

☆......☆

ماں بننے کی خبر میرے لیے خوشیاں لے کر آئی اور جڑواں بچوں کی آمد میرے لیے خوشی کا باعث بنی۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا، جب اللہ نے مجھے جڑواں بیٹا اور بیٹی سے نوازا تھا۔

ماں کی ممتا کا احساس مجھے اس وقت ہوا، جب دونوں بچے میری گود میں آئے۔ اس وقت مجھے امی کی وہ بددعا یاد آئی کہ "تم بھی ماں بنو اور وہ بھی بیٹے اور بیٹی دونوں کی۔" اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ساتھ جڑواں بچوں کی ماں بنا دیا تھا۔ میں نے دونوں بچوں کو گود میں لے کر عہد کیا کہ کبھی بھی اپنے بچوں کو لالچ کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گی، لیکن ماں باپ اپنی اولاد کے لیے خواب تو بہت اونچے اونچے دیکھتے ہیں، مگر ان کی تکمیل صرف نصیب کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ گلاب کی تمنا جب ہی کرنی چاہیے، جب گلاب کی قلم لگائی ہو۔ بچوں کو پاکر میں تو بہت خوش تھی، مگر شاہ زیب نے صرف اپنی فارمیلٹی پوری کی اور کرتے بھی کیا۔ بیٹے بیٹی کی خوشی تو وہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ بچوں کے نام بھی میں نے ہی رکھے ساحرہ اور دانیال۔

☆......☆

میں نے ایک دفعہ پھر شاہ زیب پر پہلی بیوی کو طلاق دینے کا زور ڈالا۔ ان کا آج بھی وہی جواب تھا۔ کاش شاہ زیب کی شادی کے بعد میں بھی شادی نہ کرنے کے فیصلے پر ڈٹی رہتی تو آج اس طرح بے بس نہ ہوتی۔ میرے بہن بھائی سب اپنی اپنی زندگیوں میں خوش تھے سوائے ایک میرے۔

میرے والدین کا انتقال ہوا تو میری بدنصیبی میں اپنے ماں باپ کا آخری دیدار بھی نہ کرسکی، وہ مجھ سے ایسے ناراض ہوئے کہ انہیں یہ غرض نہیں کہ میں آؤں یا نہ آؤں، میرے آنے کا انتظار کرے بغیر دنیا سے رخصت ہوگئے۔ آخری وقت میں انہوں نے مجھ سے ملنے کی تمنا بھی نہیں کی۔ ایسی صورتِ حال میں مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا۔

جب میرے اندر احساس ندامت جاگا تو بہت دیر ہو چکی تھی اور پانی سَر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اس وقت ہاتھ پیر مارنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر اپنے اس نقصان کا ازالہ نہیں کرسکتی تھی، جو انجانے میں کر چکی تھی اس وقت میں اچھے بُرے کی تمیز نہ کرپائی یا میں کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس میں میرا اپنا قصور تھا، کیوں کہ نکاح کرتے وقت اور گھر سے چلتے وقت میں سولہ سال کی نوخیز کلی نہیں 35 سال کی بھرپور سمجھدار عورت تھی۔

پچیس سال گزر گئے، رضوانہ مجھ سے ملنے آتی تو میکے کا احساس جاگ اُٹھتا۔ ہم دونوں بہنیں اپنے ماضی کو یاد کرکے کبھی ہنستے تو کبھی روتے۔ زندگی ایسے ہی چلتی رہی۔ 25 سال میں بچے دونوں بڑے ہوگئے، لیکن شاہ زیب کی اپنی وہی روٹین رہی اور میں...... میں تو تھی برباد۔

ادھر وقت بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگتا رہا، اُدھر بچے دونوں بے لگام ہوتے جارہے تھے۔ دونوں اپنی مرضی کے مالک تھے۔ میری نصیحت تو وہ ایک کان سے سن کر اسی کان سے نکال دیتے، دوسرے تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ نہ جانے میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی کہ بیٹا تو بیٹا، بیٹی بھی مجھے اپنی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ میری بربادی کی ذمے دار میری تربیت تھی یا میری حرکت، یہ میں کبھی سمجھ نہ پائی۔

سمجھ تو اس دن آئی جب ساحرہ میرے لاکھ منع کرنے کی باوجود افضل سے کورٹ میرج کرنے کے بعد میرے سامنے کھڑی اپنے حسین کارنامے کی خبر دے رہی تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ ہم جیسے لوگوں کو اولاد اسی لیے دیتا ہے کہ وہ ہمیں ہمارے ماضی کی یادوں کا آئینہ دکھاسکیں۔ ساحرہ تو نکاح کرکے واپس آ بھی گئی تھی، مگر میں نے تو اپنے اوپر اپنے باپ کے گھر کے ہر دروازے کو بند کردیا تھا۔ میں سب کچھ حاصل کرکے بھی خالی دامن تھی۔ شاہ زیب کو میرے ان حالات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی اس زندگی میں مگن تھے۔ میرے گھر مہینے میں ایک دفعہ صرف اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے آتے تھے۔ ساحرہ کی اس حرکت کے بعد میں بہت پشیمان ہوئی۔ میرا تو نہ میکہ تھا نہ سسرال والے ملتے تھے، تب اتنی بدنامی ہوئی تھی۔ جب میں نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہوگا، تب میرے ماں باپ نے اپنے بھرے پُرے خاندان کا کس طرح سامنا کیا ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر میں پاگل سی ہوجاتی۔ ماضی ایک دردناک عذاب بن کر میرے سامنے کھڑا تھا، جب ساحرہ نے مجھ سے کہا کہ اس نکاح میں نے کرلیا ہے۔ رخصتی آپ کردو، تب مجھے ساحرہ پر طیش تو بہت آیا، مگر اس وقت میں نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا، کیوں کہ مجھے معلوم تھا یہ ساحرہ نہیں، میرا خون بول رہا ہے اور خون کا اثر خون میں ضرور آتا ہے۔"

☆......☆

ایک دفعہ تو میں نے سوچا کہ ساحرہ کو رخصت کرکے اپنی زندگی سے بے دخل کردوں، مگر پھر میں ایسا نہ کرسکی، کیوں کہ میں اپنی ماں کی طرح کٹر دل اور لاپچی طبیعت کی مالک نہیں تھی اور ماضی کو دہرانا نہیں چاہتی تھی، لہٰذا شاہ زیب کو بلاکر تمام واقعات ان کے گوش گوار کیے۔ وہ تو میرے اوپر ایسے بگڑے کہ جیسے تمام واقعے کی ذمے دار اکیلی میں ہوں۔

مرد کچھ بھی کرتا پھرے، کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا، مگر عورت کی ذرا سی بات پر پورا معاشرہ دست سوال بن کر کھڑا ہوجاتا ہے، چاہے قصور کسی کا بھی ہو۔ یہاں میں نے ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہوئے شاہ زیب سے کہا۔ "اب جو ہونا تھا وہ ہوگیا، تم اس کی رخصتی سادگی سے کردو، ورنہ یہ لوگ بھی شاہ زیب اور شرمین بن جائیں گے۔" تب انہوں نے افضل کے گھر والوں کو برات لے کر آنے کی اجازت دے دی۔ میری طرف سے کون تھا، ایک رضوانہ کو ہی بلانا تھا، وہ اپنے بچے لے کر آگئی تو گھر میں تھوڑی بہت رونق لگ گئی اور میری بیٹی ماں باپ کے ساتھ ساتھ خالہ کے بھی شفقت بھرے سائے اور محبت بھری دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ وہ اپنی زندگی میں خوش تھی۔ افضل نے اسے بہت اچھی طرح سے رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں مطمئن تھی کہ میرے ایک فیصلے نے دو لوگوں کو برباد ہونے سے بچالیا تھا، مگر پھر ایک طرف بے چین ہوجاتی تھی کہ میرے ایک غلط ہی فیصلے نے کتنے لوگوں کو برباد کرنے میں کتنا اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں بیٹی کی طرف سے مطمئن ہوئی تو بیٹے نے آزمائش کے دروازے کھول دیے۔ بیٹا بھی اپنی بہن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بے غیرتی کی تاریخ رقم کررہا تھا۔ اسے مختلف لڑکیوں کے ساتھ افیئر اور غلط لڑکوں کی صحبت نے کب بگاڑا، مجھے پتا ہی نہ چلا۔ میری آنکھیں تو اس دن کھلیں، جب وہ بہکتے قدموں کے ساتھ نشے میں دھت گھر میں داخل ہوا۔ میرے تو پیر لرز کر رہ گئے۔ میرے لیے ایک دفعہ پھر امتحان کی گھڑیاں شروع ہوگئیں۔ میں نے شاہ زیب سے اس کے متعلق بات کی تو انہوں نے تو یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ "میں پیسے بھیج دیتا ہوں تم اس کا علاج کرالو اور اس پر کڑی نگاہ رکھنا، کیوں کہ میں آفس سے اتنی لمبی چھٹی نہیں لے سکتا۔ یہ سب تمہاری غلط تربیت کا نتیجہ ہے، پہلے ساحرہ اور اب دانیال۔"

☆......☆

ایک دفعہ پھر میں قصوروار ٹھہرادی گئی۔ شاہ زیب کا تو اتنا ہی احسان کافی تھا کہ وہ ہمارا خرچہ اٹھارہے تھے اور انہوں نے ہمیں اپنی زندگی سے بے دخل نہیں کیا تھا۔ بروقت علاج اور محنت کی بدولت دانیال آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔ میں بہت خوش تھی کہ میری محنت رنگ لارہی تھی، مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری یہ خوشی عارضی ثابت ہوگی۔ دانیال صحیح تو ہوگیا، مگر اس نے لڑکیوں سے عشق کرنے کی عادت نہ چھوڑی اور پھر ایک دفعہ اپنے ان دوستوں کی بدولت دانیال اپنی اسی راہ پر لگ گیا، جس سے بچانے کی خاطر میں نے کہاں کہاں دھکے نہیں کھائے تھے۔ شاہ زیب کی ناراضگی مول لی، اب دانیال کی یہ حالت ہے کہ صرف ضرورت کے تحت گھر آتا ہے، ورنہ میں اکیلی جان گھر میں پڑے ہلکان ہوتی رہتی ہوں۔ میں اب کہاں اس کے لیے ماری ماری پھرتی رہوں۔ اپنی قسمت پر صبر کرکے بیٹھ گئی ہوں۔ شادی میں اس کی اس حالت میں کر نہیں سکتی، کیوں کہ میں اتنی کٹھور نہیں ہوں کہ اپنی اولاد کے معاملے میں کہ میں کسی شریف لڑکی کی زندگی برباد کردوں، کیوں کہ کم از کم اپنے ماضی کو یاد کرکے مجھے اتنا تو یقین ہے کہ وہ بھی کسی دن ساحرہ والی حرکت کرے گا اور اپنے ہی قماش کی کوئی لڑکی بھگا لے آئے گا۔ اب میری گلی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں ہے کہ بدنامی کا بوجھ اٹھاؤں، اس لیے اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کردیا ہے، وہ جو کرے گا بہتر کرے گا۔

☆......☆

آج میں سوچتی ہوں اگر امی اپنی جگہ صحیح نہیں تھیں تو میں بھی تو غلط ہی تھی، کیوں میں نے ایک شادی شدہ عورت کی زندگی برباد کی کہ اس کی زد میں آکر میں بھی آباد نہ رہ سکی۔ اگر میں اس وقت ہی صبر کرکے بیٹھ گئی ہوتی تو آج مجھے ذلت، تنہائی اور بربادی کا اتنا کڑوا گھونٹ نہ پینا پڑتا، صرف رات کے اندھیروں میں گھر سے بھاگنے والی لڑکیاں ہی راستہ نہیں بھٹکتی ہیں، بلکہ دن کی روشنی میں گھر سے غلط مقصد کے لیے نکلنے والی لڑکیاں بھی راستے کا صحیح تعین نہیں کرپاتیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ غلطی پر ہوتی ہیں۔

زندگی کے وہ پُرپیچ راستے جو میری زندگی کی راہوں میں سولہ برس کی عمر میں آئے تھے۔ ان پر سفر کرتے ہوئے میں کہاں تک پہنچ گئی۔ آج میں خالی دامن کہاں جاؤں، کس کا سہارا تلاش کروں۔ میری کوئی منزل نہیں، میرا کوئی نشان نہیں، میری کوئی زندگی نہیں، میرا کوئی مقام نہیں۔

میری زندگی میں صرف خاروار جھاڑیاں ہیں اور آج بھی منزل کی تلاش ہے۔ میں روتی ہوں اور میری تقدیر مجھ پر ہنستی ہے۔ میں رات بھر جاگتی ہوں اور میرے نصیب کی خوشیاں نہ جانے کہاں سورہی ہوتی ہیں۔ شاہ زیب سے شادی کرکے میں کس بُری طرح سے رُلی ہوں، یہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ زندگی کی آخری عمر میں مجھے جس ہم سفر کی تلاش ہے، وہ میرا ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کوسوں دور اپنی پرسکون زندگی میں مگن ہے اور میں تنہا بیٹھی اپنی عمر کی منزلیں پوری کررہی ہوں اور بہتے اشکوں کے ساتھ اپنی زندگی کی کہانی لکھ رہی ہوں۔

آپ قارئین سے التماس ہے مجھے بتائیں کہ میری بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ کس کا تھا۔ میرے باپ کا، جو گھر کا سربراہ اور ایک مرد ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ ایک عورت کے آگے جھکے رہے۔ امی کا جو دولت کے پلڑے میں اولاد کو تولتی رہیں، کیوں کہ جس گھر کے بڑے صحیح نیت نہیں رکھتے، اس گھر میں کبھی محبت نہیں ہوتی یا پھر میرا، جو صرف اپنی دنیا آباد کرنے چلی تھی یا پھر شاہ زیب کا، جنہوں نے شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنا زندگی کا ساتھی چنا۔

☆......☆

انتقام



محمد اسلم آزاد

بلوچستان سے ایک نوجوان کے انتقام کی لرزہ خیز داستان

میرے لیے کیسی عیدیں، کیسی خوشیاں اور کیسی محبتیں......؟ مجھے تو تن پر سرخ جوڑا، ہاتھوں میں رنگین چوڑیاں اور پیروں میں پازیب پہنے بڑی مدت ہوگئی ہے۔ اب تو عید کا دن ہو یا خوشی کا یا اور کوئی تہوار، میرے ہاتھوں میں مہندی اور ماتھے پر بندیا نہیں سجتی۔ اگرچہ آج عید کا دن ہے، ہر طرف خوشیوں کا سماں ہے، مگر میں اکیلی عورت ہوں......تنہا......!

تپتی دھوپ میں سرمئی ریت کی تپش اور ذہن پر سوچوں کا حصار، پاؤں میں بھاری بھر کم جوتے، پسینے سے شرابور چند گدھوں پر مشکیزے لادے پانی کی تلاش میں کب تک اس بیابان میں ماری ماری پھرتی رہوں گی۔

ایک دو جگہ پر پہلے جہاں تھوڑا بہت پانی کھڑا تھا، اب وہ بھی سخت گرمی اور سورج کی تپش سے سوکھ گیا ہے اور اس جگہ پر بہت سی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بے جان سی پڑی دیکھ کر میرے قدموں سے بھی جان نکلتی جارہی ہے اور جب میں آگے کی طرف قدم بڑھاتی ہوں تو از خود میرے قدم پیچھے کی طرف اُٹھ جاتے ہیں۔ شدت پیاس سے میرا حلق اتنا خشک ہوگیا ہے کہ اب گدھوں کو ہانکنے کی بھی مجھ میں سکت نہیں رہی ہے اور وہ بھی اپنے منہ اِدھر اُدھر کر کے آگے کی جانب بڑھ رہے ہیں، کیوں کہ انہیں بھی پیاس نے نڈھال کر دیا ہے۔

وہ سامنے مٹی کا اُڑتا ہوا غبار شاید کسی ریوڑ کا ہے جو اس راستے سے پانی کی تلاش میں گیا تھا یا پھر واپس لوٹ رہا ہے۔ میں بھی اب اس کے قریب ہی پہنچنے والی ہوں۔ دور سے تو اس کی بھیڑ بکریاں ہشاش بشاش دوڑتی آرہی ہیں، ضرور یہ پانی پی کر آرہی ہیں اور شاید قریب ہی کسی ندی یا بند (کھیت) میں یہ پانی کھڑا ہوگا۔ بھی تو دور سے پانی کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو میرے لیے آبِ حیات بنتی جارہی ہے، اب جی بھر کے پہلے میں خوب نہالوں گی، پھر مشکیزوں میں پانی بھروں گی، مگر ذرا اِدھر اُدھر دیکھ تو لوں کہ آس پاس کوئی چرواہا یا کوئی اور مرد ٹھہرا ہوا تو نہیں ہے......؟

شکر ہے...... یہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔

ٹھیک ہے......اب میں جی بھر کے پہلے خوب نہالوں گی پھر، اس کے بعد میں پانی بھرلوں گی۔ اب ہر روز میں یہاں سے ہی پانی بھرنے آؤں گی، مگر یہ جگہ تو میرے گھر سے بہت دور ہے اور پھر یہاں تک آتے آتے دوپہر ہو جاتی ہے، پھر مجھے واپس گھر

جا کر بیمار ساس کا خیال رکھنا اور اس کے لیے کھانے پینے کا بندوبست بھی کرنا ہے اور بھیڑ بکریوں کے لیے چارہ کاٹ کر لانا ہے، یہ تو بہت ہی مشکل اور بڑا کام ہے، پھر ان سب کاموں سے بڑا مشکل کام تو وہ ہے کہ جب میرے شوہر صاحب صبح کے نکلے شام کو گھوڑے پر واپس آتے ہیں اور اپنا خوب رعب جماتے ہیں، لیکن آج تو میرا بدن تھکن سے چور چور ہے، بھلا اتنے سارے کام میں کیسے کروں گی اور رات گئے تک اپنے میاں کے پیر کیسے دباؤں گی، کیوں کہ آج تو مجھے خود بھی بخار سا محسوس ہو رہا ہے......

خیر کوئی بات نہیں، چلو اب مشکیزے بھر کر واپس گھر جانے کی تیاری کرتے ہیں۔



''آ گئی بختو بیٹی......؟ آج تو بڑی دیر لگا دی تو نے......!''

''ہاں ساسو جی بس کیا پوچھتی ہو......؟ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم گھوم کر تو مجھے بخار سا ہو گیا ہے، وہ تو شکر ہے کہ پرانی ندی کے قریب پانی کھڑا تھا، ورنہ تو بس میری جان ہی چلی گئی تھی، پانی ڈھونڈتے ڈھونڈتے......''

''خیر ہے بیٹی! اب تو ذرا آرام کر لے اور پھر کٹورے میں ڈھانپی ہوئی سویاں کھا لینا، ٹھیک ہے ساسو جی...... میں ذرا آرام کرتی ہوں، مگر شاید میری زندگی میں چین و سکون کا نام نہیں ہے اور نہ ہی سکھ کی نیند......''

ہر دن کی طرح آج بھی میرا بدن ٹوٹ رہا ہے، مگر نیند ہے کہ کوسوں دور......!

ہر دن کی ہر ہر کروٹ پر میری نظر جھگی کے ٹوٹے ہوئے بانسوں میں ایک گھونسلے پر پڑتی ہے تو اس میں بیٹھے ہوئے دو پرندوں پر نظر ٹھہر جاتی ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنی محبت یاد آ جاتی ہے، اپنا پیار یاد آ جاتا ہے اور میرے کانوں میں اس کی پیاری سی آواز آتی ہے۔

”ارے پگلی یہ تم کیا کر رہی ہو......؟ ذرا اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے اٹھا دو اور یہ تم کس انتقام کی بات کر رہی ہو......؟ ان جبر کے رشتوں اور فرسودہ رسموں کے انتقام کی، جاگیرداروں کے غلط فیصلوں یا اس محبت کے انتقام کی، جو ہمارے اور تمہارے دلوں میں بس رہی ہے۔ کیا تم اپنی ذرا سی بھول سے اس محبت کو فنا کر دینا چاہتی ہو......؟ اور کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے اس انتقام سے تمہارے دل کی آگ بجھ جائے گی؟“

”نہیں......ایسا ہرگز نہیں ہوگا، بلکہ یہ آگ تمہارے سارے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی کہ جسے بجھانے کے لیے تم ہر کسی کا ہاتھ پکڑنے میں ذرا سی بھی شرم محسوس نہیں کرو گی۔ میرا کیا ہے......؟ میں تو ایک اجنبی ہوں، جو یہاں اتفاق سے اپنی امی کو علاج کے لیے لایا تھا اور تم اپنی ساس کے ہمراہ اس ہسپتال میں آئی ہو......

کل یا پرسوں ہم آخر کو جدا ہو جائیں گے، پھر تم اپنے گاؤں جا کر اپنے سنگدل شوہر کی بے رخی اور بے دردی کا انتقام کس سے لو گی......؟ کیا کسی راہ چلتے چرواہے سے مل کر......یا کسی بھی گھڑسوار سے گلے مل کر......“

”نہیں، نہیں شہری بابو! تم تو ایسی بری باتیں مت کرو۔ میں اتنی بھی گندی اور بے غیرت عورت......نہیں ہوں، جو تم مجھے اتنا برا بھلا کہہ رہے ہو......؟“

”اگر ایسا ہوتا تو میں نے پہلے بھی تم کو بتایا ہے کہ جب میں سات سال کی تھی، تو میرے باپ اور بھائیوں کا میرے شوہر کے باپ سے جھگڑا ہو گیا تھا، جس میں وہ فوت ہو گیا تو میرے بھائی اور باپ کچھ عرصہ گھر سے غائب رہے، پھر چند مہینوں کی منت سماجت کے بعد وڈیرہ صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ میرا ہاتھ شکر خان کو دے دیا جائے اور مزید 5 لاکھ روپے بھی ان پر جرمانہ عائد کیا گیا تھا۔ جب میری شادی کم سنی میں ہوئی تو میں اپنے ہاتھوں میں مہندی اور رنگ برنگی چوڑیاں اور تن پر سرخ جوڑا دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی، مگر رفتہ رفتہ یہ خوشی غم میں بدلتی چلی گئی۔

پہلے دنوں میں تو مجھے گھر کا تھوڑا کام کرنا پڑتا تھا، لیکن جب ساسو جی بیمار ہو گئیں تو گھر کی ساری ذمے داری میرے کاندھوں پر آ گئی، پھر جب میں جوانی میں قدم رکھنے لگی تو مجھے اپنے شوہر کی بے رخی کا احساس ہوا اور میں ہر ممکن طور پر اس کے قریب رہنے کی کوشش کرنے لگی، مگر ہر بار مجھے وہ مایوس کر جاتا تھا۔

ایک رات میں نے ہمت کر کے اس کی چارپائی پر اس کے ساتھ سونے کی کوشش کی اور نصف شب کو اس کے پہلو میں سو گئی، مگر چند ہی لمحوں کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ بھڑک سا اٹھا اور پھر میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”آج کے بعد اگر تم نے میری چارپائی پر قدم رکھا تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گا۔“

اس کی یہ بات سن کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اس کے پیروں پر گر کر رونے لگی، اور اس سے کہنے لگی ”تم تو میرے شوہر ہو اور تم پر میرا پورا حق ہے کہ میں تمہارے ساتھ اٹھوں اور بیٹھوں......؟“

وہ میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا تھا کہ ”آئندہ میرے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے بارے میں مت سوچو، کیوں کہ میں تمہیں روز تڑپتا، سسکتا اور روتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، کیوں کہ میں جب بھی تم کو دیکھتا ہوں تو مجھے میرا باپ یاد آتا ہے۔ مجھے اس کی خون سے لت پت تڑپتی ہوئی لاش یاد آتی ہے اور پھر اس وقت میرا خون کھولنے لگتا ہے کہ تم میرے باپ کے قاتلوں کی بیٹی اور بہن ہو، جن سے میں اس وقت تو بدلہ نہ لے سکا تھا، مگر اب میں ان سے اور تم سے اپنے باپ کے خون کے انتقام لیتا رہوں گا اور ساری عمر میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا اور اگر اس بارے میں تم نے ذرا بھی اپنا منہ کھولا تو اس سے پہلے میں کسی راہ چلتے شخص کے ساتھ تمہیں کاروکاری کے نام پر قتل کر دوں گا اور مجھے کوئی بھی برا بھلا نہیں کہے گا۔“

ہاں شہری بابو! اتنا ظلم و ستم ہو جانے کے بعد بھی میں نے آج تک اپنا منہ نہیں کھولا، وہ صرف اس لیے نہیں کہ وہ مجھے مار دے گا، بلکہ اس لیے کہ وہ کاروکاری کے نام پر مجھے ذلت آمیز موت دینے میں ذرا بھی دیر نہیں کرے گا، میں بے بسی، محرومی کی زندگی تو جینا چاہتی ہوں، مگر ایسی موت کبھی نہ چاہوں گی کہ کل مجھ پر انگلیاں اٹھتی رہیں کہ ایسی بدکار عورت تھی، بس اسی سیاہ کلنک (دھبے) کی وجہ سے میں اتنے برسوں سے خاموش ہوں اور ابھی تک کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ کہیں بدنامی اور رسوائی میری زندگی کو مزید اجیرن کر دے۔ یہ تو قسمت کی بات ہے کہ میری ساس کی طبیعت خراب ہوئی اور میرے شوہر اسے اس اسپتال میں لے آئے، جہاں تمہاری ماں زیر علاج تھیں۔ تمہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور آنکھیں تمہیں دیکھنے کو بے تاب سی رہنے لگیں، تو میں تمہارے قریب ہوتی گئی۔ اگر سچ مانو تو مجھے تم سے سچی محبت ہو گئی اور میں تم پر دل و جان سے فدا ہو گئی ہوں۔ میری یہ دیوانگی ہے یا اور کچھ کہ میں چند لمحوں کے لیے بہک سی گئی تھی اور برسوں سے پیاسی سمندر کو دیکھ کر اپنی پیاس بجھانے چلی آئی تھی، مگر یہ بھول گئی تھی کہ میں جس کی عزت و آبرو ہوں، میں جس کی شریک حیات ہوں، وہ تو مجھے دھتکار رہا ہے اور جو اجنبی ہے وہ مجھے اتنا عزیز کیوں رکھ رہا ہے......؟ میری عزت و آبرو اور خوشیوں کا خیال کیوں رکھ رہا ہے؟ شاید یہ بھی انتقام لینا چاہتا ہے، جو میری محبت، میری چاہت اس سنگدل سے لے رہی ہے اور اسی محبت کے دم سے میں اب تک جی رہی ہوں۔

جھگی کے ٹوٹے بانسوں کے درمیاں گھونسلے میں دو پیار کرنے والے پنچھی دیکھ کر میں پرنم آنکھوں سے یہ دعا مانگ رہی ہوں کہ ہر پیار کرنے والوں کی طرح یہ جوڑی بھی سلامت رہے۔

ہاں میں تو وہ جبر کے رشتوں کی ماری ہوں کہ جس کے دامن میں نہ پھول ہیں، نہ خوشبو ہے اور نہ چاہت ہے۔ اس عید پر بھی میری آنکھوں میں اشکوں کا ایک سیلاب ہے اور غموں کا طوفان ہے۔ اب میری تنہا زندگی ہے میں ہوں اور میری محبت کا انتقام ہے۔

☆......☆

چھٹی سچ بیانی

پانچ پریاں

شکیل احمد احمدانی

ڈیرہ غازی خان سے ایک نوجوان کی عبرت خیز داستان

مزار پر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس جگہ آ کر مجھے بے حد سکون ملتا تھا۔ اس لیے میں دو چار دن رہنے کے لیے شعیب کے ساتھ اس کے گاؤں چلا آیا تھا۔ مزار کے قریب یہ جگہ جہاں ایک ہوٹل تھا، بہت پُرسکون تھی، کیوں کہ مزار اور ہوٹل گاؤں سے خاصے فاصلے پر تھے اس لیے اس طرف اِکا دُکا لوگ ہی آتے تھے۔

میں اور شعیب دونوں کلاس فیلو تھے۔ شعیب گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اور شہر میں وہ کالج کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اس کا گاؤں بہت سرسبز تھا، جونہی کالج سے گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں، میں بھی اس کے ساتھ ہی اس کے گاؤں چلا آتا۔ ہوٹل کا مالک ایک بوڑھا شخص تھا۔ وہ چائے بہت اچھی بناتا تھا، میں جتنے دن بھی گاؤں میں رہتا، چائے یہاں سے ہی پیتا تھا۔ میں اور شعیب باتوں میں مگن بینچ پر بیٹھے تھے کہ ایک چار پانچ سال کی بچی ہمارے پاس آ کے کھڑی ہوگئی اور ٹکٹکی باندھے ہمیں دیکھنے لگی۔

شعیب نے اسے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے، کیوں آئی ہو یہاں۔'' اس نے غصے سے کہا۔ بچی سہم گئی۔ کیوں ڈانٹ رہے ہو بچی کو، شعیب کی یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی۔ ''ہونہہ بچی، مجھے نفرت ہے اس بچی سے۔ چلو یہاں سے، سارا موڈ خراب کر دیا اس پاگل نے۔'' شعیب نے اُٹھتے ہوئے غصے سے کہا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ شعیب کا اس بچی سے نفرت کرنا میری سمجھ میں نہ آیا۔ بہت پیاری اور معصوم بچی تھی وہ۔ ہوٹل کے مالک نے ہماری باتوں کو سن لیا تھا، لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ضرور تھے۔

دو دن رہنے کے بعد میں وہاں سے واپس آ گیا۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو شعیب بھی شہر آ گیا اور ہم دونوں پڑھائی میں مگن ہو گئے۔ کالج کی تعلیم ختم ہوئی تو میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے غیر ملک جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے ملک سے باہر جانے سے ایک ماہ پہلے میں شعیب سے ملنے اس کے گاؤں چلا آیا۔ اس کے گھر جانے سے پہلے میں نے مزار پر حاضری دی۔ کتنا سکون تھا یہاں، میں وہیں بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرے دل میں اس وقت اس خواہش نے زور پکڑا کہ میں اسی طرح بیٹھا رہوں اور زندگی یہیں ختم ہو جائے، لیکن میری اس محویت کو اس احساس نے توڑا۔ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے میرے پیچھے کوئی ہو، میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی بچی کھڑی تھی، جس کو شعیب نے اس دن ڈانٹ دیا تھا۔ میں جب اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بھاگ گئی۔ اسی وقت شعیب اندر داخل ہوا۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوا ہوں؟ میں نے اُسے آتے دیکھا تو پوچھا۔ شعیب مسکرایا اور بولا۔ ''ہوٹل والے چچا نے بتایا تھا کہ تمہارا دوست آیا ہوا ہے۔''

''اچھا آؤ گرم گرم چائے پیتے ہیں۔''

''ہاں کیوں نہیں ضرور۔'' ہم دونوں اپنی مخصوص جگہ پر آ گئے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ وہ بچی بھی آ گئی۔ شعیب نے اُسے دیکھتے ہی رُخ پھیر لیا۔ ''آخر تمہیں اس معصوم بچی سے نفرت کیوں ہے۔'' میں نے دُکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''پاگل ہے پاگل اور پاگل لوگوں سے نفرت ہے مجھے، اس کا باپ اس کو پری کہتا ہے پری، ہونہہ ایسی پاگل اولاد سے تو بندہ بے اولاد ہی بہتر ہے۔'' شعیب نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے خیالات جان کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔ شعیب یار ایسا نہ کہو، یہ تو رب کے کام ہیں، کسی کو نارمل اولاد دیتا ہے اور کسی کو ایب نارمل۔

''پری بیٹا، میرے بچے، چلو گھر چلو، آ جاؤ شاباش میرے بچے۔'' میں نے آواز کی سمت دیکھا تو ایک شخص اس بچی پری کو پیار سے کہہ رہا تھا، جو یقیناً اس کا باپ ہوگا۔ وہ پری کو لے کر چلا گیا۔ شعیب نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''دیکھو کیسا پاگل باپ ہے۔ اس پاگل پری کو پیار کر رہا ہے۔''

''شعیب اولاد تو اولاد ہوتی ہے اور پھر ایب نارمل بچوں کو پیار کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، پلیز اپنے خیالات بدل ڈالو۔'' میں نے اس سے کہا، لیکن شعیب نے کوئی جواب نہ دیا اُور خاموش رہا۔ اس کے پاس پانچ دن رہنے کے بعد میں واپس آ گیا۔ وہ دن بھی آ گیا جب مجھے انگلینڈ جانا تھا۔ شعیب مجھے الوداع کہنے آیا تھا۔ اب ہمارے رابطے کا ذریعہ خطوط



تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کمی آتی رہی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''وقت اور فاصلے محبت کم کردیتے ہیں۔'' مصروفیت میں اضافہ ہوگیا تو ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ بھی ختم ہوگیا اور یوں پندرہ سال بیت گئے۔

میں باہر کی زندگی سے گھبرا کر پاکستان آیا تو مجھے شعیب، اس کا گاؤں اور مزار بڑی شدت سے یاد آئے۔ میں مزار پر آیا تو سب کچھ ویسے کا ویسا تھا، کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ ہاں ہوٹل والے چچا کی جگہ ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا، جس نے اپنے باپ کی جگہ سنبھال لی تھی۔ یہ بھی نظام قدرت ہے کہ باپ کی جگہ پر اس کا بیٹا اور اس کی جگہ پر پھر اس کا بیٹا۔

مزار پر چہل پہل نظر آرہی تھی، لیکن اب وہ پہلے والا سکون وسکوت نہ تھا، جو میں چھوڑ گیا تھا۔

شعیب مجھے دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ ''ارے یار جنید تم یوں اچانک۔''

بدلتے زمانے نے ہمارے خال وخد بھی کافی تبدیل کردیے تھے، ہمیں بھی بدل دیا تھا، لیکن ہم نے ایک دوسرے کو پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں کی۔

ہم نے ڈھیروں باتیں کیں، گلے شکوے کیے، شعیب نے مجھے اپنی شادی کے بارے میں بتایا۔ پتا نہیں وہ اس ذکر پر کچھ اُداس لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یار اپنے بچوں سے تو ملواؤ۔'' وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس نے ایک بچی کو گود میں اُٹھایا ہوا تھا اور اس کے پیچھے مختلف عمر کی چار بچیاں تھیں۔ شعیب نے اپنی گود میں لی بچی کے رُخسار کو چُوما اور عجیب سے لہجے میں بولا۔

''جنید یہ میری پریاں ہیں، پانچ پریاں۔ لوگ مجھے کہتے ہیں، تم ان سے اتنا پیار کیوں کرتے ہو، یہ تو پاگل ہیں، لیکن میں کیا کروں جنید یہ تو میری اولاد ہیں۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ اولاد تو اولاد ہوتی ہے۔ یہ بچیاں مجھے بہت عزیز ہیں جنید، بہت زیادہ پیاری، شاید اس بچی پری کا باپ اس سے اتنی محبت نہ کرتا ہوگا، جتنا مجھے اپنی ان پانچ پریوں سے ہے۔'' یہ کہہ کر شعیب پھوٹ پھوٹ کر رودیا۔ میں بھی اپنے آنسو ضبط نہ کرسکا۔

''واہ میرے مولا! تو نے میرے دوست کی ذرا سی خطا کی اتنی بڑی سزا دی۔ اتنی بڑی آزمائش دی۔'' میں نے اپنے دل میں سوچا اور پھر میں مزید وہاں نہ بیٹھ سکا اور بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے چلا آیا مزار کی طرف۔ کیوں کہ سکون تو مجھے وہیں جا کے ملتا تھا۔

☆......☆

خواہشوں کا اسیر



دستگیر شہزاد

چالاکیوں اور مکاریوں سے بھرپور ایک انوکھی سچ بیانی

چوبیس مارچ 2012ء کی صبح تڑکے تقریباً پانچ بجے کی بات ہے۔ نواب پور میں رہنے والا ذیشان بستر سے اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے اپنے گھر میں کسی بچے کی دردناک چیخ نے چونکا دیا۔ ذیشان جلدی سے بستر سے نیچے اُترا۔ بچے کی وہ چیخ اس کے بیٹے احمد نے بھی سنی تھی۔ چیخ سنتے ہی احمد والد کے کمرے میں آگیا۔ آواز ان کے کرائے دار اسد کے کمرے سے آئی تھی۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ اسد ڈیری کے کاروبار سے جڑا ہوا تھا اور



پچھلے سالوں سے ان کے یہاں کرائے پر رہ رہا تھا۔ صبح صبح اس کے کمرے سے چیخ نے ذیشان اور اس کے بیٹے کو اُٹھنے پر مجبور کردیا۔ دونوں ہی فوراً اسد کے کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے کے اندر سے ایسی آواز آرہی تھی، جیسے کوئی کراہتے ہوئے آخری سانسیں لے رہا ہو۔ ذیشان نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے اسد کے رونے کی آواز آنے لگی۔ اس سے ذیشان اور احمد کو لگا کہ ضرور کوئی حادثہ ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو انہوں نے دیکھا کہ اسد گود میں اپنی چھ سال کی بچی خوشی کو لیے ہوئے کھڑا تھا اور وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غم تھا اور آنکھوں میں آنسو۔ اسد نے راستہ دیا تو ذیشان اور احمد دھڑکتے ہوئے دل سے کمرے میں داخل ہوئے۔ اندر کا نظارہ اور بھی رونگٹے کھڑے کردینے والا تھا۔ اسد کی بیوی آمنہ اور بیٹا انعام بستر پر بے سُدھ پڑے ہوئے تھے۔

''کیا ہوا اسد؟'' ذیشان نے حیرت بھرے لفظوں میں پوچھا۔

''کچھ نہیں بچا ماسٹر جی۔'' اسد روتے ہوئے بولا۔

''میرا سب کچھ برباد ہوگیا ہے۔ آمنہ اور انعام، دونوں کی موت ہوگئی ہے، خوشی بھی شاید ہی بچے۔ بیماری نے میرا گھر اُجاڑ دیا ہے۔ اب میں اکیلا جی کر کیا کروں گا۔''

اسد کی بات سن کر ذیشان کے تو جیسے ہوش ہی اڑ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے گھر میں اس طرح دو موتیں ہوجائیں گی۔ اسد خوشی کو بستر پر لٹا کر سر تھام کر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ ذیشان اور احمد نے اسد کو حوصلہ دیا، ساتھ ہی اس کی اطلاع پاس پڑوس کے لوگوں کو بھی دے دی، کچھ ہی دیر میں وہاں تمام لوگ اکٹھے ہوگئے۔ آناً فاناً آمنہ، انعام اور خوشی کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے جایا گیا۔ ان تینوں کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹروں نے انہیں مردہ قرار دے دیا۔ اسد بیوی اور بچوں کی بیماری کی بات تو بتاتا تھا، لیکن اس طرح ایک ہی رات میں اس کی دنیا ویران ہوجائے گی، ایسا کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسد کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ جسے گھر کی سجاوٹ کہا جاتا ہے۔ وہ محض دکان کی سجاوٹ ہے، گھر کی سجاوٹ اس میں بسنے والے رشتے ہیں، جن کی حفاظت سے بے خبر ہماری توجہ در و دیوار پر لگی سجی اشیاء کی حفاظت و اہمیت پر رہتی ہے۔ آخر میں یہ سمجھنا محال ہوتا ہے کہ اصل سجاوٹ ماند کیوں پڑگئی، ضائع کیوں ہوگئی اور دکانوں سے خریدی بیش قیمت اشیاء نے اپنی چمک دمک قائم رکھتے ہوئے بھی خوشی اور سکون دینے سے ہاتھ کیوں کھینچ لیا۔

اسد آبائی طور پر پیر محل کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد ہارون علی کی گاؤں میں کھیتی باڑی تھی۔ ان کے خاندان میں بیوی عکاشہ کے علاوہ اسد سے چھوٹی تین بیٹیاں حدیقہ، طیبہ، ثناء اور دو بیٹے اظہر احمد اور طاہر احمد تھے۔ اسد کی بیوی آمنہ رستم پور کے علی اکبر کی بیٹی تھی۔ اسد نے فون کرکے بیوی و بچوں کے مرنے کی خبر دونوں جگہ دی تو وہاں بھی کہرام مچ گیا۔

اسد آخری رسم ادا کرنے کے لیے بیوی اور بچوں کی لاشوں کو گاؤں لے گیا۔ ایک ساتھ تین لاشوں کو دیکھ کر پورا گاؤں غم میں ڈوب گیا۔ جس نے بھی دیکھا، اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ خبر ملتے ہی حدیقہ کے میکے والے بھی پیر محل پہنچ گئے۔ بیماری سے ایک رات میں اچانک تین موتوں کی بات آمنہ کے والد کے گلے سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ ان کے دماغ میں شک کا کیڑا بری طرح سے کلبلانے لگا تھا۔ کلیوں کا مرجھا کر سوکھ جانا افسوس ناک ہے۔ تازگی اور حسن برقرار رکھتے ہوئے بھی، کلیوں کا کھل کر پھول نہ بننا ایک بڑا المیہ ہے۔ آمنہ کبھی کبھار بیمار رہتی تھی۔ یہ بات انہیں معلوم تھی، لیکن غصہ اس بات پر آرہا تھا کہ اگر اس کی حالت اتنی ہی خراب تھی تو اسد نے یہ بات انہیں کیوں نہیں بتائی تھی؟ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بات بھی بڑی عجیب سی لگ رہی تھی کہ جب آمنہ اور بچے اتنے زیادہ بیمار تھے تو وہ انہیں اسپتال کیوں نہیں لے کر گیا تھا۔ علی اکبر کے دونوں بیٹے، شان، ایمان اور وہاں موجود دیگر رشتے دار بھی یہی سوچ رہے تھے۔ ماحول بھلے ہی غمگین تھا، لیکن وہ لوگ یہ صدمہ برداشت نہیں کرپا رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے فوری طور پر اسد سے پوری بات جاننا چاہی تھی۔

بہ اصرار پوچھنے پر اسد نے یہ بتایا کہ عید کے بعد سے ہی وہ تینوں الٹی، دست، بخار اور پیٹ کے درد سے پریشان تھے۔ ان کا علاج بھی چل رہا تھا۔ بیتی شام چاروں جلد کھانا کھا کر سوگئے تھے۔ اسد نے آگے بتایا کہ رات میں آمنہ پیٹ درد اور سر درد سے کراہنے لگی۔ وہ بے چین سی ہورہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے اسے انجکشن دے دیا تھا۔ جس کے بعد وہ آرام سے سوگئی تھی، لیکن جب صبح کو میں نے انعام کو اٹھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ تو مرچکا ہے، پھر میں نے آمنہ کو جگانا چاہا، لیکن وہ بھی دنیا چھوڑ چکی تھی۔ خوشی بھی مجھے بے چین سی لگ رہی تھی۔ لیکن میں اسے بھی نہیں بچا سکا۔

اسد نے جو کچھ بھی بتایا تھا، اس قدر گہرے صدمے کے باوجود علی اکبر اور ان کے رشتے دار چاہ کر بھی اس پر یقین نہیں کرپا رہے تھے۔ علی اکبر نے مکان مالک سے بھی بات کی، تو پتا چلا کہ انہیں اس بات کی اطلاع صبح ملی تھی۔ یہ بات سبھی کو بڑی عجیب سی لگ رہی تھی کہ جب اتنی بڑی مصیبت آئی تھی، تو اسد نے کسی کو مدد کے لیے کیوں نہیں بلایا تھا۔ جب بیوی اور بیٹے کی موت ہوچکی تھی تو اسے کم از کم مکان مالک کو تو بتا ہی دینا چاہیے تھا۔ ان باتوں نے ان کے دل میں شک پیدا کردیا تھا۔ شک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آمنہ کی گھریلو زندگی ٹھیک نہیں تھی۔

اسد کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اسد پڑھا لکھا بھی تھا اور سمجھ دار بھی، لیکن اس سے ایسی اُمید نہیں تھی کہ وہ بچوں کو اسپتال لے جانے میں کوئی کوتاہی کرے گا۔

علی اکبر کے دل میں بہت سارے سوالیہ نشان تھے۔ اپنے ان سوالوں کے ساتھ وہ چپ نہیں بیٹھنا چاہتے تھے۔ اسد کو جتنا بتانا تھا، وہ بتا چکا تھا، اس لیے انہوں نے اس کے باپ سے بات کی اور پھر انہوں نے اپنا شک ظاہر کرتے ہوئے صاف کہہ دیا تھا کہ آمنہ اور دونوں بچوں کی ایک ساتھ موت اتفاق نہیں ہوسکتی، ان تینوں کا قتل کیا گیا ہے اور قاتل ہے ان کا بیٹا اسد۔

اس بات پر دونوں خاندانوں کے بیچ گرما گرمی ہونے لگی۔ جب بات حد سے زیادہ بڑھ گئی تو علی اکبر نے اس کی اطلاع تھانہ شورکوٹ کو دے دی۔ اطلاع ملتے ہی انسپکٹر عباس خان پولیس نفری کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے۔ علی اکبر اور ان کے رشتے دار اسد پر سیدھے سیدھے قتل کا الزام لگا رہے تھے۔ اے ایس پی سول لائن ماجد علی کو بھی یہ معاملہ نہایت سنگین لگا تھا، لہٰذا وہ بھی پیر محل پہنچ گئے۔ پولیس نے اسد سے پوچھ گچھ کی تو وہ دھاڑیں مار کر وہی پرانے جملے دہرانے لگا۔

''صاحب! دیکھیے میری بیوی اور پھول سے دو بچے مرگئے اور یہ لوگ ہیں کہ جھوٹے الزام لگا کر مجھے پریشان کررہے ہیں۔ پتا نہیں یہ کیسے والدین ہیں، جو اپنی بیٹی کی موت کو تماشا بنا دینا چاہتے ہیں۔ ایسی باتیں سننے سے اچھا تھا کہ میں بھی مرجاتا۔''

''تم خود کو سنبھالو اور ہمیں بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا؟'' انسپکٹر نے اسے تسلی دے کر پوچھا تو کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے وہی بات دہرادی، جو اس نے علی اکبر کو بتائی تھی۔ پولیس کو بھی یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ ایک ہی رات میں تین اموات ہوجانے پر بھی اسد نے نہ تو رات میں کسی کو بتایا اور نہ ہی مرنے والوں کو اسپتال لے جانے کی ضرورت سمجھی۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پولیس نے اس معاملے کی جانچ کرلینا ضروری سمجھا۔

انسپکٹر عباس کان نے نواب پور جا کر لوگوں سے اسد کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو وہاں لوگوں نے اسد کے بارے میں جو بتایا، اس سے پولیس کو بھی اس پر پورا پورا شک ہونے لگا۔ پولیس کو پتا چلا کہ اسد خواہش پسند اور ایک غصہ ور مزاج رکھنے والا شخص تھا۔ اس کے علاوہ بھی لوگوں سے اس کے بارے میں کئی طرح کی باتیں سننے کو ملیں۔ علی اکبر سازش کے تحت قتل کیے جانے کی بات پر اڑے بیٹھے تھے اور انہوں نے پولیس کو اسد کے خلاف کئی ثبوت بھی دے دیے تھے۔ حالات شک والے تھے، اس لیے پولیس نے گھما پھرا کر اسد سے پوچھ تاچھ کی، تو وہ کئی سوالوں کے جواب تسلی بخش نہ دے پایا۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ بیوی بچوں کے بیمار ہونے پر وہ انہیں رات میں ہی اسپتال کیوں نہ لے گیا اور ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود اس نے مالک مکان کو کچھ کیوں نہیں بتایا تھا۔ پولیس نے اس پر جواب کے لیے دباؤ ڈالا، تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اسد کی باتوں اور رونے سے پولیس اتنا تو سمجھ گئی کہ وہ رونے کا ناٹک کرکے بات کو گھمانے کی بار بار کوشش کررہا ہے۔ پوچھ تاچھ میں اس کے چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیوں نے بھی پولیس والوں کے شک کو اور گہرا کردیا تھا۔ اب پولیس نے اسد کو تفتیش کی چکی میں پیس کر رکھ دیا تھا، جسے وہ برداشت نہ کرسکا اور اس نے ایک ایسا خوفناک انکشاف کیا، جسے سن کر ہر کسی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر وہ سر تھام کر روتا رہا، پھر اچانک بولا۔

’’میں نے سبھی کو زہر کا انجکشن لگایا تھا۔‘‘

اس کی بات سن کر پولیس بھی حیرت میں رہ گئی۔ کوئی انسان اتنا حیوان ہوسکتا ہے، یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

پولیس نے اسے فوراً حراست میں لے لیا اور تینوں لاشوں کو اپنے قبضے میں کرکے ان کا پنچ نامہ بنایا اور انہیں پوسٹ مارٹم کے لیے ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوا دیا، اس کے ساتھ ہی آمنہ کے والد کی تحریر پر اسد کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرلیا گیا۔ اسد کے حیوانیت بھرے اس کرتوت سے سبھی حیرت میں تھے۔ تہرے قتل کی اطلاع پا کر آر پی او حافظ نعمان اور ڈی پی او حسن سردار بھی اسد سے معلومات کرنے پہنچ گئے تھے۔ پولیس اسے لے کر نواب پور میں واقع اس کمرے میں پہنچی تو اس نے وہ انجکشن برآمد کرادیا جس سے اس نے تینوں کو زہر دیا تھا۔

دو چار ٹکڑے ہوں تو جوڑے جاسکتے ہیں۔ کرچیاں پرانی شکل کو واپس نہیں لاسکتیں۔ لاشیں آمنہ کے والد کے حوالے کردی گئیں۔ انہوں نے تینوں لاشوں کو گاؤں لے جاکر غم زدہ ماحول میں ان کی آخری رسوم ادا کیں۔ اس رسم میں شامل ہر ایک شخص بھونچکا تھا، کسی کو بھی اسد کے کرتوت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اِدھر پولیس نے اسد سے تھانے میں تفصیل سے پوچھ تاچھ کی تو اس نے کئی چونکا دینے والے راز اُگلے۔ اس نے اپنی بیوی اور بچوں کے قتل کی ایک نہیں، کئی وجوہ بتائیں، جس میں آمنہ اور اس کے بچوں کا کوئی گناہ نہیں تھا، بلکہ اپنی اپنی خواہشوں اور انتہا پسند مزاج کی وجہ سے وہ ایسے لوگوں میں شامل ہوگیا تھا جو زندگی میں کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔

اس نے بتایا کہ قتل کی پلاننگ وہ کافی پہلے کرچکا تھا۔ اسد بچپن سے خواہش پسند تھا۔ وہ پڑھ لکھ کر اونچا مقام حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چھ بھائی بہنوں میں وہ چھوں کر سب سے بڑا تھا، اس لیے اس پر ذمے داریاں بھی بہت زیادہ تھیں۔ اسد نے ایم اے کرنے کے بعد ایل ایل بی کی پڑھائی شروع کردی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اچھی پڑھائی کرکے سول سروس کی تیاری کرے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہ مقام حاصل کرپاتا اس کے لیے پہلے سے ہی رشتے آنے شروع ہوگئے تھے۔ اس کے والد ہارون علی چاہتے تھے کہ بیٹے کی شادی ہوجائے، پھر ایک دن اس کے لیے رستم پور سے علی اکبر کی بیٹی سدرہ کا رشتہ آیا۔ ان کی بیٹی جوان تھی، اس لیے وہ لڑکے کی تلاش کررہے تھے، تاکہ وہ جلد از جلد اپنے فرض سے سبک دوش ہوسکیں۔ دونوں خاندانوں کی بات چیت کے بعد اسد کا رشتہ سدرہ کے ساتھ پکا کردیا گیا۔ رشتہ تو ہوگیا، لیکن کچھ دن بعد ہی سدرہ کی طبیعت خراب ہوگئی اور علاج کے باوجود دس بارہ دن بعد اس کی موت واقع ہوگئی۔ غم کے اس دور میں اسد کا خاندان بھی سدرہ کے خاندان کے ساتھ تھا۔ اس درمیان دونوں خاندان آپس میں گھل مل گئے تھے اور ان میں آپس میں لگاؤ بھی گہرا پیدا ہوگیا تھا۔

اسد کا خاندان بھی ٹھیک تھا اور وہ محنتی لڑکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علی اکبر نے سوچا کہ اپنی منجھلی بیٹی آمنہ کا رشتہ بھی اس کے ساتھ ہی کردینا چاہیے۔ اسد کا خاندان خود بھی یہی چاہتا تھا۔ ایک بار پھر دونوں خاندانوں میں اسد اور آمنہ کے رشتے پر آپس میں رضامند ہوگئے۔ سب کچھ طے ہوجانے کے بعد آمنہ اور اسد کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد دونوں کے دن ہنسی خوشی بیتنے لگے۔ اس درمیان نواب پور کی ایک پینٹ فیکٹری کے کیمیکل شعبے میں اسد کی نوکری بہ طور سپروائزر لگ گئی۔

شادی کے ایک سال بعد ہی آمنہ نے بیٹے کو جنم دیا تو اسد کے خاندان میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔ اس درمیان اس نے نواب پور میں ہی اپنا مکان بنالیا اور بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہنے لگا۔ نوکری کے ساتھ ساتھ اسد سول سروس میں جانے کے لیے امتحانات بھی دیتا رہا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس کا نمبر نہ آسکا۔ اسد اس کمپنی سے اتنا کما نہیں پاتا تھا کہ خاندان کی گاڑی آرام سے چل سکے، جبکہ اس کی خواہشات بہت اونچی تھیں، مگر کمزور لوگوں کے ہر جذبے اور ہر خواہش کا پورا ہونا شاید بہت مشکل ہے، کیوں کہ انسان میں منفی صفات کی قوت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اسد بیٹے کے بعد ایک بیٹی کا باپ بن گیا، تو اس کی ذمے داریوں کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ کمائی کم اور خرچے زیادہ ہوگئے تو وہ بے چین سا رہنے لگا۔

چار سال پہلے کی بات ہے، ایک دن اسد گھر آیا تو اس کے چہرے پر کافی تناؤ [illegible] رہا تھا۔ یہ دیکھ کر آمنہ نے پوچھا۔

’’کیا بات ہے۔ آج آپ پریشان سے لگ رہے ہیں۔‘‘

’’ہاں، یہ تو میری قسمت ہی بن گئی ہے۔‘‘ اسد نے تنک کر جواب دیا۔

’’ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ۔‘‘ آمنہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

’’اور کروں بھی تو کیا؟‘‘ وہ غصے میں بولا۔ ’’جو بننا چاہتا تھا وہ بن نہیں سکا، بن کر رہ گیا۔ سپروائزر، آج میں نے سپروائزر کی نوکری بھی چھوڑ دی ہے۔‘‘ اس کی بات سن کر آمنہ چونکی۔ وہ کچھ کہتی سنتی، اس سے پہلے ہی اسد سر پکڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ’’اگر میں نے جلدی شادی نہ کی ہوتی تو شاید کچھ بن گیا ہوتا۔‘‘

آمنہ کو اسد کی یہ بات قطعی اچھی نہیں لگی۔ یہ کہہ کر وہ ایک طرح سے اپنے بیوی بچوں کو بوجھ کی طرح جان رہا تھا۔ اس لیے وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

’’گرہستی کو بوجھ جان رہے ہو۔‘‘

’’بوجھ تو نہیں جان رہا، لیکن جلدی میں یہ سب کچھ ہوگیا۔‘‘ اتنا کہہ کر اسد چپ ہوگیا۔ تھوڑی دیر اسی طرح کی بات چیت کرنے کے بعد اسد کھانا کھا کر سوگیا۔ نوکری تو وہ پہلے ہی چھوڑ ہی چکا تھا، لیکن اب آنے والے دنوں میں اسے کیا کرنا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، پھر وہ نئے کام کی تلاش میں جت گیا۔ جب اسے کام اپنی پسند کا نہیں ملا، تو اس نے اپنا ہی کام کرنے کا ارادہ کرلیا۔ کافی غور و فکر کے بعد اس نے دودھ کی ڈیری کھولنے کا فیصلہ کیا۔ بھینس خریدنے کے لیے اسے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی۔ ہارون بھی بیٹے کو اتنی مدد دینے میں ناکام تھے۔ اسد کئی دنوں تک پریشان رہا، پھر سوچتے سوچتے اچانک اسے ایک راستہ نظر آیا، یہ راستہ تھا مکان بیچنے کا۔ مکان بیچ کر وہ بھینسیں خرید سکتا تھا، پھر اس نے اپنے دل کی بات آمنہ کو بتائی۔

’’مکان بیچ دو گے تو ہم رہیں گے کہاں۔‘‘ آمنہ نے اس سے پوچھا۔

کرائے پر مکان لے کر کہیں بھی رہ لیں گے۔ میرا کام شروع ہوجائے تو پیسوں کی پریشانی نہیں ہوگی۔ اسد نے آمنہ کو سمجھانے کی کوشش کی، گو کہ آمنہ کو اسد کا یہ فیصلہ اچھا تو نہیں لگ رہا تھا، لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسد نے اگر مکان بیچنے کی ٹھان لی ہے تو وہ ماننے گا نہیں، ویسے بھی ہر عورت چاہتی ہے کہ اس کا شوہر ٹھیک پیسے کماتا رہے، تاکہ اس کا خاندان سکھی رہے۔ بہرحال اسد نے اپنا مکان بیچ دیا۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے۔

مکان بیچ کر اسد نے نواب پور میں رہنے والے ایک اسکول ٹیچر نبیل کے یہاں دو کمرے کرائے پر لے لیے اور بیوی اور بچوں کے ساتھ وہاں رہنے لگا۔ اس کے بعد اس نے کچھ بھینسیں خرید کر ڈیری کھول لی۔ کام چل نکلا تو دھیرے دھیرے وہ معاشی تنگی کے دور سے بھی نکل گیا۔ اسد چاہتا تو اپنے اس کام کو بڑھا بھی سکتا تھا، لیکن خواہش پسند ہونے کی وجہ سے اس لگتا تھا کہ اتنا پڑھا لکھا ہونے کے باوجود اسے اَن پڑھوں جیسا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لیے وہ اس کام کے ساتھ ساتھ کسی اچھی نوکری کی تلاش بھی کرتا رہا۔ اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اسد کسی بھی طرح زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی جگت میں لگا رہتا تھا۔ اسی چکر میں گھومتے گھومتے اس کے دماغ میں آیا کہ وہ کسی بیمہ کمپنی کو چونا لگا کر موٹی رقم اینٹھ سکتا ہے۔ یہ بات دماغ میں آتے ہی اس نے ایک پلان بنالیا۔ اپنے پلان کے مطابق اس نے ساری بھینسوں کا بیمہ کروادیا۔ بیمہ کرائے ابھی اسے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ایک دن اچانک اس کی کئی بھینسوں کی موت واقع ہوگئی۔ بھینسوں کی موت ہوجانے سے اسد کو موٹی رقم مل سکتی تھی۔ اسد کو جاننے والے لوگ اس سے افسوس جتا رہے تھے۔ اسد نے بیمہ کمپنی کو اس بابت بتایا، تاکہ آگے کی کارروائی ہوسکے۔

ایسے معاملوں میں بیمہ کمپنیوں کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ بیمہ کمپنی نے اپنے حساب سے اس کی کارروائی شروع کی، لیکن اسی درمیان کسی نے بیمہ کمپنی کے ملازموں کو اطلاع دے دی کہ اسد کی بھینسوں کی موت قدرتی طور پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس نے بیمے کی رقم حاصل کرنے کے لیے انہیں زہر دے کر مارا تھا۔ جب انہیں شک ہوا تو بیمہ کمپنی نے ایک بھینس کا پوسٹ مارٹم کرالیا۔ پوسٹ مارٹم میں ثابت ہوگیا کہ بھینسوں کو زہر دیا گیا ہے۔ بھید کھلنے کے بعد اسد کے جیل جانے کی نوبت آگئی۔ وہ جیل چلا بھی جاتا، لیکن لوگوں کے درمیان میں آنے کی وجہ سے وہ بچ گیا۔ اسد نے سوچا تھا کہ بیمہ کے پیسے سے حالات سدھر جائیں گے، لیکن اس کے لالچ نے اسے معاشی طور سے اور بھی

گہری چوٹ پہنچائی۔ اس کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح وقت کاٹنے لگا۔ اسد پہلے ہی گھر سے الگ رہ رہا تھا، لیکن والد کے بعد گھر میں بڑا ہونے کے ناتے گھر کی ذمے داری بھی اس پر تھی۔ گھر میں اس کی تین بہنیں جوان ہو رہی تھیں، جبکہ اس کے دونوں بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ بھائیوں کی پڑھائی میں بھی وہ پیسوں سے مدد کرتا تھا اور خاندان کے بھی معاشی مسائل حل کرنے میں ہاتھ بٹاتا تھا، لیکن آمنہ کو یہ سب قطعاً پسند نہیں تھا۔ اس کے لیے وہ اسے ٹوکتی بھی رہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اور اس کے بچے ہر وقت محرومیوں میں گھرے رہتے تھے۔ گاؤں میں لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی والدین کو ان کی شادی کی فکر ستانے لگتی ہے، اسد کی دونوں بہنیں بھی جوان ہو چکی تھیں۔ اس کے والد ہارون نے اس بارے میں اسد سے بات کی تو اس نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کہ اس کی اپنی معاشی حالت ٹھیک نہیں ہے، پھر بھی جو ہو سکے گا وہ کرے گا، لیکن ایسا نہیں تھا کہ اسد کو بہنوں کی شادی کی فکر نہیں تھی۔ اسد کا دماغ خرافاتی تھا۔ ایک سال بیتتے بیتتے اس نے ایک اور کارنامے کو انجام دے دیا۔ ہوا یہ کہ ایک شام راہ چلتے لوگوں کو اسد کی ڈیرہ سے شور کی آواز سنائی دی۔ لوگوں کا دھیان اس طرف گیا تو انہوں نے دیکھا کہ دکان کا آدھا شٹر گرا ہوا تھا۔ لوگوں نے شٹر اٹھا کر دیکھا تو اسد دکان کے اندر تھا اور اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ کچھ بدمعاش آئے اور اس کا سامان لوٹ کر چلے گئے۔ بدمعاشوں نے دیوار توڑ کر سامان نکالا تھا اور اسد کو شور نہ مچانے کی دھمکی دیتے ہوئے باندھ گئے تھے۔ جب اسے لگا کہ بدمعاش کافی دور چلے گئے ہوں گے تو اس نے شور مچا دیا۔ لوٹ مار کی اطلاع پر پولیس بھی موقع پر آ گئی۔ پولیس کو یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ جب بدمعاش لوٹنے ہی آئے تھے تو وہ سامان سامنے کے راستے سے بھی لے جا سکتے تھے۔ وہ بھلا دیوار توڑنے میں کیوں اپنا وقت برباد کرتے۔ ایک بات اور غور طلب تھی کہ بدمعاشوں نے اسد کے ہاتھ پیروں کے ساتھ منہ نہیں باندھا تھا۔ ایسی حالت میں ان کے جانے کے بعد وہ شور مچا سکتا تھا۔ پولیس نے جب اسد سے سوال جواب کیے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں ٹک پایا۔ دراصل اسد نے دکان کا سامان خود ہی ایک رشتے دار کے یہاں جا کر رکھ دیا تھا اور پھر دیوار توڑ کر اپنے ہاتھ پیروں میں رسی الجھا کر ڈکیتی کی جھوٹی کہانی گھڑ لی تھی۔ اسے امید تھی کہ پولیس اس واردات کو سچ مان کر رپورٹ لکھ لے گی اور اسے بیمے کی رقم مل جائے گی۔ اس بار بھی وہ کسی طرح جیل جانے سے بچ گیا۔ اسد نے جیسے خود ہی پریشانیوں سے اپنا مکمل ناتا بنا لیا تھا۔

ڈیری چلانے کے ساتھ ساتھ اسد کچھ بچوں کو ان کے گھر جا کر ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ اسی دوران ایک لڑکی کو لے کر اسد کے دل میں پیار کے بیج پھوٹ گئے۔ طالبہ بھی اس کی طرف سے متاثر ہوئی۔ تو دونوں کا عشق پروان چڑھنے لگا۔ اس نے گھریلو پریشانیوں کے بیچ اسے سکون کے کچھ پل مل جاتے تھے۔ جلدی ہی اسد اور اس کی اسٹوڈنٹ کے پیار کے چرچے شروع ہو گئے۔ یہ بات آمنہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس نے اسد کو خوب کھری کھری سنائیں۔ کسی عورت کے دل میں ایک بار شک گھر جائے تو اس کے دماغ سے اس شک کا نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ اسد نے آمنہ کو بہلانے کی بہت کوشش کی، لیکن اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے درمیان اختلافات کڑواہٹ میں بدلنے لگے تھے۔ دورانِ گفتگو ایک ایسا مقام بھی آ جاتا ہے جب الفاظ کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور لہجہ ان کا محافظ ہوتا ہے۔ باوقار کرداروں کا احترام کرتے ہوئے ہم بہت کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ گھٹیا کرداروں کے قریب ٹھہر کر گناہ گار ہوتے ہوئے ہم اپنا وقار بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ آمنہ بس کہہ گئی۔ جب اسد کے کردار میں کھوٹ آ گئی تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے بیوی کے کردار پر انگلیاں اٹھانا شروع کر دیں۔ ایسا اس نے اس لیے کیا تاکہ آمنہ اس سے جھگڑ نہ سکے۔ مسکرا کر باتیں کرنا آمنہ کی عادت میں شمار تھا، جبکہ اسد اس کی اس عادت کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ روز روز کے جھگڑے شوہر کی ناقدری اور گھٹ گھٹ کر جینے کی وجہ سے آمنہ بیمار رہنے لگی تھی۔ اسد نے اس کا علاج بھی کرایا، لیکن اسے جو بیماریاں تھیں ان کا علاج آسان نہیں تھا۔ ادھر اسد اس کی بیماری پر ہونے والے خرچ، خاندان کے خرچ اور بہنوں کی شادی۔ کو لے کر وہ کافی پریشان رہنے لگا تھا۔ اسی سبب اس کے دماغ میں یہ بات گھر کر گئی کہ اگر وہ کسی طرح بیوی اور بچوں سے آزاد ہو جائے تو کسی امتحان وغیرہ کی تیاری کر کے کسی اچھی سروس میں نکل جائے گا اور دوبارہ شادی کر کے گھر بھی بسا لے گا۔ یہ بات دماغ میں آتے ہی اس نے ایک خطرناک فیصلہ لے لیا اور اسد نے کیمیکل کے ذریعے خاندان کا صفایا کرنے کی ٹھان لی۔ اپنے اس پلان کو وہ دھیرے دھیرے انجام دینا چاہتا تھا۔ عید کے دن اس نے خود کھانا کھانے کے بعد سبزی میں زہریلے کیمیکل کی کچھ بوندیں ملا دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمنہ اور اس کے دونوں بچوں کو الٹی دست ہونے لگے۔ اسد ڈاکٹروں سے ان کا علاج کراتا رہا، چوں کہ وہ لمبی پلاننگ کر رہا تھا، اس لیے اس نے اس بیماری کی بات اپنے گھر سے لے کر سسرال و رشتے داروں تک خوب بیان کی۔ ایسا وہ اس لیے کر رہا تھا تاکہ اپنے پلان کو انجام دینے پر کوئی اچانک اس پر شک نہ کر سکے۔ آمنہ کا جسم ایک تو پہلے ہی کمزور تھا، بیمار ہونے کے بعد وہ اور بھی کمزور ہو گئی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے اسے طاقت کے انجکشن لگوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑتا تھا۔ چوں کہ یہ آئے دن کی بات تھی، اس لیے اسد نے خود انجکشن لگانا سیکھ لیا اور جب بھی ضرورت ہوتی، وہ گھر میں ہی آمنہ کو انجکشن لگا دیتا تھا۔ کچھ انسانی کیفیات الفاظ و اظہار سے ماورا ہیں۔ اگر ہم بیان کریں تو سننے والے اسے فضول کی بک بک بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اتنا تنہا ہو جاتا ہے کہ اس کی اعلیٰ صلاحیتیں اور ذہنی رسائیں ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ چوبیس مارچ کی رات کو اسد کے سر پر حیوانیت سوار ہو گئی۔ اس نے آمنہ اور دونوں بچوں کو موت کی نیند سلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے وہ زہر بھی لے آیا۔ اس نے زہر اور کیمیکل ایک شیشی میں گھول کر رکھ لیا۔ رات میں جب آمنہ بچوں کے ساتھ سونے کی تیاری کرنے لگی تو اس نے سر درد کی شکایت کی۔

”سر درد کمزوری کی وجہ سے ہی ہو رہا ہوگا۔“ اسد نے کہا۔ ”میں تمہیں انجکشن لگا دیتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ طبیعت خراب ہو جائے، رات میں کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا۔“ اسد جو کہہ رہا تھا وہ ٹھیک ہی تھا، لیکن آمنہ کو کیا پتا تھا کہ اس کا وہی سہاگ اسے موت کی نیند سلانے کی سوچ رہا تھا، جس کے لیے وہ لمبی عمر کی تمنا کرتی ہے۔ انعام اور خوشی پہلے ہی سو چکے تھے۔

”ٹھیک ہے تم مجھے انجکشن لگا دو، میں کل ڈاکٹر سے مل لوں گی۔“ آمنہ نے کہا تو اسد نے زہریلی شیشی میں سے سرنج بھر کر آمنہ کو انجکشن لگا دیا۔ انجکشن نے بہت تیزی سے اثر کیا۔ لیٹنے کے کچھ دیر بعد ہی آمنہ کی سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی۔ جب اسد کو بھروسا ہو گیا کہ آمنہ مر چکی ہے تو وہ اگلی تدبیر کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند بھی آ گئی۔ تڑکے آنکھ کھلتے ہی اسد نے بیٹے انعام کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے انجکشن لگا دیا، کچھ دیر تڑپ کر اس کی بھی موت ہو گئی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ اس وقت پانچ بجنے کو تھے۔ اس نے ایک بار پھر سرنج بھری اور خوشی کو لگانے کے لیے آگے بڑھا۔ معصوم بچی گہری نیند میں تھی۔ اسد نے اسے انجکشن لگایا تو وہ درد سے چلا اٹھی۔ وہ چلائی تو اس نے انجکشن ایک طرف رکھ دیا تب تک زہر اس کی نسوں میں دوڑ چکا تھا۔ وہ پھڑ پھڑانے لگی۔ خوشی کی چیخ سن کر ماسٹر نبیل نے دروازہ کھٹکھٹایا تو مجبوراً اس نے دکھاوا کرنے کے لیے خوشی کو گود میں اٹھا لیا اور دروازہ کھول دیا، جبکہ اس کا پلان یہ تھا کہ صبح لوگوں کو بتائے گا کہ رات میں تینوں سوتے میں ہی مر گئے، لیکن خوشی کے چیخنے سے وقت سے پہلے ہی سب کو پتا چل گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے شاطر دماغ سے سبھی کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی حیوانیت شاید ہمیشہ کے لیے راز بن کے دفن بھی ہو جاتی، لیکن آمنہ کے خاندان نے شک ظاہر کیا تو معاملہ کھل گیا۔ اس کی حیوانیت کو جان کر ہر کوئی سکتے میں تھا۔ تفصیلی پوچھ تاچھ کے بعد پولیس نے اسد کو عدالت میں پیش کیا۔ سارے دیکھنے والوں کی وہاں بھیڑ لگ گئی تھی۔ اس نے عدالت میں کہا کہ وہ دماغی طور پر پریشان تھا، اس لیے اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ عدالت نے اسے چودہ دن کی قانونی حراست میں جیل بھیج دیا۔ اسد بہت خواہش پرست، بعاوتی مزاج والا اور لالچی نہ ہوتا تو شاید وہ خاندان ایسا درد جھیلنے کو مجبور نہ ہوتے۔ تادمِ تحریر اسد کی ضمانت نہیں ہو سکی تھی۔ جیل میں وہ خود کو دماغی مریض بتا کر دن کاٹ رہا ہے۔ عدالت کیا سزا دے گی۔ یہ تو وقت بتائے گا، لیکن معاشرہ اسے اس درندگی کے لیے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ پیسا بے شک زندگی کی اہم ضرورت ہوتا ہے، مگر اس کی خاطر ضمیر بیچنے والا بہت ہی بڑا بدقسمت ہوتا ہے۔ دنیا کی عدالت اسے جو بھی سزا دے۔ وہ بھگت ہی لے گا، لیکن کل روزِ حساب اللہ کی عدالت میں جب میزان قائم کی جائے گی تو کیا اس کا یہ عمل گناہوں کے پلڑے کو جھکا نہیں دے گا؟

☆......☆

بھرم ٹوٹ گیا

سویرا فلک

بیوی کے طعنوں سے تنگ ایک قاتل شوہر کی سچ بیانی

''رحیم بابا ذرا آج کا اخبار تو لے آیئے۔'' میں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو میں نے اپنے ملازم رحیم بابا کو آواز لگائی۔

''لا رہا ہوں صاحب۔ آپ بھی اخبار کے بغیر ناشتا شروع ہی نہیں کرتے، یہ لیں۔'' رحیم بابا نے چائے میز پر رکھی اور اخبار میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

رحیم بابا میرے سرکاری ملازم تھے۔ میں ایک سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ میرا آبائی شہر تو حیدر آباد دکن تھا، مگر پھر میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لندن چلا گیا اور پھر جب وہاں سے واپس آیا تو ایک شاندار مستقبل نے میرا استقبال کیا۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ مجھے اعزازی گاڑی، گھر اور ملازم بھی دیے گئے تھے۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور بدقسمتی سے میرے والدین حیات نہیں تھے۔ مجھے رحیم بابا کے ساتھ سال بھر ہو گیا تھا اور وہ بھی مجھے بیٹے جیسا ہی سمجھنے لگے تھے، اس لیے مالک و نوکر والے رشتے کو میں نے کبھی فروغ نہیں دیا اور ہمیشہ انہیں اپنا بزرگ ہی سمجھا۔

''بیٹا ناشتا سکون اور اطمینان سے کیا کرو۔ یوں اخبار پڑھتے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے غذا جسم کو نہیں لگتی اور ذہن کو طاقت بھی نہیں دیتی۔ ناشتا تمام کھانوں کا سردار ہے اور تم اسے اخبار کی نذر کر دیتے ہو۔'' انہوں نے مجھے بڑے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا کریں بابا، سارا دن اتنی مصروفیت رہتی ہے کہ اس کے بعد نہ ڈھنگ کر ٹی وی دیکھنے کا ٹائم ملتا ہے اور نہ ہی صحیح سے اخبار پڑھنے کا۔ ویسے بھی جو مزہ اخبار پڑھنے میں ہے، وہ ابھی بھی ٹی وی کی بریکنگ نیوز اور تیز و تند آوازوں والے ٹاک شوز میں کہاں۔ آرام، سکون اور تسلسل سے مطالعے کا لطف کچھ الگ ہی ہے، کیوں.....؟'' میں نے مسکراتے ہوئے سوالیہ نظروں سے رحیم بابا کو دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ناشتے کے برتن سمیٹنے لگے۔ میں دوبارہ اخبار کی جانب متوجہ ہو گیا۔ شہ سرخیوں پر نظر ڈال کر میں نے اندرونی صفحہ کھولا تو ایک تصویر کے ساتھ لگی خبر نے مجھے چونکا دیا۔

''شوہر نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔''

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسی خبریں تو آئے دن اخبار میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں چونکنے والی کیا بات ہے۔ وہ تصویر میرے بچپن کے دوست عامر سے متعلق تھی، مگر میں عامر کی تصویر دیکھ کر نہیں، حقیقتاً خبر دیکھ کر ہی چونکا تھا، کیوں کہ یہ خبر میرے لیے ناقابلِ یقین تھی۔

عامر کی سال بھر پہلے عالیہ سے محبت اور پسند کی

شادی ہوئی تھی۔ عالیہ کو عامر نے کسی شادی میں دیکھ کر پسند کیا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کا خاندان بھی ان کے لیے سماج کی دیوار نہ بنا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عامر کے والد اور عالیہ کی والدہ دور کے رشتے دار نکلے، پھر اس کے علاوہ عامر ایک نیک اور برسرِ روزگار لڑکا تھا، جبکہ عالیہ خود بھی ایک باحیا، پردہ دار اور شریف لڑکی تھی۔ عامر اپنی محبت پا کر بے حد خوش تھا، پھر ایسا کیا ہوا کہ یہ ناخوشگوار حادثہ پیش آیا۔ شاید کسی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو یا پھر کسی نے عامر کے خلاف کوئی سازش کی ہو۔ میرے دل و دماغ میں ہلچل مچ گئی تھی اور طبیعت میں شدید بے چینی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً آفس فون کیا اور ایمرجنسی کا کہہ کر رحیم بابا سے بیگ پیک کروایا اور فوری طور پر حیدر آباد روانہ ہو گیا۔

☆......☆

''عامر میرے دوست یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ مجھے بتا کس نے چال چل کر تجھے پھنسایا ہے؟''

عامر میرے روبرو سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ ایک خوبرو نوجوان تھا، مگر آج اس کی بڑھی ہوئی شیو اور وحشت ناک آنکھیں دیکھ کر مجھے اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔

''اس نے میرا مان توڑ دیا ہاشم، میری محبت کا بھرم نہ رکھ پائی وہ۔'' عامر نے میرے اصرار پر خاموشی کا قفل توڑا۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ بھابی تو بہت چاہتی تھیں تجھے اور وہ تو بہت باحیا اور پردہ دار تھیں اور تو خود اُن کی شرافت کے گن گایا کرتا تھا۔''

کھل کر پوچھ بھی نہیں پا رہا تھا کہ کیا وہ کسی اور کے



ساتھ انوالو ہو گئی تھیں۔

''وہ مرتے وقت تک پاکباز تھی۔ میں اس بات کا گواہ ہوں۔'' عامر نے میرے خیال کی تردید کی۔

''پھر کیا کسی نے کوئی چال چلی ہے۔ تجھے پھنسایا ہے جھوٹے الزام میں۔ مجھے بتا میں وکیل کرتا ہوں۔''

''میں اعتراف جرم کر چکا ہوں۔ میں نے ہی اسے گلا گھونٹ کر مارا ہے۔'' عامر نے ہنوز اسی گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

''ایسا کیا ہو گیا تھا، تو کیوں مجھے الجھا رہا ہے۔ صاف صاف بتا آخر کیا ہوا تھا جو تو نے یہ قدم اٹھا لیا؟''

میری جھنجلاہٹ پر عامر نے مجھے نظر بھر دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری اور پھر کہنے لگا۔

''ہاشم ضروری نہیں کہ ایک شوہر اپنی بیوی سے صرف اسی لیے نفرت کرے، اسے قتل کرے کہ وہ پاک دامن نہیں۔ عالیہ بہت اچھی عورت تھی۔ باحیا اور باکردار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سلیقہ مند بھی تھی۔ شادی کے بعد اس کے ہاتھ کے ذائقے دار کھانے کھا کھا کر اور گھریلو امور میں اس کی مہارت دیکھ کر اس کا اور بھی شیدائی ہوگیا تھا۔ ایک شوہر کو اور کیا چاہیے کہ جب اس کی محبت اس کی بیوی بن کر اپنے شوہر کی زندگی اور گھر دونوں کو جنت بنادے۔ عالیہ کو اچھے اچھے کھانے بنانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ خوب صورت تو تھی، مگر ساتھ ہی اس کو خود کو اور گھر کو بھی سجانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ آئے دن مجھے لسٹیں تھمادیتی تھی کہ یہ لادو، وہ لادو۔ شروع شروع میں تو میں بھی بخوشی اسے تمام من پسند اشیاء فراہم کرتا رہا، مگر جب محض چھ ماہ میں ہی میرا سارا بینک بیلنس ختم ہوگیا تو میں نے پریشان ہوکر عالیہ سے اس کا تذکرہ کیا۔

''عالیہ ہمیں اپنے اخراجات کو کچھ کنٹرول کرنا ہوگا، ورنہ بصورتِ دیگر ہمارے لیے بڑے مسائل کھڑے ہوجائیں گے۔ اللہ نے چاہا تو کل کو ہم صاحب اولاد بھی ہوجائیں گے، تب تو بچت کرنا ناممکن ہوجائے گا۔ اس لیے ہمیں ابھی سے ہی سنبھل کر چلنا ہوگا۔''

میری بات سن کر عالیہ نے میری تائید کرنے کے بجائے الٹا بحث شروع کردی۔

''کیا مطلب ہے؟ میں فضول خرچی کرتی ہوں؟ ارے جو کچھ کرتی ہوں، تمہارے اور تمہارے گھر کے لیے کرتی ہوں۔''

مجھے اس کی بات سن کر غصہ تو آیا اور اس کا یہ روپ میرا دل بھی دکھا گیا، مگر پھر بھی میں نے تحمل سے کام لیا اور کہا۔

''یہ گھر ہم دونوں کا ہے اور ہمیں ہی مل جل کر چلانا ہے۔ ہم دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ زندگی میں اچھا برا وقت تو آتا ہی ہے۔ عقلمندی اسی میں ہے کہ کل کے لیے آج ہی کچھ بچا کر رکھا جائے۔''

مگر عالیہ نے میرے ضبط اور سمجھانے کو بالکل ہی نظر انداز کردیا اور غصے سے بولی۔

''ہاں تم ہی تو عقل مند ہو، میں بے وقوف ہوں۔ مجھے کیا پڑی ہے جو جان جوکھوں میں ڈال کر تمہارے لیے ہانڈی چولہا کروں اور تمہارے گھر کو رگڑ رگڑ کر چمکاؤں۔''

اتنا کہہ کر وہ پیر پٹختی ہوئی چلی گئی اور اس دن کے بعد گویا اس نے اپنا رنگ ڈھنگ ہی بدل لیا۔ یا تو وہ کھانا بناتی ہی نہیں تھی یا پھر انتہائی بدمزہ اور جلا ہوا۔ گھر کی حالت بھی ابتر رہنے لگی تھی۔ اب وہ مجھ سے بھی کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی اور کبھی کوئی ضروری بات کرتی بھی تو ایسے جھڑک کر جیسے کسی نوکر یا غلام سے بات کررہی ہو۔

گھر کی پریشانیوں اور آئے دن کی ناچاقیوں کے باعث آفس میں میری کارکردگی خراب ہونے لگی اور پھر ایک دن بے دھیانی میں کی گئی بڑی غلطی کے سبب مجھے نوکری سے فارغ کردیا گیا۔ میں لٹا لٹایا، قسمت کو روتا پیٹتا گھر آیا اور اسے اپنی بپتا سنائی تو اس عورت نے شوہر سے ہمدردی کرنے کے بجائے تمام حدیں ایک ہی جست میں عبور کرلیں۔

''یا اللہ! تو نے کہاں میری قسمت پھوڑ دی۔ ارے میں کیسے کھاتے پیتے گھر سے آئی تھی اور میرا کس کنجوس اور کنگال آدمی سے پالا پڑ گیا۔ ارے جب تم شادی کرکے بال بچوں کا بوجھ اٹھا ہی نہیں سکتے تھے تو شادی کرنے کی کیا پڑی تھی۔ ہائے اماں کیسے بھوکے ننگے کے سنگ باندھ دیا مجھے؟ نہ خاندان، نہ ذات پات، نہ رہنے اوڑھنے کا سلیقہ نانجار کہیں کے۔ بیوی کیوں لائے، باندی خرید لاتے۔''

اس کا بین اور دہائیاں سن کر میرا سر پھٹنے لگا تھا اور اس کا خوب صورت چہرہ مجھے کسی ناگن کی مانند دکھائی دینے لگا تھا جس کی گز بھر لمبی زہریلی زبان شعلے اگل رہی ہو، پھر میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا ڈالا، تاکہ اس کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوجائے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید میرا اپنا دل بند ہوجاتا۔ خبیث عورت......!'' ہاشم نے دانت کچکچا کر کہا۔ وہ جذبات کی شدت سے ہانپنے لگا اور میں اس کا شانہ تھپکتے ہوئے سوچنے لگا۔

''ہر خبر کا پس منظر ہمیشہ ایک ہی نہیں ہوتا۔ ہر مرد اپنی عورت کو اس لیے نہیں مارتا کہ وہ بدچلن ہے، بلکہ مرد نافرمان اور بدزبان عورت سے بھی بیزار ہوجاتا ہے اور یہ تو آپ نے بھی سنا ہوگا کہ جب عورت کی زبان چلتی ہے تو مرد کا ہاتھ اٹھتا ہے۔''

☆......☆

نویں سچ بیانی

اَمر بی بی

غلام مصطفےٰ خان

مظفر گڑھ سے، مردوں کے ظلم وستم کی شکار، اَمر کی عبرت انگیز کہانی

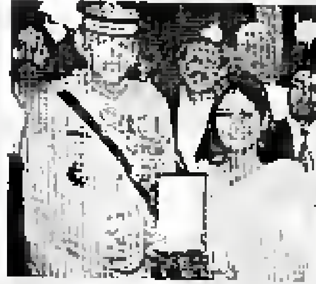
بہار کا موسم، ہر سو ہریالی، ہر طرف پھول، کوئل کی خوش راگنی، چڑیوں کی چہچہار عروج پر تھی۔ خوشگوار موسم اور صبح کی بھینی بھینی خوشبو والی بادِ صبا میں پرندوں کے غول در غول مستیاں اور اٹکھیلیاں کررہے تھے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ہوا کے دوش پر محو رقص تھے۔ سورج بھی اپنی ہلکی ہلکی کرنیں بکھیر رہا تھا اور وقت کا گھوڑا حسب معمول سرپٹ دوڑا جارہا تھا۔ امر ان سب چیزوں سے بے نیاز گھٹنوں میں دبائے زاروقطار رو رہی تھی۔ اس طرح کے موسم کی وہ رسیا تھی، لیکن آج بھی سب کچھ ویسے کا ویسا تھا، مگر اذانوں سے پہلے جاگنے والی امر آج جاگ تو پتا نہیں کب سے رہی تھی، لیکن آج وہ سب کاموں اور وقت سے لاپروا ہوکے رو رہی تھی۔ روتی بھی کیوں نہ، مصائب کا مقابلہ کرتے کرتے آج وہ خود ٹوٹ چکی تھی، اس کی آخری امید کی کرن بھی دور افق میں روپوش ہوچکی تھی۔

امر ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کا باپ انور ایک معمولی پھیری والا تھا، جو گلی سڑی سبزیاں اور پھل بیچ کے گھر کا چولہا جلاتا تھا اور اس کی امی زینب بھی محلے والوں کے کام کاج کرکے زندگی کا پہیہ گھما رہی تھی۔ اسی زبوں حالی کے دور میں امر کی صحت کا خیال رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ زندگی گھسی پٹی ڈگر پر چل رہی تھی۔ جسے جسم اور سانسوں کا رشتہ بحال رکھنے کے لیے دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوں، وہ بھلا کسی کی صحت کا خیال کیسے رکھے؟ انہی حالات میں امر کی پرورش ہورہی تھی۔ جب بھی عید کا موقع آتا تو وہ گلی محلے میں بچوں کو رنگ برنگے کپڑوں میں دیکھ کر اپنے امی ابو سے کپڑوں اور نئے جوتوں کا مطالبہ کرتی تو ہمیشہ ایک ہی جواب ملتا کہ بس اپنی بچی کو اگلی عید پر لادوں گا۔ اگر وہ ضد کرتی تو ہمیشہ اسے ڈانٹ ڈپٹ اور آنکھوں سے اشکوں کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔

حسب معمول انور آج بھی پرانے امرود اور پرانی سبزیاں سائیکل پر لادے صبح سویرے ہی گلیوں اور محلوں میں بیچنے نکل گیا، لیکن بہت ہی کم لوگ اس سے پرانی سبزیاں اور پھل خریدتے تھے۔ وہ روزانہ منڈی سے تازہ سبزیاں اور پھل لاتا، وہ تو وہی چیزیں خریدتا جو اسے سستے داموں مل جاتیں، چاہے وہ کیسی ہی کیوں نہ ہوں۔ سارا دن آوازیں لگا لگا کر وہ تھک چکا تھا، لیکن اس کی جیب میں اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ شام کے کھانے کے لیے آٹا خریدتا۔ آج وہ بہت ہی اداس گھر لوٹا اور سامان اتار کے رکھا تو امر نے ایک امرود اٹھالیا تو اس دن اسے باپ کا جو زناٹے دار تھپڑ پڑا تھا، وہ اسے کبھی نہیں بھولے گا۔

☆......☆

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں "دم"





پاکستان کی اہم خاتون شخصیات کی زندگی اور جدوجہد سے مربوط ایک خاص سلسلہ' جس میں آپ آج کی عورت کا اصل مقام' اُس کی اِس معاشرے میں ثابت قدمی' سے منزل کو پانے کی کہانی اور ملکی تاریخ میں اپنا لوہا منوانے کے عزم کو' آپ کے لیے' اُن ہی کی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔

اُن مایہ ناز خواتین کی کہانی' جن سے ہماری آج کی عورت بہت کچھ سیکھ رہی ہے۔

دوشیزہ ڈائجسٹ کی روایات سے' مربوط' آج کی عورت کی عظمت کا آئینہ

"وجودِ زن سے ہے' تصویرِ کائنات میں "دم"





نیر اس کا چچازاد بھائی تھا جس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسرے بہن بھائی بھی نہ تھے۔ وہ شروع ہی سے بُری صحبت میں پڑ گیا تھا اور کم عمری میں ہی نشہ شروع کر دیا تھا۔ اسے کسی کی کوئی خبر اور پروا نہیں تھی اور نہ اسے اپنا ہوش تھا۔ کبھی نشے میں دھت کہیں پڑا ہے تو کبھی کہیں۔ جب نشے کے لیے کچھ نہ ملتا تو چوری اور ڈاکے بھی ڈالتا تھا۔ کئی بار جیل کاٹ چکا تھا۔ اتنے بڑے بڑے بال، گھنی میلی کچیلی اور بے ڈھنگی بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ سرخ آنکھیں امر کو تو اسے دیکھ کے بھی ڈر لگتا تھا اور وہ اس کے منہ سے ٹپکتی رال دیکھ کر ڈری جاتی تھی۔

جب امر کچھ بڑی ہوئی تو اسے بھی اپنی ماں کے ساتھ لوگوں کے کام کاج کرنے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ کسی گھر میں وہ لوگوں کے کپڑے دھوتی تو کہیں جھاڑو لگاتی اور کہیں اسے برتن صاف کرنے پڑتے جس کے بدلے میں اسے چند روپوں کے ساتھ ساتھ بہت سے طعنے تشنے بھی سہنے پڑے تھے۔ کپڑے صاف نہیں دھلے، داغ ویسے کے ویسے ہیں۔ برتنوں پر چکنائی کے داغ بھی نہیں اترے، حرام کے پیسے لیتی ہو، حرام کی کمائی کھاتی ہو، صحیح طریقے سے کام نہیں کر سکتی ہو حرام زادی کہیں کی۔ ایسے الفاظ سن کر اس کا دل بھر آتا اور وہاں نہ کام کرنے کا تہیہ کرتی، لیکن مجبوراً اسے صبح آنا پڑتا، کیوں کہ انہی کے گھر کے بچے ہوئے ٹکڑوں سے تو اس کا پیٹ پلتا تھا، ورنہ اپنے گھر میں اور کیا رکھا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور وقت کے ساتھ امر بھی بڑی ہوتی رہی۔ اب انور اور زینب کو گھر کے ساتھ ساتھ ایک اور فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اب امر کی شادی بھی کرنی تھی، لیکن گھر میں تو کچھ بھی نہیں تھا اور لوگ بھی ان کی غربت کی وجہ سے ان سے نفرت کرتے تھے۔ زینب کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ دن کو کام میں تو لگی رہتی، لیکن اس کا خیال امر کے بارے میں لگا رہتا کہ کیا میری بچی کی عمر بھی میری طرح گزرے گی، لیکن پھر ایک موہوم سی امید پیدا ہوتی اور خدا سے دل ہی دل میں گڑگڑا کے دعا مانگتی کہ میری بچی کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ آ جائے، لیکن اس بے چاری کو اتنا پتا نہیں تھا کہ لوگ ان کے گھر سے رشتہ تو کیا، انہیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ انور نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ بیٹی کا رشتہ اچھی جگہ ہو جائے لیکن کوئی بات نہ بنی۔ رات بھر میاں بیوی یہی سوچتے کہ بیٹی کا کیا بنے گا۔ بیٹی اب انہیں رحمت کی بجائے زحمت لگنے لگی تھی۔ انور تو دل ہی دل میں دعا کیا کرتا کہ اے اللہ تو اگر اس کا رشتہ نہیں بھیجتا تو اسے سنبھال لے۔

امر جوانی کی دہلیز پر کب کی پاؤں رکھ چکی تھی، تمام لڑکیوں کی طرح اس کے دل میں بھی شادی کے سہانے خیال آتے تھے اور وہ دل ہی دل میں مسکرا دیتی تھی۔ اب اس کا انتظار طول پکڑتا جا رہا تھا۔ جب پہلی بار کہیں سے دو، ایک رشتے والے آئے تھے تو وہ کتنا نہال تھی، لیکن جب وہ جہیز کا مطالبہ کرتے تو اس کے ماں باپ کا دل دھک سے ڈوب جاتا اور پھر ناامیدی اور مایوسی کے سائے اور بھی گہرے ہو جاتے۔ ادھر امر کی جوانی گزری جا رہی تھی۔ اب انور اور زینب کو اچھے رشتے تو کیا کسی بھی رشتے کی تلاش تھی، لیکن کوئی بھی ان کی بیٹی کا رشتہ لینے کے لیے رضامند نہ ہوا اور ادھر امر کے بالوں میں چاندی دیکھ کر زینب کتنا روئی اور چلائی تھی، مگر انور بھی کرتا تو کیا، وہ بھی تو سارے جتن کر چکا تھا۔

ایک دن دونوں میاں بیوی چولہے کے پاس بیٹھے تھے۔ امر اندر ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر لیٹی پڑی تھی کہ انور نے زینب کو اپنا فیصلہ سنایا کہ زینب سنو، میں نے امر کی شادی نیر سے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی زینب کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، آسمان چکراتا ہوا محسوس ہوا، بے چاری بہت چلائی، مگر ہوتا کیا تھا کچھ بھی نہیں، کیوں کہ اس کا متبادل تو کچھ بھی نہیں تھا۔ رو دھو کے اسے شوہر کی بات سے متفق ہونا پڑا۔ وہ اور کرتی بھی تو کیا۔ امر کو جب اس بات کا پتا چلا تو وہ چوری چوری کتنا روئی تھی۔ وہی نیر جسے وہ ایک آنکھ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی، وہ آج اس کے سر کا تاج بننے جا رہا تھا۔ وہی نشئی جس کے منہ سے ہمیشہ رال ٹپکتی رہتی ہے جسے نہ صبح کا پتا ہوتا ہے نہ شام کا، یہ سوچ کے بھی وہ لرزی جاتی۔

زینب اور انور نے پیٹ کاٹ کاٹ کے امر کے لیے تین چار سوٹ کپڑوں کے خریدے اور چند پرانے کپڑے زینب جہاں سے کام کرتی تھی، وہاں سے لے آئی اور ایک پرانا جوتا بھی تھا۔ یہ تھا امر کے جہیز کا کل سامان۔ انور نیر کو ڈھونڈ کے اس کے گھر لایا، گھر کیا تھا

ایک کچی جھونپڑی تھی جو مدتوں سے ویران اور سنسان پڑی تھی۔ در و دیوار میں گھاس اُگ آئی تھی۔ زینب اور انور نے مل کے اس کے گھر کی صفائی کی جہاں جہاں دیواریں ٹوٹ چکی تھیں وہاں گارے سے لپائی کی، گھاس کاٹی۔ نیر کا حلیہ ٹھیک کیا۔ وہ چند روز نشے سے دور رہنے کی وجہ سے نارمل حالت میں آیا تھا۔ انور نے اسے شادی کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہوگیا۔ چند دنوں بعد انور نے چند اپنے طرح کے لوگوں کی موجودگی میں امر کا نکاح نیر سے کر کے اپنے سر سے بوجھ اتار دیا۔

امر کی شادی کیا ہوئی تھی، اس پر تو مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ نیر تو کسی کام کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا، تو مجبوراً امر کو شادی کے تیسرے دن دوبارہ لوگوں کے گھروں میں کام کے لیے جانا پڑا۔ اب اس کے کندھوں پر دوہری ذمے داری تھی، اپنے ساتھ ساتھ اسے نیر کا پیٹ بھی پالنا پڑتا تھا۔

امر صبح سویرے گھر سے نکلتی اور رات کو گھر واپس آتی تھی۔ جب وہ واپس آتی تو اس کے سر پر پرانے اخباروں اور کاغذوں کی گٹھڑی ہوتی تھی اور ہاتھ میں پرانے ٹین کے ڈبے ہوتے تھے جنہیں وہ کباڑ میں فروخت کرتی تھی اور روپیہ روپیہ اکٹھا کرتی تھی۔ نیر اس سے دوسرے چوتھے دن پیسوں کا مطالبہ کرتا تھا، کیوں کہ وہ نشہ کرتا تھا اور کوئی بھی کام نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ پیسے دینے سے انکار کرتی تو وہ اسے بُری طرح مارتا تھا، آخر مجبوراً اسے پیسے دینا پڑتے تھے۔

وقت گزرتا رہا، اب امر کو خدا نے دو چاند جیسے بیٹے بھی عطا کیے تھے، جن کی امر اچھی پرورش کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ یہ بڑے ہو کر تعلیم حاصل کریں اور کسی بڑے اسٹور میں کلرک بن جائیں۔ اب اسے اپنا مستقبل روشن نظر آنے لگا تھا اور اس نے اور زیادہ کام کرنا اور پیسے جوڑنا شروع کر دیے تھے۔ اب اس کی زندگی میں کوئی آرام نہیں تھا، سوائے اتوار والے دن۔ وہ اتوار کو کام پر نہیں جاتی تھی، بلکہ پرانے اخبار اٹھا کر بیٹھ جاتی اور تصویریں دیکھا کرتی تھی۔ اب اس نے ایک ایک روپیہ بچا کے اکٹھا کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ ان روپوں کو ایک ٹین کے ڈبے میں ڈال دیتی تھی اور اس ٹین کے ڈبے کو وہ اس کے چارپائی پر پڑے سامان میں چھپا کر رکھا تھا، تاکہ نیر کی اس پر نظر نہ پڑے۔ وہ ہر روز انہیں گنا کرتی تھی۔ وہ ہزار روپے پورے کرنا چاہتی تھی جو امر کے خیال میں اس کے بچوں کے مستقبل کے لیے لازمی تھے۔ آج پیسے گنتے ہوئے وہ کتنا خوش تھی، کیوں کہ آج ڈبے میں 988 روپے تھے۔ وہ ہدف پورا کرنے میں صرف بارہ قدم پیچھے تھی۔ اسے اپنا دل خوشی سے جھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی محنت رنگ لا رہی تھی، وہ سہانے مستقبل کے سپنے دیکھ رہی تھی، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شام کو وہ جب کام سے تھکی ہاری کام سے لوٹی تو نیر حسب عادت ابھی گھر نہیں آیا تھا، وہ ہمیشہ دیر سے آنے کا عادی تھا۔ دن بھر تو وہ آوارہ اور نشئی دوستوں کے ساتھ نشے میں دھت رہتا اور رات گئے گھر واپس آتا تھا۔ اس نے بچوں سے پیار کیا، لوگوں کے گھروں سے بچا کھچا کھانا بچوں کو کھلایا اور انہیں سلا دیا۔ وہ کافی دیر تک نیر کے انتظار میں جاگتی رہی۔ وہ جیسا بھی تھا اس کے سر کا سربراہ تھا۔ اس کے گھر کا تاج تھا۔ لیکن کافی دیر تک وہ واپس نہ آیا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ نہ جانے کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا؟ یہی سوچ بچار کرتے ہوئے دن بھر کی تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی آنکھ لگ گئی، صبح جب وہ جاگی تو گھر کے باہر لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ قریبی گھر میں رات کو ڈاکو گھس آئے تھے۔ وہ قیمتی سامان اور زیورات بھی اٹھا کر لے گئے اور مالک مکان کو بھی قتل کر دیا اور ان میں سے ایک آدمی کو پولیس نے گرفتار بھی کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی اور دل ہی دل میں دعا بھی کر رہی تھی کہ خدا اس کا سہاگ سلامت رکھے، کہیں نیر تو اس واردات میں شامل نہیں تھا۔ اس نے بچوں کو گھر پر چھوڑا اور بھاگتے ہوئے قریبی تھانے میں گئی تو پتا چلا کہ نیر تو قتل اور چوری کی واردات میں حوالات میں بند تھا۔ اسے حوالات میں بند دیکھ کر اس کا دماغ چکرا سا گیا۔ وہ کافی دیر تک اس سے حقیقت دریافت کرنے کی کوشش میں لگی رہی کہ آیا کہ وہ اس واردات میں ملوث بھی تھا یا شک کی بنیاد پر پولیس نے اسے گرفتار کیا تھا، لیکن نیر نے اسے کچھ بھی نہ بتایا۔

وہ اسے چھوڑ کر گھر واپس آ گئی۔

گھر آتے ہی ایک اور مصیبت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے رقم والا ڈبہ اٹھایا تو وہ خالی تھا۔ اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکل گئی۔ اس کی زندگی کی جمع پونجی لٹ چکی تھی۔ اس نے کیسے بچوں کے روشن مستقبل کی خاطر بڑی محنت مشقت سے رقم جوڑی تھی۔ اس پر دونوں طرف سے مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ چکے تھے۔ اس کا روشن مستقبل اسے تاریک نظر آ رہا تھا۔ اسے شک گزرا کہ یہ رقم نیر نے چرائی ہوگی۔ وہ پھر الٹے قدم بھاگتے ہوئے تھانے میں گئی اور نیر سے اس رقم کے بارے میں پوچھا، لیکن اس نے کچھ بھی نہ بتایا تو اس نے پولیس والوں سے کہا کہ قتل اور چوری کے ساتھ ساتھ اس سے وہ میری رقم کے بارے میں بھی تحقیق کریں، یہ میرا چور ہے، اس سے میری رقم واپس دلوا دیں۔

زندگی بھر کی کمائی کے لٹ جانے سے اسے اب تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ مزید کام کرنے سے بیزار ہو چکی تھی۔ وہ ہر روز تھانے جاتی، لیکن نیر سے رقم کا کوئی پتا نہ چلا اور اس پر قتل اور چوری کا الزام ثابت ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں اسے سزائے موت سنائی گئی تھی۔ اس نے ہر طرف سے ہاتھ پاؤں مارے، جن لوگوں کے ہاں وہ کام کرتی تھی ان سے مدد کی درخواست کی، مگر کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی۔ جس دن اس کو پھانسی ہوئی اور میت گھر پہنچی تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ بچے رو رو کر نڈھال ہوگئے۔ اس پر بھی سکتہ طاری ہوگیا تھا اور دورے پر دورے پڑ رہے تھے۔ محلے کے چند لوگوں نے مل جل کر اس کی تجہیز و تکفین کی تھی، ورنہ اس کے پلے کیا تھا۔

اس غم میں وہ تین چار دن تک کام پر بھی نہیں گئی تھی۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ وہ زندہ رہنے کی تمنا ہار چکی تھی۔ اسے زندگی سے کوئی محبت نہیں رہی تھی، سب کچھ لٹا کے بھی اسے چین نہیں ملا تھا۔ اس نے خودکشی کرنے کی ٹھان لی تھی، لیکن گود میں پڑے روتے اور سسکتے اور بلکتے بچوں کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ میں تو اس ظالم دنیا سے جان چھڑا لوں مگر میرے ان بچوں کا کیا ہوگا۔ اگر میں مر گئی تو ان کو کون کھلائے گا، پلائے گا، ان کی کفالت کون کرے گا۔ اگر میں نے بھی ان کی تربیت نہ کی تو ان کا انجام بھی باپ جیسا ہوگا؟ یہ بھی نشئی بن کے زندگی گزاریں گے؟ کیا ان کو بھی زمانہ حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا؟ یہ سوچتے ہی اس میں زندگی کا حوصلہ پیدا ہوا، نہیں میں خودکشی نہیں کروں گی مجھے جینا ہوگا، مجھے اپنی اولاد کی خاطر جینا ہوگا۔ مجھے یہ دکھ درد برداشت کرنا ہوں گے۔ مجھے اپنے بچوں کو سہارا دینا ہوگا۔ ان کی مشکلات کو اپنے سر پر اٹھانا ہوگا، لیکن انہیں ہر حال میں خوش رکھنا ہوگا۔ یہی سوچ کر اس نے زندگی کی روٹین کو دوبارہ شروع کیا اور اپنے بچوں کی خاطر دوبارہ کام کرنا اور لوگوں کے گھروں پر برتن اور کپڑے صاف کرنا شروع کر دیے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ محنت اور زیادہ کام کر رہی تھی، کیوں کہ بچے اب بڑے ہو رہے تھے اور ان کی ضروریات میں بھی اضافہ ہو چکا تھا اور اب ان کی پڑھائی اور روشن مستقبل کی خاطر پھر سے روپیہ روپیہ جوڑنا تھا اور انہیں پھر سے ٹین کے ڈبے میں ڈال کر پرانی پھٹی پرانی رضائی کے نیچے چھپا کے رکھنا تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔ وقت اور مشکلات سے مرجھایا ہوا جسم کسی مریل بیل کی طرح زندگی کے چکر پورے کر رہا تھا، لیکن دل میں امید کی چنگاری سلگ رہی تھی جو بچوں کے روشن مستقبل کی صورت میں تھی، تبھی تو وہ سب مشکلات اور دکھوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر رہی تھی۔

امر ایک چٹان کی مانند سینہ سپر بنی ہوئی تھی۔ وہ گردش روزگار کے ہاتھوں تنگ تو تھی، مگر اپنے بچوں کو احساس تک نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ ہر روز جیتی اور ہر روز ہی مرتی تھی، لیکن اس نے اپنے بچوں کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ روکھی سوکھی جو کچھ بھی میسر ہوتا، پیار و محبت سے بچوں پر نچھاور کر رہی تھی۔

آج امر کو زندگی کی پہلی خوشی میسر ہو رہی تھی اور آج وہ وقت سے پہلے ہی اٹھ گئی تھی۔ آج اس کا مرجھایا ہوا گلاب سا چہرہ پھر سے کھل اٹھا تھا، کیوں کہ آج اس کے بڑے بیٹے طلحہ نے پہلی بار اسکول جانا تھا اور وہ اس کے اسکول جانے کا انتظام کر رہی تھی۔ چاہت سے خریدی ہوئی یونیفارم کی سلوٹیں درست کر رہی تھی، پھر جلدی سے اٹھی، کسی کے گھر سے لائی ہوئی گندم کو اٹھایا، گندم کیا تھی

آدھے سے زیادہ اس میں جو تھے، پھر بھی وہ خوش تھی۔ آج کافی مدت بعد اس کے اپنے گھر میں چولہا جلے گا۔ آج اس کے گھر سے بھی دھواں اٹھے گا۔ وہ اس برائے نام گندم کو ہاتھ کی چکی پر پیس رہی تھی اور دل ہی دل میں اللہ پاک کا شکر بھی ادا کر رہی تھی، تھوڑی دیر میں آٹا تیار ہو چکا تھا اور وہ اس آٹے کو جھونپڑی میں بیٹھی گوندھ رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر بھاگ کر باہر سے سوکھے سرکنڈے لے آئی اور روٹی پکنا شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ادھ جلی دو روٹیاں تیار تھیں اور کھانے کے لیے ساتھ نمک کی نعمت بھی ساتھ تھی اور جلدی سے طلحہ کو محبت اور مان سے جگایا اور اس کا ہاتھ منہ دھلایا اور کھانا پیش کیا۔ طلحہ آج بہت ہی خوش تھا، کیوں کہ وہ گھر کی پکی روٹی کھا رہا تھا اور خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد طلحہ یونی فارم میں ملبوس تھا اور ہاتھ سے بُنا کپڑے کا تھیلا جس میں ایک قاعدہ اور تختی تھی، تھامے مسکرا رہا تھا۔ امر اسے سمجھا رہی تھی کہ بیٹا وہاں پر لڑائی جھگڑا نہ کرنا، محنت اور جی لگا کر تعلیم حاصل کرنا اور اعلیٰ نوکری حاصل کرنا، دیکھا نہیں ہے نوابوں کے بچے کیسے بنے سنورے ٹہل رہے ہوتے ہیں، تو بھی ایک دن ویسا ہی ہوگا۔

امر بچے کی انگلی تھامے اسکول چھوڑنے کے لیے باہر نکل تو ایک معصوم بچی کی صدائیں دینے۔ "خدا آپ کے بچے کو سلامت رکھے، اللہ کے نام پر کچھ دے دو، امر کے پاس تو اور کچھ نہ تھا جب اس نے بچے کا نام کا صدقہ مانگا تو اس نے اسے اپنے سر سے چنری اتار کے دے دی، جو اسے کام کرنے والوں کے ہاں سے کسی کی شادی کے موقع پر ملی تھی اور خود پھٹی پرانی چنری اوڑھے بچے کو اسکول چھوڑ آئی۔ زندگی کے کچھ اچھے لمحات گزر رہے تھے اور طلحہ اسے چھوٹا بیٹا عدیل بھی کچھ بڑا ہو گیا تھا اور اسے بھی اسکول میں داخل کرانا تھا۔ وہ جب کام پر جاتی تو عدیل اکیلا رہتا تھا۔ جب وہ واپس آتی تو مختلف گھروں سے بچا کھچا سالن اور روٹی بھی لاتی تھی۔ ایک دن جب وہ کام سے واپس آئی، دیکھا کہ طلحہ اکیلا گھر میں تھا اور عدیل موجود نہیں تھا۔ اس نے طلحہ سے عدیل کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ میں تو جب آیا عدیل گھر میں نہیں تھا۔ میں سمجھا آج تمہارے ساتھ گیا ہوگا۔ اب امر

تھی کہ اس کا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا، لگی وہ اسے تلاش کرنے اِدھر اُدھر، گلی محلے سے پتا کیا، مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس کا کلیجہ باہر آنے لگا تھا۔ رات بھی ہو گئی تھی، مگر عدیل کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ مصیبت پر مصیبت اور طوفانوں پر طوفان، وہ روتی رہی، چلاتی رہی، پاگل ہو رہی تھی، اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کسے کہے کہ آدھی رات گزر چکی تھی۔ وہ بیٹھی رو رہی تھی کہ اچانک دو بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی اندر داخل ہوئے۔ گھر کا دروازہ تو تھا ہی نہیں۔ دروازے کی جگہ پر ایک پرانا کپڑا لٹکا رہتا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ ڈر گئی اور پوچھا۔ "کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" ان میں سے ایک نے گرج دار آواز میں کہا۔ "ان باتوں کو چھوڑو، تیرا بیٹا ہمارے قبضے میں ہے، پچاس ہزار روپے کا انتظام کرو ورنہ تیرے بیٹے کو قتل کر دیا جائے گا۔" بے چاری رو رو کر اور چلا چلا کر پیچھے سے پکارتی رہی۔ خدا کے واسطے میرے بچے کو کچھ نہ کہنا۔ میں رقم کا بندوبست کروں گی۔ وہ تو چلے گئے اور اس بات کا یقین دلا گئے کہ رقم کا انتظام کرنا اور اپنا بچہ واپس لینا اور ہاں اگر تو نے کسی کو بتایا یا پولیس کو خبر کی تو بچے سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ بے چاری بہت روئی، چلائی، بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر پچاس ہزار تو کیا پانچ سو کا بھی انتظام نہ ہو سکا، لیکن ظالموں کو کیا پتا کہ بڑی بڑی کوٹھیوں میں کام کرنے والی کے پاس بڑی رقم بھی ہوگی۔ اس کے پلے کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے دو دن کی مہلت دی گئی تھی کہ رقم لے کر فلاں روڈ کے پاس آ جانا اور بچہ لے جانا۔ اگر زیادہ چالاکی دکھائی تو انجام برا ہوگا۔

دو دن بعد امر اس روڈ کے پاس پہنچ گئی، لیکن ہاتھ میں چند روپوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ وہاں کھڑی روتی رہی۔ عدیل کی جدائی نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور وہ یہ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ پتا نہیں وہ اس کے بچے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، کیوں کہ اس کے پاس رقم تو تھی نہیں، وہ خود میں ہی گم تھی کہ ایک کار آ کر رکی اور آدمی نے شیشے سے باہر سر نکال کر کہا کہ کہاں ہے رقم۔ وہ گم سم کھڑی رہی اور اندر سے عدیل کے چلانے کی آواز آئی۔ "امی مجھے ان سے چھڑاؤ، مجھے ان کے پاس نہیں رہنا، مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے۔"

امر کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ بھاگ کے کار کے پاس گئی اور اندر ہاتھ ڈال کر بچے کو اٹھانا چاہا، مگر ایک مضبوط ہاتھ نے اس کی کمزور کلائی پکڑ لی اور کہا۔

"پہلے پیسے بعد میں بچہ۔"

پھر زوردار آواز میں پوچھا۔ "کہاں ہے پیسا؟"

امر نے کہا۔ "پیسے نہیں ہیں، مجھے مار ڈالو مگر میرے بیٹے کو رہا کر دو۔" ابھی بات مکمل ہی نہیں کر پائی تھی کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا، وہ خود کو نہ سنبھال سکی اور وہیں سڑک پر گر پڑی۔ کار چل دی اور وہ پاگلوں کی طرح کار کے پیچھے بھاگتی رہی، مگر کار تو نہ جانے کہاں جا چکی تھی۔ وہ زار و قطار روتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ نہ اسے اپنا خیال تھا نہ گھر کا کہ ایک معصوم تو گھر میں بھی اکیلا پڑا ہے۔ وہ کس حال میں ہوگا۔ کافی دیر بعد وہ گھر واپس لوٹی۔ طلحہ بھی رو رو کے بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر اور زیادہ گھبرا گئی اور اس کو گود میں اٹھا لیا۔ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے، تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آیا تو ماں کے گلے سے لپٹ کے رونے لگا۔ ماں تو اور زیادہ جوش میں آئی۔ کسی بچے کی طرح جو بھوک سے چلا رہا ہو، چیخ چیخ کر رو رہی تھی، نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ تو سولی پر بھی لگ جاتی ہے۔ تین چار دن تک وہ اسی طرح گھر میں بے سدھ پڑی رہی۔ اگلے دن جب وہ صبح باہر نکلی تو باہر کھیتوں میں پرندے شور کر رہے تھے۔ وہ وہاں گئی تو جو کچھ اس نے وہاں دیکھا وہ ناقابلِ بیان تھا، کیا دیکھتی ہے کہ عدیل کا سر دھڑ سے جدا ہے اور معصوم کے نازک جسم کو پرندے نوچ رہے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک اسپتال میں تھی۔ نہ جانے اسے کون اسپتال میں لایا تھا اور کیوں لایا تھا۔ وہ پاگل ہو چکی تھی۔ اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کبھی وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگتی تو کبھی رونے لگتی اور کبھی گم صم سی ہو جاتی تو کبھی بال نوچنے لگتی۔ چند دنوں بعد اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور وہ واپس آ گئی۔ طلحہ امر کی امی کے گھر تھا اور اس کی امی امر کو بھی اپنے گھر لے آئی اور طلحہ کی دیکھ بھال زینب کر رہی تھی۔ طلحہ ماں کی حالت دیکھ کر بہت ہی اداس اور پریشان تھا، مگر بچہ تھا معمول کے مطابق اسکول آتا جاتا تھا۔

ایک دن طلحہ اسکول گیا ہوا تھا کہ اسکول میں ایک خودکش دھماکہ ہوا اور کافی بچوں کی جانیں چلی گئی تھیں۔ زینب کو جب اس بات کا پتا چلا تو وہ بھاگتے ہوئے اسکول گئی۔ ہر طرف معصوم بچوں کے اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ جگہ جگہ پر بچوں کا اور اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ کافی دیر تک زینب اِدھر اُدھر دیوانہ وار بھاگتی رہی۔ ایک جگہ پر اس کے قدم رک سے گئے۔ اس نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ طلحہ کا جھلسا ہوا جسم پڑا تھا جسے دیکھ کر وہ منہ کے بل گری اور اللہ کو پیاری ہو گئی اور ہمیشہ کے لیے اس دنیاوی دکھ اور مصائب سے نجات پا گئی۔ جب دو لاشیں گھر پہنچیں تو در و دیواروں کو ٹکریں مار مار کر رو رہا تھا، مگر امر ان سب باتوں سے بے نیاز پتھر کے بت کی طرح چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی اور ہر آنے جانے والے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ آسمان لگتا تھا کہ اس صدمے پر اشکبار تھا، مگر امر بت بنی بیٹھی تھی۔ شاید پچھلے صدموں سے اس کا دماغ چل بسا تھا۔ تجہیز و تکفین ہو گئی، مگر امر کی آنکھوں سے ایک اشک بھی نہ نکلا، نکلتا بھی کیسے، آنسو تو رو رو کر کب کے ختم ہو چکے تھے۔ اعصاب جواب دے چکے تھے۔ پہاڑ کا حوصلہ رکھنے والی زمانے کی نظر میں پاگل ہو چکی تھی، مگر اصل میں وہ ٹوٹ چکی تھی۔ اس کے اندر آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ رو رو کر بینائی بھی کمزور ہو چکی تھی۔ ہر کوئی اسے پاگل پاگل کہتا تھا، مگر وہ پاگل تو نہیں تھی۔ پاگل تو اسے پاگل کہنے والے تھے۔ اگر اتنے مصائب پتھر پر بھی پڑتے تو وہ بھی پھٹ پڑتا، وہ تو پھر بھی انسان تھی۔

ایک رات وہ چپکے سے اٹھی اور اپنی پرانی چنری کو چھت سے باندھ کر خودکشی کرنا چاہی، کیوں کہ اب اس کی زندگی کا مقصد ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ مزید غم برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی دنیا لٹ چکی تھی، جس نے شوہر، دو بچوں اور ماں کے جنازے دیکھے ہوں، اس کے غم کا بھلا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ چنری کو گردن میں ڈالا اور جھول گئی، مگر پرانی چنری اس کا وزن برداشت نہ کر سکی اور وہ ٹوٹ گئی اور امر کو موت بھی نہ مل سکی اور آج اس لیے وہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ خدا نے اسے ابھی کون سا دن دکھانے کے لیے زندہ بچا لیا ہے......؟؟؟

☆......☆

معصوم بچیاں

مالا فراز

معصوم زندگیوں کے گرد گھومتی ایک سبق آموز سچ بیانی

میں ان دنوں چھٹیاں گزارنے اپنی پھوپو کے گھر گئی۔ وہ فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ ان ہی فلیٹوں میں ایک فلیٹ آسیہ کا بھی تھا۔ آسیہ ایک بہت ہی خاموش رہنے والی لڑکی تھی۔ میری ملاقات اس سے پھوپو کے فلیٹ پر ہوئی تھی، پھر آہستہ آہستہ ہماری بات چیت شروع ہوگئی، مگر وہ پھر بھی کم بولتی تھی۔ میں کچھ دن پھوپو کے گھر گزار کر واپس آگئی پھر کچھ عرصے بعد دوبارہ پھوپو کے گھر جانا ہوا تو میں آسیہ سے ملنے گئی، وہاں دیکھا تو ایک نوجوان لڑکی بھی تھی اور دو چھوٹی بچیاں بھی جو کہ بہت ہی پیاری تھیں۔ میں نے آسیہ سے پوچھا، یہ کون ہیں تو اس نے کہا کہ وہ ان کے ہاں مہمان آئی ہیں۔ اس لڑکی نے چائے بنا کر دی، پھر کچن میں چلی گئی، وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی، مگر وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھی اور اٹھ کر چلی گئی۔ میں بھی تھوڑی دیر آسیہ کے پاس بیٹھی اور واپس آگئی۔ میں پھوپو کے پاس ایک ہفتہ رہی۔ اس دوران آسیہ مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے آسیہ سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ آسیہ نے بتایا اس کا نام شازیہ ہے۔ ایک روز میں آسیہ کے گھر گئی تو وہ گھر پر نہیں تھی، البتہ شازیہ تھی جو کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ اس نے مجھے بٹھایا اور چائے بنانے چلی گئی، جب وہ چائے لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ آسیہ کی کون ہے۔ تو مجھے شازیہ نے بتایا کہ وہ آسیہ کی کوئی رشتے دار نہیں ہے بلکہ اس کے شوہر کی پہلی بیوی ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت زیادہ حیرت ہوئی کہ وہ اس کے شوہر کی پہلی بیوی ہے، کیوں کہ فلیٹ تو آپس میں بہت ملے ہوتے ہیں اور کسی کو بھی اس بات کی خبر نہیں۔ پوری بلڈنگ والے اس کو آسیہ کا رشتے دار ہی سمجھتے ہیں۔

میں نے شازیہ سے پوچھا کہ وہ اگر پہلی بیوی ہے تو اس نے اپنے شوہر کی دوسری شادی کیوں ہونے دی۔ میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر اپنی بچیوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہیں میرے شوہر کی دوسری شادی کی ذمے دار۔''

اس نے بتایا کہ ساجد سے اس کی شادی چھ سال پہلے ہوئی تھی اور وہ دونوں آپس میں بہت محبت سے رہتے تھے۔ ساجد اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا اور نہ ہی وہ اپنے ماں باپ کے گھر زیادہ جاتی تھی، کیوں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ شازیہ کے گھر والے کہتے تھے کہ تم تو ہمیں بھول ہی گئی ہو۔ ایک



رات بھی نہیں آ کر رہتی۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے، پھر شازیہ نے ایک پیاری سی بیٹی کو جنم دیا، مگر ساجد کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی، جب شازیہ کی ساس کو پتا چلا کہ شازیہ نے بیٹی کو جنم دیا ہے تو وہ ان کے گھر آئیں اور شازیہ کو بہت برا بھلا سنایا اور فوراً ہی چل گئیں۔

دن اسی طرح ساجد کی بے رُخی میں گزرتے رہے اور وہ ایک بار پھر ماں بنی۔ اس بار بھی اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ اس بار ساجد نے اس سے بات تک نہیں کی۔ ساس دیکھنے تک نہیں آئیں۔ شازیہ اپنی بیٹی کو لے کر اسپتال سے گھر آگئی، ان دنوں ساجد کا موڈ بہت خراب رہنے لگا تھا۔ ساجد نے کچھ دنوں کے لیے شازیہ کو اس کے ابو کے گھر بھجوا دیا۔ شازیہ نے بتایا اس کو معلوم نہیں تھا کہ اس کو اس کے والد کے گھر کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ والدین کے گھر رہتے ہوئے اسے 4 مہینے گزر گئے تھے اور ساجد نے اس کی کوئی خیر خبر نہیں لی۔ والد صاحب ساجد کے گھر بھی گئے مگر وہ نہیں ملا۔ تب شازیہ خود ہی اپنے سسرال پہنچ گئی اور اپنی ساس کو بتایا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ ساجد پتا نہیں کہاں ہے۔ ساس نے بھی انجان بنتے ہوئے کہا کہ وہ نہیں جانتی کہ ساجد کہاں ہے۔ کئی دنوں بعد ان کے ایک عزیز نے بتایا کہ انہوں نے ساجد کو ایک عورت کے ساتھ ایک گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔ شازیہ یہ سنتے ہی اپنے والد کے ساتھ وہاں پہنچ گئی تو اسے پتا چلا کہ ساجد دوسری شادی کر چکا ہے اور وہ لڑکی شازیہ کی ساس کی رشتے دار ہے۔ اس کی یہ شادی ساس نے کروائی ہے، کیوں کہ انہیں بیٹا چاہیے تھا، اس لیے شازیہ کو ساجد نے واپس بھیج دیا تھا۔ شازیہ اپنی کہانی سناتی جا رہی تھی اور اس کے آنسو بہتے جا رہے تھے۔

میں نے پوچھا کہ پھر وہ ساجد کے پاس کس طرح آئی اور آج اس فلیٹ میں کیسے ہے۔ شازہ نے بتایا کہ ساجد کی دوسری بیوی آسیہ سے بیٹا ہوا، جب یہ بات انہیں پتا چلی تو والد صاحب خاندان کے کچھ لوگوں کو لے کر ساجد کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ وہ شازیہ کو اپنے پاس رکھے اور دونوں بیٹیوں کو بھی، کیوں کہ وہ ساجد کی ذمے داری ہیں۔ اس طرح ساجد نے اسے اپنے گھر

بلالیا، مگر اس کا رویہ شازیہ کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔

شازیہ کو یقین نہیں آتا ہے کہ وہ یہی ساجد ہے جو اس سے اتنی محبت کرتا تھا اور آج دفتر سے آکر سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ دوسری بیوی کے پاس اور اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں ہے، نہ ہی اس کی کسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اگر بیٹیاں اس کے پاس جائیں تو انہیں کمرے سے آسیہ نکال دیتی ہے۔

شازیہ نے بتایا کہ وہ میٹرک پاس ہے، کہیں جاب بھی نہیں کرسکتی۔ شازیہ کو تعلیم نہ حاصل کرنے کا بھی بہت افسوس ہے۔ اگر پڑھی لکھی ہوتی تو کہیں جاب کرکے اپنی ضرورتیں پوری کرلیتی۔ اب آسیہ اس سے گھر کے سارے کام کرواتی ہے اور خود اپنے بیٹے کو سنبھالتی ہے۔ ساجد بھی آسیہ کی ہی بات مانتا ہے، کیوں کہ وہ بیٹے کی ماں ہے۔

شازیہ اب اپنے گھر دونوں بچیوں کے لے کر نہیں جاسکتی، کیوں کہ اس کی امی کا انتقال ہو چکا ہے، والد بوڑھے ہیں اور گھر میں بھابیاں ہیں جو زیادہ دن تک اسے برداشت نہیں کریں گی۔ شازیہ نے کہا کہ اس ساری صورتحال کی ذمے دار اس کی ساس ہیں۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتیں اور ساجد کو سمجھاتیں تو وہ آج اتنی ذلت کی زندگی نہیں جی رہی ہوتی۔ آج ایک ٹیبلٹ خریدنے کے لیے بھی اس کے پاس نہیں ہوتے۔ آسیہ نے ساجد سے کہہ رکھا ہے کہ اگر اس نے کبھی شازیہ سے بات چیت کی تو وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ اس لیے ساجد دفتر سے آکر سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

شازیہ نے کہا کہ میں نے کئی بار سوچا کہ زہر کھا کے مرجاؤں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے، مگر اپنی معصوم بچیوں کا خیال آتا ہے، آسیہ کیوں کر ان بچیوں کو رکھے گی۔ وہ تو باپ سے بات بھی کرنے نہیں دیتی۔ کمرے سے نکال دیتی ہے اور نہ ہی ساجد کو آنے دیتی ہے۔ شازیہ نے کہا، اب یہی میرا ٹھکانہ ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو اپنی زندگی جیسے تیسے گزار ہی لوں گی، مگر ان بچیوں کا کیا قصور ہے؟ جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی باپ کی شفقت و محبت سے محروم ہیں۔ وہ ایک آس کے سہارے زندگی گزار رہی ہے کہ شاید کبھی ساجد کو خیال آجائے اور اس کے دل میں باپ کی محبت جاگ اٹھے۔ آج شازیہ کو اپنی امی بہت یاد آتی ہیں۔ کاش وہ زندہ ہوتیں، وہ اپنا غم انہیں بتاتی اور اسے اک ڈھارس تو ہوتی کہ کوئی تو ہے دنیا میں اس کا اپنا۔ شازیہ نے بتایا کہ وہ اپنے اچھے دنوں کو یاد کرتی ہے اور روتی ہے۔

اولاد تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ یہ انسان کے اپنے ہاتھ میں تو نہیں ہے کہ بیٹا یا بیٹی پیدا کرے، پھر اسے کس وجہ سے اتنی ذلت بھری زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔ یہ سب سن کر میں سوائے افسوس کہ کیا کہہ سکتی تھی۔ اس کی معصوم بچیوں کو دیکھا جو اپنا کھیل رہی تھیں۔ میرا بہت دل چاہا کہ شازیہ کو دنیا کی سب خوشیاں دلا دوں۔ مجھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے جا رہے تھے۔ اس کی عمر بھی ابھی کم ہی تھی اور ایک لمبی زندگی اس کے سامنے تھی جسے اس نے گزارنی تھی۔ میں شازیہ کی کہانی سن کر واپس آگئی، کیوں کہ میں کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی خوشی تو ساجد میں تھی، جو کہ اس سے بات بھی کرنا گوارا نہیں کرتا اور یہ خوشی دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ مجھے ان معصوم بچیوں پر ترس آرہا تھا جو باپ کے ہوتے ہوئے اس کی شفقت اور پیار سے محروم تھیں۔ کہیں وہ بڑے ہونے کے ساتھ احساس محرومی کا شکار نہ ہوجائیں۔ ایسے بچے بہت زیادہ حساس ہوجاتے ہیں اور وہ ٹھہری لڑکی ذات، کہیں حالات کا شکار نہ ہوجائیں۔

میرا پھر دوبارہ جانا نہیں ہوا شازیہ کے پاس۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ آج بھی مجھے وہ بچیاں بہت یاد آتی ہیں۔ کاش ساجد کو یہ احساس ہو جائے کہ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں۔ وہ انہیں ایک باپ کی محبت دے، توجہ اور پیار دے۔ ان کو بھی وقت دے تاکہ وہ ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ آسیہ کے دل میں بھی رحم ڈال دے اور ساجد اپنی پہلی بیوی اور بچیوں سے محبت کرے۔ ان کا خیال رکھے۔

قارئین آپ بھی شازیہ کے لیے دعا کریں کہ وہ جہاں ہو خیریت سے ہو اور زندگی کی خوشیاں اسے بھی حاصل ہوں۔ (آمین)

☆......☆

گیارہویں سچ بیانی

شریک سفر



نفیسہ فضل

بیتے لمحات میں قید ایک عورت کی سچ بیانی

یہ قصہ جو آپ کے گوش گزار کررہی ہوں، سو فیصد سچ ہے اور اس کے چشم دید گواہ ہمارے خاندان کے علاوہ اہل محلہ بھی ہیں۔

یہ واقعہ 1987ء کا ہے، جب ہم لاہور میں رہتے تھے۔ لیکن رشتے داروں سے ملنے کراچی آئے ہوئے تھے۔ اس وقت ہم ملیر کالا بورڈ میں اپنی بہن کے یہاں قیام پذیر تھے۔ شمسی ولاو میں میرے بڑے بھائی اور کورنگی میں چھوٹے بھائی اور والدہ، جبکہ منجھلے بھائی رفاہ عام میں رہتے تھے۔

جنوری کے سرد دن تھے۔ میرے شوہر (مرحوم) فضل محمود میری کزن کے گھر، جو کہ پی آئی اے اسٹاف کالونی میں رہتی تھیں، میرے شوہر کی رضائی بہن بھی ہیں اور ان کے شوہر مرتضیٰ بیگ (مرحوم) میرے شوہر کے بچپن کے دوست تھے۔ مرتضیٰ بھیا کے بڑے بھائی ملائیشیا سے آئے ہوئے تھے۔ وہ لوگ تاش کھیلنے کے بہت شوقین تھے، وہ ان کے گھر گئے ہوئے تھے، ملاقات کی غرض سے، جہاں ان کے بھائی مرزا حبیب جان بیگ (مرحوم) نے ضد کرکے انہیں تاش کھیلنے کے لیے روک لیا تھا۔

رات بارہ بجے تو میرے شوہر بمشکل ان سے اجازت لے کر واپس ہوئے۔ جب وہ ملیر ہالٹ پہنچے تو ساڑھے بارہ بجے کا عمل تھا اور ریلوے پھاٹک بند تھا، کیوں کہ ملیر کینٹ جانے والی مال گاڑی گزر رہی تھی۔ اس وقت ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ فضل صاحب کو سخت حاجت محسوس ہوئی تو وہ قریب ہی اُگی ہوئی جھاڑیوں میں جہاں آج کل بچت بازار لگتا ہے، بیٹھ گئے، پھر گیٹ کھلنے پر گھر آکر سو گئے۔

صبح جب میں ان کو بیڈ ٹی دینے گئی تو انہوں نے مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے گھور کر دیکھا اور چائے نہیں لی، پھر وہ غسل کرنے چلے گئے۔ واپس آنے پر میں نے انہیں ناشتا دیا تو وہ بھی نہیں کیا، بلکہ کمرے میں جاکر لیٹ گئے۔ ان کے اس رویے سے میں اور میری بہن پریشان ہوگئے۔ میری بہن عشرت کی ساس نے دیکھا تو بولیں۔

''اس پر تو کسی نے کچھ کرا دیا ہے۔'' اور قرآن پاک لاکر اس کی ہوا دینے لگیں تو فضل صاحب نے پاس پڑی دوائی کی بوتل ان کے اوپر دے ماری، جو کسی کو لگی تو نہیں لیکن دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہوگئی۔ اسی اثناء میں، میں نے اپنے بڑے بھائی کے گھر فون کردیا۔ بھابی نے بتایا کہ بھائی جان تو آفس کے لیے نکل چکے ہیں، پھر میں نے اپنے بیٹے طاہر کو فون کیا، جو اپنے دوست کے گھر گیا ہوا تھا۔ اس نے عقلمندی یہ کی کہ



میرے منجھلے بھائی منیر کو اس کے آفس سے پیتا ہوا آیا۔ منیر آتے ہوئے اپنے ساتھ کسی حافظ جی کو لیتے آئے جو ایک پیر سے معذور تھے۔ انہوں نے آ کر پڑھائی شروع کی تو فضل صاحب غصہ کرنے لگے۔

''او، حافظ کے بچے چلا جا، ورنہ تیری دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گا۔'' اور انہیں گالیاں دینے لگے۔ سب حیران تھے کہ اتنے مہذب انسان کو ایک دم یہ کیا ہوگیا ہے۔ غرض حافظ صاحب تعویذ وغیرہ دے کر چلے گئے۔

شام کو سب لوگ ان کی مزاج پرسی کرنے کے لیے آئے تو وہ گھر سے نکل کر جانے لگے اور بولے۔

''میں تو ریلوے کی پٹریوں پر جاؤں گا۔'' ہم نے رات بھر ان کا پہرہ دیا کہ کہیں وہ رات کو نکل کر نہ چلے جائیں۔ دوسرے دن گھر سے باہر نکل کر گلیوں میں بھاگنے لگے، پاگلوں کی طرح۔ پتھر اٹھا کر لوگوں کو مارتے۔ بہن کے گھر کے آگے ایک بڑا سا درخت تھا، اس کی طرف دیکھ کر گالیاں دیتے، پتھر مارتے، درخت کے تنے کو پکڑ کر زور زور سے ہلاتے، پھر جب ہوش میں آئے تو ان سے پوچھا، کہنے لگے۔ یہ سب کیا تھا، تو وہ بولے۔ ''ایک پہلوان ہے، بھینگا ہے، دھوتی اور بنیان پہنا ہوا ہے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ میرے ساتھ چل اور کبھی کہتا ہے کہ مجھ سے دوستی کر لے۔ ساری رات مجھ سے کشتی کرتا رہا تھا۔''

ہم نے بھائی جان سے گاڑی منگوائی کہ انہیں ان کے گھر لے جائیں۔ بڑی مشکل سے پچھلی سیٹ پر لٹایا، پھر جیسے ہی میں بیٹھنے لگی تو کسی نے ان کے دونوں پیر پکڑ کر انہیں گاڑی باہر کھینچ لیا اور وہ ایک چھلانگ میں کمرے میں جا کر بیڈ پر لیٹ گئے اور الٹی سگریٹ سلگا کر پیر پر پیر رکھ کر بولے۔

''میں یہاں ہی رہوں گا۔''

فضل صاحب ہینڈسم اور دنیادار آدمی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ پھاٹک کے پاس جو پیٹرول پمپ ہے، وہاں پہلے نرسری ہوا کرتی تھی۔ وہاں پہلوان کا اکھاڑا ہے۔ گھر میں وہ گھنٹوں بے ہوش سے رہتے، مگر نجانے پہلوان کس طرح انہیں اپنے اکھاڑے میں لے جاتا تھا اور اپنے سامنے بٹھا کر اپنے داؤ پیچ انہیں دکھاتا تھا۔

ایک روز چھوٹا بھائی صابر آیا تو اس نے کہا۔

''باجی! بھائی کو میرے گھر لے چلیں۔'' وہ فوراً

راضی ہوگئے۔ صابر نے موقع سے فائدہ اٹھا کر فوراً ٹیکسی منگوائی اور کورنگی اس کے گھر چلے گئے۔ صابر ہر سال 27 ذی الحج کو اپنے گھر پر قوالیاں کراتے تھے۔ ہم تو چوں کہ لاہور میں رہتے تھے۔ اس لیے ہمیں کچھ پتا نہیں تھا۔ والدہ صاحبہ نے بتایا تھا کہ صابر کو حال آتے ہیں۔ جب ٹھیک تھے تو اس کا مذاق اڑاتے تھے کہ میرے سامنے کھیلے تو میں سوئی چبھاؤں گا اور مرچوں کی دھونی دوں گا۔ کورنگی 2 نمبر پر کوئی صاحب تھے، وہ انہیں بھائی جی کہتے تھے۔ صابر انہیں ان کے پاس لے گئے تو وہ وہاں سے اٹھ کر آ گئے۔ سارا دن لیٹے رہتے، نہ کسی کام کے نہ کاج کے۔ ہم اپنے گھر بھی جانا چاہتے تھے...... ایک روز صابر کسی مولوی صاحب کو گھر لائے اور انہوں نے فضل صاحب کی حاضری کرادی، تو وہ پہلوان بولا۔

آپ نے بلایا ہے تو میں گھر کے اندر آ گیا ہوں۔ میں صرف اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ سب باتیں میرے شوہر کر رہے تھے۔ اس وقت وہ بھینگے ہوگئے تھے۔ میری نند اور نندوئی ان کی طبیعت کا سن کر لاہور سے آ گئے تھے۔ جب وہ لوگ ان سے ملنے آئے تو اس وقت وہ فریج سے کینو نکال نکال کر کھا رہے تھے۔ جب پہلوان آتا تھا تو یہ کسی کو نہیں پہچانتے تھے اور بہت کھاتے تھے، پھر بعد میں کہتے۔

''میں نے کچھ نہیں کھایا ہے، مجھے بھوک لگی ہے۔'' غرض اس وقت انہوں نے بہن کو بھی نہیں پہچانا اور جب ٹھیک ہوئے تو بہن سے لپٹ گئے کہ تم کب آئیں۔

اسی طرح شگفتہ میری بھابی کچن میں شامی کباب بنا رہی تھی۔ یہ گھڑی گھڑی جاتے اور اس سے گرم گرم کباب لے کر خوب کھاتے، پھر جب سب کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو شگفتہ سے بولے۔ ''کباب تو کھلاؤ۔'' وہ بہت حیران ہوئی کہ ابھی تو اتنے سارے کباب کھائے ہیں۔ دوسرے دن میرے بھتیجے آ گئے۔ ان کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بلاتے رہے تو اٹھے ہی نہیں، اتفاقاً میری بڑی بھابی آ گئیں۔ انہوں نے ان کا سر پکڑ کر اپنی طرف جو گھمایا تو غضب ہی ہوگیا۔ فضل صاحب نے تاش پھینکے اور بھابی کی گردن دبوچ لی۔ سب لوگ گھبرا گئے کہ یہ کیا ہوگیا اور پھر ان سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے، جبکہ گھر میں صرف چار مرد تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہاں کون ہے، جس نے اس پہلوان کو قابو کیا، البتہ وہ بے ہوش ہوگئے تھے۔ جب وہ ہوش میں آئے تو ان کی ایک آنکھ سوج رہی تھی اور کالی پڑ گئی تھی، جبکہ ان کی آنکھیں بھوری اور خوب صورت تھی۔ ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ دو ماہ تک ان کی آنکھ کا نیل نہیں گیا تھا۔ میری نند میرے بھائی منیر کی ساس بھی ہیں۔ وہ ان دنوں کراچی آئی ہوئی تھیں۔ میرے شوہر اپنے، پرائے، بچے، بوڑھوں میں بے انتہا ہردلعزیز تھے۔ آج جبکہ انہیں اس دنیا سے گئے ہوئے 18 برس گزر گئے ہیں۔ ہر چھوٹا بڑا اور اپنا پرایا، بہت عزت و احترام سے انہیں یاد کرتا ہے۔ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مجھ سے فضل صاحب نے کہا کہ جا کے منیر کو بلا کے لاؤ۔ آج کہیں جانا ہے؟ ہم سب خوش ہوگئے کہ فضل صاحب ٹھیک ہوگئے ہیں۔ شام کو منیر مع اپنی بیوی صائمہ، سسر اور ساس کے ساتھ آ گئے۔ سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے، خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ میری نند بولیں۔

''میں نے تو کوئی پہلوان شہلوان نہیں دیکھا۔ ٹھیک ہے میرا بھائی۔'' منیر نے کہا۔

''ہاں تو بھائی فضل کہاں چلنا ہے؟''

صابر نے کہا۔ ''عبداللہ شاہ غازی۔'' اتنا کہنا تھا کہ فضل صاحب صابر پر جھپٹ پڑے اور بھینگے ہوگئے۔ صابر باہر بھاگا تو وہ بھی اس کے پیچھے بھاگے اور صحن میں جا کر اسے گردن سے دبوچ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ سب انہیں چھڑانے لگے، مگر ان میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اچانک منیر کو جلال سا آ گیا۔ اس نے فضل صاحب کے بال پکڑ کر نعرہ لگایا۔ ''حق فرید یا فرید۔'' اتنا کہتے ہی لگا، گویا کسی نے جھٹکا دے کر انہیں نیچے گرا دیا ہو۔

دراصل میرے والد مرحوم اور بھائیوں کا سلسلہ چشتیہ ہے اور منیر بابا فرید کے عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ ہر سال وہ آپ کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ میری نند اور سب لوگ سکتے میں آ گئے۔ دراصل جب

میری نند نے کہا تھا کہ میں نے تو کوئی پہلوان نہیں دیکھا، تو اسی وقت پہلوان آ گیا تھا اور اس نے آ کر بتایا تھا کہ مجھے پاکستان بننے سے پہلے اس جگہ پر قتل کیا گیا تھا۔ جب سے میں یہاں ہی رہتا ہوں اور ملیر ہالٹ سے ملیر 15 نمبر (ملیر سٹی) کے درمیان تک جو بھی ایکسی ڈنٹ ہوتے ہیں، وہ میں ہی کراتا ہوں۔ جب کوئی لڑکا اپنی شوخی میں بائیک چلاتا ہے تو میں اس کا ہاتھ ہلا دیتا ہوں۔ منیر نے چلتے ہوئے مجھے قوالیوں کی ایک کیسٹ دی کہ جب ان کی طبیعت خراب ہو تو یہ کیسٹ لگا دینا۔

دوسرے دن میرے خالہ زاد اپنی بیوی کے ساتھ ایئر پورٹ کسی کام سے جا رہے تھے تو انہوں نے ہمیں بھی ساتھ لے لیا۔ ہم ندی کے راستے آ گئے۔ واپسی پر ناصر نے کہا۔

''بھائی بوتل پئیں گے۔'' بڑے لہک کر بولے۔ ''ہاں''۔

اس نے شمع پر گاڑی روکی اور بوتل منگوائی، سردی ویسے ہی تھی، بوتل ٹھنڈی ہوئی تھی، مگر ہم تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ ایک سانس میں بوتل خالی تھی۔ جب ہم چلے تو کہنے لگے۔ ''پھاٹک کی طرف سے چلو۔''

میں نے ناصر کو منع کر دیا کہ اُدھر نہ جانا۔ ہمارے آگے بائیک پر نو بیاہتا جوڑا جا رہا تھا۔ کہنے لگے۔ ''اس پر گاڑی چڑھا دو۔ میں نے دل ہی دل میں پڑھنا شروع کر دیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم پھاٹک کی طرف سے نہیں گئے۔

اسی طرح ایک دن جب ہم بڑے بھائی کے گھر تھے، تو گھر سے باہر نکل گئے۔ میرے بھتیجے ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ وائرلیس گیٹ پر پہنچے تو ٹرین گزر رہی تھی۔ کہنے لگے۔

''کھڑے کیوں ہو، اس کے نیچے سے نکلو۔'' سب ان کی حالت سے پریشان تھے۔ ہمارے بچے الگ پریشان، اسکول کھل چکے تھے، کام کا الگ نقصان تھا۔ لاہور میں ان کا پینٹ کا چھوٹا سا بزنس تھا۔ ایک مزے کی بات یہ تھی کہ صابر گھر پر ہوتے، تو پہلوان ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ میری بھتیجی بھی رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ صبح نو بجے کا وقت تھا۔ صابر ہمیں اپنے بڑے کمرے میں سلاتے تھے۔ اسی کمرے میں قوالیاں بھی ہوتی تھیں، جیسے ہی صابر دفتر کے لیے نکلے، میں انہیں چائے دینے گئی تو دیکھا وہ دروازے کی طرف دیکھ کر عجیب ہی آواز نکال رہے ہیں۔

میں نے پوچھا ''کیا ہوا؟''

بولے۔ ''وہ پہلوان کھڑا ہے۔''

میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ''آج صابر آ جائے، میں اسے سید صاحب، جو صابر کے ساتھ ہیں، ان بزرگ کے حوالے کروں گی۔'' اتنا سنتے ہی میرے میاں نے ایک ہاتھ میں میرے بال اور دوسرے سے گلا پکڑ لیا، جبکہ میرے کٹے ہوئے کھلے بال اتنے گھنے تھے کہ ایک ہاتھ میں نہیں آتے تھے، میں جو چیخی تو میری امی (مرحومہ) اور بھتیجی، بھابی، سب لوگ بھاگے، اِدھر میرے گلے پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ امی قرآن پاک لائیں۔ اچانک مجھے خیال آیا تو میں چلائی۔

''سید صاحب، بابا صاحب! جو کوئی بھی ہیں انہیں سنبھالیں۔'' ایک دم لگا کسی نے جھٹکے سے انہیں اپنی طرف کھینچا اور وہ فرش پر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

اس سے پہلے صابر انہیں دو اور مولویوں کے پاس لے کر جا چکے تھے۔ ایک محمود آباد میں رہتے تھے۔ انہوں نے آگ سامنے جلا کر انہیں بٹھا دیا اور ان کے سر پر دف بجانا شروع کر دی۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے بیٹھے رہے، پھر صابر کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ بولے۔ ''قابو ہی نہ کر لے، یہ تو خود ڈراما ہے۔'' باہر آ کر کباب کی دکان سے ایک درجن کباب کھا گئے۔ وہ پہلوان کھانے اور گھومنے کا بہت شوقین تھا۔ سب پریشان تھے کہ کیا کریں۔ ہم اس حال میں اپنے گھر جانے سے رہے۔ لاہور جا کر انہیں کون سنبھالتا؟ یہاں تو میرے سب بہن بھائی، بھانجے بھتیجے تھے۔ اس حال میں یہ سب بھی ہمیں نہ جانے دیتے تھے۔ شام ہوئی تو صابر کے آنے پر صبح کا واقعہ انہیں سنایا گیا۔ صابر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''آج ہم گھر میں ہی بھائی کا علاج کرتے ہیں۔''

شام کو مغرب سے کچھ دیر قبل کمرے میں جائے نماز بچھائی، اگربتیاں، لوبان سلگا کر صابر پڑھنے بیٹھ گئے۔ اس وقت صابر کی عمر چھبیس ستائیس برس ہو گی۔ چہرے پر بلا کا نور آ گیا تھا۔ فضل صاحب دوسرے کمرے میں

میرے بھتیجے ندیم کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ اچانک بڑے کمرے سے ایک پر جلال آواز آئی۔

''بلا ؤ اسے!'' ہم سب نے گھبرا کر دیکھا تو صابر کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہے تھے۔ ''اِدھر آؤ۔'' ندیم نے فضل صاحب سے کہا۔

''آپ کو بلا رہے ہیں۔'' اتنا سنتے ہی انہوں نے تاش کے پتے پھینکے۔ ندیم کو ایک گھونسا سینے پر مارا، وہ بے چارہ اس ناگہانی آفت پر گھبرا کر پیچھے گر گیا اور یہ ایک جست میں دوسرے کمرے میں جا کے صابر کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔

صابر کی حاضری ہو چکی تھی۔ وہ سید صاحب تھے۔ سید صاحب نے السلام علیکم کہہ کر ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے اپنا ہاتھ سید صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ سید صاحب نے ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیا اور بولے۔

''تم کیوں تنگ کر رہے ہو؟ یہ بے چارہ اپنے گھر اور کام پر جانے کے لیے بیٹھا ہے، اس کا پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ بولا۔

''دوستی کی ہے، نہیں جاؤں گا۔'' سید صاحب نے قریب رکھی مرچیں اٹھا کر آگ میں ڈالیں، وہیں وہ جھٹکا دے کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فضل صاحب بے ہوش ہو کر گر چکے تھے۔ سید صاحب نے انہیں دَم کیا۔

اسی دن رات کو صابر کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔ صابر وغیرہ وہاں پر مصروف تھے۔ میں فضل صاحب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اچانک میری نظر ان کی طرف گئی تو محسوس کیا کہ اب پہلوان آ گیا ہے۔ میں نے جلدی سے قوالی لگا دی۔ غلام فرید صابری کی قوالی۔ ''عرس میں انبیاء اولیاء آئے ہیں'' شروع ہوئی تو وہ باادب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی دوسری قوالی نصرت فتح علی کی ''بابا تیری جوگن ہوں'' شروع ہوئی تو انہوں نے حال کھیلنا شروع کر دیا۔ میں نے صابر کو بلایا۔ جلدی آؤ، پہلوان ڈراما کر رہا ہے، مگر فضل صاحب کا چہرہ اور انداز اتنا پیارا لگ رہا تھا۔ خوب صورت تو وہ تھے ہی، مگر ان پر بے انتہا نور تھا۔ سب دیکھنے والے حیران تھے۔ جب وہ ٹھیک ہو گئے تو مجھ سے کہنے لگے۔

''جب میری طبیعت خراب ہوتی ہے تو دَم کا پانی نہ پلایا کرو، اب پہلوان نہیں آ رہا بلکہ اب ایک بابا آتے ہیں۔ یہاں بھی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔''

ہم نے سوچا کہ پہلوان ڈراما کر رہا ہے تاکہ اس کا علاج نہ ہو سکے۔ دوسرے دن صابر کسی مولوی کے پاس انہیں کورنگی 2 نمبر لے کر گئے۔ یہ وہاں کچھ دیر بیٹھے، پھر صابر سے بولے۔

''چلو یہاں سے یہ 2 نمبر آدمی ہے۔ اندر جا کے دیکھو، یہ عورتوں کے ساتھ نازیبا حرکات کر رہا ہے۔ دَم درود کے بہانے اور ہاں میرا علاج تمہارے گھر سے ہو گا، کہیں نہیں ہو گا۔''

پھر ہم دو دن بعد کسی کے مشورے پر انہیں بابا شاہ عتیق کے مزار پر لے گئے۔ ہمارے ساتھ آٹھ دس لوگ تھے اور ہم نے رات وہیں گزارنی تھی، بہر حال رات ہم سب نے وہاں چھپر ہوٹل میں گزاری۔ صبح صبح فضل صاحب نے سب کو جگا کر کہا۔ ''رات میرے پاس بابا شاہ عتیق آئے تھے۔ انہوں نے گلے میں اسٹیتھو اسکوپ پہنا ہوا تھا۔ دو آدمی ان کے ساتھ تھے۔ صبح نو بجے بلایا ہے۔'' یہ کہہ کر خود فوراً چلے گئے۔ میرے بڑے بھائی ساتھ تھے۔ ان کے دونوں پیراور پر تنگ پک رہے تھے، کسی علاج سے ٹھیک نہیں ہوتے تھے۔ ہم سب ناشتے سے فارغ ہو کر مزار پر پہنچے۔ ہم اندر داخل ہو رہے تھے اور وہ مزار شریف کے احاطے سے باہر جا رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''کہاں چلے گئے تھے؟'' مجھے کسی اجنبی کی طرح دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔ شام کو ہم سب گھر واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھے سب باتیں کر رہے تھے مگر فضل صاحب تمام راستے خاموش بیٹھے رہے۔

گھر آ کر صاحب نے کہا کہ ہم قوالیاں کراتے ہیں۔ بھائی کی بیٹھک دینی ہے۔ شاید قارئین کرام جانتے ہوں گے کہ بیٹھک کی قوالیاں کرانے سے جو کسی کے ساتھ ہوتا ہے، کھل جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا مسئلہ ہے۔ غرض تین چار دن بعد گھر میں قوالیاں کرائی گئیں......

صابر کی تو حاضری ہوتی ہی ہے، قوالیاں شروع ہوتے ہی فضل صاحب نے بھی حال کھیلنا شروع کر دیے۔ بہت پیارے انداز میں کھیل رہے تھے۔

دل کرتا ہے کاش میں ان کا انداز پھر دیکھوں۔ جب قوالیوں میں چائے کا وقفہ ہوا تو میں اندر کمرے میں

ان کے پاس گئی، بعد سلام کے پوچھا۔

"آپ کون صاحب ہیں کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" میرے پوچھنے پر جب جواب نہیں ملا تو سید صاحب (صابر) مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"آپ بات کریں بابا صاحب سن رہے ہیں، مگر بابا صاحب جواب نہیں دیں گے، کیوں کہ یہ بول نہیں سکتے!" اس کے بعد ہم صابر کے گھر مزید دو ماہ رہے۔ اب پہلوان نہیں آتا تھا۔ میں تنگ آ چکی تھی، میں اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ میں نے فضل صاحب سے گھر جانے کو کہا تو وہ بولے۔

"تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔" بچے بھی ہم سے دور تھے اور پریشان تھے۔ فضل صاحب بولے۔

"ابھی میرا علاج ہو رہا ہے۔ بابا جی نے کہا ہے، ابھی دو ماہ یہاں رہو۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بابا جی تو بول نہیں سکتے؟"

وہ کہنے لگے۔ "ہاں یہ بات ٹھیک ہے، مگر جب بھی بابا جی آتے ہیں، ان کے ساتھ تین چار بزرگ ہوتے ہیں، وہ مجھے بتاتے ہیں۔" اب فضل صاحب نماز عشاء کے بعد ہر روز وہی قوالیاں سنتے تھے۔ ہم قوالیوں کے بعد بابا جی سے ملاقات کرتے تھے۔ بابا جی ہاتھ کے اشاروں سے ہمیں جواب دیتے تھے جو باتیں ہم سمجھ نہ پاتے وہ بعد میں فضل صاحب خود بتاتے تھے۔ جب قوالیاں سنتے تو سر پر تولیہ یا کپڑا ڈالتے۔ ان کے بابا جی سر پر رومال، جسے پنجابی میں "پرنا" کہتے ہیں، ڈالتے تھے۔ بدھ کے روز مغرب سے پہلے زردہ بنوا کے رکھتے تھے۔

کوئی ضرورت مند کسی کام کے لیے آتا تو اس کی ہر بات درست بتاتے۔ اسی کی ایک رشتے دار کی بیٹی کا رشتہ نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے آ کر بابا جی سے کہا تو بابا جی نے انہیں کہا۔ چار بدھ مغرب سے پہلے آ کر یہاں بیٹھ جاؤ، دل کرے تو نماز پڑھ لینا۔ وہ ماں بیٹیاں دو ہفتہ ہی آئی تھیں کہ خالدہ کا رشتہ ہو گیا۔ انہوں نے چار بدھ پورے کیے۔ جب شادی طے پا گئی تو لڑکی کے والد جو کہ انگلینڈ میں تھے، شادی پر نہیں آ رہے تھے، پھر ماں بیٹی روتی ہوئی آ گئیں۔ بابا جی نے کہا، پانی لاؤ، دم کر کے کہا گھر میں چاروں کونوں میں ڈال دینا۔

آپ یقین کیجیے، اس کے والد دس دن کے اندر آ گئے اور دھوم دھام سے بیٹی کی شادی کی۔ سب حیران تھے۔

اسی طرح ایک جاننے والی خاتون رقیہ آئیں۔ ان کے شوہر انڈیا جا کر بیٹھ گئے تھے۔ کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ انہوں نے آ کر اپنے شوہر کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آ رہے؟ تو بابا جی نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ وہ شراب اور عورت کے چکر میں ہیں، پھر کافی دن بعد انہوں نے میرے ذریعے معلوم کیا کہ وہ کب تک آئیں گے۔ بابا جی نے کہا۔ بہت جلد اور اس کے شوہر تیسرے دن ہی گھر پہنچ گئے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ فضل صاحب گم صم ہو جاتے۔ ایک دن ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ اکثر اور بزرگ بھی آتے ہیں، ان سے باتیں ہوتی تھیں۔ اسی طرح بہت سے لوگوں کی باتیں بتاتے اور ان کے کام بھی ہوتے تھے۔ ایک دن صابر کے گھر نماز عشاء کے بعد محفل لگی ہوئی تھی۔ خاندان کے کافی افراد آئے تھے، محلے سے بھی کچھ عقیدت مند آئے تھے۔ قوالی کے بعد فضل صاحب نے سب کو کہا۔ آپ سمٹ کر نہ بیٹھا کریں، آرام سے بیٹھا کریں۔ صابر سے بولے کہ تمہیں آج تک پتا نہیں چلا تمہارے اس کمرے میں آستانہ ہے۔ بہت بزرگ یہاں ہیں۔ سب نے ایک جیسے کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ یہ جنات ہیں، صرف میرے والے بابا جی سفید رومال سر پر اوڑھتے ہیں، جس سے ان کا چہرہ اکثر چھپ جاتا ہے۔ فضل صاحب نے بتایا کہ بابا جی کہتے ہیں۔ ہم یہاں بیٹھے تھے، کسی نے ہمیں مدد کے لیے پکارا تو ہم آ گئے۔ ویسے بابا جی پاکپتن شریف کے والی بابا فرید کے چاہنے والے ہیں۔ ان کی شان میں کہی قوالیوں پر بہت حال کھیلتے ہیں اور بابا جی کی ڈیوٹی مزار مبارک پر چڑیوں کو دانہ ڈالنے کی ہے۔ انہوں نے خود ہمیں بتایا تھا اشاروں سے پھر فضل صاحب کی زبانی...... فضل صاحب گھنٹوں حال کھیلتے، مگر بالکل نہ تھکتے تھے۔ نہ کبھی کہیں چوٹ لگی......

ایک دن رات کے وقت ہم کالا بورڈ درخشاں سے پیدل رفاہ عام منیر کے گھر آ رہے تھے۔ ہمارے ساتھ میرے بہنوئی اور بھانجی کے شوہر تھے۔ ان سے بھی فضل صاحب کی بہت دوستی تھی۔ جیسے ہی ہم پھاٹک کے قریب

جہاں اب ہفتہ بازار لگتا ہے، پہنچے تو جھاڑیوں کے قریب آ کر بولے۔ "میں نے پیشاب کرنا ہے۔" آواز ایسے ہو گئی جیسے نشے میں ہوں۔ بمشکل ان کو وہاں سے بڑھ بڑھ کر نکالا۔ ریلوے لائن کراس کر کے ہم گھر آ گئے۔ گھر آ کر فضل صاحب اپنی قمیص کا پچھلا حصہ دھونے لگے۔ ہم نے پوچھا کیا ہوا، کچھ نہیں بتایا۔ صبح ناشتے سے پہلے کہیں چلے گئے۔ واپسی پر ہم نے پوچھا تو بولے۔ "رات پہلوان پھر مجھے قابو کرنا چاہ رہا تھا۔ جب میں قابو نہیں آیا تو غصے میں کتا مار دیا۔ قمیص پر اس کے خون کے دھبے تھے۔ میں دیکھنے گیا تھا واقعی وہاں کتا مرا پڑا ہے۔ ہم نے رات کو منیر کے گھر آتے ہی قوالیاں لگا دی تھیں۔ وہ قوالیاں سن کر بابا جی نے اشارے سے قوالیاں بند کرا دی تھیں۔ اب بابا جی ہی آتے تھے، پہلوان جا چکا تھا۔ اس دوران میرے بھائیوں نے صابر اور بڑے بھائی جہانگیر نے ہمارا ہر طرح خیال رکھا۔ تین ماہ ہم صابر کے گھر رہے۔ ایک بات اور بہت ہی حیران کن تھی۔ بابا شاہ عتیق کے مزار سے آنے کے بعد جہانگیر بھائی کے پیر بالکل ٹھیک ہو گئے تھے، پھر ہم لوگ لاہور اپنے گھر آ گئے۔ میں ہر بدھ کو زردہ بناتی اور جائے نماز بچھاتی تھی۔ فضل صاحب گھر میں ہوتے تو نماز پڑھ کر سب پر دم درود کرتے۔ کسی کو کوئی کام ہوتا تو پوچھتا۔ ہمارے مالک مکان نے بھی اپنے مکان و زمین کے بارے میں معلومات کی تھیں، پھر فضل صاحب نے بابا جی کے کہنے پر مجھ سے کہا کہ طاہر کی شادی اپنی بھانجی رفعت سے کر دو۔ ان کے کہنے پر ہم نے رفعت کو اپنے بڑے بھائی جان سے مانگ لیا۔ میری بہن بہنوئی وفات پا چکے تھے۔ جب رفعت تین سال کی تھی...... بھابی بھائی جان نے اس کی پرورش کی تھی، غرض طاہر کی شادی کر دی۔ فضل صاحب کے معدے میں درد ہوتا ہے تو انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اس تکلیف کو نہیں لیا تھا۔ دودھ لیا، ایک چین کلر ٹیبلٹ لی، بس...... طاہر کی شادی پر تو بہت تکلیف اٹھائی۔ ولیمے کے دن تو انہوں نے آنکھ بھی ٹھیک سے نہ کھولی۔ انجکشن دے کر سلا دیتے تھے۔ طاہر کی شادی کے تیسرے دن ان کا آپریشن ہوا ایک گردہ نکال دیا گیا، مگر تکلیف نہ گئی۔ ہر دوسرے ماہ لاہور سے کراچی آتے اور لیاقت نیشنل اسپتال میں انہیں انجکشن لگتا تھا، مگر تکلیف نہیں گئی۔ پھر میں فیروز پور روڈ لاہور میں اپنے فیملی ڈاکٹر نصیر محی الدین شیخ کے پاس لے کر گئی، وہ بہت قابل ڈاکٹر تھے۔ بولے بھابی انہیں خون کی الٹی تو نہیں آئی۔ میں نے کہا نہیں، پھر انہوں نے دوائیاں لکھیں، جن سے انہیں فائدہ ہوا۔

ہم 1994ء میں کراچی میں تھے۔ فضل صاحب کا لاہور سے فون آیا کہ ایک ہفتہ کے اندر بچوں کو لے کر لاہور پہنچو۔ دراصل ہم نے اپنے چھوٹے بیٹے نادر کی شادی بھی کر دی تھی۔ وہ بولے کہ "دلہن کو بھی ساتھ لانا۔ اس کا جہیز فرنیچر وغیرہ لے آؤ۔ میرے کل شدید درد اٹھا تھا۔" یہ سن کر تو ہم سب تڑپ اٹھے۔ ہم نے فوراً رخت سفر باندھا اور ایک ہفتے میں اپنے گھر لاہور جا پہنچے۔

سب ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ ہم حسب سابق! بدھ کے دن عصر مغرب کے درمیان زردہ کی نیاز بنا کر رکھتے۔ کبھی ان کا موڈ ہوتا تو بعد نماز عشاء قوالیاں سنتے۔ موسم گرما شروع ہو گیا تھا۔ کراچی سے حسب سابق مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ صابر مع فیملی اور منیر آئے ہوئے تھے، اسی دوران میری بہن عشرت بھی اپنے بیٹے کی منگنی کرنے لاہور آئیں۔ فضل صاحب بہت مہمان نواز تھے۔ ایک دن سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو اچانک صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"تم آج کل نیاز نہیں بنا رہیں اور اگربتی بھی نہیں جلاتی ہو؟"

میں نے کہا کہ آپ اکثر نہیں ہوتے اس لیے نیاز نہیں بنائی اور اگربتی سے ان دونوں بہوؤں کے سر میں درد ہوتا ہے۔ یہ سنتے ہی غصے میں آ گئے۔ کہنے لگے۔ "بابا جی نے کہا ہے میں ہوں یا نہ ہوں، نیاز رکھنی ہے اور اگربتیاں بھی جلانی ہیں۔"

دوسرے دن اتوار تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم سب گپ شپ کر رہے تھے۔ اچانک فضل صاحب نے آنکھیں بند کیں اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر ہلایا کہ کیا ہوا۔ وہ بول بھی نہیں پائے، ٹھنڈے برف جیسے ہاتھ تھے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور بڑی نقاہت سے بولے۔

''سخت ترین درد تھا، شدید تکلیف ہوئی ہے۔'' میں نے اور میرے دونوں بھائیوں نے کہا کہ ڈاکٹر کے پاس چلیں، لیکن وہ کل پر ٹال گئے۔ میری بہن عشرت نے کہا۔ ''لگتا ہے گیس دل پر چڑھ گئی ہے۔ انہیں سکنجبین بنا کر پلا دو۔ میں نے سکنجبین بنا کر دی تو ان کی طبیعت سنبھل گئی، پھر ڈاکٹر کے پاس جانے کی بات بھی ٹل گئی!

جیسا کہ میں نے بتایا کہ فضل صاحب بہت مہمان نواز اور محبت کرنے والے تھے۔ رات کو انہوں نے میرے بھانجے کی منگنی کی خوشی میں گانوں کا پروگرام رکھا جس کو سب نے انجوائے کیا۔ دلہن کی امی میری ماموں زاد انیسہ سے بھی فضل صاحب کی بہت بنتی تھی۔ میری ماموں زاد کے علاوہ انیسہ سے میری دوستی بھی ہے، اسی وجہ سے ہم نے منگنی کو بھرپور طریقے سے شادی کا سا رنگ دے دیا۔ ایک ہفتہ بعد 30 جولائی کو عشرت وغیرہ کی کراچی کے لیے واپسی تھی اور فضل صاحب کو اسی شام سوات جانا تھا۔ دراصل وہ بزنس کے سلسلے میں ہر ماہ کے آخر میں کشمیر اور سوات جاتے تھے۔ ان دنوں بارشوں کا سلسلہ شروع تھا۔ میں نے فضل صاحب کو سوات جانے سے روکا تو بولے۔ ''مت ماری ہے جو نہ جاؤں نقصان ہو جائے گا۔'' پھر عشرت سے بولے، تم لوگ رک جاؤ، میں تین دن میں واپس آ جاؤں گا۔ اس پر میرے بہنوئی کہتے ہیں۔ ابھی جانے دو، کہو تو پانچ دن بعد جہاز سے آ جاؤں؟ پھر وہ لوگ کراچی اور فضل صاحب سوات چلے گئے۔

13 اگست کی رات کو فضل صاحب کی واپسی ہوئی، تھوڑی دیر بعد ہی مزید مہمان آ گئے۔ میری بھتیجی کے شوہر اور بچے ایبٹ آباد سے واپسی پر ہمیں ملنے آئے تھے۔ دو دن ہمارے پاس رہنا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر صابر نے اور میری امی نے اجازت مانگی اور کہا ہم انیسہ کے گھر جا رہے ہیں تو وہ ناراض ہونے لگے۔ صابر نے سمجھایا کہ ابھی آپ ان مہمانوں کو دیکھیں ہم پرسوں آ جائیں گے۔ تب وہ راضی ہوئے اور پرسوں آنے کی تاکید کی۔ دوسرے دن صبح ناشتے سے فارغ ہوئے تو میری بھتیجی کی بیٹیوں سے بولے۔ ''چلو تیار ہو جاؤ، تمہیں قلعہ اور شاہی مسجد کی سیر کرا لائیں......'' میں کھانا تیار کر رہی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کچن سے لے آئے کہ تم بھی چلو اور بیٹی ہما کو بھی بلایا۔

موسم بے حد خوب صورت تھا، ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم پہلے یادگار پھر شاہی مسجد اور اس کے بعد قلعہ جا پہنچے۔ دربار عام میں غلام نبی نے تصویریں بنائیں۔ میری اور فضل صاحب کی تصویر بنائی جو کہ ہماری زندگی کی آخری تصویر ٹھہری۔

پانچ بجے تک سب گھر آ گئے۔ 6 بجے کے بعد منیر، صائمہ اور میری نند اور بچے آ گئے۔ چائے پانی سے فارغ ہو کر وہ جانے لگے تو ہم گیٹ تک انہیں رخصت کرنے آئے۔

منیر نے کہا ہم فورٹ ریس جا رہے ہیں، آپ بھی ساتھ چلیں۔'' بولے۔

''یار تھک گیا ہوں، اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہوں، پھر صبح سے گھومنے گئے ہوئے تھے، ادھر انہوں نے عائشہ سے رات کو میکلوڈ روڈ لے جا کر گول گپے کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ پیار تو سب سے ہی کرتے تھے، مگر عائشہ کو بہت چاہتے تھے۔ جب وہ چھوٹی تھی تو توتلی زبان میں باتیں کرتی بہت پیاری لگتی تھی۔ میں نے پلاؤ دم پر لگایا تو بولے۔

''مجھے پہلے تھوڑا سا دے دو۔'' میں نے کہا۔

''ہما ابھی شامی کباب بنا رہی ہے، میں کھانا لگاتی ہوں۔''

بولے۔ ''میرے درد ہو رہا ہے۔'' دراصل انہیں معدے کا السر بھی تھا۔ میں نے جلدی سے انہیں تھوڑا سا پلاؤ دے دیا۔ کھا کر وہ ٹی وی پر خبریں دیکھنے لگے۔ میرا بلڈ پریشر ہائی تھا، میں لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد انہیں طاہر نے اینو گلاس میں ڈال کر دیا، کچھ دیر بعد نادر نے آ کر بتایا کہ ابو کے بازو میں شدید درد ہو رہا ہے۔ میں گھبرا کر بھاگی۔ کیا ہوا تو وہ پچھلے ہفتے کی طرح بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ طاہر نے فوراً گاڑی نکالی اور ہمارے قریب ہی شیخ زید اسپتال تھا، لے گئے۔ وہاں جا کر انہیں ہوش آیا تو پانی مانگا۔ میں نے ڈاکٹر سے معلوم کیا تو وہ ناراض ہوا اور مجھے باہر جانے کو کہا۔ دونوں بیٹے اور غلام نبی اندر تھے۔ میں باہر بیٹھی دعا کر رہی تھی، آنسو بہہ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی صابر وغیرہ سب آ گئے۔ میری دوبارہ ایمرجنسی میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اتنی دیر میں ایک لیڈی ڈاکٹر میرے پاس آئی۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''کیوں رو رہی ہیں، ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہم انہیں وارڈ میں بھیج دیں گے۔'' اچانک میرا دل گھبرایا اور میں کھڑی ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے میرے پیروں سے دل تک آگ بھڑکا دی ہے۔ میں گرنے لگی تھی کہ سامنے سے طاہر بھاگتا ہوا آیا اور مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر بولا۔

''کیا ہوا امی؟'' مجھے اس نے لے جا کر کرسی پر بٹھایا تو سامنے سے منیر اور میری نند وغیرہ آتے دکھائی دیے۔ طاہر لپک کر ان کی طرف گیا اور انہیں لے کر ایمرجنسی میں چلا گیا۔ منیر نے کہا۔ ''ہم بھائی کو بھی لے آئیں گے۔'' غرض میں وہاں سے خالی دماغ لیے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

گھر آئی تو گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ منیر کمرہ خالی کروا رہا تھا۔ اتنے میں میری امی داخل ہوئیں، تب انہیں دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں اور سمجھ میں آ گیا کہ میں لٹ گئی ہوں۔

ویران زندگی مری پل بھر میں کر گیا
اپنا مکاں بنا لیا جا کے خلد میں

14 اگست کو رات گیارہ بجے وہ ہمیں چھوڑ گئے۔ 5 اگست کی صبح کراچی سے تقریباً 30 افراد میرے بھائی، بھتیجے، بھابیاں سب By Air لاہور آ گئے تھے اور یہ میرے شوہر کی محبت اور اخلاق ہی تھا جو اتنے لوگوں کو ایک ساتھ جہاز میں سیٹیں مل گئی تھیں۔ جبکہ کراچی میں حالات بہت خراب تھے اور کیسے لوگ ایئرپورٹ پہنچے۔ ادھر کراچی کے حالات، ادھر لاہور کا موسم۔ جب نسیم بھائی کا لاہور ایئرپورٹ سے فون آیا تو انہیں کہا گیا کہ آپ سیدھے قبرستان چلے جائیں۔ وہ جب وہاں پہنچے تو تدفین ہو چکی تھی، کیوں کہ بارش کچھ دیر کے لیے ہی رکی تھی، پھر موسلا دھار برس پڑی تھی۔ سوئم میں صابر کے پاس بابا جی آئے۔ ہمیں اس طرح پتا چلا کہ صابر نے سر پر کپڑا ڈالا اور اشاروں سے ہم سب سے تعزیت کی۔ بچوں کو گلے لگایا اور بتایا ہم اسپتال میں تھے، دعا کر رہے تھے، مگر اللہ کی یہی مرضی تھی۔ میں نے بابا جی سے استدعا کی۔ آپ ہمیں بھی نہ چھوڑیں ہمارے سر پر اپنا ہاتھ رکھیں۔ یہ سن کر بابا جی بہت روئے اور وعدہ کیا۔ ہم اکثر قوالیاں لگا کر سنتے تھے۔ میں ہمیشہ نیاز بنا کر رکھتی تھی۔ میں نے صابر کے ذریعے بابا جی سے بات کی کہ وہ جیسے فضل صاحب کے پاس آتے تھے طاہر کے پاس آیا کریں۔ جب میں نے ضد کی اور سید صاحب کے ذریعے خاص درخواست کی تو صابر نے کہا کہ بابا جی کہہ رہے ہیں، طاہر کی بیٹھک دے دیں۔ میں نے قوالیاں کرائیں۔ کراچی سے خاص طور پر صابر اور بہنوئی اختر کو بلایا۔ انہوں نے ہی طاہر کو سنبھالا تھا۔ ثاقب تو چھوٹا تھا، اسے کچھ پتا بھی نہیں تھا۔ ساری رات طاہر نے حال کھیلے، مگر اپنے ابو کی طرح بالکل تھکا نہیں، بالکل وہی انداز وہی طریقہ......

جب ہمیں کوئی بات سمجھ نہیں آتی تو کاپی پنسل لے کر لکھ دیتے تھے۔ جب سے طاہر بیمار ہوا ہے اور الگ گھر میں گئے ہیں تو انہوں نے نیاز رکھنی چھوڑ دی ہے، مگر کہیں قوالیاں ہوں تو طاہر کو حال آ جاتے ہیں، گویا بابا جی اپنے وعدے پر قائم ہیں اور میں تو مجبور ہوں۔ میرا کوئی گھر، کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ہم ان کے انتقال کے چھ سال بعد کراچی شفٹ ہو گئے۔ بھائی نے اپنے مکان کے اوپر مکان بنوا دیا تھا کہ یہاں رہو، پھر جیسے چڑیا کے بچے اڑ جاتے ہیں، میرے بچے چلے گئے تو بیٹی کی شادی کے بعد میں نیچے بھائی کے پاس آ گئی۔ بھائی کے بچے اوپر آ گئے۔ اب میں دس پندرہ دن بھائی کے گھر اور ہفتہ بھر طاہر کے گھر رہتی ہوں۔

یہ آج جو ہم پھر رہے ہیں ہوائے دربدر
اپنے بھی پیروں کے نیچے دہلیز تھی کبھی

طاہر مجھے بہت کہتا ہے۔ ''امی آپ میرے پاس رہیں، کسی کے گھر نہ رہا کریں۔'' مگر یہ دل ہے نا، اکلوتی بیٹی ہما اور چھوٹے پوتے ارمان کے لیے تڑپتا ہے، جو آٹھ دس دن بعد چار گھنٹے کے لیے ملنے آ جاتی ہے۔ بھائی کا گھر قریب ہے، طاہر کا دور ہے......

قارئین سے التماس ہے میرے اور میرے بچوں کے حق میں دعا کیجیے۔

☆......☆

آتشِ جنون



سلیم فاروقی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام ونشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس معرکے میں اُس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا

چٹان سا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی رُوداد، 27 ویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت دانا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے..... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان، راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی، راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کررہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کردیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلۂ کار ہے۔ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ راشد کا مرڈر ہوجاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کرکے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جاکر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔ تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آجاتا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہوجاتا ہے۔ اسی دوران میں پولیس، عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی والدہ کا انتقال ہوجاتا ہے۔ اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہوجاتے ہیں۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر توسکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کرلی ہے..... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں..... عمران اور تیمور، شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ، حاکم خان کے غنڈوں کو زخمی کرکے پہلے ہی فرار ہوجاتی ہے۔ تیمور، حاکم خان کو ہلاک کردیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی فون کرکے ان کاغذات میں سے ایک ریڈ فائل کا تقاضہ کرتا ہے مگر عمران اسے فائل دینے سے انکار کردیتا ہے۔ ٹیلی فون پر مشہدی اور عمران کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ مشہدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس کو اس کے پیچھے لگادیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کا ایک دشمن غنی بلوچ، عمران سے آملتا ہے۔

جان محمد جو کہ مشہدی کا آدمی ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کررہا ہے۔ معلومات فراہم کرتا ہے کہ ان کے خاتمے کے لیے مشہدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلایا ہے، ان کی تعداد پانچ ہے جن میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے، ایک ہندو ہے اور دو یہودی۔ بلوچ، شبو کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں چھوٹا موٹا بدمعاش تھا جسے بعد میں مشہدی نے اپنے گینگ میں شامل کرلیا تھا۔ اس کا اصل نام شہاب ہے اور اس کی ڈیوٹی پورٹ پر ہوتی ہے۔ مشہدی کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔ تیمور، نعیم کی مدد سے آرنلڈ کے مردہ جسم کو لے کر باہر نکل جاتا ہے۔ ابھی تیمور کو نکلے مشکل سے دس منٹ ہوئے تھے کہ عمران کے گھر کے نزدیک پولیس موبائل کے سائرن کی کرخت آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بلوچ شبو سے پوچھ گچھ شروع کردیتا ہے۔ شبو بتاتا ہے کہ ارسلان مشہدی کی قید سے فرار ہوگیا تھا جاتے جاتے مشہدی کی خفیہ فائل لے گیا ہے۔ انڈیا میں وہ ''را'' والوں کے ہتھے چڑھ گیا اور اب تہاڑ جیل دہلی میں ہے۔ اچانک سامنے سے کوسٹ گارڈ والوں کی تیز رفتار بوٹ آتی ہے جسے دیکھ کر بلوچ اپنی بوٹ کی اسپیڈ بھی بڑھا دیتا ہے۔ کوسٹ گارڈز کی بوٹ کی طرف سے فائرنگ شروع ہوجاتی ہے، حملے میں شہاب مارا جاتا ہے۔ اخبار میں خبر چھپتی ہے کہ معروف سماجی کارکن اور تاجر عبدالحمید راجپوت کو ہوٹل میں پراسرار طور پر قتل کردیا گیا ہے۔ عمران اس حقیقت سے واقف ہے کہ قتل ہونے والا دراصل ''را'' کا ایک سفاک اور خونی ایجنٹ ونود تھا، جو گزشتہ بائیس برس سے پاکستان میں مقیم تھا۔ وہ یہ معلومات اخبار کو مہیا کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے ذہن میں معروف انگلش روزنامے کے چیف ایڈیٹر اور کالم نگار وقار الحسن کا نام آتا ہے۔ عمران انہیں فون کرکے ملاقات کے لیے کہتا ہے اور اپنے ہمراہ ہاشم کو بھی لے جاتا ہے۔



وقارالحسن کے دفتر سے واپسی پر انہیں جیک کی مرسڈیز نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جیک کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں۔

ہوٹل کے کمرے میں ان لوگوں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے اور ان میں سے ایک شخص ہلاک ہو جاتا ہے، جب کہ جیک فرار ہو جاتا ہے۔ عمران اور ہاشم بڑے محفوظ طریقے سے ہوٹل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اگلے روز وقارالحسن سے ملنے ان کے آفس پہنچتے ہیں اور جیک کے بارے میں بتاتے ہیں تو وہ فکرمند ہو جاتے ہیں۔ عمران وقارالحسن کو اپنی فیملی ٹریجڈی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کیسے ان لوگوں کی دشمنی مشہدی سے ہوئی اور وہ لوگ ارسلان کو مردہ سمجھتے رہے، جب کہ وہ دہلی کی تہاڑ جیل میں ہے۔ تب وقارالحسن انہیں اپنے انڈیا جانے اور ''را'' کی قید میں رہنے کے واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

جہاں ان کی ملاقات کئی ایسے قیدیوں سے ہوتی ہے جو محض مسلمان اور پاکستانی ہونے کے جرم میں پوری پوری عمر میں وہاں کاٹ چکے ہوتے ہیں۔ وکی نامی قیدی ان سے کہتا ہے کہ اس جیل سے تم قانونی طور پر رہا نہیں ہو سکتے اس لیے تمہیں یہاں سے غیر قانونی طریقے سے باہر نکلنا ہوگا، وقارالحسن اس کی اس بات پر راضی ہو جاتے ہیں۔

فرار ہونے کی کوشش میں وقارالحسن زخمی ہو جاتے ہیں، انہیں اسپتال لے جایا جاتا ہے جہاں ڈاکٹر شاہد سے دوران علاج ملاقات ہوتی ہے ڈاکٹر شاہد کہتے ہیں کہ وقار صاحب میں جانتا ہوں کہ آپ بے گناہ ہیں اور گزشتہ کئی برس سے بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ میں نے اسکول کے زمانے میں آپ کے کالم پڑھے ہیں اور آپ کی گرفتاری کی خبر پر مجھے صدمہ ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کے لیے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکے گا میں کروں گا۔ ڈاکٹر شاہد بتاتے ہیں کہ ان کا تعلق کشمیر لبریشن فرنٹ سے ہے اور وارڈ بوائے ارجن کا تعلق بھی اسی جہادی تنظیم سے ہے۔ ارجن ایک پرچہ وقارالحسن کو دے کر جاتا ہے، جس پر تحریر ہوتا ہے کہ آپ کا زخم اگلے ہفتے تک اتنا بھر جائے گا کہ آپ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے، لیکن اسپتال کے عملے کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ آپ ٹھیک ہو گئے ہیں۔ ہولی کے تہوار والے دن ارجن مریضوں میں مٹھائی تقسیم کرتا ہے اور وقارالحسن کے پاس آ کر کہتا ہے کہ دو گھنٹے بعد آپ تیار رہیے گا، انہیں ایک گفٹ پیک بھی ملتا ہے جس میں ٹی شرٹ اور جینز تھی، کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ارجن وقارالحسن کے چہرے پر مختلف رنگ مل دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ میں نے تمام پولیس والوں اور سیکورٹی گارڈز کو بھنگ کے لڈو کھلا دیے ہیں۔ وقارالحسن ارجن کے پیچھے چلتے ہوئے اسپتال سے باہر آ جاتے ہیں۔ جہاں ایک سوزوکی ہائی روف آ کر رکتی ہے، رخصت ہوتے وقت ارجن وقارالحسن کے پوچھنے پر اپنا نام ارسلان بتاتا ہے۔ عمران ارسلان کا حلیہ پوچھتا ہے جو کہ اس کے گم شدہ بھائی ارسلان کا ہوتا ہے۔ عمران بتاتا ہے کہ وہ میرا بھائی ارسلان تھا، اب مجھے یقین آ گیا کہ وہ زندہ سلامت ہے۔ تیمور اور نادیہ بھی یہ خبر سن کر خوش ہوتے ہیں کھانے کے دوران بلوچ کی کال آتی ہے۔ وہ عمران کو بتاتا ہے کہ اس کی بہن شائستہ کا پتا چل گیا ہے اور وہ تفصیل بتانے گھر آ رہا ہے۔ بلوچ شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ آج کل میر پور خاص میں کسی پیر کی حفاظت میں ہے اور یہ بات بلوچ کے آدمی رمضان نے بتائی ہے، رمضان عمران کو بتاتا ہے کہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لڑکی اپنی مرضی سے نہیں رہ رہی ہے، کیوں کہ وہ جس کمرے میں تھی وہ باہر سے بند تھا۔ پوچھنے پر وہ بتاتا ہے کہ پیر صاحب کا نام پیر احسان الحق شاہ ہے۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شائستہ کی تلاش میں میر پور خاص کے لیے روانہ ہو جاتا ہے، میر پور خاص کے داخلی راستے پر بنی پولیس چوکی پر انہیں روک لیا جاتا ہے۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے)

میں نے تیمور سے پوچھا۔ ''ہمارے آدمیوں کے پاس جو ہتھیار ہیں وہ لائسنس شدہ ہیں؟''

''ہاں۔'' تیمور نے جواب دیا۔ ''جو ہتھیار ان کے ہاتھوں میں نظر آ رہے ہیں وہ سب کے سب لائسنس والے ہیں۔''

میں نے ہاشم کو بھی یوٹرن لیتے دیکھا تھا لیکن اس نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ گاڑی کا رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

ہم چند منٹ میں وہاں تک پہنچ گئے۔ تیمور نے زوردار بریک لگا کر گاڑی روکی اور گاڑی سے اُتر گیا۔ مجھے اب اس کے شانے پر ایک کلاشن کوف بھی لٹکی نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے گاڑی ہی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ تیمور کے ساتھ ہاشم بھی اتر گیا تھا۔ اس کے شانے سے بھی کلاشن کوف جھول رہی تھی۔

''کیا بات ہے آفیسر؟'' تیمور نے درشت لہجے میں پوچھا۔

ان دونوں میں سے ایک سب انسپکٹر تھا اور دوسرا انسپکٹر تھا، بقیہ دو سپاہی تھے۔

انسپکٹر نے چونک کر تیمور کو دیکھا اور بولا۔ ''آپ اپنے کام سے کام رکھیں جناب عالی!''

''ہم اپنے کام سے کام ہی رکھ رہے ہیں، تم نے جن لوگوں کو روکا ہے وہ نواب اکبر علی جنجوعہ کے گارڈز ہیں، کیا ان لوگوں نے بتایا نہیں تھا کہ وہ کس کے گارڈز ہیں؟''

''نواب اکبر جنجوعہ؟'' انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ ''میں ان کا نام پہلی دفعہ سن رہا ہوں۔''

''نواب صاحب، وڈیرے ممتاز سومرو صاحب کے مہمان ہیں اور پھر احسان الحق صاحب کی زیارت کو تشریف لائے ہیں۔''

''سر...... لیکن ان کے پاس...... اسلحے کے لائسنس موجود نہیں ہیں اور......؟''

''آفیسر!'' میں نے گاڑی ہی سے رعب دار آواز لہجے میں کہا۔ ''تم نے میرا نام شاید نہ سنا ہو لیکن سندھ کے ہوم سیکریٹری اور ہوم منسٹر نے بہت اچھی طرح سن رکھا ہے۔'' پھر میں تیمور سے مخاطب ہوا۔ ''سیکریٹری! تم ہوم سیکریٹری یا آئی جی کو ٹیلی فون کرو۔''

''اوکے سر!'' تیمور نے مستعدی سے کہا اور جیب سے سیل فون نکال لیا۔

''سر، معافی چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے، آپ وڈیرے ممتاز کے مہمان ہیں، ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے اور پیر صاحب کے عقیدت مندوں کو بھلا کون روک سکتا ہے۔'' پھر وہ لجاجت سے بولا۔ ''سوری سر! آپ لوگ جا سکتے ہیں۔''

''تمہارے نام کیا ہے آفیسر؟'' تیمور نے اس سے پوچھا، پھر اس کی جیب پر لگی ہوئی نام کی پٹی پڑھنے لگا۔ ''اکرم



سیال!'' اس نے ایک مرتبہ پھر سیل فون سنبھالا۔

''سر، اب اس بات کو جانے دیں، اصل میں آپ کے گارڈز کے پاس لائسنس......''

''ان کے پاس لائسنس نہیں تھا تم نے فرض کرلیا کہ ان کا اسلحہ غیر قانونی ہے، ان سب کے لائسنس نواب صاحب کے پاس ہیں اور تم نے نواب صاحب کے گارڈز کو دھمکیاں دیں، ان کے ایک گارڈ کو ہتھکڑی پہنائی، پھر تم سوری کہہ رہے ہو، اب تو آئی جی ہی یہاں آ کر ان لوگوں کے لائسنس چیک کرے گا۔''

''سر، میں نے عرض کیا نا کہ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ مجھے تو ان سنتریوں نے پوری بات ہی نہیں بتائی، پھر وہ گرج کر سنتریوں سے بولا۔ ''تم لوگ کیا بھنگ پی کر بیٹھے ہو؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ یہ لوگ نواب صاحب کے گارڈز ہیں؟''

''مجھے موقع ہی نہیں ملا سر!'' سنتری جو عہدے کے لحاظ سے حوالدار تھا، منمنا کر بولا۔

''چلو ان کی ہتھکڑی کھلواؤ اور ان سے معافی مانگو۔''

''معافی یہ نہیں بلکہ تم مانگو گے۔'' تیمور نے بپھر کر کہا۔ میں ان کی بے ساختہ اداکاری پر عش عش کر رہا تھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں سر!'' اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''معافی مجھ سے نہیں بلکہ میرے اس گارڈ سے مانگیں جسے آپ نے جرائم پیشہ سمجھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی ہے۔ وہ باعزت آدمی ہے، اگر وہ میرا گارڈ ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ......''

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے انسپکٹر جلدی سے بلوچ کی طرف گھوما۔ ''سر! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بلوچ کی ہتھکڑی کھولی اور اس کا ریوالور اسے واپس کر دیا۔

''تھینکس آفیسر!'' میں نے باوقار لہجے میں کہا۔ اسی وقت انسپکٹر تیزی سے میرے پاس آیا اور کھڑکی کے پاس جھک کر سرگوشی میں بولا۔ ''سر، آپ سے ایک عرض کرنا تھی۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ عام پبلک کے سامنے فرعون نظر آنے والا وہ انسپکٹر اس وقت بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔

''جی کہیے؟'' میں نے حسب دستور اپنے لہجے کو باوقار رکھا۔

''سر! سومرو صاحب مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو گئے ہیں اور انہوں نے یہاں سے میرا ٹرانسفر کشمور کرا دیا ہے۔ اگر آپ سفارش کر دیں تو......''

''میں کوشش کروں گا کہ سومرو صاحب کی ناراضی دور ہو جائے۔'' میں نے کہا، پھر تیمور نے کہا۔ ''چلو، سیکریٹری! ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔''

تیمور نے گاڑی کو یوٹرن دیا تو انسپکٹر اکرم سیال نے ہمیں سیلوٹ کیا اور ہماری گاڑی روانہ ہو گئی، ہمارے پیچھے بلوچ کی گاڑی بھی تھی۔

ہاشم نے ہمیں بہ خیر و عافیت آتے دیکھا تو اس نے بھی اپنی گاڑی کو یوٹرن دے دیا اور ہمارا قافلہ روانہ ہو گیا۔

☆......☆

ممتاز سومرو انتہائی خوش اخلاق، پڑھا لکھا اور خوش لباس شخص تھا۔ وہ اپنے لباس اور بات چیت سے سندھ کا وڈیرہ نہیں لگتا تھا۔ اس نے بہت پرتپاک انداز میں ہمارا استقبال کیا اور بولا۔ ''سائیں، آپ ارسلان کے بڑے بھائی ہو تو ہمارے بھی بڑے ہوئے، ویسے آپ کو دیکھ کر ارسلان یاد آ گیا، وہی قد، وہی جسامت، وہی بال اور اس کی طرح آنکھیں، وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ ہم نے بہت اچھا وقت گزارا ہے، اب تو صرف اس کی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''میں بھی آپ کے سامنے کیا بات لے بیٹھا، اگر آپ کو میری باتوں سے صدمہ پہنچا ہو تو آئی ایم سوری بھیا؟''

''بھیا؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''ہاں، ارسلان جب بھی آپ کا تذکرہ کرتا تھا، بھیا ہی کہتا تھا۔'' پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ ''اوے چھوٹو مہمانوں کے لیے کچھ چائے پانی کا بندوبست کرو اور زیناں سے کہو کہ وہ کھانا ذرا اچھا پکائے۔''

''یار ممتاز!'' تیمور نے کہا۔ ''پہلے ہم فریش ہونا چاہتے ہیں تاکہ راستے کی کچھ تھکن اترے۔''

''سائیں، یہ پوری حویلی آپ کی ہے، میں نے کل رات ہی اس کی صفائی ستھرائی شروع کروا دی تھی۔'' پھر وہ نادیہ سے بولا۔ ''بھابی جی! پہلے آپ اپنے اور بھیا کے لیے کوئی کمرا پسند کر لیں۔'' نادیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ تیمور ہمیں براہ راست ممتاز کی مہمان داری میں حویلی لایا تھا، شاید ان کے درمیان یہ پہلے ہی طے ہو چکا ہو۔

''بھیا! آپ فریش ہو جائیں، چائے وغیرہ پئیں، میں جب تک اپنی حویلی سے ہو کر آتا ہوں۔''

''آپ کی حویلی یہاں سے کتنی دور ہے ممتاز صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''بھیا! پہلے تو یہ آپ جناب اور صاحب چھوڑیں، کیا آپ ارسلان سے بھی اسی طرح بات کرتے تھے؟''

''اچھا بھئی، تمہاری حویلی یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''نزدیک ہی ہے بھیا سائیں!'' اس نے کہا۔ ''مشکل سے ڈیڑھ کلومیٹر دور ہو گی۔''

''تو کیا ہم اکیلے چائے پئیں گے؟'' میں نے کہا۔

''میں ابھی آدھے گھنٹے میں آ جاؤں گا۔ میں اپنے بچوں اور آپ کی بہو کو لینے جا رہا ہوں، اب بھابی جی آئی ہیں تو اچھا نہیں لگتا کہ وہ میری وائف سے نہ ملیں۔'' یہ کہہ کر اس نے نوکروں کو ایک بار پھر ہمارے آرام کی ہدایت کی اور عجلت میں باہر نکل گیا۔

میں نے اس حویلی کا جائزہ لیا، وہ نام کی نہیں بلکہ واقعی حویلی تھی اور اس کی تعمیر زیادہ پرانی بھی نہیں تھی، پوری حویلی جدید انداز میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں اوپر نیچے جانے کتنے بیڈ رومز تھے۔

نادیہ نے اوپر کا ایک کشادہ بیڈ روم پسند کیا، اس کی کھڑکی سے نہ صرف حویلی کے لان بلکہ دور تک کا منظر نظر آتا تھا، میں نے اس کے ساتھ والا کمرا اپنے لیے محفوظ کر لیا، اس کے بعد تیمور اور ہاشم کے کمرے تھے، تیمور کے آدمی اور بلوچ کے آدمی نچلی منزل میں تھے۔

ہم لوگ نہا دھو کر فریش ہوئے تو ڈائننگ روم میں چائے اور دیگر لوازمات کی میز سجی ہوئی تھی، اس میں کھانے کا اتنا سامان تھا کہ ہمیں رات کے کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ابھی ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہی تھے کہ حویلی کا آہنی پھاٹک کھلنے کی آواز آئی اور پھر پورچ میں کوئی گاڑی آ کر ٹھہری، چند منٹ بعد حویلی کے داخلی دروازے سے ممتاز اندر داخل ہوا، اس کے ساتھ دو بہت ہی خوب صورت بچے تھے، ان کی عمریں مشکل سے بارہ سال اور تیرہ سال رہی ہوں گی، ان کے پیچھے نازک سی، تیکھے نقوش والی ایک گوری چٹی لڑکی بھی تھی، اس کے جسم پر بھی جدید لباس تھا۔

ممتاز سیدھا ڈائننگ روم میں آیا اور بولا۔ ''بھیا! یہ آپ کی بہو مریم ہے اور یہ دونوں آپ کے بھتیجے علی اور حمزہ ہیں۔''

مجھے شدید حیرت ہوئی، سندھ کے وڈیرے تو اپنی عورتوں کو شدید پردے میں رکھتے ہیں، یہ میں نے پہلا وڈیرہ دیکھا تو جو اپنی بیوی کا تعارف غیروں سے کرا رہا تھا۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعا دی اور جیب سے ہزار ہزار کے چند نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''مریم بیٹا! مجھے تمہارے لیے کوئی تحفہ لانے کا خیال ہی نہیں رہا، میری طرف سے فی الحال یہ قبول کرو۔''

مریم ہچکچائی تو ممتاز نے کہا۔ ''لے لو مریم! کامران بھیا میرے بڑے بھائی ہیں، ان سے کوئی تکلف مت کرو۔''

مریم نے نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر مجھے ایک مرتبہ پھر سلام کیا۔

میں نے دونوں بچوں کو بھی ایک ایک ہزار کے نوٹ دے دیے۔ ''انکل! آپ کراچی سے آئے ہیں؟'' ممتاز کے

بڑے بیٹے علی نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! ہم کراچی سے آئے ہیں، آپ یہ بتایئے، آپ کس اسکول میں پڑھتے ہیں۔''

''میں نے ان دونوں کو کیڈٹ کالج گھوڑا گلی بھجوا دیا ہے۔ آج کل تو یہ چھٹیوں پر آئے ہوئے ہیں، دو دن بعد چلے جائیں گے۔''

''بھیا! آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہے ہیں۔'' مریم نے کہا۔ ''بادام کا حلوہ تو کھا کر دیکھیں۔''

''مریم! اگر میں نے سب کچھ کھا لیا تو پھر رات کا کھانا گول کرنا پڑے گا، میرا خیال ہے کہ تم لوگ رات کے کھانے کا تکلف مت کرو۔''

''بھیا! یہ کیسے ہوسکتا ہے، ابھی صرف ڈھائی ہی تو بجے ہیں۔ رات تک تو یہ سب کچھ ہضم ہو جائے گا۔''

مجھے اچانک بلوچ اور تیمور کے آدمیوں کا خیال آیا، میں نے تیمور سے کہا۔ ''تیمور! تم نے گارڈز کو بھی کھانا بھجوایا ہے؟''

''جی بھیا!'' ممتاز نے کہا۔ ''میں نے نوکروں کو پہلے ہی ہدایت کردی تھی، ان لوگوں نے آپ کے گارڈز کو بھی یہ ہی سب کچھ بھجوا دیا ہے۔''

''ان میں سے سب گارڈز نہیں ہیں بلکہ میرے دوست بھی ہیں۔''

''ان کے آرام کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔'' ممتاز نے کہا۔ ''تمہیں اگر کوئی شک ہے تو تم خود ان سے معلوم کرلو۔''

''نہیں مجھے شک تو نہیں ہے۔'' تیمور مسکرا کر بولا۔

''ممتاز! تم انسپکٹر اکرم سیال کو جانتے ہو؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

ممتاز نے اب چونک کر میری طرف دیکھا، پھر بولا۔ ''آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟''

''اصل میں شہر کے داخلی راستے پر پولیس کی جو چوکی بنی ہے، وہ وہاں تعینات ہے۔''

''وہ تو علاقے کا ایس ایچ او ہے۔'' ممتاز نے کہا۔ ''وہاں تو دو تین غریب کانسٹیبل اور حوالدار کھڑے ہوں گے لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''جس وقت ہم شہر میں داخل ہوئے، اس وقت وہ بھی چوکی پر موجود تھا۔''

''کیا اس نے آپ کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بدتمیزی یا بدسلوکی تو نہیں کی ہے۔ وہ انتہائی گھٹیا اور کم ظرف انسان ہے۔''

''نہیں اس نے ہمارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے بلکہ وہ تو تمہارا نام سن کر ہم سے بہت زیادہ مرعوب ہو گیا تھا۔''

پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ممتاز! اس نے مجھ سے ایک درخواست کی ہے، اسے قبول کرنا یا رد کرنا تمہارے اختیار میں ہے، میں تم پر دباؤ تو نہیں ڈالوں گا، میں نے اس سے وعدہ کرلیا ہے کہ میں ممتاز صاحب سے بات کروں گا، اگر وہ مان گئے تو ٹھیک ہے ورنہ......''

''بھیا! اس نے اپنا ٹرانسفر رکوانے کی بات کی ہوگی؟'' ممتاز نے کہا۔

ہاں، بات تو یہ ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس کی غلطی بہت بڑی ہے لیکن میں آپ کی سفارش کو کیسے ٹال سکتا ہوں۔''

''میں نے اس کی سفارش نہیں کی ہے، بس تمہیں اطلاع دی ہے۔''

''آپ کی اطلاع ہی میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے بھیا!'' پھر وہ موضوع بدل کر بولا۔ ''بھیا میرا خیال ہے کہ چائے باہر ٹیرس میں بیٹھ کے پی جائے؟''

''ہاں، میرا بھی یہ ہی خیال تھا۔'' میں نے کہا۔

ممتاز نے اپنے ایک ملازم کو بلا کر ٹیرس میں کرسیاں اور چھوٹی ٹیبل لگانے کی ہدایت کی اور دوسرے ملازم سے کہا کہ ابھی اور اسی وقت بڑے صوبے دار (ایس ایچ او) کو ٹیلی فون کرو اور یہاں بلاؤ۔

ہم جانے ہی والے تھے کہ اکرم سیال وہاں آ گیا، ممتاز نے اسے حویلی کے اندر نہیں بلایا تھا بلکہ وہ باہر لان میں کھڑا تھا، ممتاز نے مجھ سے کہا۔ ''بھیا آپ کو زحمت نہ ہوگی لیکن ذرا میرے ساتھ نیچے چلیں۔''

میں ممتاز کے ساتھ نیچے لان میں چلا گیا۔

اکرم سیال تیر کی طرح ہماری طرف آیا اور مجھے بہت لجاجت سے سلام کیا۔

''انسپکٹر!'' ممتاز فوراً وڈیرہ بن گیا۔ ''یہ میرے مہمان نہیں بڑے بھائی ہیں، تم جانتے ہو کہ میں ایک دفعہ جو فیصلہ کر لیتا ہوں، اسے پھر کبھی تبدیل نہیں کرتا لیکن اپنے بڑے بھائی کے لیے تو میں کچھ بھی کرسکتا ہوں، ان ہی کی وجہ سے میں تمہیں معاف کر رہا ہوں لیکن آئندہ مجھے تمہاری طرف سے ایسی کوئی شکایت نہ ملے ورنہ بار بار بھیا تمہاری سفارش نہیں کریں گے۔''

''آپ کی بہت مہربانی سرجی!'' سیال نے کہا۔

''وہ مزید کچھ کہتا لیکن ممتاز نے اسے ٹوک دیا۔ ''ٹھیک ہے اب تم جاؤ لیکن میری بات یاد رکھنا۔''

وہ وہاں سے چلا گیا، جیسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوگی تو ممتاز اپنا فیصلہ تبدیل کر دے گا۔

ممتاز! یہاں کوئی پیر احسان الحق ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے کون نہیں جانتا۔'' ممتاز نے کہا۔

اس وقت تیمور بھی ہمیں ڈھونڈتا ہوا وہاں آ گیا۔

''آپ کو اس جعلی پیر سے کیا کام پڑ گیا؟''

ممتاز نے تضحیک آمیز لہجے میں پوچھا۔

''جعلی پیر؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اس کا تو بہت نام ہے، اس کے عقیدت مند دور دور سے اپنی مرادیں پوری کرانے اس کے پاس آتے ہیں۔''

''تو کیا آپ بھی کوئی کام لے کر اس کے پاس آئے ہیں؟'' ممتاز مسکرایا۔

''اصل میں تمہیں کچھ اور کام ہے۔'' تیمور نے کہا، پھر اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ ممتاز کو سچائی بتا دے۔

''کیا کام؟'' ممتاز نے چونک کر پوچھا۔

''اس کی تفصیل تو تمہیں بھیا ہی بتائیں گے۔'' تیمور نے اپنا دامن صاف چھڑا لیا۔

''ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں بھیا! خاص بات تو ہے ورنہ آپ کراچی سے میرپور خاص نہ آتے۔''

''یار، کچھ عرصہ پہلے کچھ لوگوں نے بھیا کی بہن کو اغوا کرلیا تھا۔''

''وہاٹ؟'' ممتاز چیخ کر بولا۔ ''ارسلان کی ایک ہی بہن تھی، شائستہ! کیا انہیں کسی نے اغوا کرلیا ہے۔''

''اغوا کرلیا تھا۔'' تیمور نے کہا۔ ''وہ اس کی قید سے نکل بھاگیں، پھر کافی عرصے تک ان کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ یہاں پیر صاحب کی حویلی میں موجود ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے رمضان بلوچ کا واقعہ بھی بتا دیا۔

''بہت اُلو کا پٹھا ہے وہ پیر!'' ممتاز نے کہا۔

''بہ ظاہر وہ بہت اللہ والا اور پہنچا ہوا بزرگ ہے لیکن اس کا باطن کالا سیاہ ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی افواہیں بھی گردش کر رہی ہیں لیکن اس کی پہنچ ایوانِ صدر اور پی ایم ہاؤس تک ہے لیکن اگر اس کی پہنچ صدر امریکا تک بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب یہ میری ذمے داری ہے، آپ بس آرام سے بیٹھ کر تماشا دیکھیں۔''

''لیکن ممتاز! جب اس کا اثر رسوخ اتنا ہے تو......

''آپ اس کی فکر مت کریں۔'' ممتاز نے کہا۔ ''اگر وہ اپنے جعلی کارناموں سے اوپر تک رسائی حاصل کرسکتا ہے تو میں اپنی شرافت سے وہاں تک کیوں نہیں پہنچ سکتا۔''

''سوال میری بہن کا ہے ممتاز!'' میں نے کہا۔

''آپ پریشان کیوں ہورہے ہیں، ہماری بہن پر تو آنچ بھی نہیں آئے گی، اس کے لاکھوں مرید ہیں لیکن وہ مجھ سے بہت گھبراتا ہے، میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں، میں پہلے تو بات چیت کے ذریعے سلسلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا، اگر اس سے بات نہ بنی تو میں اس کی زبان میں بات کروں گا۔ اپنی بہن کی عزت کے لیے میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''آپ ناحق اتنے گارڈز لے کر آئے۔ میرے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں ہے، میں آج ہی اس سے بات کروں گا۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، آپ کا اس بات چیت میں شریک ہونا بہت ضروری ہے، چاہیں تو تیمور کو بھی ساتھ لے لیں۔''

''اس سے کب ملاقات ہوسکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ عموماً مغرب کے بعد بیٹھتا ہے، پھر عشاء تک عام مریدین کو فارغ کرنے کے بعد عشاء کے بعد خاص مریدوں سے ملتا ہے، ہم عشاء کے بعد ہی چلیں گے، اس وقت وہاں زیادہ رش بھی نہیں ہوگا۔''

''کیا وہ صرف دو گھنٹے کے لیے بیٹھتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو میں آپ کو اس کا شام کا پروگرام بتارہا ہوں، وہ صبح آٹھ بجے سے ظہر تک بیٹھتا ہے، پھر دو تین گھنٹے آرام کے بعد عصر کے بعد مغرب تک بیٹھتا ہے۔'' پھر اس نے وقت دیکھا۔ ''ابھی تو بہت دیر ہے عشاء میں، اس وقت تک تو ہم کھانے سے فارغ ہوجائیں گے۔''

☆......☆

پیر احسان الحق کی حویلی کسی محل سے کم نہیں تھی، اس کا بلند و بالا پھاٹک اتنا بڑا تھا کہ اس سے ایک ساتھ دو ٹرک گزر سکتے تھے، آہنی دروازوں کے نیچے حرکت دینے کے لیے اس میں پہیے لگے تھے، گیٹ کے باہر بہت سی قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں، پھاٹک پر دو مسلح پہرے دار موجود تھے، ان کے شانوں پر کلاشن کوف رائفلیں تھیں اور کمر کے گرد لگے ہوئے ہولسٹرز میں پسٹل بھی تھے، ان کے حلیے ہی ایسے تھے کہ دیکھنے والا ان سے خوف زدہ ہوجائے۔

ممتاز نے اپنی ٹویوٹا وہاں کھڑی ہوئی گاڑیاں میں پارک کی اور ہمارے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھا، گیٹ کے دونوں سروں پر تیز روشنی والے بلب روشن تھے، ان کی روشنی دور تک جارہی تھی، گیٹ پر ایک جانب پیتل کی پلیٹ پر ابھرے ہوئے چمکدار حروف میں پیر احسان الحق شاہ تحریر تھا، اس کے نیچے اس کی تعلیمی ڈگریاں تھیں۔

ممتاز اس بات سے بے خبر تھا کہ ہمارے پیچھے پیچھے ہاشم اور ندیم بھی اپنی گاڑی میں آئے تھے، لیکن حویلی سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک کر ہاشم اور ندیم پیدل ہی حویلی تک آگئے تھے، وہاں اب بھی بہت سے لوگ اس کے آس پاس میں موجود تھے کہ ممکن ہے پیر صاحب کے پاس وقت ہو اور وہ انہیں بھی شرف ملاقات بخش دیں، ممتاز نے بتایا تھا کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پیر صاحب ''مخصوص'' مریدین سے فارغ ہونے کے بعد دو چار عام افراد کو بھی بلالیا کرتے تھے لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

ہاشم اور ندیم بھی ان ہی مریدوں میں کھڑے ہوگئے اور دوسروں کی طرح وہ بھی گیٹ کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے ابھی کوئی وہاں سے نکل کر انہیں پیر صاحب سے ملاقات کی نوید سنائے گا۔

پیر صاحب کے چوکیدار ممتاز کو دیکھ کر چونک اٹھے، ان میں سے ایک نے ممتاز کو سلام کیا اور بولا۔ ''خیر تو ہے سائیں! آج آپ ادھر کیسے بھول پڑے۔''

''بابا! پیر سائیں سے تو کسی کو بھی کام ہوسکتا ہے۔'' ممتاز مسکرایا۔ ''انہیں اطلاع بھجوادو کہ ممتاز ان سے ملنا چاہتا ہے؟'' چوکیدار نے فوراً اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ملا کر بولا۔ ''بخشل! پیر سائیں جا مہمان آیا اہن (پیر سائیں کے مہمان آئے ہیں)......سائیں ممتاز سومرو۔'' اس نے شاید دوسری طرف سے پوچھنے پر نام بتایا تھا۔

''مشکل سے دو منٹ بعد ہی اس بلند و بالا پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھلی اور شلوار سوٹ اور پگڑی میں ملبوس ایک جیم

شخص باہر نکل آیا، اس کے چہرے پر گھنی داڑھی مونچھیں تھیں اور شانے پر شاید سیون ایم ایم کی رائفل اور سینے پر گولیوں کی بیلٹ تھی۔

اس نے بہت تپاک سے ممتاز کا خیر مقدم کیا اور اسے سلام کیا۔

ممتاز نے پوچھا۔ ''کیسے ہو بخشل؟''

''سائیں، دعا ہے آپ کی۔'' اس نے انکساری سے کہا۔

''میری دعاؤں میں اتنی تاثیر کہاں بخشل، دعا تو پیر سائیں کی ہے۔''

وہ اس کے لہجے کے طنز کو محسوس نہ کر سکا اور سر ہلا کر بولا۔ ''بے شک سائیں۔ پیر سائیں کی دعا تو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''سائیں، اندر آئیں نا! آپ نے بھی مجھے باتوں میں لگا لیا۔ پیر سائیں آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

ہم آہنی پھاٹک کی ذیلی کھڑکی سے اندر داخل ہوئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ اقامتی عمارت وہاں سے خاصے فاصلے پر ہے۔ دور سے مجھے پورچ میں بھی کئی گاڑیاں نظر آئی تھیں۔

''بخشل! پیر سائیں کے ساتھ اور کون کون ہے اس وقت؟'' ممتاز نے پوچھا۔

''سائیں سکرنڈ کا وڈیرہ علی نواز ہے، لاڑکانہ کا غلام قادر مہر ہے اور دوگن کا احمد خان ہے۔'' بخشل نے بتایا۔

پھر ممتاز نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ ہمیں لے کر برآمدے تک پہنچا تو وہاں دو مسلح آدمی کھڑے تھے، ان دونوں نے ممتاز کو سلام کیا اور ایک مسکرا کر بولا۔ ''سائیں! آپ تو جانتے ہو کہ......''

''ہاں بابا! جانتا ہوں۔'' ممتاز نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''نہ میرے پاس کوئی ہتھیار ہے، نہ میرے مہمانوں کے پاس ہے، تم چاہو تو تلاشی لے لو۔''

''نہ سائیں!'' ان میں سے ایک آدمی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''ہم آپ کی تلاشی لیں گے؟ آپ نے کہہ دیا، یہی کافی ہے، آیئے ہمارے ساتھ!''

میں جانتا تھا کہ تیمور کی پنڈلیوں سے خوف ناک قسم کا خنجر ضرور بندھے ہوں گے، وہ کسی بھی جگہ نہتا تو جاتا ہی نہیں تھا، البتہ میرے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔ ممکن ہے ممتاز کے پاس کچھ ہو۔

وہ دونوں ایک دروازے پر پہنچے اور اس پر ہلکی سی دستک دے کر بولے۔ ''سائیں! وڈیرہ ممتاز آیا ہے۔''

''تو اسے اندر بھیجو بابا!'' اندر سے ایک نرم آواز آئی، اندر داخل ہونے سے پہلے ممتاز نے اپنے جوتے اتار دیے، ہم لوگوں کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔

اندر داخل ہو کر میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں، کمرا تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا، پورے کمرے میں انتہائی دبیز قالین تھا، اس پر سفید چادر کا فرش تھا۔ سامنے ایک باریش اور بارعب شخص بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر خاصا قیمتی لباس تھا، قمیص کے کفوں میں سونے کے کف لنکس تھے اور ہاتھ پر انتہائی قیمتی گھڑی تھی، وہ چہرے سے واقعی کوئی برگزیدہ شخص نظر آ رہا تھا، سرخ و سفید چہرے پر کالی داڑھی جو کہیں کہیں سے سفید ہو گئی تھی، اس کے وقار میں اضافہ کر رہی تھی۔

ممتاز کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، اس کے کھڑے ہوتے ہی اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے افراد بھی کھڑے ہو گئے، اس نے ممتاز کو گلے سے لگایا، پھر ہم لوگوں سے باری باری مصافحہ کیا اور ہمیں اپنے نزدیک ہی فرشی نشست پر بٹھا لیا، اس کے مہمان ہماری وجہ سے ایک طرف سمٹ گئے تھے۔

''سناؤ سائیں ممتاز! آج ہماری یاد کیسے آ گئی؟''

''سائیں، یاد تو اس کی آتی ہے جسے آدمی بھول جاتا ہے، میں تو آپ کو ہر وقت یاد رکھتا ہوں۔''

پیر احسان الحق مسکرایا اور بولا۔ ''حکم کرو بابا!''

''سائیں، آپ اپنے مہمانوں سے فارغ ہو جائیں، مجھے ذرا تفصیلی بات کرنا ہے۔''

میں نے اس کی بات پر پیر صاحب کو چونکتے دیکھا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گئے اور بولے۔ ''بابا! اکرم خان سے پھر کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟''

''نہیں سائیں! اکرم خان میں اب اتنی جرأت کہاں کہ وہ مجھ سے جھگڑا کر سکے۔''

''ہاں بابا! اکرم سے مجھے یاد آیا، وہ جو انسپکٹر اکرم سیال ہے، تم نے اس کا ٹرانسفر کشمور کرا دیا ہے، وہ بے چارہ بال بچوں والا آدمی ہے، کچھ خیال کرو بابا!''

''سائیں کشمور بھی تو اس ملک کا حصہ ہے اور وہاں جو لوگ اس وقت ہیں، وہ بھی تو بال بچوں والے ہوں گے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''سائیں، آپ کی سفارش ہے تو وہ انسپکٹر کشمور نہیں جائے گا، میں ابھی ہوم سیکریٹری سے بات کر لیتا ہوں۔'' اس نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے مہمانوں سے فارغ ہو جائیں۔''

میں ممتاز کی سیاست پر حیران ہو رہا تھا، وہ اتنا سیدھا تھا نہیں جتنا نظر آتا تھا، انسپکٹر کا تبادلہ تو وہ پہلے ہی رکوا چکا تھا، یہ پتا تو اس نے پیر صاحب پر احسان کرنے کو پھینکا تھا۔

اس نے یوں ہی ایک نمبر ملایا اور بولا۔ ''السلام علیکم سر! ممتاز بول رہا ہوں، میں نے دوپہر میں آپ کو کال کی تھی لیکن بات نہ ہو سکی...... ہاں سب خیریت ہے، معمولی سا کام ہے، وہ جو انسپکٹر اکرم سیال ہے میرے علاقے میں، نہیں بھئی، اس کا ٹرانسفر کرنا نہیں ہے بلکہ روکنا ہے۔ ہاں ابھی آرڈر جاری کر دو، تھینک یو یار!''

پیر صاحب بہ ظاہر ان لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے لیکن ان کا دھیان ممتاز کی باتوں کی طرف تھا، جب اس نے ٹرانسفر رکنے کی خبر سنی تو اس کے چہرے پر سکون ہو گیا۔

اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے پیر صاحب کے ہاتھ چومے تھے اور ان کی طرف پیٹھ کیے بغیر دروازے تک گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد پیر صاحب نے آواز دی۔ ''اڑے چھورا!''

اسی وقت ایک ملازم نما شخص کمرے میں داخل ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بابا، مہمان آئے ہیں، کچھ چائے، پانی کا انتظام کرو۔''

''تکلف مت کریں سائیں!'' ممتاز نے کہا۔ ''یہ میرا اپنا گھر ہے، مجھے ضرورت ہو گی تو خود مانگ کر کھا لوں گا۔''

''اچھا، ان باتوں کو چھوڑو بابا!'' پیر صاحب نے کہا۔ ''تم آج ادھر کیسے بھول پڑے؟''

''سائیں، آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے!'' ممتاز نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور وہ کام اس پورے علاقے میں آپ کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔''

''ایسا کیا کام ہے بابا؟'' پیر صاحب نے اپنی نورانی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، اس کی عمر چالیس بیالیس سے زیادہ نہیں ہو گی لیکن اپنی بردباری اور سنجیدگی کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کچھ بڑا ہی لگتا تھا۔

''سائیں، یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔'' ممتاز نے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ کراچی سے آئے ہیں۔''

''تمہارے بھائی؟'' پیر صاحب نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، یہ میرے لیے بھائیوں سے بڑھ کر ہیں۔'' ممتاز نے کہا۔ ''اصل میں کام ان ہی کا ہے۔''

''سائیں، آپ نے تو اپنا نام مجھے نہیں بتایا۔'' پیر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''میرا نام کامران ہے سائیں۔'' میں نے کہا۔

''میری بہن کچھ لوگوں کے قبضے میں ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے ان لوگوں کی قید سے رہائی مل جائے۔''

''سائیں، تمہاری بہن اگر سندھ کے کسی بھی کونے میں ہوئی تو تمہیں ضرور ملے گی۔'' پیر صاحب نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''ممتاز نے زندگی میں پہلی دفعہ کوئی کام کہا ہے، تمہیں کچھ پتا ہے کہ تمہاری بہن کہاں ہے؟'' پیر صاحب نے پوچھا۔ ''وہ سندھ کے کسی وڈیرے کے قبضے میں ہے یا ڈاکوؤں کے قبضے میں ہے؟''

"سائیں، وہ سندھ کے ایک بہت طاقت ور اور معزز آدمی کے پاس ہے۔"

"بابا! وہ کتنا بھی طاقت ور اور معزز ہو، اس سے نمٹنا میرا کام ہے۔" پیر صاحب کو گویا جلال آ گیا۔ "تم اس کا نام بتاؤ، تمہاری بہن چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔"

"سائیں اس معزز آدمی کا نام ہے پیر احسان الحق!" ممتاز نے سرد لہجے میں کہا۔

اپنا نام سن کر پیر صاحب یوں اچھلے جیسے ان کا پاؤں دہکتے ہوئے انگارے پر پڑ گیا ہو۔ لمحے بھر کو وہ بوکھلا گئے پھر سنبھل کر بولے۔ "ممتاز! سوچ سمجھ کر بات کرو۔" "تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"سائیں، میں سوچ سمجھ کر اور پورے ہوش وحواس میں بات کر رہا ہوں۔" ممتاز نے سرد لہجے میں کہا۔

"بھائی کامران کی بہن شائستہ آپ کے پاس ہے۔"

"تم نے کہیں بھنگ تو نہیں پی رکھا ہے۔"

"احسان الحق!" ممتاز نے درشت لہجے میں کہا۔

"پورا علاقہ جانتا ہے کہ میں بھنگ تو کیا، کوئی بھی نشہ نہیں کرتا ہوں۔"

"تم میرے ہی گھر میں بیٹھ کر مجھ پر الزام لگا رہے ہو، تم جانتے ہو کہ میں جھوٹ بولنے والے کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں احسان الحق!" ممتاز نے کہا۔

"اس لیے میں جھوٹ نہیں بلکہ سچ بول رہا ہوں۔"

"بابا! تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔" پیر صاحب اپنے غصے پر قابو پا کر بولے، غصے کی شدت سے ان کا سانس پھول گیا تھا، لوگ ان کے ہاتھ چومتے تھے، پاؤں چومتے تھے، ممتاز تو سراسر ان کی توہین کر رہا تھا، انہیں ان کے نام سے مخاطب کر رہا تھا۔

"تم کیا کہتے ہو بابا؟" پیر صاحب نے میری طرف رُخ کیا۔

"میں بھی یہی کہوں گا کہ میری بہن آپ کے قبضے میں ہے، میری اطلاع پر تو ممتاز یہاں آیا ہے۔"

پیر صاحب اچانک جلال میں آ گئے۔ "بہت سن لی تمہاری بکواس! اب یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میرے گارڈز تم تینوں کے ٹکڑے کر دیں گے اور تمہاری لاشوں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔"

"یہ آپ کا آخری جواب ہے؟" ممتاز نے کہا۔

"اگر تم فوراً یہاں سے دفع نہ ہوئے تو میں اپنے گارڈز کو ایک آواز دوں گا، پھر تم زندہ یہاں سے نہیں جا سکو گے۔"

میں نے تیمور کو غیر محسوس طریقے سے اپنی پنڈلی کی طرف ہاتھ لے جاتے دیکھا۔

"ٹھیک ہے احسان الحق!" ممتاز نے کہا۔

"میں ابھی تو جا رہا ہوں لیکن دوبارہ آؤں گا۔ اس وقت صورتِ حال زیادہ خراب ہو گی۔"

"گیٹ لاسٹ!" پیر صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ انگریزی بھی جانتے ہیں۔

تیمور نے اچانک جھپٹ کر ان کی گردن کو اپنے بائیں بازو کے حلقے میں لے لیا اور دائیں ہاتھ سے خنجر کی نوک ان کے گلے پر رکھ کر بولا۔ "احسان الحق! اگر زندگی چاہتا ہے تو ابھی اور اسی وقت ہماری بہن کو ہمارے حوالے کر دے ورنہ اس خنجر کی دھار اتنی تیز ہے کہ لمحوں میں تیری گردن جسم سے علیحدہ ہو جائے گی۔ بتا شائستہ کہاں ہے؟"

"یہ زیادتی ہے بابا!" پیر صاحب نے کہا۔ "مجھے مار کے تم لوگ بھی زندہ یہاں سے نہیں جا سکو گے۔"

"ہمیں تو زندگی اور موت کا یہ کھیل کھیلتے ہوئے زمانہ گزر گیا، ہمیں موت سے مت ڈرا، ہم مریں گے تو کم سے کم تجھے تو جہنم رسید کر ہی دیں گے۔"

صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے ممتاز نے جھپٹ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

میں نے دیکھا، پیر صاحب اپنے گاؤ تکیے کے پیچھے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، میں نے جھپٹ کر گاؤ تکیہ

ہٹا دیا، اس کے پیچھے اعشاریہ تین آٹھ کا قیمتی اور ہولناک ریوالور رکھا تھا، میں نے فوراً اسے اٹھا لیا، وزن سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ریوالور پوری طرح لوڈ ہے۔

ریوالور میرے قبضے میں دیکھ کر پیر صاحب کے چہرے پر حیرانی چھا گئی، وہ آہستہ سے بولے۔ "بابا! میری گردن تو چھوڑ دو۔"

میرے اشارے پر تیمور نے ان کی گردن چھوڑ دی، میں نے ریوالور ان کی پسلیوں سے لگا دیا اور بولا۔ "اگر تمہارے حلق سے کسی بھی قسم کی آواز نکلی تو میں تمہارا ریوالور تمہارے ہی جسم پر خالی کر دوں گا۔"

"شائستہ کہاں ہے؟" تیمور نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں نے اسے اغوا نہیں کیا ہے بابا! وہ تو خود یہاں پناہ کی تلاش میں بھٹک رہی تھی، میں نے تو اسے پناہ دی ہے۔"

"تمہارا بہت شکریہ احسان الحق!" میں نے کہا۔ "تم نے میری بہن کو پناہ دی، میں تمہارا احسان مند ہوں اور ساری زندگی رہوں گا لیکن اب تم اسے میرے حوالے کر دو۔"

"میں یہاں سے اندر جاؤں تو اسے لاؤں گا نا!" احسان الحق نے کہا۔

"اندر چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"تم...... تم میرے زنان خانے میں جاؤ گے؟" پیر مظہر الحق ایک مرتبہ پھر پیر بن گیا۔

"تم اپنی خواتین کو دوسری طرف بھیج دو۔" ممتاز نے کہا۔

"وہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں بھی جا سکتی ہیں۔ جلدی کرو میرے پاس وقت نہیں ہے، پھر وہ تیمور سے بولا۔ تیمور مجھے یہ خنجر دے دو، یہ خنجر ریوالور سے زیادہ خطرناک ہے یہ زہر میں بجھا ہوا اس کا معمولی سا زخم تمہاری جان لے لے گا۔"

احسان الحق نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگلنے کی کوشش کی، اس کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی تھی۔

"ان لوگوں کے بارے میں تمہیں اندازہ نہیں ہے، تیمور اب تک اکیس قتل کر چکا ہے اور انڈر ورلڈ میں ٹائیگر کے نام سے مشہور ہے، اس نے اب تک بے شمار پولیس مقابلے کیے ہیں، اپنے بے شمار مخالفین کو ہمیشہ کے لیے معذور کیا ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ یہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا ہے، یہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا ہے۔"

تیمور نے خنجر ممتاز کو دیتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس اس قسم کا ایک اور خنجر ہے۔" اس نے اپنی پنڈلی سے دوسرا خنجر کھولا اور ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"جلدی کرو احسان الحق!" ممتاز نے خنجر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اسے دور ہی رکھو۔"

احسان الحق نے کہا۔ "اگر غلطی سے ہلکا سا جھٹکا بھی لگ گیا تو میں زخمی ہو جاؤں گا۔"

"اور زخمی ہونے کا مطلب ہے موت!"

ممتاز نے کہا۔ "چلو اٹھو۔"

احسان الحق کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "میری جیب سے موبائل فون نکال کر مجھے دے دو، میں اپنے آدمیوں کو ہدایت دے دیتا ہوں کہ وہ شائستہ کو یہیں لے آئیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اب تک بس اس چکر میں تھے کہ ہمارے ساتھ کوئی ہوشیاری دکھا سکو گے؟" ممتاز نے درشت لہجے میں کہا۔ "اس لیے اندر جانے کا بہانہ بنا یا تھا۔" اس نے سیل فون احسان الحق کے حوالے کر دیا۔

"اور سنو، اگر تم نے کسی اور کو کال کرنے کی کوشش کی تو تمہارے جسم پر صرف ایک چرکا لگاؤں گا، ممتاز نے سفاک لہجے میں کہا۔ "پھر تمہاری ساری پیری مریدی ختم ہو جائے گی۔"

پیر احسان الحق نے کانپتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کیا، ممتاز نے اس کے پہلو میں خنجر کی نوک رکھ دی۔

"ہاں، ہاں خشل! اوپر جا کر اس لڑکی کو لے آ جس نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، چابی تو تیرے پاس ہے نا......؟ جلدی کر بابا! مہمان انتظار کر رہے ہیں۔"

اس نے سیل فون بند کیا تو ممتاز نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو، تم یہاں سے زندہ نکل جاؤ گے؟" احسان الحق بپھر کر بولا۔ وہ ابتدائی صدمے سے کسی حد تک سنبھل گیا تھا۔

"تو اپنی فکر کر جعلی پیر" تیمور نے درشت لہجے میں کہا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

تیمور بلی کی طرح دبے قدموں دروازے تک گیا اور اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا، پھر دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔

دستک دوبارہ ہوئی تو ممتاز کے اشارے پر احسان الحق نے کہا۔ "اڑے بابا کون ہے؟ اندر آ جاؤ۔"

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور وہی لحیم شحیم شخص اندر داخل ہوا جو ہمیں باہر ملا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔

"ٹھیک ہے بابا! لڑکی کو ادھر ہی چھوڑ دے۔" احسان الحق نے کہا۔

وہ لڑکی کو چھوڑ کر الٹے قدموں باہر نکل گیا، اس کے جاتے ہی تیمور نے دروازہ بند کر دیا۔ لڑکی کا سر جھکا ہوا تھا، اور وہ فرش کو تک رہی تھی، میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ "شائستہ!"

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور مجھے دیکھا، وہ شائستہ ہی تھی لیکن وہ شائستہ نہیں تھی جسے میں نے کھویا تھا بلکہ یہ تو اس کی پرچھائیں لگ رہی تھی، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو، پھر اس کے حلق سے ایک کربناک سی آواز برآمد ہوئی۔

"بھیا!" میں دوڑ کر اس کے نزدیک پہنچا، اس نے ایک مرتبہ پھر غور سے مجھے دیکھا اور بے اختیار میرے سینے سے لگ کر بری طرح رونے لگی۔ "بھیا! یہ آپ ہی ہیں یا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں؟"

"میں تیرے سامنے ہوں گڑیا!" میں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اب اپنے آنسو پونچھ لے، ہم نے بہت آنسو بہا لیے ہیں، اب آنسو بہانے کی باری دشمنوں کی ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے بھیا!" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"اب تک تو نے جو بھیانک خواب دیکھا تھا گڑیا، وہ خواب اب ختم ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے...... یہاں سے لے چلیں بھیا!" اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے اسے خدشہ ہو کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گا یا اس خواب سے اس کی آنکھ کھلے گی تو پھر وہ اپنے قید خانے میں ہو گی۔

"میں تجھے لینے ہی آیا ہوں گڑیا!"

میں نے کہا۔ اس دوران میں تیمور واپس احسان الحق کی طرف چلا گیا تھا، اچانک اس نے احسان کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا اور درشت انداز میں بولا۔ "میں نے کہا ہے کہ اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔"

احسان الحق کا چہرہ توہین اور غصے کے احساس سے سرخ ہو گیا، اس نے بپھر کر کہا۔

"یا تم لوگ مجھے مار دو یا پھر اپنے مرنے کا انتظار کرو، میرے جیتے جی تم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔ یہ میری حویلی نہیں ہے بلکہ قلعہ ہے قلعہ! ممتاز اچھی طرح جانتا ہے، پھر بھی وہ تم لوگوں کو مرنے کے لیے یہاں لے آیا۔"

"آپ میری فکر مت کریں بھیا!" شائستہ نے کہا۔ "آپ یہاں سے نکل جائیں یہ شخص انتہائی گھٹیا اور کمینہ ہے، یہ اوپر سے جتنا نیک نظر آتا ہے، اندر سے اس کا دل اتنا ہی کالا ہے۔"

"تم فکر مت کرو شائستہ!" تیمور نے پہلی دفعہ اسے مخاطب کیا۔ "اس کمینے سے نمٹنا ہماری ذمے داری ہے۔"

شائستہ نے چونک کر تیمور کو دیکھا، پھر بولی...... آ...... آپ کون ہیں...... میں آپ کو پہچانی نہیں؟"

"میں ارسلان کا دوست ہوں شائستہ!" تیمور نے کہا۔

"یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، اب یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔" میں نے کہا۔

میری بات پر احسان نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اگر نکل سکتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔"

تیمور نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اچانک بائیں طرف کے ایک دروازے کی طرف اچھال دیا، ایک کربناک چیخ کی آواز سنائی دی، پھر کوئی دھم سے فرش پر گر پڑا۔

گرنے والا دروازے کے پردے سمیت گرا تھا، وہ گرتے ہی ساکت ہو گیا۔

میں حیرت سے وہ منظر دیکھ رہا تھا اور تیمور کی حاضر دماغی پر عش عش کر رہا تھا۔

"تو نے اور کتنے گارڈ یہاں چھپا رکھے ہیں؟" تیمور نے مرنے والے کے جسم سے خنجر نکالا، اسی کے کپڑوں سے صاف کیا اور احسان الحق کی گردن پر رکھ دیا۔

احسان الحق کے سرخ و سفید چہرے پر اس وقت گویا راکھ اڑ رہی تھی، اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں، اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن آواز نہ نکل سکی۔

"بول حرام زادے، اور کتنے آدمی ہیں یہاں؟ اب اگر مجھے کسی کا بھی احساس ہوا تو میں اس سے پہلے تجھے مار دوں گا۔"

"اب یہاں کوئی بھی نہیں ہے، یہ میرا باڈی گارڈ تھا اور دس آدمیوں پر بھاری تھا، یہ ہمیشہ اس پردے کے پیچھے رہتا تھا، میرے مریدوں کے علاوہ دشمن بھی یہاں آتے ہیں، انہیں بخشل غیر مسلح کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود اگر چار پانچ خالی ہاتھوں سے بھی مجھ پر حملہ آور ہوں گے تو مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں، میں نے اس لیے نورو کی ڈیوٹی یہاں لگی تھی کہ جب میں اسے اشارہ کروں تو وہ پردے کے پیچھے سے باہر نکل آئے۔"

"تو پھر ابھی تو نے اشارہ کیوں نہیں کیا؟" تیمور نے اس کے چہرے پر ایک اور تھپڑ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو، آج تک کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوئی ہے کہ وہ ٹیڑھی آنکھ سے مجھے دیکھ بھی لے۔"

"تو میری بات کا جواب دے ورنہ اس مرتبہ ہاتھ کی بجائے میری لات چلے گی۔" تیمور نے کہا۔

"میں اگر اسے اشارہ کرتا تو تم فوراً ہی یہ زہریلا خنجر میرے جسم میں اتار دیتے، ایسے موقع پر تو نورو کو خود ہی فیصلہ کرنا تھا کہ وہ مجھے کیسے بچائے؟"

"اب تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔" ممتاز نے کہا۔

احسان الحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ "میں...... میں تمہارے ساتھ چلوں گا؟"

"ہاں، تجھے ہم ضمانت کے طور پر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" تیمور نے کہا۔ "بعد میں تجھے چھوڑ دیں گے ویسے تو اس قابل تو نہیں ہے کہ تجھے زندہ چھوڑا جائے۔"

"میں کیسے جا سکتا ہوں بابا؟" اس نے کہا۔ "میں آج تک اپنے کسی بڑے سے بڑے مرید کے ساتھ نہیں گیا، میرے گارڈز فوراً شک میں مبتلا ہو جائیں گے، پھر تمہاری زندگیوں کی ضمانت بھی میں نہیں لے سکوں گا۔"

"باتیں مت بنا جعلی پیر!" تیمور نے کہا۔ "ان کا شک و شبہ دور کرنا میرا کام ہے، اگر ایسا نہ ہوا تو پھر تیری زندگی کی ضمانت کون دے گا۔ اپنے آدمی سے کہہ کہ گاڑی تیار کر کے پورچ میں لائے میں اپنے مہمانوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"اور اس لاش کا کیا بنے گا؟" احسان الحق نے نورو کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"لاش تیرے لیے اور تیرے آدمیوں کے لیے کیا مسئلہ ہے، تو تو کسی کے ذرا سے کھانسنے اور چھینکنے پر بھی جان لے لیتا ہے، تیرے پاس جانوروں کی کوئی کمی ہے اور ہاں یہ آدمی تیرے ہی ہاتھوں مارا گیا ہے۔" تیمور کا لہجہ انتہائی کرخت تھا۔

"بخشل کا نمبر بتا۔" ممتاز نے پوچھا۔

"مجھے زبانی یاد نہیں ہے، وہ میرے موبائل کے اسپیڈ ڈائل میں ہے، دو نمبر ہے اسپیڈ ڈائل کا۔" احسان نے بے بسی سے جواب دیا۔

ممتاز نے بخشل کا نمبر ڈائل کیا اور سیل فون احسان کو دے کر اس کے پہلو میں ریوالور کی نال اڑا دی۔

"بخشل! بابا گاڑی تیار کر...... مجھے ابھی مہمانوں کے ساتھ ایک ضروری کام سے جانا ہے...... کوئی آدمی نہیں بابا...... میں اکیلا جاؤں گا۔ ہاں، کچھ ایسا ہی کام ہے...... نہیں بابا تو بھی نہیں...... گاڑی ممتاز کا ڈرائیور چلائے گا۔"

ممتاز نے سیل فون اس کے ہاتھ سے چھین کر سلسلہ منقطع کر دیا، چند سنٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی تو احسان نے کہا۔ "آ جاؤ بابا!"

دوسرے ہی لمحے بخشل اندر داخل ہوا، اس وقت تک ممتاز نے احسان کو اور ہم سب کو بٹھا دیا تھا۔

"گاڑی تیار ہے پیر سائیں!" بخشل نے بھاری آواز میں کہا۔

تیمور کی نظریں مسلسل احسان کے چہرے کی طرف تھیں کہ وہ بخشل کو کوئی خفیف سا اشارہ بھی نہ کرنے پائے۔

"ٹھیک ہے بابا! تو جا!" احسان نے کہا۔

بخشل سر جھکا کر چلا گیا۔

ممتاز کو کچھ خیال آیا اور اس نے احسان کے سیل فون سے دیکھ کر اپنے موبائل سے بخشل کا نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ "بخشل! میں ممتاز بول رہا ہوں، باہر میرا ڈرائیور اور گارڈ ہے، اسے بھی اندر پورچ میں آنے دو۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند منٹ بعد بخشل پھر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ سائیں ممتاز کی گاڑی اور ڈرائیور بھی آ گیا ہے۔

اس کے جانے کے بعد ممتاز نے ریوالور مجھے دیا اور خود اپنے ہاتھ میں خنجر لے کر احسان کے پہلو میں آ گیا، دوسری طرف سے تیمور بھی اس کے پہلو میں آ گیا۔ احسان نے سہمے ہوئے انداز میں تیمور کو دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ ہم سب سے زیادہ تیمور سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔

میں نے شائستہ کا ہاتھ پکڑا اور چلنے سے پہلے احسان سے کہا۔ "ذرا سی بھی ہوشیاری دکھائی تو میں اپنی جیب سے بھی فائر کر سکتا ہوں۔"

"آپ فکر مت کریں بھیا!" تیمور نے کہا۔ "اس کے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ کب اس کے پہلو میں یہ زہریلا خنجر اتر گیا، چل اب باہر کی طرف!" اس نے احسان کو دھکا دیا۔

احسان نے اپنا حلیہ درست کیا، ہاتھوں سے بال سنوارے اور سر پہ خوب صورت سی ایک ٹوپی پہن لی، پھر وہ ہمارے ساتھ یوں چلا جیسے سزائے موت کا کوئی قیدی پھانسی گھاٹ کی طرف جاتا ہے۔

"اپنی چال پر قابو پاؤ۔" ممتاز نے کہا۔ "ورنہ تمہارے آدمی یہ سمجھیں گے کہ آج پیر صاحب نے کچھ زیادہ ہی پی لی ہے۔"

"سیدھی طرح چل!" تیمور نے ہتک آمیز انداز میں کہا۔ تیمور کے کہنے پر وہ کچھ سنبھل گیا۔ تیمور نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور ہم لوگ اس کمرے سے برآمد ہوئے۔

باہر بخشل کھڑا تھا، اس نے آگے بڑھ کر احسان کے قدم چھونے چاہے لیکن احسان نے اسے اشارے سے روک دیا، وہ ادب سے ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا، اس کا کوئی ملازم براہ راست اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھتا تھا، یہ ایک طرح سے ہمارے حق میں غنیمت ہی تھا ورنہ وہ احسان کی اڑی اڑی رنگت اور فق چہرہ دیکھ کر ضرور شک میں پڑ جاتے۔

احسان پورچ کی طرف بڑھا تو بخشل نے آگے بڑھ کر احسان کی لینڈ کروزر کی عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

احسان گاڑی میں سوار ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی ممتاز بھی گاڑی میں بیٹھ گیا، ڈرائیونگ سیٹ پر ممتاز کا ڈرائیور بیٹھ گیا، ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر تیمور بیٹھا اور ممتاز نے مجھ سے کہا۔

"بھیا! آپ میری گاڑی میں آ جائیں۔"

اس کی کرولا بھی احسان کی گاڑی کے پیچھے ہی کھڑی تھی، میں نے شائستہ کو اپنے ساتھ پسنجر سیٹ پر بٹھایا اور خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

روانگی سے پہلے احسان نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ کھولا اور بخشل سے کہا۔ "اندر نورو کی لاش پڑی ہے، اسے ٹھکانے لگا دینا، وہ کم بخت کچھ زیادہ ہی سرکشی دکھانے لگا تھا۔"

"جی سائیں!" بخشل نے یوں کہا جیسے احسان نے اسے اندر رکھا ہوا ایش ٹرے صاف کرنے کو کہا ہو۔

پھر احسان کی گاڑی حرکت میں آ گئی، اس کے ساتھ ہی میں نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔

احسان کی گاڑی دیکھ کر آہنی گیٹ پر کھڑے ہوئے پہرے داروں نے لمحے بھر کی حیرت سے گاڑی کو دیکھا، پھر فوراً ہی گیٹ کھول دیا، دونوں گاڑیاں آگے پیچھے باہر نکل گئیں۔

میں نے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا، وہ پیر سائیں کی ایک جھلک دیکھنے کو گرتے پڑ رہے تھے لیکن پیر سائیں کے پہرے دار انہیں بے دردی سے پیچھے دھکیل رہے تھے، اس بھیڑ میں مجھے ہاشم نظر آیا، میں نے اسے دیکھ کر جیب سے سیل فون نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کر کے کہا۔ "ہاشم! ہم لوگ واپس جا رہے ہیں، تم بھی ہمارے پیچھے آ جاؤ۔"

"ہاں، میں نے دیکھ لیا ہے، تم لینڈ کروزر کے پیچھے ممتاز کی کرولا میں ہو۔"

ممتاز وہاں سے سیدھا اپنی شہر سے باہر والی حویلی میں پہنچا، ہماری گاڑیاں جوں ہی گیٹ کے اندر داخل ہوئیں، ممتاز نے اپنے گارڈز سے گیٹ بند کرنے کو کہا۔ پھر اس نے دھکیل کر احسان کو باہر نکال لیا۔

"بابا! اب تو تم خیریت سے پہنچ گئے ہو، اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے، اب تو مجھے جانے دو۔"

"تو کیا ہمیں بالکل ہی الو کا پٹھا سمجھتا ہے؟" تیمور نے کہا۔

"ہم تجھے چھوڑ دیں اور تو ابھی جا کر اپنے آدمیوں کو یہاں بھیج کر ممتاز کی حویلی کا گھیراؤ کرا لے۔ جب تک ہم یہاں سے روانہ نہیں ہو جاتے، تب تک تو ہمارا مہمان رہے گا۔"

"دیکھو، بخشل صرف ایک گھنٹا انتظار کرے گا، پھر وہ اپنے طور پر کچھ بھی کر سکتا ہے، یہ تو وہ جانتا ہی ہے کہ مجھے وڈیرہ ممتاز اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

"تو ابھی کچھ دیر بعد اسے سیل فون پر اطلاع دے گا کہ ایک وفاقی وزیر اس وقت حیدرآباد میں موجود ہے، میں اس سے ملاقات کرنے جا رہا ہوں، اگر میں اس وقت نہ پہنچا تو وہ وزیر واپس چلا جائے گا، مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔" تیمور نے کہا۔

"بابا! تیرا دماغ تو بہت شیطانی ہے۔" احسان نے کہا۔ "ہر بات کا جواب ہے تیرے پاس۔"

"ملک کے بڑے بڑے بدمعاش اور مافیا چیف یونہی بھی میرے نام سے نہیں کانپتے۔" تیمور نے سفاک لہجے میں کہا۔ "میں ان سے دس چالیس آگے کی سوچتا ہوں، تو تو پھر ایک جعلی پیر ہے جو سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کو لوٹتا ہے۔"

"بابا مراد!" ممتاز نے اپنے گارڈ کو آواز دی۔ "پیر سائیں ہمارا مہمان ہے، اس کے آرام کا خیال رکھنا لیکن اگر یہ کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرے تو بالکل لحاظ مت کرنا۔"

"جو حکم سائیں!" مراد نے کہا۔

"بابا مراد!" تیمور نے کہا۔ "کہیں تم بھی تو اس کے مرید نہیں ہو؟"

"توبہ کریں صاحب! اگر میں اس کا مرید ہوتا تو سائیں ممتاز کے ساتھ نہیں ہوتا، سائیں ممتاز نے کبھی اسے پیر سمجھا ہی نہیں۔"

"سائیں ممتاز ایک دن پچھتائے گا اور......"

اچانک تیمور نے اس کی گردن دبوچ لی اور بائیں ہاتھ سے اس کے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی خوب صورت اور قیمتی ٹوپی دور جا گری اور اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ پھر وہ مراد سے بولا۔ "اگر یہ زیادہ بکواس کرے تو اس کے ساتھ اسی طرح پیش آنا۔" اس نے احسان کو مراد کی طرف دھکیل دیا۔

مراد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف لے گیا، اس وقت بلوچ سمیت اس کے ساتھی بھی وہاں موجود تھے، بلوچ کے چہرے پر خوشی کا تاثر تھا، اس نے ہنس کر کہا۔ "کامران صاحب! میں آپ کو مان گیا، جو کام رائفل کی

کوئی نہیں کرسکتی، وہ انسان اپنی عقل سے کرلیتا ہے۔ اگر ہم اس ڈبّا پیر کی حویلی پر حملہ کرتے تو اپنے نقصان کے علاوہ کچھ بھی نہیں کرتے۔ میں نے اس کی حویلی کا جائزہ لیا تھا، وہ حویلی کیا، چھوٹا موٹا قلعہ ہے، ہم میں سے کوئی اگر اندر پہنچنے میں کامیاب بھی ہوجاتا تو وہ کافی دیر تک تو شائستہ بہن کو تلاش ہی کرتا رہتا اور اسی چکر میں پیر کے کسی گارڈ کے ہاتھوں مارا جاتا۔''

''یہ سارا کمال ممتاز کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو وہاں صرف خاموش تماشائی تھا، ہاں، کچھ ہاتھ پیر تیمور نے ضرور چلائے ہیں۔'' پھر ہم اندر آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ شائستہ مسلسل میرے ساتھ تھی، اسے ابھی تک یہ خوف تھا کہ شاید میں اسے یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ مجھے اس کی ذہنی حالت ابھی نارمل نہیں لگ رہی تھی، وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھ سے لپٹ کر رونے لگتی تھی، اس وقت تک ہاشم اور ندیم بھی واپس آگئے تھے، تیمور انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا چکا تھا۔

''یار! میں تو بہت پریشان ہوگیا تھا، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں حویلی کے اندر کیسے جاؤں؟ ندیم نے تو باہر سے حویلی کا چکر لگا کر بھی دیکھ لیا تھا، کہیں کوئی ایسا راستہ نہیں تھا جہاں سے ہم اندر داخل ہوتے، پھر ایک آخری طریقہ تھا۔'' ہاشم نے کہا۔ ''میں تم سے سیل فون پر بات کرتا اور اگر خیریت نہ ہوتی تو حویلی کے آہنی گیٹ کو بم سے اڑا دیتا۔''

''تمہارے پاس بم بھی ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن چھوٹا موٹا بم اس پھاٹک کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟''

''چھوٹا موٹا بم!'' ہاشم نے ہنس کر کہا۔

''وہ بم اتنا طاقت ور ہے کہ نہ صرف حویلی کا پھاٹک دھماکے سے اُڑ جاتا بلکہ وہاں کھڑے ہوئے گارڈ اور بہت سے عقیدت مند بھی ہلاک ہوجاتے اور اردگرد کی عمارتوں میں بھی دراڑیں پڑسکتی تھیں۔''

شائستہ ابھی تک بہت مضبوطی سے میرا بازو تھامے ہوئے تھی اور وقفے وقفے سے رو رہی تھی۔

میں نے ندیم سے کہا۔ ''یار! ذرا شائستہ کا چیک اپ کرلو، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسے نیند کا کوئی انجکشن دے دینا تاکہ یہ آرام سے سو جائے۔''

''نہیں بھیا! میں سونا نہیں چاہتی، میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں، آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا بھئی ندیم!'' میں نے کہا۔ ''اسے نیند کے کسی قسم کے انجکشن مت دینا، صرف ڈپریشن کی دوا دو اور کوئی پین کلر انجکشن دے دینا۔''

''ٹھیک ہے کامران صاحب!'' ندیم نے کہا۔

''نادیہ! تم شائستہ کے ساتھ چلی جاؤ۔''

''نادیہ!'' اس نے نادیہ کا نام سن کر چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ''بھیا! آپ کی پسند تو بہت زبردست ہے۔'' پھر وہ مسکرا کر نادیہ کے ساتھ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ممتاز کا ایک ملازم کافی لے آیا، ممتاز نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ زیادہ دیر یہاں نہیں رُک سکتے۔ ہمیں ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر پنجاب کی طرف نکلنا ہوگا۔''

''پنجاب کی طرف کیوں؟'' تیمور نے پوچھا۔

''اس ڈبّا پیر کے پورے سندھ میں بہت بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں، اس کا سیکریٹری اور خادم خاص تھوڑی دیر میں آسمان سر پر اٹھالیں گے۔''

''ابھی ہمارے پاس پوری رات ہے۔'' ممتاز نے کہا۔ ''میں احسان سے ابھی ٹیلی فون کراتا ہوں کہ وہ آج رات حیدرآباد میں گزارے گا اور کل صبح اپنا پروگرام بتائے گا۔''

ندیم کمرے میں داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ میں نے شائستہ کو خواب آور دوا کا انجکشن دے کر سلا دیا ہے، دراصل اس کا ذہن ابھی اس تبدیلی کو پوری طرح قبول نہیں کرپایا ہے، وہ نارمل ہونے میں ایک دو دن تو لے گی۔''

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے ممتاز سے کہا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟ کیا احسان کو اسی طرح چھوڑنا ہے؟''

''احسان سے تو پچھلے بہت سے حساب برابر کرنا ہیں، اس نے تو میرے بابا سائیں کے ساتھ بھی بہت ظلم کیا تھا، ان کے حصے کی بہت سی زمین ہڑپ کرگیا اور وہ خاموش رہے، وہ بنیادی طور پر بہت صلح پسند اور نیک آدمی تھے، میں اس وقت بہت چھوٹا تھا اور یہاں تھا بھی نہیں۔''

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں احسان الحق قید تھا، اس نے مجھے اور تیمور کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ممتاز کے آدمیوں نے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے تھے تاکہ وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے ہماری طرف دیکھا اور تیمور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

''دیکھو احسان! میں تم سے جو کچھ پوچھوں اس کا بالکل سچ سچ جواب دینا۔'' ممتاز نے کہا۔

''ورنہ میں تمہیں تیمور کے حوالے کرکے یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''پہلے تم تخشل کو یہ اطلاع دے دو کہ تم آج رات حیدرآباد میں ایک صوبائی وزیر کے ساتھ گزارو گے۔'' اس نے جیب سے احسان کا سیل فون نکالا اور اسے آن کرکے تخشل کا نمبر ڈائل کردیا۔

تیمور نے پہلے ہی خنجر نکال لیا تھا، وہ پھرتی سے اس کے پہلو میں پہنچ گیا، ممتاز نے سیل فون احسان کے کان سے لگا دیا، پھر احسان نے وہی کچھ کہا جو ممتاز چاہتا تھا۔

''اب تم بتاؤ کہ تم نے شائستہ کو اپنی قید میں کیوں رکھا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''شائستہ میری قید میں نہیں بلکہ میری پناہ میں تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

جواب میں میرا بھرپور تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا اور میں نے کہا۔ ''تم سے پہلے ہی کہا گیا تھا کہ بالکل سچ بولنا ہے۔'' پھر میں تیمور سے بولا۔ ''تیمور! تمہیں معلوم ہے کہ تھانے میں پولیس والے کسی بھی معزز آدمی سے کچھ اگلوانے کے لیے کیا کرتے ہیں؟''

''معلوم ہے بھیا!'' تیمور نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ سب سے پہلے اسے عریاں کردیتے ہیں تاکہ وہ خود اپنی ہی نظروں میں گر جائے۔''

''تو پھر پہلے ہمارے اس ڈبّا پیر کو لباس سے محروم کردو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' احسان بری طرح چیخا۔ ''ایسا مت کرنا!''

''تیمور ایسا ہی کرے گا ورنہ تم سچ نہیں بولو گے۔''

''میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔

''بعد میں تم مزید سچ اگلو گے۔'' میں نے کہا اور تیمور سے مخاطب ہوا۔ ''اس کے کپڑے اتار دو۔''

''تیمور نے آگے بڑھ کر پہلے اس کے ہاتھ اور پاؤں کھولے اور بولا۔ ''ہاتھ پیر بالکل مت چلانا۔ اگر اس زہریلے خنجر کا ہلکا سا زخم بھی آگیا تو تمہاری زندگی کا باب یہیں بند ہوجائے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے پہلے اس کی قمیص پھاڑ کر جسم سے علیحدہ کی، پھر بنیان کو کھینچ کر جسم سے اتارا، اس کا جسم خوب پلا ہوا سرخ و سفید تھا، ظاہر ہے وہ برسوں سے عیاشی کی زندگی گزار رہا تھا، بہترین غذا کھا رہا تھا تو اس کا جسم لاغر کیسے ہوسکتا تھا۔

پھر اچانک تیمور نے اسے بالکل برہنہ کردیا۔

اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا، وہ جلدی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''کھڑے ہوجاؤ۔'' تیمور نے کہا۔ ''ورنہ......'' اس نے خنجر اس کے جسم کے قریب لے جاکر لہرایا، وہ کانپتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ میں اسے دیکھ کر گنگ ہوگیا، میری طرح تیمور اور ممتاز بھی سکتے میں تھے۔

☆......☆

یہ پُرتجسس، سنسنی خیز اور لہو رنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات آئندہ ماہ کے ''سچی کہانیاں'' میں ملاحظہ فرمائیں



سلونی

شائستہ میر آرزو

سوات سے، دولت کی ہوس میں گرفتار ایک باپ کی داستانِ ملامت

قارئین یہ ایک ایسی کم عمر لڑکی کی کہانی ہے جس نے بہت ظلم و ستم سہے تھے، لیکن اپنے آپ کو رسوا نہیں ہونے دیا اور ہر قدم پر ثابت قدمی اور ہمت کا مظاہرہ کیا۔ ہم دونوں کا چوں کہ بچپن سے ساتھ رہا ہے، اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ میرا آنکھوں دیکھا حال ہے۔

آیئے اس کی زبانی یہ کہانی سنیں۔

''دُکھ کیا ہے؟ اور یہ کس چڑیا کا نام ہے؟'' یہ سوال میں اکثر اپنی گہری دوست فرح سے کیا کرتی تھی، جسے سن کر وہ اکثر ہنس پڑتی تھی۔

''سلونی تمہیں اس طرح اندازہ نہیں ہوسکے گا جب تک کہ تمہارا خود دُکھ سے واسطہ نہ پڑے۔''

لیکن میں انجان تھی کہ جس دن میں دنیا میں آئی۔ اس دن سے ہی دکھوں نے بھی میرے ساتھ جنم لیا، لیکن میں ابھی تک محسوس ہی نہیں کر پائی تھی۔

میرا نام سلونی ہے اور ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ بہن، بھائیوں میں میرا نمبر سب سے پہلا ہے۔

میں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں پیسوں کی ریل پیل تھی، کسی بھی چیز کی کمی نہ تھی۔ میرا تعلق اس اس جگہ سے تھا جہاں لڑکیاں زیادہ عزیز ہوتی ہیں، کیوں کہ وہ اپنے خاندان کے لیے آمدنی کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں، لہٰذا میری پیدائش پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ مجھے بہت ناز و نعم سے پالا گیا۔ اسکول کی عمر کو پہنچی تو مجھے اسکول داخل کرایا گیا۔

بچپن سے ہی میں نے محسوس کرلیا تھا کہ ہمارے گھر کا سسٹم دوسرے گھروں سے بالکل مختلف ہے۔ ہر روز مہمانوں کا آنا جانا، تیز موسیقی اور میک اپ سے بھرے چہرے مجھے عجیب سی اُلجھن میں ڈال دیتے۔ مجھے یہ سب کچھ بہت بُرا لگتا۔

میں فطری طور پر بہت حساس اور کم گو واقع ہوئی تھی۔ رات کو جب سب گھر والے جن میں میری کزن بھی شامل ہوتی، اکٹھے بیٹھ کر گاتے یا ناچتے تو مجھے بہت کوفت ہوتی۔ میں ہمیشہ ان کے ساتھ بیٹھنے سے کتراتی، جبکہ میری ہم عمر کزن رانی ان محفلوں میں پیش پیش ہوتی۔ پھوپو ہر دوسرے، تیسرے روز تیار ہو کر نجانے کہاں جاتی۔ وہ اکثر رانی کو بھی ساتھ لے جاتی اور جب مجھے ساتھ جانے کے لیے کہتی تو میں ہمیشہ انکار کرتی۔

مجھے بچپن سے ہی شور شرابے اور ہنگامے پسند نہیں تھے۔ سکون کے لیے دو ہی جگہیں میری پسندیدہ تھیں۔ ایک اسکول اور دوسری فرح کا گھر۔

میرے گھر والے ہر طریقے سے مجھے اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے، کیوں کہ ان کے بقول میں اپنے گھر کو روشن کرنے والا چراغ تھی اور ابو چاہتے تھے کہ جب یہ چراغ روشنی دینے کے قابل ہو جائے تو اپنے پیشے کو اختیار کرے، اس میں کوئی جھجک محسوس نہ کرے اور گھنگرو کی آواز سے در و دیوار تک لرزہ کریں، جیسا کہ پھوپو نے کیا تھا۔ وہ بھی ایک چراغ روشن تھی، لیکن آخر کو اس چراغ نے بجھنا بھی تو تھا۔

تبھی تو ابو نے مجھے اتنی توجہ دی تاکہ بڑی ہو کر وہ مجھ پر اپنی محبت جتائیں اور میں سر جھکا کر ان کی محبت کے اعتراف میں اپنا سب کچھ لٹا کر محبت کا حق ادا کروں۔ یہ سوچے بغیر کہ ہر درخت بھلا کب پھل دینے کے قابل ہوتا ہے۔

خیر وقت گزرتا گیا اور میں ساتویں جماعت میں آ گئی، اب تو میں خاصی بڑی اور ہوشیار ہو گئی تھی۔ تیرہ، چودہ سال کی عمر میں، میں نے اچھا خاصا قد کاٹھ نکالا تھا اور میں اپنی عمر سے بڑی نظر آنے لگی۔

میں اپنے نام کی طرح تھی بھی سانولی سلونی سی، لیکن جوانی تو جوانی ہوتی ہے۔ یہ تو نام ہی نکھار کی آمد کا ہے، لیکن جب کبھی یہی جوانی اور حسن زندگی کی خوشیاں چھین لے اور جینا دوبھر کر دے تو پھر اپنے وجود سے ہی نفرت ہونے لگتی ہے اور ہر سو چھائی بہار بھی خزاں لگتی ہے۔

میرے مقابلے میں رانی بہت گوری اور خوب صورت تھی۔ اب مجھے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم طوائف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری امی پختون گھرانے کی تھیں اور چوں کہ غریب تھیں اس لیے ابو نے انہیں زبردستی اپنایا تھا۔

پھوپو بھی ناچنے گانے سے شاید تنگ آ چکی تھیں، لہٰذا انہوں نے اپنا گھر بسانے کا سوچا اور اپنی مرضی سے شادی کی۔ ابو نے بہت برا منایا تھا۔ وہ ابھی پھوپو کے ذریعے اور بھی دولت کمانا چاہتے تھے۔ شادی سے ایک دن پہلے وہ پھوپو سے قدرے خفگی سے بولے۔ ”شاداں! دو، تین مہینے اور انتظار کر لو، سلونی کمانے کے قابل ہو جائے پھر ہم دھوم دھام سے تمہاری شادی کریں گے۔“

”نہیں بالے بھیا اور زبردستی نہیں چلے گی، مجھ سے جو ہو سکا وہ کر دیا۔

اتنا پیسا ہاتھ آ جانے کے بعد ابو ”بالے“ سے ”بیدار بخت خان“ بن گیا تھا، لیکن پھوپو اب بھی اسے ”بالے بھیا“ ہی کہا کرتی تھیں۔

”یہ لونئی کار اور گھر کی چابیاں۔“ پھوپو تقریباً اسے ابو کی طرف پھینکتے ہوئے بے پروائی سے بولیں۔

”کار آپ کے لیے تحفہ اور گھر تو میرے نام ہے، لیکن آپ اس میں رہ سکتے ہیں اور ہاں ماننے بھیا کو کچھ پیسے دے کر میں نے اس کا منہ بند کر دیا ہے، اسے کچھ اور دینے کی ضرورت نہیں۔“

”شاداں! تھوڑا سا صبر......“

”بس بالے بھیا“ پھوپو دونوں ہاتھ اٹھا کر حتمی فیصلے سنا رہی تھیں۔

”مجھ سے اور نہیں ہوگا یہ کام، میں نے اتنا کمایا ہے جسے دو تین سال بیٹھ کر آرام سے خرچ کیا جا سکتا ہے اور ویسے بھی بقول آپ کہ دو تین مہینوں ہی کی تو بات ہے، پھر سلونی آپ کی جیب بھاری کر دے گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم جس سے شادی کرنے جا رہی ہو وہ تو شادی شدہ ہے، ہمارا مطلب ہے اس کے تو تین بچے بھی ہیں۔“

”میں جانتی ہوں، لیکن ایک ناچنے، گانے والی کو کون سہارا دے سکتا ہے۔ اب کنوارا لڑکا تو مجھے کبھی قبول ہی نہیں کرے گا۔ وہ شادی شدہ جیسا بھی ہے مجھے چاہتا ہے، کم از کم وہ مجھے عزت سے جینے تو دے گا۔“

پھوپو کی شادی کے بعد ہم الگ الگ گھر منتقل ہو گئے۔ ابو کو افسوس تو ہوا کہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی، لیکن پھر بھی مطمئن تھے کہ چلو اب دوسری چڑیا بھی جوان ہو گئی ہے۔

میں اکثر امی، ابو کو چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھتی، لیکن جب کبھی میں ان کے سامنے سے گزرتی تو وہ دونوں چپ ہو جاتے۔ مجھے ہر وقت ایک انجانے سے خوف کا خدشہ لگا رہتا تھا اور ایک دن یہی خدشہ حقیقت میں بدل کر سامنے آیا۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک رات میں سوئی ہوئی تھی کہ اچانک آنکھ کھلی۔ اچانک آنکھ کھلنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ مجھے آنے والے طوفان کا الہام سا ہو گیا

تھا۔ مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی، لیکن میں اتنی بدحواس تھی کہ کمرے میں رکھے پانی کے جگ کو بھی نہ دیکھ سکی اور پانی پینے کچن میں چلی گئی۔ واپسی پر ابو کے کمرے کے نزدیک سے گزرتے ہوئے مجھے دھیمی دھیمی باتوں کی آواز میں، میں نے اپنا نام سنا تو نا چاہتے ہوئے بھی وہاں رک گئی۔ ابو کہہ رہے تھے۔

”سلونی اب جوان ہو گئی ہے۔ اب وہ بھی کچھ کما کر لائے اور ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنے۔“

”کیا کہہ رہے ہو بیدار بخت خان؟ خدا کے لیے اپنی بیٹی کے بارے میں ایسا مت سوچو، بچے کیا کہیں گے۔“ امی بے زاری سے بولیں۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے تاج بیگم! سلونی کے جوان ہونے تک ہم نے کتنا انتظار کیا ہے، کیا کیا سوچا ہے ہم نے۔ اب جلد ہی ہمارا خواب پورا ہونے والا ہے۔“

مجھ میں تو اور سننے کی طاقت نہیں تھی۔ مجھ پر ایک لرزہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی، اگر میں دیوار کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر پڑتی۔

پتا نہیں ابو مجھے کہاں بھیجیں گے، میں کبھی پھوپو کی طرح نہیں ناچوں گی، میں تو پڑھنا چاہتی ہوں۔ یہی سوچتے ہوئے روتے روتے نجانے کب میں نیند کی وادی میں چلی گئی۔

صبح امی کی آواز پر آنکھ کھلی۔

”اٹھو سلونی بیٹا، چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ کیا اسکول نہیں جانا، دیر ہو جائے گی بیٹا اٹھو شاباش۔“ یہ کہتے ہوئے امی حسب معمول قریب آ کر سر سہلانے لگیں تو چونک گئیں۔

”ارے تمہیں تو سخت بخار ہے، چلو آج چھٹی کر لو اسکول سے تاکہ تمہیں ڈاکٹر کو دکھاؤں۔“

”امی!“

”میں صدقے جاؤں۔“ امی میری سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بے قراری سے بولیں۔

”امی! ابو کل رات آپ سے میرے بارے میں کیا کہہ رہے تھے۔ انہیں سمجھائیے امی، میں کبھی پھوپو کی طرح کام نہیں کروں گی۔ میں نے آپ لوگوں کی باتیں سن لی ہیں۔“ میں بے اختیار رونے لگی۔

”نہیں بیٹا رو نا مت، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہارے ابو کو کبھی ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“ امی نے گلے لگاتے ہوئے تسلی دی تو مجھے کچھ سکون ملا۔

اسکول جانے کا وقت تھا اس لیے فرح ہمارے گھر آئی، ہم دونوں اکٹھے اسکول آتے جاتے، پڑوس کی عورتوں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ سلونی کے ساتھ میل جول مت بڑھاؤ، لیکن اس نے کسی کی بات کی پروا نہ کی۔ فرح کو میں نے سر درد کا بہانہ کیا۔

دوسرے دن اسکول میں اس نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

”کیا بات ہے سلونی، کل تم اسکول کیوں نہیں آئی تھیں۔“

”فرح مجھے جس بات کا ڈر تھا، وہی ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، تم ہی کچھ بتاؤ فرح۔“ میں ایک دم رونے لگی۔

”ارے سلونی تم تو رو رہی ہو، بزدل لڑکی! میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھ رہی تھی، پلیز خدا پر بھروسا رکھو، تم تو ابھی سے حوصلہ ہار رہی ہو۔ اگر تمہارا یہی حال رہا تو تمہاری بہنیں کیا کریں گی، پھر وہ بھی اس عذاب کی بھینٹ چڑھ جائیں گی اور اگر تم ثابت قدم رہیں اور اپنے ابو کی بات نہ مانی تو پھر تمہاری بہنیں بھی تمہاری ہمت کو دیکھ کر اپنا دفاع کر سکیں گی۔ تمہیں تو لڑنا ہے دوست، اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے۔“

”فرح دنیا کے سارے باپ تو ایسے نہیں ہوتے، باپ تو بیٹیوں کو اپنی عزت سمجھتے ہیں، پھر میرے ابو میرے ساتھ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں، کیا میں ان کی بیٹی نہیں ہوں اس سے تو بہتر تھا کہ میں پیدا ہوتے ہی مر جاتی، یوں ذلت کی زندگی گزارنے سے تو بچ جاتی۔“

”سلونی مایوسی کفر ہے۔ تمہیں ہر حال میں حوصلے سے کام لینا ہے۔ میں نے کہا نا کہ خدا پر بھروسا رکھو، اس کے فیصلے کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔ تم ابھی سے گھر میں کوئی ہنگامہ نہ کرنا ورنہ وقت سے پہلے وہ کچھ ہو جائے گا جو ابھی وہ نہیں کرنا چاہتے۔ تم سب کچھ خدا پر چھوڑ دو اور وقت کا انتظار کر لو، خدا جانے کب کیا ہو جائے۔ ٹھیک ہے نا پیاری دوست؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو فرح نے

کہا۔ ”یہ ہوئی نا بات، گڈ گرل، چلو کلاس میں چلتے ہیں۔“

دو تین دن اسی اضطراب میں گزر گئے کہ نجانے کب ابو اپنا فیصلہ سنا ئیں۔ ان تین دنوں میں، میں نے ابو کا سامنا بہت کم کیا، وہ جب بھی سامنے آتے تو خوف کے مارے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتیں۔ آخر کار ابو کے فیصلے کا وقت آن پہنچا۔ میں کمرے میں بیٹھی اسٹڈی کر رہی تھی کہ میرا سب سے چھوٹا بھائی شان آیا۔

”آپی! آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔“

”اب...... بو...... مم...... مجھے۔“

”ہاں آپی آپ کو۔ اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟“

”ادھر آؤ شان وہ کیا کہہ رہے ہیں مجھے، تمہیں کیا کہا ابو نے؟“

”آپی مجھے کیا پتا خود جا کر پوچھ لو کیا کہنا چاہتے ہیں وہ، میں تو چلا۔“

میں سمجھ گئی تھی کہ وقت آ پہنچا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ابو گرج برس کر اپنا فیصلہ سنا ئیں گے لیکن اس کے برعکس ابو نے مجھے پیار سے بلا کر اپنے ساتھ بٹھایا۔ ابو قدرے نرمی سے سب کچھ بتا رہے تھے۔

”سلونی بیٹا! تم ہماری سب سے اچھی اور پیاری بیٹیا ہو، ہم نے تمہیں بہت ناز و نعم سے پالا تاکہ تم ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنو، تم ہماری بڑی اولاد بھی ہو، اب تم ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہو، ہوشیار ہو، ہر بات سمجھ سکتی ہو، دیکھ تمہاری پھوپو ہم سے بغاوت کر گئی، اپنی مرضی سے شادی کی، ورنہ آج وہ لاکھوں کی مالک ہوتی۔ خیر ہم نے بھی اسے بتایا تھا کہ تم تو چلی گئی، لیکن ہماری بیٹیا ہمارا ہر خواب پورا کرے گی۔ دیکھ بیٹا اس دنیا میں پیسا ہی سب کچھ ہے، تم جانتی ہو گھر کے اخراجات بھی بڑھ رہے ہیں، مہنگائی بھی ہے۔ اب تمہارا بوڑھا باپ کہاں کہاں کے دھکے کھائے گا۔ شان بھی چھوٹا ہے، بڑا بیٹا ہوتا تو شاید ہم تم سے نہ کہتے۔ ہو سکتا ہے تمہاری ماں نے تمہیں الٹی سیدھی باتوں سے ورغلایا ہو، لیکن اس کی باتوں میں مت آنا وہ گنوار ان باتوں کو نہیں سمجھتی۔ ہمیں امید ہے تم ہمیں مایوس نہیں کرو گی۔ ہے نا بیٹیا جانی؟“ اور میں جو اتنی دیر سے خاموش و پریشان بیٹھی ابو کی باتیں سن رہی تھی، دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

”ابو میرے ساتھ ایسا ظلم مت کریں۔ میں پڑھ کر استانی بنوں گی۔ آپ کی، آپ کی ہر ایک خواہش کو پورا کروں گی، لیکن پلیز ابو...... مم...... میں کبھی یہ کام نہیں کر سکوں گی۔“

ابو ایک دم بھڑک اٹھے۔

”چپ کر و خبیث کی اولاد۔ ہم نے تیری پرورش میں کوئی کمی نہیں کی۔ تیری ہر ایک ضرورت پوری کی اور آج جب ہمیں تیری ضرورت پڑ رہی ہے تو، تُو انکار کر رہی ہے۔ یہ ضرور تیری اس گستاخ ماں کی چاپلوسی ہو گی۔“

وہ سختی سے میرے بال پکڑ کر بولے۔

”دیکھ سلونی شرافت سے ہماری بات مان، ورنہ تیرا وہ حشر کروں گا کہ تُو یاد رکھے گی۔“

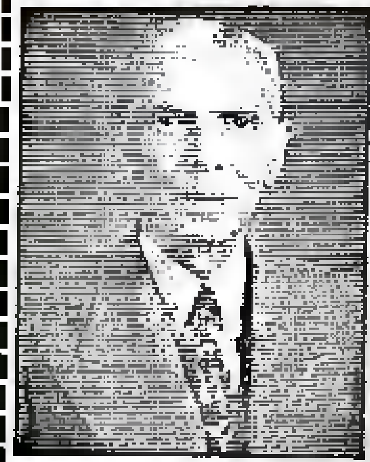
پھر تو ابو کا معمول بن گیا، وہ ہر روز مجھے کبھی جان سے مارنے کی دھمکی دیتے تو کبھی پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتے، لیکن میں کسی طرح بھی ماننے والی نہیں تھی۔ میری پڑھائی بھی ان حالات اور ٹینشن کی وجہ سے متاثر ہو گئی۔ میں ہر دوسرے، تیسرے دن اسکول سے چھٹی کر لیتی۔ اب تو تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا۔ ابو نے اسکول جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ فرح کو میں ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتی، لیکن آج تو وہ اکیلے اسکول جانے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

”سلونی پلیز اور کتنی چھٹیاں کرو گی۔ مس تمہارا نام خارج کرنا چاہتی ہے۔ امتحانات قریب ہیں، اب اسکول چلو پلیز۔“

”میں کیا کروں فرح، ابو نہیں مان رہے، ابو جنون کی حد تک خود غرض اور لالچی ہوں گے، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مجھے تو انہیں باپ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، خدا اس گھر میں بہن، بیٹی پیدا نہ کرے جہاں میرے باپ جیسا باپ رہتا ہو۔“

”تم فکر نہ کرو سلونی، میں تمہارے ابو سے بات کروں گی۔ ویسے بھی تم کہتی ہو کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنا دوسرا روپ ظاہر نہیں کرتے۔“

قائداعظم کا تدبر



ہمارے پہلے گورنر جنرل نے عہدہ سنبھالتے ہی ایک ایسا بڑا اقدام کیا جس سے سب حیران رہ گئے اور جس گتھی کو انگریز اپنے صد سالہ دورِ حکومت میں کبھی سلجھا نہ سکے تھے، اسے قائداعظم نے وزیرستان سے فوج ہٹا کر جہاں انگریز کروڑہا روپیہ خرچ کر کے زیادہ تر اپنے وقار اور بعد میں ہندوستان کے دفاع اور آزاد پٹھانوں کی سرکوبی کے لیے فوجیں رکھتے تھے، مسئلہ کو حل کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کی آزاد قبائلیوں کے ساتھ رات دن جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن انگریز انہیں کبھی مغلوب نہ کر سکے۔ بسا اوقات انگریز اپنی بے بسی کے پیشِ نظر خطیر رقومات ادا کر کے اپنی عورتوں اور افسروں کو رہا کراتے جنہیں پٹھان اُن چھاؤنیوں سے جہاں چڑیا تک پر نہیں مار سکتی تھی، اغوا کر کے لے جاتے گرفتاری کے بعد وہ ان قیدیوں کی روایتی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور بعد میں زرِ کثیر وصول کر کے ان کو رہا کر دیتے۔ ہمارے قائداعظم نے افواج کو واپس بلواتے ہوئے آزاد قبائل کے لوگوں سے کہا کہ بحیثیت مسلمان تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے ملک پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کرو۔ دیکھیے کس خوب صورتی سے غیور پٹھانوں کو یہ جتلایا گیا کہ اب اس نئے ملک کے تم مالک ہو اور انگریز حاکم جو غاصب تھا دستبردار ہو گیا ہے اور اب اس ملک کی حفاظت کی ذمے داری تمہاری ہے۔ اسلامی رواداری اخوت اور تدبر کا یہ ایسا شاہکار تھا کہ امن و امان فوراً قائم ہو گیا۔ سرحدوں کی خود بخود حفاظت ہو گئی اور آزاد قبائلیوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔ مزید برآں پاکستان مستقل زیرباری سے بچ گیا۔

”ہاں یہ تو ہے، ان کے تو دو روپ ہیں۔ کتنا عجیب انسان ہے۔ شرافت کا لبادہ اوڑھ کر وہ لوگوں کو کتنی آسانی سے فریب دیتا رہتا ہے جیسے دنیا میں اس جیسا شریف کوئی اور ہے ہی نہیں۔“

”ہاں یار، یہ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔“

ابو مان تو گئے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ امتحان دو اور پھر دوسرے امتحان کی تیاری کرو۔

میں نے امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ میں اپنے ہاتھ میں پرائز (کپ) تھامے بڑے خوشی سے گھر آ رہی تھی، گھر میں داخل ہوئی تو سب کچھ اپنا منتظر پایا۔ امی کے علاوہ کسی نے بھی مجھے مبارکباد نہیں دی۔ ابو نے میرے ہاتھ سے کپ چھین کر ایک طرف پھینک دیا اور غصے سے کہا۔

”بس بہت ہو چکا۔ اب ہم سے اور برداشت نہیں ہوتا۔ رانی کو دیکھ آج پورے پچاس ہزار کما کر لائی ہے۔ کمبخت تیری ہی عمر کی تو وہ بھی ہے، اب یہ رونے دھونے کے ناٹک بند کر دو۔“

ان دنوں پھوپو بھی آئی ہوئی تھیں، وہ بھی ابو کی حمایت کرنے لگیں۔

”ہاں بالے بھیا یہ پڑھ کر کیا کر لے گی، مجھے تو پڑھنے نہیں دیا۔ اب اس سے بھی تھوڑا کام چلاؤ۔ خوامخواہ بیکار بیٹھی ہے۔“

مجھ میں نجانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی، غصے سے سرخ ہو گئی تھی، بُرے انجام کی پروا کیے بغیر میں پھوپو سے مخاطب ہوئی۔

”پھوپو میں آپ کی طرح ذلت کی زندگی نہیں گزاروں گی، میں عزت سے جینا چاہتی ہوں، پڑھ کر استانی۔“ یہ سنتے ہی ابو نے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا، شدتِ درد سے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”کمبخت! دو، تین جماعتیں کیا پڑھ لی کہ مستقبل کی فکر شروع کر دی، تو کون ہوتی ہے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے والی۔ ہم نے تجھے اتنی محبت دی، تیری تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، آج اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے۔ ہم تیری اس دراز زبان کو کاٹ ڈالیں گے۔ اس زمین میں تجھے زندہ گاڑ دیں گے، کتیا......“

”مار ڈالیں مجھے...... یوں ذلت کی زندگی گزارنے

سے تو بہتر ہے میں سکون کی موت مر جاؤں۔"

اور ابو واقعی کمرے میں چلے گئے اور پستول نکال لی۔ یہ دیکھتے ہی سب گھر والے زار و قطار رونے لگے اور ابو کی منتیں کرنے لگے۔ اس لمحے پڑوس کی عورتیں بھی ہمارے گھر آ گئیں۔ یقیناً انہوں نے رونے کی آوازیں سنی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی ابو جلدی سے کمرے میں چلے گئے، کیوں کہ وہ تو دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو بہت شریف اور غیرت مند سمجھتے تھے۔ پڑوس کی عورتیں بھی واقف تھیں کہ یہ کس بات پر جھگڑا چل رہا ہے اس لیے دادی سے دو تین پوچھ گچھ کے بعد اپنی گھروں کو چل دیں۔

ابو کمرے سے نکلے تو گرج دار آواز میں کہا۔

"اس کمینی کو سمجھا لے، ورنہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھولے گی۔"

ابو باہر چلے گئے تو پھوپو سمجھانے لگیں۔

"دیکھ سلونی! ابو کی بات مان! اس میں تیرا ہی فائدہ ہے۔ نا تو مجھے بتا تو موت سے نہیں ڈرتی؟ بے وقوف لڑکی وہ تمہیں جان سے مار دیں گے۔ قسم سے مجھے تو ایک مرتبہ ہی کہا گیا تھا اور میں راضی ہو گئی اور پھر یہ سارے خاندان والے بھی تو یہی کام کر رہے ہیں۔ تو پہلی لڑکی ہے جو اس طرح نخرے کر رہی ہے۔ ریشماں اور رانی کو دیکھ وہ......"

"بس کریں پھوپو، میں آپ لوگوں کی طرح بے ضمیر نہیں ہوں۔ مجھے اپنی زندگی پر پورا حق حاصل ہے، میں اپنی مرضی سے جینا چاہتی ہوں اور آپ کو میرے بارے میں سوچنے کا کوئی حق نہیں۔ کیا بُرا ہے اور کیا بہتر...... یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اب میں کوئی بچی نہیں ہوں۔" میں بے خوفی سے بولی۔

"آہ ہاں، میں کوئی بچی نہیں ہوں۔" پھوپو نے میرے الفاظ میرے لہجے میں دہرائے۔

"تو اتنی بڑی بھی نہیں ہے سلونی بٹیا۔ جتنا تم خود کو سمجھ رہی ہے، یہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کہاں سے سیکھیں؟ طوائف خاندان میں پلی بڑھی اور حق کی بات کر رہی ہو؟ اے لڑکی! یہاں کسی بھی لڑکی کو اپنی زندگی پر کوئی حق حاصل نہیں۔ یہاں جو بڑے کہتے ہیں وہی ہوتا ہے، چاہے وہ صحیح ہو یا غلط۔"

اس لمحے دادی نے میری طرف داری کی۔

"لعنت ہو تم پر۔ اگر تم نے اپنے لیے کوئی آواز نہیں اٹھائی تو کم از کم اس کو اس عذاب سے تو بچا سکتی ہو۔"

"میں کیوں بچاؤں اس کو، جب مجھے بچانے کے لیے کوئی نہ تھا، اماں تم بھی تو اس وقت موجود تھیں اور بھیا کی طرف داری کر رہی تھیں۔ مجھ پر تو ذرا بھی ترس نہیں آیا تم لوگوں کو اور اب اس لڑکی کو بچانے کے لیے ہر کوئی تیار ہے۔"

"اپنے اپنے نصیب کی بات ہے، تمہاری قسمت میں جو لکھا تھا وہ تجھے مل گیا۔"

'بھاڑ میں گئے ایسے نصیب۔" پھوپو نفرت سے بولیں۔ ابو کی دن رات دھمکیوں اور مارنے مجھے بے حد نڈھال کر دیا۔ کالج جانے پر پابندی تھی۔ پابندی کی بھی بس مکمل چھوڑ دیا تھا اس لیے جہاں کہیں کمرے میں بیٹھی تو بیٹھی رہتی اور سوتی تو سوتی رہتی۔ سر میں ہر وقت درد لگا رہتا اور کبھی کبھی بخار بھی۔ امی بہت پریشان تھیں، وہ ابو سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ سلونی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔

ایک دن جب مجھے سخت بخار تھا اور کھانسی بھی شدید تھی امی میرے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی تو ابو نے دیکھ لیا۔

"کیا ہوا اسے؟" ابو اپنے مخصوص انداز میں بولے جس سے غصہ اور نفرت ٹپک رہی تھی۔

"پتا نہیں اس کا بخار کیوں نہیں اُتر رہا، کھانسی بھی کر رہی ہے۔"

ابو میرے قریب آئے تو چونک گئے اور گھبرا بھی گئے، کیوں کہ اتنے دنوں بعد اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا۔

"یہ تمہاری رنگت کو کیا ہو گیا ہے، یہ...... یہ تو بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔ چلو جلدی سے اٹھو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔"

یہ ابو کے دل میں میرے لیے محبت تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔ بہرحال وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے ٹیسٹ کروائے تو پتا چلا کہ مجھے ٹی بی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب ہماری بیٹی کا جلدی سے علاج کروائیے، پیسوں کی فکر مت کریں، بس اسے جلدی صحت یاب کر دیں۔"

گھر آ کر ابو نے ناقابل یقین باتیں کہیں۔

"سلونی بیٹا ہمیں معاف کر دے، ہم نے تم کو دکھ دیا، آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے، تمہارے ساتھ۔ تم بس وقت پر دوائیاں لینا اور دیکھو ساری باتیں بھول جاؤ۔ زیادہ ٹینشن تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔"

"ابو آپ۔"

"بس بیٹا کوئی سوال نہ کرنا، ہمیں احساس ہو گیا ہے اپنی غلطی کا۔"

میرا برابر علاج ہوتا رہا۔ اب تو مجھے کوئی ٹینشن بھی نہیں تھی۔ اس لیے میں بہت جلدی صحت یاب ہو گئی۔ دن رات کی طعنوں، دھمکیوں اور مارنے مجھے جس قدر نڈھال اور کمزور بنایا تھا اور جس قدر پریشانی دی تھی وہ ابو کی ایک بات سے ہی ختم ہو گئی۔ اب میں پہلے سے بھی زیادہ پرکشش اور حسین نظر آنے لگی۔

☆......☆

ایک شام ابو گاڑی لے کر آئے اور کہا "سلونی چلو تجھے تیرے چچا کے گھر چھوڑ آؤں، رانی بھی تجھے یاد کر رہی ہے۔"

مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ میں جلدی جلدی تیاری ہو گئی۔ چھوٹی بہن نے جانے کی ضد کی، لیکن ابو نے اسے ڈانٹا، وہ بے چاری خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں گاڑی میں بیٹھ تو گئی، لیکن دل میں طرح طرح کے وسوسوں نے جنم لیا۔ کہیں ابو مجھے مجرے میں تو نہیں لے جا رہے ہیں...... نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے آپ کو گھر کا۔ ابو تو اب بہت اچھے بن گئے ہیں۔ انہیں اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہوا ہے، وہ تو اب مجھ پر کوئی ظلم نہیں کریں گے۔

میں یہی سوچ رہی تھی کہ ابو نے گاڑی کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔

میں نے جلدی سے کہا۔

"ابو ہم کہاں جا رہے ہیں...... چچا کا گھر تو پیچھے رہ گیا۔" وہ کچھ نہیں بولے اور بدستور مسکرا رہے تھے۔ ابو کے اس فاتحانہ مسکراہٹ سے مجھے اندازہ تو ہوا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں لیکن پھر بھی میں سمجھی میں غلط سوچ رہی ہوں۔ اس لیے دوبارہ ابو سے پوچھا۔

"ابو ہم کہاں جا رہے ہیں؟ بتایئے نا ابو۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"آج اپنی بٹیا کو ہم ایک خوب صورت جگہ لے جانا چاہتے ہیں۔ بس تم آرام سے بیٹھ کر دیکھتی رہو۔"

ابو نے گاڑی ایک بڑی کوٹھی کی قریب روک لی۔ اندر داخل ہوتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ یہ کوٹھی مردوں سے بھری پڑی تھی، خاصے امیر اور عیاش لوگ لگ رہے تھے، جو ہاتھوں میں شراب کی بوتل لیے قہقہے لگا رہے تھے۔ تیز موسیقی چل رہی تھی۔ چرس اور سگریٹ کی بُو سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے روتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"ابو......؟"

"چپ! ابو نے آنکھیں نکال کر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں یہ سب درندے دیکھ رہی ہوتا...... اگر ان سے بچنا چاہتی ہے تو وہاں جا کر خاموشی سے بیٹھ۔ رانی کو غور سے دیکھ کہ وہ کس طرح مردوں کی توجہ اپنی طرف دلاتی ہے۔ اگلے دن تمہاری باری، یہ کہہ کر وہ نجانے کہاں غائب ہو گئے۔ میں اکیلے اتنی گھبرا رہی تھی کہ سخت سردی کے باوجود بھی ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ میں نے ان مجروں وغیرہ کے بارے میں پھوپو سے سنا بہت تھا، لیکن اسے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے پہلی بار مردوں کا اتنا ہجوم دیکھا تھا۔ اس کوٹھی میں زن نام کی کوئی چیز تھی تو وہ میں اور رانی تھیں۔ ان جنگلی جانوروں کے سامنے ہماری حیثیت اس بے بس چڑیا کی سی تھی جو اڑنا تو دور کی بات ہے ان کے مرضی کے بغیر ہل بھی نہیں سکتی تھی۔

میرے خدایا! پھوپو ان سارے مردوں کے سامنے ناچتی تھیں؟ کیا پھوپو اتنے مضبوط دل کی مالک تھیں؟ ایسے ان درندوں سے بھی خوف نہیں محسوس ہو رہا ہوتا، تبھی تو وہ اتنی خوشی سے سنگھار کر کے یہاں آتی تھیں۔ کیا میں بھی اس کی طرح ایک دن یہاں......؟ اس سے آگے سوچنا میرے لیے محال تھا۔

''نہیں نہیں...... خدا نہ کرے۔ میں زہر کھا کر زندگی کا خاتمہ کرلوں گی، لیکن ابو کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں کروں گی۔ اگر وہ مجھے یہاں سے جانے ہی نہ دے تو پھر...... پھر میں کیا کرسکوں گی، کیسے بچاؤں گی ان درندوں سے اپنے آپ کو......؟ میرے خدایا کیا کروں میں۔''

اچانک میرے کانوں میں فرح کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''دوست تمہیں تو لڑنا ہے، اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے۔'' اس جملے نے کچھ وقت کے لیے مجھ میں ایک نئی طاقت پیدا کردی، لیکن جیسے ہی میں گیٹ کے قریب پہنچی تو اس کو ایک بڑا تالا لگا تھا۔ قریب ہی چوکیدار بھی کھڑا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں اور کھلے گریبان والا چوکیدار شکل سے ہی غنڈہ لگ رہا تھا۔

میں کچھ دیر امداد طلب نظروں سے اسے دیکھتی رہی، پھر وہ مسکرا کر قریب آیا اور کہا۔ ''کیوں بالی، باہر جانے کا ارادہ ہے کیا۔ یہ تو صبح سے پہلے کھل ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر تمہیں اس ہجوم میں رات گزارنا پسند نہیں اور نیند آرہی ہے تو آؤ ہم تمہیں اوپر لے جاتا ہے۔ وہاں مکمل خاموشی ہے، آجا بالی ڈرنا نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چھوڑو میرا ہاتھ، مم...... میرا ہاتھ چھوڑ دو، تمہیں خدا کا واسطہ، ورنہ میں چلاؤں گی۔ کوئی ہے...... بچاؤ۔''

''ارے بالی اس نقار خانے میں طوطے کی آواز کون سنتا ہے۔ چل شاباش...... ہم تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔''

اس سے پہلے کہ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اوپر لے جاتا، میری نظر اس کے ڈنڈے پر پڑی جو اس نے گیٹ کے قریب احتیاطاً رکھا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ اٹھایا اور ایک ہاتھ میں جتنی طاقت ہوسکتی ہے وہ استعمال میں لاکر زور سے اس کے سر پر دے مارا، وہ درد سے کراہ اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر تھام لیا۔ میں جلدی سے اپنی جگہ آکر بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

''اے خدا مجھ پر رحم فرما، مجھے ان درندوں سے بچا، بے شک تو ہی عزت دینے والا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد رانی چہکتی ہوئی میرے پاس آئی۔ وہ بلا کی خوب صورت لگ رہی تھی، مسکرا کر کہنے لگی۔

''آداب سلونی جی...... آداب!'' وہ طوائفوں کے سے انداز میں بولی۔ ''کیوں سلونی آخر آہی گئی نا، بہت غرور کررہی تھی تو اپنے آپ پر، آج تیرا غرور خاک میں مل گیا۔ بڑی آئی استانی بننے۔'' وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے بولی۔

''خیر اب تو ہم دوست ہیں، پڑھنے میں کیا رکھا ہے یار۔ یہاں ہم تھوڑا ہی ناچتے ہیں، بلکہ دوسروں کو اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں...... تو آج دیکھ ہم کتنا روپیہ کماتی ہیں۔'' میں بے بسی سے اسے دیکھتی رہی۔

رانی کی اداؤں پر ہر ایک مرد دل کھول کر اپنا پیسا لٹا رہا تھا۔ وہ تھی بھی اتنی خوب صورت کہ ہر ایک مرد والہانہ طریقے سے اس پر پیسے لٹانا فخر سمجھتے تھے۔ ابو اور چچا پیسوں کو تھیلے میں بھر بھر کر ایک طرف رکھ دیتے۔ میں نے ساری رات روتے ہوئی گزاری۔ فجر کی اذان ہوئی تو سب لوگ جانے لگے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ابو نے کہا۔

''کہو سلونی کیسا لگا پروگرام، کتنا زبردست تھا، ہے نا! تمہیں پسند آیا؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور روتی رہی۔ گھر پہنچی تو امی نے بھی رو رو کر بُرا حال کیا تھا۔ امی کو دیکھتے ہی میں ان کے قدموں میں گری اور بے ہوش ہوگئی۔

دوپہر کو جب مجھے ہوش آیا تو ابو کے علاوہ سب گھر والے کھڑے رو رہے تھے۔ امی نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

''کیا ہوا سلونی مجھے بتا، تم کہاں تھیں ساری رات، تمہیں کچھ ہوا تو نہیں۔'' امی نے ایک ہی سانس میں سارے سوالات کر ڈالے۔

''امی ابھی کچھ نہیں ہوا، لیکن بہت کچھ ہوجائے گا، بہت کچھ۔ مجھے بچالیں امی، خدا کے لیے مجھے بچالیں۔ میں مرجاؤں گی، لیکن یہ کام کبھی نہیں کرسکوں گی۔'' میں نے رو رو کر رات والا احوال بتایا۔

ابو اس وقت گھر سے باہر تھے۔ امی نے دادی کے کہنے پر جلدی جلدی کپڑے سنبھالے اور ہم ماموں کے گھر آگئے۔

ابو کو پتا چلا تو آگ بگولہ ہوئے، لیکن پھر نجانے کیا سوچ کر خاموش ہوگئے۔ شاید یہ سوچ کر کہ ماموں غریب تھا اور وہ ہمیں زیادہ وقت اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا تھا، لیکن جب ہمیں ماموں کے گھر رہتے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا تو انہیں فکر لاحق ہوگئی۔ وہ بھلا ہمیں اتنی آسانی سے کب چھوڑنے والے تھے۔ اس لیے ماموں کے گھر آکر ان کی منتیں کرنے لگے کہ مجھے معاف کردیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ سلونی پر کوئی ظلم نہیں کروں گا اور نہ اسے غلط کاموں کے لیے مجبور کروں گا۔ آخرکار جرگے ہوئے اور ہم اس شرط پر گھر آگئے کہ وہ دوبارہ ہم پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔

دو تین ہفتے تو آرام سے گزر گئے، لیکن پھر ابو نے دوسری شادی کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ امی نے بخوشی اجازت دے دی کہ چلو اس طرح تو میری بیٹیاں اس کے ظلم و ستم سے بچ جائیں گی۔

ابو نے ایک بیوہ طوائف سے شادی کی۔ نئی امی تین بیٹیوں کو چھوڑ کر ہمارے گھر آگئیں۔ اب نئی امی بھی ابو کو میرے بارے میں اُکسانی تھی کہ تم اکیلے کیا کیا کرتے پھرو گے۔ کب تک ان سب کا بوجھ برداشت کرو گے، اب سلونی سے کام چلاؤ۔

''ٹھیک کہتی ہو تم، لیکن میں نے سب کو اسکول سے بھی اٹھوا دیا ہے اور یہ مجھ سے کسی چیز کی فرمائش بھی نہیں کرتے، تو پھر میں کیوں کر اسے بوجھ کی بات کہہ سکتا ہوں؟''

''ہائے ہائے بیدار بخت خان تیری عقل کو کیا ہوا ہے۔ لگتا ہے تم بوڑھے ہوگئے ہو۔ ارے میں کہتی ہوں یہ چھ افراد کچھ کھاتے پیتے نہیں، کیا انہیں بھوک نہیں لگتی، تم روزانہ تھیلیاں بھر بھر جو سبزیاں لاتے ہو وہ کہاں جاتی ہیں۔ یہی لوگ ہی اسے ہڑپ کر کھا جاتے ہیں۔ ارے کچھ کرو وقت گزر گیا تو پھر ہاتھ ملتے رہو گے۔ ہم تو بھوکے مرجائیں گے۔'' نئی امی قدرے خفگی سے بولی۔

''بات تو تیری دل کو لگی، ویسے اب تو ہم دوسری کے بارے میں سوچ رہا ہوں، بلو بھی اب جوان ہوگئی ہے۔''

''دوسری کو بعد میں دیکھا جائے گا، پہلے، 'پہلی' سے نمٹو۔''

ابو کے جذبات پھر سے جوش مار گئے اور پستول نکال کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''سلونی آج میں حتمی فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لو گھنگرو، پہن لو اسے اور چلنے کی تیاری کرو، ورنہ آج ہم تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے۔'' وہ میری طرف گھنگرو پھینکتے ہوئے بولے۔ میں حیران و پریشان کبھی انہیں اور کبھی گھنگروؤں کو دیکھ رہی تھی۔

''لیکن ابو آپ نے تو وعدے......''

''ہاں وعدہ کیا تھا ہم نے۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولے۔ ''لیکن اب میں گھر کے اخراجات پورا نہیں کرسکتا۔ گاڑی اور جتنے پیسے تھے وہ تو ہم نے اپنی شادی پر لگادیے۔ اب میں اکیلا کیا کیا کرتا پھر دں۔'' اس سے میرا چھوٹا بھائی شان بیچ میں آگیا اور روتے روتے کہنے لگا۔

''ابو آپ کی وجہ سے ہم نے اسکول چھوڑ دیا، کپڑوں اور جوتوں کا مطالبہ کرنا چھوڑ دیا۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں لوگوں کی گاڑیاں صاف کروں گا، جوتے پالش کروں گا، لیکن آپ کے لیے پیسے لاؤں گا۔ پلیز ابو آپی پر اور ظلم مت کرنا، آپی کو مت مارنا۔''

امی بھی بول پڑی۔ ''ہاں بیدار بخت خان میں لوگوں کے گھروں میں کام کروں گی اور ان بچوں کا پیٹ پال لوں گی۔ آپ سے ہم کچھ بھی نہیں مانگیں گے لیکن خدا کے لیے۔''

''خاموش ہوجاؤ گستاخ۔ ان بچوں کو تو ہی سب باتیں سکھاتی ہے، تیری ہی وجہ سے آج یہ سب میرے سامنے کھڑے ہیں۔ تیرا تو آج میں کام ہی تمام کردوں گا۔ تو ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔''

''کرلے میرا کام تمام اور ان بچوں کا بھی، تنگ آگئے ہیں ہم ایسی زندگی سے یوں گھٹ گھٹ کر جینے سے تو بہتر ہے ہم ایک بار ہی مرجائیں۔ تیرا کلیجہ اگر اس طریقے سے ٹھنڈا ہوتا ہے تو کرلے ہم سب کا کام تمام۔ تجھ میں ویسے بھی شرم نام کی کوئی چیز نہیں۔ اپنی بیٹی کو گندگی میں ڈال کر تم اپنے آپ کو باپ سمجھتے ہو؟ لعنت ہو ایسے باپوں پر جو اپنی بیٹیوں کی بربادی پر اپنے خواہشات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر تجھے اتنا شوق ہے تو اپنی طوائف

بیوی کو محفلوں میں لے جاؤ وہ تو ویسے بھی عادی ہے۔ تو نے میرے صبر کا پیمانہ لبریز کیا ہے بیدار بخت خان۔ خبردار جو میری بیٹی کو اب اور کچھ کہا۔"

یہ پہلا موقع تھا جب امی نے ابو سے اس لہجے میں بات کی تھی، ورنہ وہ تو ابو سے اتنی ڈرتی تھیں کہ ان کے سامنے سانس لینا بھی بھول جاتیں۔

یہ سنتے ہی ابو پہلے حیرانگی سے امی کو دیکھتے رہے اور پھر ان پر لاتوں کی بوچھاڑ شروع کر دی اور امی کو بھی اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئیں۔

"کمینی مجھے کہتی ہے اپنی بیوی کو محفل میں لے جا؟ وہ عزت ہے میری۔ خبردار جو اس کے بارے میں کوئی بات کی۔ زبان کاٹ ڈالوں گا تیری کتیا۔"

ابو کی نظر میں بیوی تو عزت کی حق دار ہوتی ہے، جبکہ بیٹی اور بہن کو تو وہ جانور سمجھتے ہیں۔ بیٹی یا بہن کی عزت باقی رہے یا نہ رہے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پھر وہ میرے ماتھے پر پستول رکھ کر غصے سے بولے۔ "سلونی! میں چاہوں تو ابھی پستول کی ایک گولی سے تمہیں اڑا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں، لیکن اتنی آسانی سے نہیں کتیا۔ تم نے بہت تڑپایا ہے، میں تمہیں تڑپا تڑپا کر ماردوں گا۔ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تو خود ہی موت کی بھیک مانگے گی، لیکن میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ میں تم پر تیزاب پھینکوا دوں گا۔ یاد رکھنا سلونی۔" یہ کہتے ہی وہ غصے سے پیر پٹختا ہوا باہر نکلا۔

میں اور میرے چھوٹے بہن بھائی رو رو کر امی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ امی کو ہوش آیا تو دادی نے کہا۔

"بہو تو فکر مت کر، سلونی کو کچھ نہیں ہوگا۔ تو ایسا کر اپنی بہن کو فون کر کہ وہ سلونی کا رشتہ مانگ لے۔"

دوسری صبح میری خالہ آ گئیں۔ امی نے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ ماموں کو نہ بتائیں۔ میرا گھر تو ویسے بھی برباد ہو چکا ہے، لیکن مجھے اپنے بچوں کی خاطر اس گھر میں رہنا ہے۔

امی کے صرف ایک ہی بھائی اور پانچ بہنیں ہیں۔ وہ خود بھی غریب تھا اس لیے امی اس پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھیں۔

خالہ نے ابو سے میرا رشتہ مانگ لیا۔ پہلے تو وہ انکار کرتے رہے لیکن پھر اصل بات کی طرف آئے کہ اگر وہ ایک لاکھ روپے دے تو رشتہ ممکن ہے۔

خالہ اگرچہ غریب نہیں تھی لیکن اتنی امیر بھی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے منت کر کے 50 ہزار تک بات بنائی اور ایک مہینے کی مہلت لی۔

بہت منتوں کے بعد ابو آخر کار پچاس ہزار پر مان گئے۔ ویسے بھی وہ جان گئے تھے کہ سلونی کی جان بھی جائے تب بھی وہ ماننے والی نہیں، کیوں کہ وہ مجھے مناتے مناتے تھک گئے تھے۔

اب میں پندرہ سال کی ہو گئی تھی۔ ایک مہینے کے اندر اندر میری شادی ہو گئی اور یوں میں جہنم سے جنت میں داخل ہو گئی۔

میرا شوہر بہت عام سی شکل و صورت والا ہے، لیکن مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ میں عزت سے جینے کی خواہاں تھی جو مجھے مل گئی۔

رانی نے طوائف خاندان کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ کر شادی کی۔

پھوپو نے جس کے ساتھ شادی کی تھی اس نے پھوپو کو بہت عزت اور محبت دی، لیکن ایک بیٹا ہونے کے بعد وہ شخص انتقال کر گیا۔ اب وہ پھر سے ابو کے گھر رہ رہی ہے۔

میں اپنے آپ پر بیتے ہوئے ظلم کو جب یاد کرتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے، لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اپنے گھر کی ہو گئی ہوں۔ خدا نے مجھے ایک بیٹا بھی عطا کیا ہے جس سے ماضی کی تلخ یادیں کسی قدر کم ہو گئی ہیں، لیکن بلو اور سوہنی کے بارے میں فکر ہوتی ہے کہ میری بہنیں کیا کریں گی۔ مجھے تو جو سہنا تھا سہہ گئی۔

قارئین میری بہنوں کے لیے دعا کرنا کہ وہ اس ظلم سے بچ جائیں، جو مجھ پر بیتے اور اللہ ابو کو نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆......☆

کہاں آ کے لٹے کارواں



ایم اشفاق بٹ

محبت کے قافلے میں لٹنے والے خزاں رسیدہ شخص کی کتھا

صحت بہت پیاری چیز ہے۔ اگر آپ کی صحت اچھی ہے تو آپ دنیا کے خوش قسمت انسان ہیں۔ دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ کے پاس کروڑوں روپے ہیں اور آپ کی صحت اچھی نہیں ہے۔ آپ چل پھر نہیں سکتے، آپ دیکھ نہیں سکتے، آپ سن نہیں سکتے تو ایسی دولت کس کام کی۔ اللہ تعالیٰ ہم کو دنیا میں ہی جنت دکھاتا ہے۔ یہ آنکھیں جنت ہی ہیں۔ ہم ہر روز ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ہم دنیا میں رہ کر جنت کے نظارے دیکھ رہے ہیں۔

دل کو خوشیاں روزانہ ملتی ہیں، لیکن ہمیں خوشیاں نظر نہیں آتیں۔ دل تو بڑا معصوم ہے، بڑا پاگل ہے۔ یہ کبھی خوش نہیں ہوتا۔ اگر آپ کسی کو دکھ دیں گے تو آپ کو بھی دکھ ہی ملیں گے اور اگر خوشیاں دیں گے تو آپ کو بھی خوشیاں ہی ملیں گی۔

عورت محبت کرنے کے لیے ہوتی ہے، عورت سے نفرت کرنے والے انسان وحشی ہوتے ہیں۔ عورت کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔ ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر وہ جڑ نہیں پاتا۔ عورت بہت ناسمجھ ہوتی ہے، اپنا اچھا بُرا نہیں سمجھتی۔ محبت اندھی ہوتی ہے، عورت اندھی نہیں ہوتی۔ وہ زمانہ ضرور آئے گا جب کوئی میرے دکھوں کو اور خوشی کے آنسوؤں کو بار بار چکائے گا۔ میں وعدے نہیں کرتا، لیکن میں کچے وعدے خود سے کرتا ہوں۔ منزل سامنے نظر نہیں آتی۔ میری تقدیر میرے پیار کی جاگیر میرے اپنے ہی دل میں قید ہے۔

میرا بچپن گجرات کے قریبی گاؤں میں گزرا۔ مجھ سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن مجھ سے چھوٹی تھی۔ والد صاحب سرکاری ملازم تھے، گزر بسر ٹھیک ہو رہی تھی۔ سب سے بڑے بھائی ارشد نے ایم اے کرنے کے بعد ایک سرکاری کالج میں لیکچرشپ حاصل کر لی تھی اور اس کے چند ماہ بعد ان کی شادی کر دی گئی، مجھ سے بڑے بھائی امجد اور چھوٹی بہن شازیہ کا رشتہ والد صاحب نے اپنے بھائی کے ہاں کر دیا تھا۔

امجد نے بی کام کر کے ملازمت شروع کر دی تھی، جبکہ میں ابھی فرسٹ ایئر میں تھا کہ والد صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد میری والدہ بیمار رہنے لگیں اور شوہر کی جدائی کا غم انہیں گھن کی طرح لگ گیا۔ ہم نے ان کی دلجوئی کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن ان کی حالت نہ سنبھلی اور تقریباً آٹھ ماہ کے بعد وہ بھی سفر آخرت کو سدھار گئیں اور یوں والدین کی شفقت کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھ گیا۔

میرے ایف اے کے امتحان میں ابھی دو ماہ باقی تھے۔ بھائیوں کا رویہ میرے ساتھ بدلنے لگا۔ خاص طور پر بھابی کسی نہ کسی بہانے مجھے نیچا دکھانے اور بُرا بھلا کہنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی جلی کٹی سن کر میں خون کے آنسو پی کر رہ جاتا۔ ”آمدن ہے کوئی نہیں اور اسے پڑھائی کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ پڑھ لکھ کر کون سا تم نے ڈپٹی کمشنر بن جانا ہے۔ کام سے جان چھڑانے کے لیے پڑھائی کا خوب ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ بھائیوں کی کمائی کی روٹیاں توڑتا ہے نکھٹو کہیں کا......“ یہ وہ طنز کے تیر تھے جو بھابی کی زبان سے نکل کر میرے دل کو زخمی کر جاتے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ایف اے کیا اور پڑھائی کا شوق ہونے کے باوجود مزید پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور نوکری تلاش کرنے لگا، لیکن جہاں ایم اے پاس ڈگریاں لے کر نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں وہاں ایف اے پاس کو نوکری کہاں سے ملنی تھی، لہٰذا نوکری کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ اس گھر میں میرے زخموں پر مرہم رکھنے والی صرف میری بہن شازیہ تھی۔ وہ ہر وقت میری دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ مایوسیوں اور ناامیدیوں میں وہ مجھے اُمید کی کرن دکھاتی اور میرا حوصلہ بڑھاتی تھی اور کبھی کبھی وہ خود بھی رو پڑتی اور کہتی کہ بھیا مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ لوگ آپ کو اتنا کم تر کیوں سمجھتے ہیں۔ آخر آپ ان کے بھائی ہیں، کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ اگر آپ کو نوکری نہیں ملتی تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے، آخر کیوں یہ آپ کو طعنے دیتے رہتے ہیں۔ آپ کو اب میں اسے کیا سمجھاتا کہ باپ اور بھائی میں یہی فرق ہوتا ہے۔ ابا جان نے انہیں اعلیٰ تعلیم دلوائی اور اس قابل بنایا کہ یہ مناسب روزگار حاصل کر سکیں۔ اب ابا جان اس دنیا میں نہیں ہیں، میری تقدیر میں شاید یہی لکھا ہے۔ میں اسے تسلی دیتا کہ پگلی تو کیوں پریشان ہوتی ہے۔ جب میں ان کی باتوں کا بُرا نہیں مانتا تو ان کی باتوں کو دل پر کیوں لیتی ہے۔ اگر اچھے دن نہیں رہے تو بُرے دن بھی نہیں رہیں گے۔ میں بہن کو تو مطمئن کر دیتا تھا، لیکن خود بے چین سا ہو جاتا تھا۔ زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

میں اپنی پوری کوشش کر رہا تھا، لیکن لگتا تھا کہ تقدیر ابھی مجھ پر مہربانی کرنے سے کترا رہی تھی۔ میرے بھائی اور بھابی کا رویہ شازی کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا۔

اگر ابا جان بھائی کے رشتے کی بات چچا سے نہ کر



گئے ہوتے تو...... چچا بھی ہمارے ہی گاؤں میں رہتے تھے اور بھائیوں پر ان کا کچھ رعب و دبدبہ تھا۔ ویسے بھی امجد بھائی کی شادی چچا کی بیٹی سے ہوئی تھی، لہٰذا دونوں بھائی اور بھابی شازیہ کو برداشت کر رہے تھے، ورنہ اس کے ساتھ بھی نہ جانے کیسا سلوک کرتے۔ ماں باپ کی وفات کے بعد چچا کے سوا باقی رشتے داروں سے میل جول بھی بھائیوں نے کم کر دیا تھا۔ صرف شادی و مرگ پر آنا جانا رہ گیا تھا۔ کراچی میں ہماری ایک خالہ رہتی تھیں، جب والدہ زندہ تھیں تو وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کو لے کر آ جاتی تھیں، لیکن والدہ کی وفات کے بعد اور بھابی کا خشک مزاج دیکھ کر انہیں نے بھی آنا جانا کم کر دیا تھا۔

انہیں دنوں ان کی بڑی بیٹی کی شادی تھی۔ شادی کے کارڈ کے ساتھ خالہ کا خط بھی آیا تھا، جس میں شادی میں شرکت کی تاکید تھی۔ گجرات سے کراچی تک کا طویل سفر تھا اور دو تین دن قیام لازمی تھا، لہٰذا دونوں بھائیوں نے چھٹی نہ ملنے کا بہانہ بنایا اور مجھ سے کہا کہ تم شازیہ کو ساتھ لے کر چلے جاؤ۔ اس طرح خالہ کو بھی گلہ نہ ہوتا اور چند روز کے لیے مجھ سے ان کی جان چھوٹ جاتی۔ اتفاق سے شادی سے ایک ہفتہ پہلے شازیہ کو بخار ہو گیا جس سے وہ خاصی نقاہت محسوس کرنے لگی اور اس کی تیمارداری کے لیے چچا بھی آئے تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ ہم دونوں کا کراچی جانے کا پروگرام ہے، تو انہوں نے شازیہ کو بھیجنے سے منع کر دیا کہ سفر طویل ہے، کہیں راستے میں طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے، لہٰذا طے یہ پایا کہ میں اکیلا ہی کراچی جاؤں گا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، کراچی کا میرا یہ پہلا سفر تھا۔ اتنا لمبا سفر میرے لیے سوہان روح تھا، لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ فارغ تو تھا ہی سوچا چلو کچھ دنوں کے لیے بھائیوں اور بھابی کے طعنے تو نہیں سننے پڑیں گے۔

میں ٹرین میں بیٹھ کر کراچی کے لیے روانہ ہوا۔ گاڑی میں خاصا رش تھا۔ میں نے سیٹ ریزرو بھی نہیں کروائی تھی۔ مجھے اتنا لمبا سفر کرنے کا اتفاق ہی کب ہوا تھا، پہلے تو میں پریشان ہو گیا پھر سوچا، ہو سکتا ہے اگلے کسی اسٹیشن پر جگہ خالی مل جائے، لیکن اگلے اسٹیشن پر صورت حال یہ ہوئی کہ اگر دس مسافر اترتے تو بیس مسافر چڑھ آتے۔ بہت سے مسافر تو دروازے کے پاس اپنا سامان رکھ کر اس کے اوپر بیٹھ گئے تھے۔ میں اپنا بیگ پاؤں کے پاس رکھ کر ڈبے کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ مجھے کھڑے ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اور میری ٹانگوں میں درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اگر کراچی تک مجھے ایسے ہی سفر کرنا پڑا تو میرا کیا حشر ہو گا۔

میں ابھی اسی سوچ بچار میں تھا کہ سامنے سیٹ پر بیٹھے ایک نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں جب اس کے قریب گیا تو وہ مجھے کچھ شناسا سا لگا اور پھر جب میں اس کے قریب گیا تو پھر جب اس نے یاد دلایا کہ وہ میٹرک میں میرے ساتھ پڑھتا رہا ہے تو مجھے یاد آ گیا، وہ جمال تھا۔ اس نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص سے میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ یہ میرے ماموں ہیں۔ انہوں نے گوجرانوالہ جانا ہے۔ تم یہاں بیٹھ جانا۔ گوجرانوالہ اسٹیشن پر جمال کے ماموں اتر گئے اور یوں مجھے بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ میں نے جمال سے اس کی موجودہ مصروفیات کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں راولپنڈی میں ملازمت کرتا ہوں، والد صاحب کراچی میں ملازمت کرتے ہیں، ٹیلی فون کے محکمے میں، میں ان سے ملنے کراچی جا رہا ہوں۔ جب مجھے پتا چلا کہ جمال بھی کراچی جا رہا ہے تو مجھے اور خوشی ہوئی، کیوں کہ اتنا طویل سفر تنہا کاٹنے کے تصور سے ہی میں ہلکان ہو رہا تھا۔ جمال نے جب مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے اپنی تمام بپتا سنا دی۔

میرے حالات سن کر جمال کچھ دیر خاموش رہا، پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ تم فکر نہ کرو میں تمہیں اپنے والد سے ملواؤں گا وہ ضرور تمہارے لیے ملازمت کا بندوبست کر دیں گے۔ جمال میرے لیے فرشتہ ثابت ہو رہا تھا۔ ملازمت میرے لیے اس وقت اہم ضرورت تھی۔ بھائیوں اور بھابی کی باتیں سن سن کر میں عاجز آ گیا تھا، ویسے بھی حالات اس اسٹیج پر پہنچ گئے تھے کہ جتنی جلدی مجھے ملازمت مل جائے اتنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ جمال کی رفاقت میں طویل سفر بغیر کسی اذیت سے گزر گیا۔

کراچی پہنچ کر جمال نے اپنے والد صاحب کا پتا دے دیا اور مجھے تاکید کی کہ میں کل شام کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ میں وعدہ کر کے ٹیکسی میں سوار ہو کر ملیر کے علاقے ماڈل کالونی کی طرف روانہ ہوا۔ ڈرائیور کے تعاون سے میں خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ خالہ کا گھر ان کی معاشی آسودگی کا پتا دیتا تھا۔ خالہ کی تین بیٹیاں تھیں۔ لبنیٰ، سمیعہ، طیبہ جبکہ بیٹا کوئی نہیں تھا۔ خالہ خالو اور ان کی تینوں بیٹیاں بڑے تپاک سے ملیں، دیگر گھر والوں کے نہ آنے کا سبب پوچھا تو میں نے بتایا۔ خالہ سن کر بڑی حسرت بولیں۔ ”چلو میری مرحومہ بہن کے گھر سے کوئی تو آیا، ورنہ جب سے بہن فوت ہوئی ہے، آپ لوگ تو ہمیں بھول ہی گئے ہیں۔“ میں ان کی باتوں کا کیا جواب دیتا، اس لیے خاموش رہا۔

مجھے خاموش دیکھ کر چھوٹی طیبہ بولی۔

”امی جان آپ تو ہر کسی کے سامنے اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ جاتی ہیں، آئیں بھائی جان آپ پہلے آرام کر لیں باقی باتیں کھانے پر ہوں گی۔“

وہ مجھے ایک کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ تھکاوٹ اور نیند کا غلبہ تو تھا ہی، لہٰذا میں بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اگلے دن میں خالہ کو بتایا کہ جمال کے والد صاحب سے ملنے گیا۔ جمال پہلے ہی والد صاحب سے میرا ذکر کر چکا تھا، لہٰذا مجھے وہاں لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جمال کے والد صاحب نے پوچھا۔ ”بیٹے تم کس قسم کی ملازمت چاہتے ہو۔“

”میں نے کہا انکل حالات ایسے ہیں کہ جیسی بھی مل جائے قبول ہو گی۔“

انہوں نے کہا کہ ”ہمارے محکمے میں آپریٹر کی آسامیاں خالی ہیں۔ ایف اے پاس لڑکوں کی ضرورت ہے۔ چند روز پہلے اخبار میں اشتہار آیا تھا، ابھی درخواست دی جا سکتی ہے۔ اگر تم چاہو تو درخواست دے دو، باقی میں سنبھال لوں گا۔“

ان کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ ملازمت تو یہاں مجھے مل جائے گی، لیکن رہائش کا کیا ہو گا؟ شروع میں پانچ ہزار یا چھ ہزار تنخواہ ہو گی۔ اس میں الگ مکان لے کر کیسے رہا جا سکتا ہے۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر جمال بولا۔

”یار نعمان تم کس سوچ میں پڑ گئے، اگر رہائش وغیرہ کا مسئلہ ہے تو تم ابا جان کے ساتھ رہ سکتے ہو۔ انہیں محکمے کی طرف سے فلیٹ ملا ہوا ہے۔“ جمال کے والد صاحب نے بھی تائید کی، میں نے باقی فیصلے بعد پر چھوڑے اور وہیں بیٹھ کر درخواست لکھ دی۔ جمال کے والد نے کہا کہ تم درخواست دے دو میں جمع کرا دوں گا اور تم ٹیسٹ و انٹرویو تک اسناد گھر سے منگوا لو وہ میں بعد میں درخواست کے ساتھ لگا دوں گا۔ میں نے جمال اور اس کے والد صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کھانا کھا کر ان سے اجازت لی اور واپس خالہ کے گھر آ گیا۔

جب میں نے خالہ کو بتایا کہ میری نوکری کا بندوبست ہو گیا ہے تو سب بہت خوش ہوئے، لیکن جب میں نے یہ بتایا کہ میں جمال کے والد صاحب کے ساتھ رہوں گا، تو خالہ سخت ناراض ہوئیں اور بولیں۔

”بھلا اپنا گھر چھوڑ کر کسی غیر کے گھر کیوں رہو گے۔ میں تو پہلے کہتی تھی کہ بہن کے مرنے کے بعد تم لوگ آنا جانا بھی چھوڑ دو گے۔ میں تمہاری ماں نہ سہی خالہ تو ہوں، تم اگر ہمیں اپنا سمجھتے تو اس طرح بات نہ کرتے۔“ اتنا کہتے ہوئے خالہ اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔ میں خود بھی آبدیدہ ہو گیا۔ ایک سگے بھائی تھے جو میرا وجود برداشت نہیں کرتے تھے اور ایک یہ خالہ تھیں کہ اپنے گھر رکھنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ جب باقی گھر والوں نے بھی اصرار کیا تو میں نے خالہ کے ہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اپنی بہن شازیہ بہت یاد آ رہی تھی۔ اس گھر میں وہی تو تھی مجھ سے محبت کرنے والی۔

میں نے اسے کال کر کے ساری صورت حال بتا دی اور اسناد وغیرہ فیکس کرنے کا کہا۔ اگلے تین چار دن شادی کے ہنگاموں میں گھر کی مصروفیات میں گزر گئے۔ لبنیٰ کی شادی ہو گئی۔

سمیعہ اور طیبہ خوش طبیعت کی مالک تھیں۔ سارا گھر ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ لبنیٰ کی شادی کے بعد خالہ کا گھر کچھ اداس اداس لگنے لگا، لیکن طیبہ کی شوخی اور شرارتیں اس اداسی کو کم کیے دیتی تھیں۔ سمیعہ جس کو بھی سمی کہتے تھے، اس کی طبیعت دونوں بہنوں سے مختلف تھی۔ وہ بہت کم مجھ سے بات کرتی تھی، اس لیے میں نے بھی اسے محسوس نہ کیا۔ چند روز کے بعد میرا ٹیسٹ اور انٹرویو ہوا اور یوں مجھے محکمہ ٹیلی فون میں آپریٹر کی جاب مل گئی۔

میں نے جمال کا اور اس کے والد صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پھر میں نے شازیہ کو کال کر کے خوش

خیری سنائی۔ اس نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ ملازمت ملنے پر بھائیوں اور بھابی کی طرف سے بھی مبارک باد کی کال آئی۔ میں نے ملازمت شروع کردی اور خالہ کے گھر رہنے لگا۔

خالہ کے گھر میں مجھے بہت اپنائیت ملی، میرا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا۔ شام کو کبھی کبھی ہم آئس کریم کھانے کے لیے چلے جاتے تھے۔ طیبہ آئس کریم کی بہت شوقین تھی۔ کوئی بات ہوتی وہ کہہ اٹھتی۔ ''واہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، اسی خوشی میں آج شام کو آئس کریم کھانے چلیں گے۔'' اس کی اس بات پر ایک بھرپور قہقہہ ابھرتا۔ میں نے محسوس کیا کہ سیمی مجھ سے کچھ روٹھی سی رہتی ہے۔ کبھی مجھے لگتا جیسے وہ کوئی بات مجھ سے کہنا چاہتی ہے، لیکن کچھ نہیں پاتی۔ کھانے کی میز پر یا چائے کے دوران مجھے محسوس ہوتا جیسے مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ جب میں سر اٹھا کر دیکھتا تو سیمی کو اپنی طرف متوجہ پاتا۔ جونہی آنکھیں چار ہوتیں، وہ آنکھیں جھکا لیتی۔

میں جوں جوں سیمی کے بارے میں سوچتا میری بے چینی اور پریشانی میں اضافہ ہوجاتا۔ خالہ اور خالو نے ایک ایسے وقت میں، جب میرے سگے بھائی میرا وجود بوجھ محسوس کرتے تھے، مجھے اپنے بیٹے کی طرح اپنے گھر میں جگہ دی، میں ان کے احسانوں تلے دبا ہوا تھا، لیکن سیمی کا رویہ مجھے احساس فراموشی پر اکسا رہا تھا۔ وہ میری خالہ کی بیٹی تھی۔ خاندان میں اس طرح کے رشتے ہوتے رہتے ہیں۔ شازیہ اور امجد بھائی کا رشتہ بھی تو چچا کے گھر ہوا تھا، لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔ خالو کی اپنی مالی حیثیت ٹھیک تھی، جبکہ میں معمولی ملازم تھا اور خالہ کے گھر میں مقیم۔ آخر ایک اعتماد تھا تو انہوں نے مجھے اپنے گھر میں جگہ دی تھی، پھر میں ان کے اعتماد کو کس طرح ٹھیس پہنچا سکتا تھا، لڑکیاں تو ہوتی ہی بے وقوف ہیں۔ وہ ہواؤں میں محل بنانے اور پانی کی سطح پر لکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں کس طرح اس کے ساتھ اس کے سراب کے پیچھے بھاگ سکتا تھا۔ میرا ضمیر اس کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ یہ سب میرا وہم بھی ہوسکتا ہے اور پھر میں خدا سے دعا کرتا کہ یہ واقعی میری غلط فہمی ہو، کیوں کہ ابھی میں نے اپنا مستقبل بنانا تھا۔ شازیہ کی شادی کے سلسلے میں اپنا فرض بھی ادا کرنا تھا۔ میں شازیہ کو جہیز میں زندگی کی ہر آسائش دینا چاہتا تھا۔ بھائیوں نے اپنے طور پر اس کے جہیز کے لیے بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے محکمانہ ترقی کے لیے ملازمت کے ساتھ ساتھ بی اے کی تیاری بھی شروع کردی تھی۔ اگر میں ابھی سے عشق و محبت کے چکروں میں پڑجاتا تو اپنی منزل کو نہ پاسکتا۔ تقدیر نے بڑی مشکلوں سے ایک موقع فراہم کیا تھا۔ میں نے اگر یہ موقع بھی گنوا دیا تو پھر ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے کبھی سیمی کو یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ میں اس کی نظروں کو مفہوم سمجھتا ہوں۔ میں ایک قدم بھی اس راستے پر نہیں رکھنا چاہتا تھا جو راستہ رسوائیوں کا راستہ ہوسکتا ہے، جو میرے مستقبل، میری انا اور خودداری کی قتل گاہ تک جاسکتا ہے۔ میں کئی روز تک بڑی سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے اب یہ گھر چھوڑ کر الگ فلیٹ لے لینا چاہیے۔ اب میری تنخواہ اتنی تھی کہ میں الگ فلیٹ لے کر رہ سکتا تھا، لہٰذا ایک روز کھانے کی ٹیبل پر میں نے خالہ سے مخاطب ہوکر کہا۔

''خالہ جان میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔''

خالہ بولیں۔ ''ہاں بیٹا اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے، لیکن آپ اس کا غلط مطلب نہیں لیں گی۔'' میں نے حوصلہ کرکے کہہ ہی دیا۔ خالہ جان آپ نے جس طرح مجھے محبت دی اور ہر طرح سے میرا خیال رکھا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ سب کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ اب میں اس قابل ہوگیا ہوں کہ الگ فلیٹ لے کر رہ سکتا ہوں، اس لیے آپ مجھے اجازت دیں کہ میں...... خالہ نے میری بات پوری نہ ہونے دی اور کہنے لگیں۔ ''ہم نے تمہیں غیر سمجھ کر نہیں اپنا بیٹا سمجھ کر اس گھر میں رکھا تھا۔ ہمارا کون سا کوئی بیٹا ہے۔ تمہارے یہاں رہنے سے ہمارے بیٹے کی کمی پوری ہوگئی اور تم ہو کہ غیروں جیسی باتیں کر رہے ہو، اگر تمہیں اس گھر میں کوئی تکلیف ہے۔''

''نہیں خالہ جان میرا تو آپ نے اس طرح خیال رکھا ہے کہ میں اسے ساری زندگی فراموش نہیں کرسکتا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ......''

خالہ نے پھر میری بات کاٹ دی۔ ''تمہیں الگ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم یہیں رہو گے۔''

خالہ نے فیصلہ سنا دیا اور میں نے خاموشی سے ان کے فیصلے کے آگے نہ چاہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ خالہ نے مجھے کہا اور فوراً بول اٹھیں۔

''یہ ہوئی نا بات۔ اس خوشی کے موقع پر سب کو میری طرف سے آئس کریم کی ٹریٹ۔'' سب ہنس دیے۔ میں نے کنکھیوں سے سیمی کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا۔

اگلی روز سیمی میرے کمرے میں آئی اور عجیب انداز میں میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔'' میرے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ سیلاب جو نہ جانے کب کا رکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ہی نہیں وہ بھی مجھ پر برس رہی تھی۔

''دوسروں کی محبت کی یوں توہین کی جاتی ہے۔ کیا آپ کے نزدیک دل کانچ کے کھلونے ہیں جنہیں جب چاہا توڑ دیا۔ کیا آپ کے نزدیک کسی کے جذبات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر بڑے شوق سے یہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔ آپ کو جانے کی بات کرنے سے پہلے یہ تو سوچ لینا چاہیے تھا کہ آپ کی اس بات سے کسی کے دل پر کیا گزرے گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اتنے عرصے میں آپ کو اپنی محبت کا احساس نہ دلا سکی۔ میری محبت میں شاید کوئی کمی تھی۔ میں اپنی نظروں میں آپ گر گئی ہوں، لیکن آج میں آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ جس دن آپ یہ گھر چھوڑ کر گئے، میں یہ دنیا چھوڑ دوں گی۔''

میں نے لاکھ خود کو سمجھانا چاہا کہ جو تمہاری نظروں کا مفہوم نہیں سمجھتا، جس کا دل تمہارے دل کے ساتھ نہ دھڑ کتا۔ آخر تم کیوں اس کے پیچھے دیوانی ہو رہی ہو۔ میں اپنی زندگی آپ کے نام کرچکی ہوں اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اتنا کہہ کر وہ آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل گئی۔

میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ اس گھر میں مجھے بہت محبت ملی تھی، لیکن سیمی کی محبت نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ سیمی بہت خوب صورت، حساس اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی، لیکن میری اس گھر میں حیثیت ایسی تھی کہ میں سیمی کو پسند کرنے کے باوجود اس سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ خالہ کو جب اس بارے میں پتا چلے گا تو وہ کیا سوچیں گی۔ چند دنوں بعد گھر سے بھائی نے کال کی کہ چچا شازیہ کی شادی کی تاریخ مانگنے آئے تھے۔ اگلے ماہ کی بارہ تاریخ طے پائی ہے، تم کیم کو چھٹی لے کر آجانا، میں نے کیم سے پہلے چھٹی لی اور خالہ کو مع فیملی شادی میں شرکت کی تاکید کی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ سب آئیں گے۔ میں نے جو رقم پس انداز کی تھی وہ ہمراہ لی اور گھر آگیا۔ میرے پاس جتنی رقم تھی، میں نے بھائی کے حوالے کردی۔ شازیہ کے لیے میں بہت سی چیزیں خرید کے لایا تھا۔ شازیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بھائیوں اور بھابی کا رویہ بھی اب میرے ساتھ ٹھیک تھا، کمانے جو لگ گیا تھا۔

میں اب ان پر بوجھ نہیں تھا۔ شادی سے دو دن پہلے خالہ خالو، سیمی، طیبہ بھی آگئیں۔ شادی کا مرحلہ خیریت سے ختم ہوا اور ہم کراچی آگئے۔ کراچی آکر میں سیمی سے نظریں نہ ملاتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری نظروں سے بھی محبت کا پیغام پڑھ لے اور پھر ایک سراب کے پیچھے بھاگنا شروع کردے۔ میں اب خود بھی سیمی سے محبت کرنے لگا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سیمی کے آنسو پونچھ کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کروں، لیکن میں نے خود کو قابو میں رکھا۔ میں نے اسے اپنی محبت کا احساس نہ ہونے دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ باز آجائے، مجھ سے مایوس ہوجائے اور میں خالہ اور خالو کی نظروں سے گرنے سے بچ جاؤں۔ سیمی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرچکی تھی۔ اس کے بعد بھی میری بے رخی سے وہ کچھ اداس رہنے لگی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر ترس بھی آتا تھا اور پیار بھی۔ صرف میری انا اور خودداری کی وجہ سے، میں ایک معصوم لڑکی کی محبت کے پاکیزہ جذبوں کو نظر انداز کرکے اس کا دل تڑپا رہا تھا، لیکن میں جو کچھ کر رہا تھا، ٹھیک کر رہا تھا۔ چند ہی دنوں میں مجھے احساس ہوا کہ جیسے طیبہ کو اس صورت حال کا پتا چل چکا ہے۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں کبھی مجھے اور کبھی سیمی سے چھیڑ خانی کرتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ سیمی

نے خود اسے اپنا راز دار بنایا تھا یا اسے خود ہی اس معاملے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ یہ بات میرے لیے تشویشناک تھی، کیوں کہ اگر طیبہ کو پتا چل سکتا تھا تو خالہ اور خالو کو بھی اس معاملے کی ہوا لگ سکتی تھی۔ میں اس بارے میں فکر مند رہنے لگا اور سیمی سے گفتگو میں مزید احتیاط کرنے لگا۔

ایک دن طیبہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

''بھائی جان آپ کو پتا ہے کہ آپی آپ سے محبت کرتی ہے۔ وہ آپ کی محبت میں اس قدر آگے نکل چکی ہے کہ اگر اب آپ انہیں نہ ملے تو شاید وہ خودکشی کر لے وہ اتنی حساس ہیں...... کہ مجھے اب ان کی طرف سے فکر رہنے لگی ہے اور وہ کہیں کچھ کر ہی نہ لے، لہٰذا آپ نے جو بھی فیصلہ کرنا ہے، جلدی کر لیں اور مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں۔''

وہ اس قدر سنجیدگی سے بات کر رہی تھی کہ میں حیران رہ گیا۔ اس کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''طیبہ تم جانتی ہو کہ اس گھر میری پوزیشن کیا ہے۔ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، میرے چاہنے سے کیا ہو سکتا ہے تم سیمی کو سمجھاؤ کہ خود کو تقدیر کی لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔ وہ جہاں لے جائیں سو لے جائیں، ورنہ زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ مجھے اس گھر سے تحفظ اور محبت ملی ہے۔ خالہ نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح رکھا ہے۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا کہ جس سے خالہ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔ میں نے سیمی سے اسی لیے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا، ابھی سیمی یہ سمجھ رہی ہے کہ اس کی محبت یکطرفہ ہے۔ اگر اسے علم ہو گیا کہ میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں اور حالات نے ہمارا ساتھ نہ دیا، ہم نے مل پائے تو خود سوچو اس کی حالت کیا ہوگی۔ میں تم سے یہی کہوں گا کہ جب تک حالات ہمارے حق میں نہیں ہو جاتے، تم اسے نہ بتانا۔''

طیبہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی۔ ''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں، میں صرف آپ کی رائے لینا چاہتی ہوں کہ آپ اس بات پر راضی ہیں نا تو بس ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

چند روز کے بعد میں دفتر سے گھر آیا تو دیکھا چچا جان، بھائی جان، بڑی بھابی خالہ کے گھر موجود تھے۔

میں انہیں دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ان سے آنے کی وجہ پوچھی تو پتا چلا کہ وہ میرے لیے سیمی کا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔ طیبہ نے کالج کر کے انہیں پتا نہیں کیا بتایا کہ وہ رشتہ مانگنے آ گئے۔

میں خوش بھی تھا۔ جب چچا نے خالہ سے بات کی تو وہ بولیں۔

''نعمان نہایت سعادت مند لڑکا ہے۔ میں اس کے حسن اخلاق اور حسن کردار سے بہت متاثر ہوں۔ اسے میں نے بہت پہلے ہی اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لیے ہماری طرف سے ہاں ہی سمجھیں۔'' میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ آج مجھے یقین ہو گیا کہ سیمی کو مجھ سے کس قدر محبت ہے۔

میرے دل میں جو خدشات تھے وہ بے بنیاد نکلے اور خالہ نے بڑی محبت اور خوشی سے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا۔ شادی ایک سال بعد ہونا قرار پائی تھی، تاکہ اس وقت تک میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ کچھ عرصے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب میرا خالہ کے گھر رہنا مناسب نہیں ہے۔ جب میں نے خالہ سے بات کی تو انہوں نے بھی اجازت دے دی، کیوں کہ اب نے ان کی بیٹی کو بیاہنے آنا تھا۔ میں نے ایک مناسب سا فلیٹ کرایہ پر لے لیا اور شادی کی تیاریاں کرنے لگا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ میں مسرتوں کی وادی میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ کراچی میرے لیے بڑا اچھا ثابت ہوا تھا۔ اس شہر نے مجھے بڑی خوشیاں اور بڑا مقام دیا تھا اور اب ایک محبت کرنے والی بیوی میری زندگی میں آنے والی تھی۔ میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا تھا۔ اب میں خالہ کے گھر بہت ہی کم جاتا تھا۔ اگر جاتا بھی تو سیمی میرے سامنے نہ آتی تھی اور میں کچھ دیر کے بعد واپس پلٹ آتا اور ایک دن میں خالہ کے گھر گیا، کچھ دیر کے لیے۔ خالہ کچن میں گئیں تو میں نے طیبہ سے سیمی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑی افسردگی سے بتایا کہ بھائی جان جب سے آپ دونوں کا رشتہ طے ہوا ہے۔ باجی کو جیسے چپ لگ گئی ہے۔ دکھ کی پرچھائیاں ان کے چہرے پر عیاں ہونے لگی ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس شادی پر خوش نہیں ہیں۔ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''طیبہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ سیمی نے خود مجھ سے کہا تھا اور تم نے بھی اس کی تصدیق کی تھی کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی، پھر یہ اچانک تبدیلی کیسی، ضرور تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی؟''

اب میرا اس سے ملنا مناسب نہیں ہے۔ طیبہ تم ہی پتا چلاؤ اسے کیا پریشانی ہے۔ طیبہ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اصل بات کا پتا لگائے گی۔ میں خالہ سے ملے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔ طیبہ کی بات نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ جو لڑکی میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی، وہ مجھ سے شادی پر خوش نہیں تھی۔ چند دنوں کے بعد میں پھر خالہ کے ہاں گیا اور موقع ملتے ہی طیبہ سے پوچھا۔

''کچھ پتا چلا۔''

وہ بولی۔ ''آپ کو تو پتا ہے کہ آپی بہت حساس طبیعت کی مالک ہیں۔ وہ آپ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور اس کا اظہار بھی انہوں نے آپ سے کیا تھا۔ وہ سمجھتی ہیں کہ آپ کو ان سے محبت نہیں ہے، ورنہ آپ اس کا اظہار ضرور کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ صرف میرے کہنے پر شادی کے لیے راضی ہوئے ہیں اور چوں کہ آپ کے گھر والوں کو بھی میں نے بلایا تھا، اس لیے وہ سمجھتی ہیں کہ آپ یہ شادی مجبوراً بس ایسے ہی کر رہے ہیں۔ آپی کا کہنا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے کیسے شادی کر سکتی ہے جسے اس کے ساتھ محبت ہی نہ ہو، جو اتنے عرصے تک میری محبت کو ہی نہ سمجھ سکا۔ اس کے ساتھ کیا زندگی گزارنی۔ اگر امی ابو نے ہاں نہ کر دی ہوتی تو میں اس شادی سے انکار کر دیتی۔''

طیبہ کے الفاظ میری سماعت پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ میں نے طیبہ سے التجا کی پلیز طیبہ اسے سمجھاؤ اسے بتاؤ کہ میں اس سے محبت کرتا تھا، لیکن محبت کے اظہار میں کیا رکاوٹیں حائل تھیں۔ اگر مجھے اس سے محبت نہ ہوتی تو میں اس سے شادی پر کیوں کر راضی ہوتا، کیا صرف کسی کا دل رکھنے کے لیے کوئی کسی سے شادی پر تیار ہو جاتا ہے جس کے ساتھ ساری زندگی اکٹھے گزارنی ہوتی ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا ہے، لیکن وہ کہتی ہیں کہ تم صرف میرا دل رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کہتی ہو۔ میں نے طیبہ سے کہا کہ تم اسے پھر سمجھاؤ، میری طرف سے اسے یقین دلاؤ۔ اگر پھر بھی اسے یقین نہ آیا تو پھر میں خود اس سے بات کروں گا۔

میں جتنی دیر وہاں رہا، سیمی مجھے نظر نہ آئی۔ میں خالہ سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شادی کے بعد اسے یقین آ جائے گا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں یا نہیں۔ میں اسے اپنے دل کی کیفیت بتاؤں گا اور اسے اپنی مجبوری بتاؤں گا...... کہ میں کیوں اس سے اظہار محبت نہیں کر رہا تھا، لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایک روز طیبہ کی کال آئی کہ بھائی جان آپی نے بہت سی خواب آور گولیاں کھا لی ہیں۔ فوراً پہنچیں۔ میں دیوانہ وار خالہ کے گھر پہنچا، لیکن تب تک سیمی اس دنیا کو چھوڑ چکی تھی۔ سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی طیبہ مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بھائی جان آپی کو ہماری بات کا یقین نہیں آیا تھا اور وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔'' میرے تو ہوش و حواس کھو گئے۔ جب ہوش آیا تو میری دنیا ہی لٹ چکی تھی اور سیمی کو منوں مٹی تلے دبا دیا گیا تھا اور میں آخری دفعہ اپنی محبت کا دیدار بھی نہ کر سکا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سیمی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

میں جو خالہ کی نظروں سے گرنے سے بچنے کے لیے سیمی سے اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ آج خالہ کے سامنے نظریں نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ سیمی تم نے فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کی ہے۔ ایک بار مجھے صفائی کا موقع تو دیتیں۔ جب ہمارا ایک ہونے کا وقت آیا تو تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میں تو تمہیں ہمسفر بنانا چاہتا تھا، تمہارا ہاتھ پکڑ کر زندگی کی آخری سانس تک سفر کرنا چاہتا تھا، لیکن کہاں آ کے لٹ گیا کارواں، اس کا پتا نہیں تھا۔ کراچی شہر مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگا تھا۔ میں جس شہر کو اپنی خوشیوں کا گہوارہ سمجھ رہا تھا، وہ میری خوشیوں کا قاتل نکلا تھا۔ میں کراچی شہر چھوڑ کر دوبارہ اپنے گاؤں آ گیا۔ آج مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ بہار مجھ سے روٹھ گئی ہے اور میں دوبارہ خزاؤں کی زد میں ہوں۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ازل سے ہی خزاں میرا نصیب ہے۔

☆......☆

ادھوری محبت

نسیم سحر

ادھوری محبت کا شکار، ایک مرد کی سچ بیانی

میرا نام عمران ہے۔ یہ کہانی میرے دوست محمود کی ہے جو کہ میرا کافی پرانا دوست ہے۔ وہ بہت اچھا، مخلص، محبت کرنے والا اور حسّاس شخص تھا، لیکن قسمت نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ اچھا نہیں کیا۔ اپنوں کے علاوہ دوسروں کی بے وفائی نے بھی اس کو بالکل دنیا سے دور کر دیا تھا۔ چوں کہ میں اس کے حالات سے واقف ہوں، لیکن بہتر ہے کہ یہ کہانی خود محمود کی زبانی ہی پڑھی جائے۔

ابھی ابھی مجھ پر پھر یاسیت کا دورہ پڑا تھا۔ کام کرتے کرتے میری طبیعت اکتا سی گئی تھی اور قلم چھوڑ کر میں نے کرسی کی پشت سے ٹکا لیا تھا۔ خیالات تھے کہ امڈے چلے آرہے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو میں ان خیالات کو روکنے کی کوشش کرتا رہا، پھر ناکام ہو کر سر کو جھٹک کر اپنے اردگرد دیکھا تو سب لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ مجھے ان پر بہت رشک آیا کہ وہ سب ان ذہنی الجھنوں سے دور تھے تو پھر میں کیوں......؟ آخر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ میں نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ قبل اس کے میں کوئی با آواز بلند اظہار کر بیٹھتا، میری نظر اسد سے ٹکرا گئی۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملنے پر وہ مسکرا دیا۔ وہ میرا بہت اچھا کولیگ تھا، بہت ہی خوش مزاج اور کام آنے والا باتونی سا لڑکا تھا۔

اس کی مسکراہٹ نے گویا آگ پر پانی ڈال دیا تھا اور میں اپنی کیفیت سے باہر آ گیا تھا۔ جواباً میں نے بھی اسد کو مسکرا کر دیکھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ چھ بجے آفس سے چھٹی ہونے پر میں باہر نکلا اور سیدھا اپنے اپارٹمنٹ پہنچا۔ گھر جا کر کافی دیر تک میں شاور لیتا رہا، گویا اپنی یادوں سے چھٹکارا پا رہا ہوں، پھر فریش ہو کر میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور گیلری میں آ گیا۔ گیلری میں کھڑا ہونا مجھے ہمیشہ سے ہی بہت اچھا لگتا تھا۔ دو گھر چھوڑ کر زاہد صاحب رہتے تھے۔ وہ ریٹائرڈ آدمی تھے اور اس وقت وہ بھی عموماً گیلری میں ہی ہوتے تھے۔ ان سے میں دور دور سے ہی سلام دعا کر لیتا تھا۔ سامنے والا گھر عمر کا تھا۔ وہ پندرہ سالہ لڑکا کوچنگ جانے سے پہلے گیلری میں ضرور آتا اور مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتا اور وہیں سے اپنی پڑھائی کے بارے میں بتاتا تھا۔ شام کے وقت پلازہ میں بہت رونق ہوتی تھی۔ بچے کھیل رہے ہوتے تھے۔ مرد حضرات کی کام سے واپسی شروع ہو جاتی تھی۔ کہیں گاڑی رکنے کی آواز تو کہیں بائیک کا شور، مجھے یہ منظر بہت اچھا لگتا تھا۔ یہاں آتے ہی میں وہ سب کچھ بھول جاتا تھا جو میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہاں آئے تین سال ہونے کو آئے تھے۔ یہ میرے

دوست کا فلیٹ تھا جو خالی تھا اور اس نے مجھے رہنے کے لیے دیا تھا۔ ابھی میں وہیں کھڑا رہتا کہ فون کی آواز آئی۔ گھڑی دیکھی آٹھ بجنے والے تھے۔ ارے آج تو کافی ٹائم ہو گیا۔ مجھے آٹھ بجے عمران فون کرتا تھا، پھر ہم لوگ کھانا کھانے باہر چلے جاتے اور رات گئے گھر واپسی ہوتی، پھر میں آ کے آ کے سو جاتا اور صبح آفس۔ بس میری یہی روٹین چل رہی تھی۔

☆.....☆

ہم پانچ بھائی اور تین بہن تھے۔ بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور ایک بہن مجھ سے چھوٹی تھی۔ بیچ کا ہونا بھی میرے لیے ایک المیہ ہی تھا۔ نہ بڑا ہونے کا فخر میرے حصے میں آتا تھا اور نہ ہی چھوٹا ہونے کا لاڈ۔ جس طرح ماں باپ کی محبت مجھ تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئی تھی۔ اسی طرح ہر چیز بھی، شاید عید پر ہی میرے لیے نیا جوڑا بنتا تھا، ورنہ تو سارا سال بڑے بھائی کے کپڑے، جوتے، کورس، بیگ ہی حصے میں آتے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، بڑے بھائی ابو کی زندگی میں ہی کام کرنے لگے تھے۔ اس لیے گھر کے حالات میں کچھ معمولی سی تبدیلی آئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں اپنے الگ الگ گھر کا خواب دیکھ رہے تھے اور اس لیے گھر میں نہ ہونے کے برابر خرچ دیتے تھے، کیوں کہ وہ اپنے اپنے فلیٹ کی قسطیں بھی بھر رہے تھے اور وہ اپنے لیے لڑکیاں بھی پسند کر چکے تھے، پھر جیسے ہی ان کو فلیٹ کا قبضہ ملا، یکے بعد دیگرے شادی کر کے وہ دونوں اپنے گھر شفٹ ہو گئے اور رہا سہا تعلق بھی ہمارا ان سے ختم ہو گیا۔ تیسرے بھائی اچھے تھے۔ وہ سب کا خیال رکھتے تھے۔ ابو کو بھی ان سے بہت اُمید تھی، لیکن ان کا اپنڈکس پھٹ جانے سے وہ جوانی میں ہی



خواب سجائے دنیا چھوڑ گئے تھے۔ ابا خاص کر اس حادثے کے بعد بہت پریشان ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ ابھی انہوں نے ایک بھی بیٹی نہیں بیاہی تھی۔ اماں بھی پریشان تھیں، لیکن مجھ سے بڑے بھائی نے ابا کو تسلی دی تھی کہ ان کے کالج کا آخری سال تھا۔ ان ہی دنوں بڑی آپا کا ایک اچھا رشتہ آ گیا، ابا نے فوراً اِدھر اُدھر سے قرضہ لے کر آپا کو بیاہ دیا۔ ابھی ابا تھوڑا سا ہی سکون میں آئے تھے کہ بڑے بھائی کا کالج سے آتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ اسپتال جاتے جاتے ہی ہمیں چھوڑ گئے، یوں لگتا تھا کہ موت نے ہمارا گھر دیکھ لیا تھا۔ ابا یہ صدمہ سہار نہیں پائے اور چپکے سے انہوں نے بھی موت کو گلے لگا لیا۔ ہم لوگ اس پے در پے صدمے سے بالکل ہی نڈھال ہو گئے تھے۔ مالی مسائل بھی سر اٹھائے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی ابھی گھر میں تھیں۔ اب میں ہی اس گھر میں مرد بچا تھا۔ اس وقت میں انٹر کر چکا تھا۔ میرا آگے پڑھنے کا ارادہ تھا، مگر حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ملتوی کرنا پڑا۔ میں نے ابا کے دفتر میں ہی اپلائی کر دیا۔ خوش قسمتی سے نوکری مل گئی اور گھر کی گاڑی پھر چل پڑی۔ اب اماں اور دو بہنوں کی ذمے داری مجھ پر تھی۔ اماں بیمار رہنے لگی تھیں۔ میں تو سارا دن گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ شام کو جب واپس آتا تھا تو اماں اکیلی چارپائی پر لیٹی ہوتی تھیں اور دونوں بہنیں یا تو ٹی وی دیکھ رہی ہوتیں یا اپنے ہی کسی کام میں مشغول ہوتیں۔ میں جب کہتا کہ ”اماں کو بھی دیکھ لیا کرو۔“ تو وہ اتنا ترخ کر جواب دیتیں، جو باہر لیٹی اماں بھی سن لیتیں۔ اماں ابا نے بچے تو اتنے سارے پیدا کر لیے تھے، لیکن آپس میں پیار محبت کسی میں بھی نام کو نہ تھا۔ چھوٹے تھے لڑ جھگڑ کر ٹائم پاس ہوا اور بڑے ہوئے تو ایک دوسرے سے لاتعلق ہو گئے۔ ابا تو رہے نہیں تھے اور اماں کو یہ احساس بہت دیر سے ہوا، جب تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اماں شاید اور کچھ دن زندہ رہ جاتیں، اگر بیٹیں ان کا خیال کر لیتیں۔ شوہر اور دو بیٹوں کی جدائی اور بیٹیوں کی بدتمیزی نے اماں کو بھی جلد ہی ہم سب سے دور کر دیا۔ میں تو اتنا صدمے کی حالت میں تھا، لگتا تھا کہ کچھ نہیں بچا۔ ابا اماں ہی تو میرا سائبان تھے۔ وہ میرے ماں باپ تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بہنوں سے لپٹ کے روؤں یا بڑے بھائی مجھے گلے ہی لگا لیں، مگر وہ سب تو خانہ پری کے لیے ہی آئے تھے اور تو اور وہ بہنیں جو گھر میں تھیں، ایسا لگ رہا تھا کہ شاید وہ اماں کو بوجھ سمجھنے لگی تھیں جواب اتر گیا تھا۔ میں کئی دن خالی الذہنی کی تکلیف میں رہا۔ عمران میرے دوست نے مجھے بہت سہارا دیا۔ آہستہ آہستہ سب پھر پہلے جیسا ہونے لگا۔ میں صبح جب کام کے لیے نکلتا تو دونوں بہنیں سو رہی ہوتیں۔ میں پہلے ہوٹل جاتا، ناشتا کرتا، پھر آفس چلا جاتا، لنچ میں آفس میں ہی کرتا۔ شام کو گھر جاتا تو ایسا لگتا کہ دونوں کو میرا آنا ناگوار گزرتا۔ میں بھی کمرے میں ہی بند رہتا۔ میرا دل چاہتا کہ ہم لوگ مل بیٹھ کر باتیں کریں، کھانا کھائیں۔ اب وہ دونوں میری ذمے داری تھیں۔ میں نے پرائیویٹ گریجویشن کر لیا تھا اور پارٹ ٹائم جاب بھی کرنے لگا تھا، تاکہ زیادہ جلدی پیسے جمع کروں اور ان کی شادیاں کر سکوں مگر وہ لوگ تو کچھ اور ہی منصوبہ بنائے بیٹھی تھیں۔ ایک دن میرے سر میں درد تھا، میں جلدی چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ گھر آیا تو دیکھا گھر میں ایک لڑکا بیٹھا ہے اور وہ دونوں خوب ہنس ہنس کر بات کر رہی ہیں۔ میرے آنے پر وہ لڑکا تو گھبرایا لیکن ان کی دیدہ دلیری واضح نظر آئی کہ وہ گھبرائی نہیں، میرے پوچھنے پر صرف اتنا بتایا ”یہ منیر ہے۔“ منیر تو مجھے دیکھ کر ہی کھسک گیا۔ اب جب مجھے پتا چل ہی گیا اور منیر کو بھی گھر میں میری حیثیت کا اندازہ ہو چکا تھا تو وہ اکثر گھر میں نظر آنے لگا اور بڑے کر و فر سے بیٹھا رہتا۔ چھوٹی بہن نے بتایا کہ آپا اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں تو میں نے منیر سے بات کی۔ اس کے گھر والوں سے ملنے کا کہا تو معلوم ہوا اس کا کوئی نہیں، اس کو چچی نے پالا تھا۔ نوکری بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ کسی دکان پر سیلز مین تھا۔ میں نے منع کر دیا لیکن دونوں بہنوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ شادی اپنی مرضی سے کریں گی۔ میں نے جب کوئی چارہ نہیں دیکھا۔ محلے میں بھی باتیں ہو رہی تھیں۔ ابا کے ایک بہت اچھے دوست تھے۔ انہوں نے مجھے بلا کر سمجھایا تو میں نے بھی سادگی سے نکاح پڑھوا دیا۔ لیکن یہ تو الٹی مصیبت گلے میں پڑ گئی، کیوں کہ منیر نے بجائے میری بہن کو بیاہ کر لے جانے کے، وہ خود ہی ہمارے گھر رہنے لگا۔ میں نے اس پر کافی اس کو بُرا بھلا کہا، مگر یہاں تو میری بہن ہی اس کی حمایت کر رہی تھی۔ مجھے مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ مجھے تو اب چھوٹی کی فکر تھی۔ منیر مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ یہی بات جب میں نے بڑی سے کہی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی اور اتنا واویلا کیا کہ محلے

والے آ گئے۔ بڑی بہن نے الزام لگایا کہ میں ان تینوں کو نکال کر گھر پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ میری ماں جائی مجھ پر، اپنے بھائی پر یہ الزام لگا رہی تھی۔ کیا سگے بہن بھائی ایسے ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ماں باپ کے بعد ہم سب میں اعتماد اور محبت مضبوط ہو جائے گا، مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ دراصل ان تینوں کا مقصد مجھے وہاں سے ہٹانا تھا۔ یہ گھر ہمارے والدین کا تھا، جس پر سب کا حق تھا، مگر بڑے دونوں بھائی لاتعلق ہوئے تھے۔ آپا نے بھی حصہ لینے سے منع کر دیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے ابھی پتا چلی تھی۔ پتا نہیں یہ لوگ کب سے منصوبہ بنا رہے تھے۔ اب میں ہی ان کا کانٹا تھا، جس کو وہ دور کرنا چاہ رہے تھے۔ بڑی نے خوب مگرمچھ کے آنسو بہائے اور محلے والوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئی کہ اس کا میاں بے روزگار ہے، وہ کہاں لے کر جائے گا۔ اور اگر وہ چلی بھی گئی تو چھوٹی کا کیا ہوگا۔ کیوں کہ میں تو سارا دن ہوتا نہیں ہوں، اس لیے اس گھر میں ہم ہی رہیں گے۔ ہاشم خالو نے مجھے سمجھایا کہ بیٹا وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم برسرِ روزگار ہو، اپنے لیے کچھ نہ کچھ بنا ہی لو گے۔ یہ ”بے چاریاں“ کہاں کرائے کے گھر میں رلتی رہیں گی۔ تم یہ گھر ان دونوں کو ہی دے دو، جیسے تمہارے بڑے بھائی بہن دستبردار ہو گئے۔ مجھے مکان سے صرف اتنا لگاؤ تھا کہ یہ میرے ماں باپ کی نشانی تھا اور دوسری فکر مجھے چھوٹی کی تھی، مگر جب وہ دونوں کو میری ضرورت نہ تھی تو میں کیا کرتا۔ میں نے اپنے کپڑے اٹھائے اور در و دیوار پر آخری نظر ڈالتا ہوا گھر سے رخصت ہو گیا۔

☆......☆

اس سلسلے میں عمران نے میری بہت مدد کی اور اس نے اپنا یہ فلیٹ مجھے رہنے کو دے دیا۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ پہلے دو سال میں ایک دوست کے ساتھ رہا، پھر جب اس کے والد نے اس کی شادی کر دی تو مجھے وہ گھر چھوڑنا پڑا، پھر میں عمران کے فلیٹ میں آ گیا۔ عمران میرا بہت اچھا دوست تھا۔ اسی کے مشورے پر میں نے تعلیم حاصل کی تھی اور نوکری کے ساتھ ساتھ کوچنگ بھی لی تھی اور اب میں ایم۔ بی۔ اے کی تیاری کر رہا تھا۔ میری نوکری پکی ہو گئی تھی اور تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ اسی خوشی میں کپڑے اور مٹھائی لے کر گھر گیا تھا۔ معلوم ہوا وہ دونوں گھر بیچ کر کہیں اور چلے گئے ہیں اور اس کے لیے انہیں منیر نے ہی مجبور کیا تھا۔ اب میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے تو دونوں کو بہت سمجھایا تھا، مگر اب میرے پاس تو کوئی ان کا پتا بھی نہیں تھا۔ میں دل مسوس کر واپس آ گیا۔ میری زندگی کا یہ باب اب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔

☆......☆

میں نے اب خود کو فلاحی کاموں میں مصروف کر لیا تھا۔ کسی کو اسپتال کا مسئلہ ہوتا یا اسکول میں داخلے کا یا کسی کی شادی یا نوکری کا، میں پوری کوشش کرتا کہ ان کی مدد کر سکوں۔ اسی طرح مجھے بہت سکون ملتا تھا۔ بس کبھی کبھی اپنوں کی یاد ستاتی تو دل بے چین ہو جاتا۔ عمران مجھے شادی کرنے کا مشورہ دے رہا تھا، مگر میں انکار کیے جا رہا تھا۔ میں ان چکروں میں بھی نہیں رہا تھا اور اپنی بہنوں کے رویے کے بعد تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی لڑکی کیسے اعتبار کے قابل ہو گی۔ میں بغیر دیکھے کیسے شادی کروں۔ اگر وہ بھی میری بہنوں کے جیسی مزاج کی نکلی تو پھر کیا ہو گا۔ انہی الجھنوں میں وقت گزرتا رہا۔ فلاحی کاموں کے دوران مجھے کچھ بیوہ عورتوں اور مطلقہ عورتوں سے بھی واسطہ پڑا۔ میں ان عورتوں سے مل کر کافی حیران ہوا کہ اتنی اچھی سلجھی ہوئی محنتی عورتیں محض اپنے بچوں کی خاطر محنت مزدوری کرنے کو تیار تھیں۔ کم گو سادہ مزاج عورتیں۔ ان میں سے دو کو تو میں نے نوکری لگوائی اور ایک کو سلائی مشین دلا دی۔ ایک کے بچے کو اسکول میں داخلہ کرا دیا، پھر اچانک ہی میرے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ کیوں نہ میں ایسی ہی کسی بیوہ یا مطلقہ کا سہارا بن جاؤں۔ یہ تو کارِ ثواب تھا۔ جب عمران سے میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ پہلے خوب ہنسا، پھر سمجھانے لگا کہ بظاہر یہ بہت آسان ہے، مگر بہت مشکل ہوتی ہیں۔ میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ اگر کوئی ایسی عورت ملی جو خود بھی سہارے کی خواہش مند ہو گی تو میں اس کا ہاتھ تھام لوں گا۔ میری شخصیت عمران کے سامنے تھی، اس لیے وہ سمجھ گیا کہ میں نے یہ بات پوری سنجیدگی سے کی ہے، اس لیے پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔

☆......☆

ایک دن میں ایسے ہی عمران کو میسج کر رہا تھا کہ وہ غلطی سے کسی دوسرے نمبر پر چلا گیا، کیوں کہ جواب کچھ اور آیا۔ میں نے سوری کا میسج بھیجا، جواباً اُدھر سے بھی ہلکا پھلکا میسج آ گیا۔ میں اس دن نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ میں بھی برابر میسج کرنے لگا، حالاں کہ میں ان فضولیات سے دور ہی رہتا تھا، پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب میری روانہ میسج کے ذریعے بات ہونے لگی۔ پہلے تو وہ خود کو مرد ظاہر کر کے بات کرتی رہی، لیکن جب میری طرف سے کوئی بھی فضول میسج نہیں گیا تو پھر اس نے اپنا ادھورا سا تعارف کرا دیا۔ مجھے خیر اس کی کوئی کھوج نہیں تھی۔ وہ جیسے بات کرتی میں ویسے ہی اس کو جواب دیتا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ جو سچ تھا سب بتا دیا تھا۔ آواز سے مجھے وہ کافی ینگ لگی تھی اور میں سمجھا کہ شاید وہ کوئی ڈری سہمی سی لڑکی ہے، جس پر والدین سختی کرتے ہیں، کیوں کہ بقول اس کے کہ وہ چھپ کر بات کرتی ہے۔ وہ کافی سلجھی ہوئی گفتگو کرتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ پڑھی لکھی ہے۔

میرے حالات جان کر اس نے بھی مجھے شادی کا مشورہ دیا۔ جواباً جب میں نے اپنی مرضی بتائی تو وہ کافی حیران ہوئی، پھر اس نے بھی مجھے سمجھانے کی کافی کوشش کی، مگر میں نے ٹال دیا۔ ہمارے یہ صاف ستھری دوستی میسج کے ذریعے چلتی رہی۔ اب ہم کافی باتیں شیئر کرنے لگے تھے۔ وہ ایک کمپنی میں جاب کرتی تھی۔ میں نے اس کے مالی حالات کی وجہ سے کئی بار مدد کی پیش کش بھی کی جو اس نے منع کر دی، پھر جب اس نے بتایا کہ وہ بیوہ ہے اور دو بچوں کی ماں ہے تو مجھے اس سے سچ مچ ہمدردی ہو گئی۔ وہ واقعی بہت اچھی تھی۔ ان حالات میں بھی اس نے میری کسی پیش کش کا فائدہ نہ اٹھایا۔ بقول اس کے اسے صرف اچھے دوست کی تلاش تھی، جس سے وہ اپنے دل کا حال کہہ سکے۔ سال ہو گیا تھا، میں اب اس کا عادی ہو گیا تھا جس دن اس کا میسج نہیں آتا میرا دل کسی کام میں نہیں لگتا۔ میں نے اسے پرپوز کر دیا تھا، مگر اس نے انکار کر دیا کہ اس کا میرا کوئی جوڑ نہیں۔ میں سمجھا کہ وہ میرے غیر شادی شدہ اور اپنے بیوہ ہونے کی وجہ سے کہہ رہی ہے۔ میں نے اپنے گھر اور آفس کا پتا بھی اسے دے دیا، تاکہ وہ تسلی کر لے اور جیسے چاہے معلومات کر لے، مگر اس نے انکار ہی کیے رکھا۔ اب ہم فون پر بھی بات کرتے تھے۔ میں نے ملنے پر بہت اصرار کیا، مگر وہ نہ مانی۔ اب پھر میں نے عمران کو بتایا۔ حسب معمول اس نے مجھے کافی لتاڑا، مگر پھر میری سنجیدگی دیکھ کر اس نے مجھے تسلی دی کہ ”فکر نہ کر مان جائے گی، آخر تیرے جیسا بندہ اس کو کہاں ملے گا۔“

☆......☆

اسی طرح تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اچانک اس کا میسج اور فون آنا بند ہو گئے۔ کوئی جواب نہیں آ رہا تھا، کبھی نمبر بند اور کبھی مصروف، میں تو بالکل پریشان ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میرے پاس تو سوائے نمبر کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ تقریباً ایک ماہ بعد مجھے ایک لیٹر ملا، یہ اسی کا خط تھا، لکھا تھا۔

”محمود! مجھے آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا تھا۔ آپ ایک پڑھے لکھے انسان ہیں۔ میں آپ کے خلوص کی بہت قدر کرتی ہوں۔ آپ نے جو پیش کش مجھے کی تھی اس حوالے سے میں نے بہت سوچا، پھر آپ کے دیے گئے پتے پر میں نے آپ کو دیکھ بھی لیا۔ یقین جانیے آپ کسی بھی لڑکی کو خوش رکھ سکتے ہیں، پھر آپ یوں خوامخواہ خود کو کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ آپ نے مجھے نہیں دیکھا۔ مجھے سہارے کی ضرورت تو تھی، اسی لیے میں نے آپ کو چھپ کے دیکھ بھی لیا، لیکن پھر مجھے آپ کو دھوکہ دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں آپ سے عمر میں بہت بڑی ہوں اور مجھے ایک مچیور سہارے کی ضرورت ہے، گو کہ آپ کی باتوں سے مجھے آپ میچور ہی لگے، مگر عمر کا فرق بہرحال معنی رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی والدہ کے بتائے ہوئے ایک رشتے پر ہاں کر دی ہے اور ابھی پچھلے ہفتے ہی میرا نکاح ہوا ہے۔ اب میرا آپ سے رابطہ ناممکن ہے۔ میری آپ کے لیے دعائیں ہیں اور یہ گزارش بھی کہ آپ کسی اچھی اور اپنی ہم عمر لڑکی سے شادی کر لیں۔ والسلام۔“

خط پڑھ کر میں دل گرفتہ ہو گیا۔ پتا نہیں میرے خلوص اور محبت میں کہاں کمی تھی جو کوئی میرا بن ہی نہیں پاتا۔ میں تو اس کو بیوہ اور اپنی عمر سے بڑا ہونے کے باوجود قبول کر رہا تھا، کیوں کہ وہ پہلی عورت تھی جس کو میں نے سلجھا ہوا پایا تھا، لیکن شاید میں اس کے معیار پر پورا نہیں اترا تھا اور میری یہ محبت ادھوری ہی رہی، اب شاید میں کسی پر بھروسا نہ کر سکوں۔

☆......☆



ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ ”ناگن“۔ آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر 7

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سمے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آجائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آچکا تھا۔

وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔

لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آجاتی ہے اور کہتی ہے۔

”ارجن کے قاتلو! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔“

شگفتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

شگفتلا سمجھ جاتی ہے کہ مہاراج اس کے حسن کے جادو کا شکار ہو چکے ہیں وہ ان سے کہتی ہے کہ وہ اسے اپنی مہارانی بنالیں۔ رام ناتھ اور شگفتلا کے سات پھیرے آگ کے گرد مکمل ہو جاتے ہیں۔ شگفتلا مہارانی ماریہ کی خاص کنیز کوشیلیا کو کنیزوں کی سرداری سے برطرف کر دیتی ہے اور پریہ کو کنیز عالیہ بنا دیتی ہے۔ دوسری طرف ماریہ سامری جادوگر سے شگفتلا کے متعلق پوچھتی ہے، لیکن سامری جادوگر اسے کہتا ہے کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں اس کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے گرو کی روح سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ مہارانی اسے جلد از جلد شگفتلا سے نجات دلانے کا کہتی ہے۔ سامری جادوگر ماریہ سے شگفتلا کو شاہی محل سے نکالنے کا وعدہ کرتا ہے۔

سامری جادوگر اپنے گرو شداد جادوگر سے ملاقات کرتا ہے جو اسے کہتا ہے کہ وہ ناگن ہے اور ”تو سب کچھ چھوڑ ناگن سے ناتا جوڑ“ سامری یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ سامری شگفتلا سے ملاقات کرتا ہے اور اسے سانپ زادی کہہ کر مخاطب کرتا ہے مہارانی شگفتلا یہ سن کر سمجھ جاتی ہے کہ سامری اس کے راز کو جان گیا ہے۔ شگفتلا کہتی ہے کہ ”آؤ سامری ہم ایک ہو جائیں اور دونوں مل کر اس وسیع ریاست پر اپنی حکمرانی قائم کریں، میں سانپوں کی ملکہ ہوں اور تم جادوگروں کے بادشاہ، ہم دونوں بادشاہ اور ملکہ بن جاتے ہیں۔ سامری اسے کچھ دن بعد جواب دینے کا کہتا ہے۔ شگفتلا اپنی ملازمہ خاص پریہ کو بھی اپنی سچائی کے بارے میں بتاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ آج کے بعد میرے لیے نوجوان انسانی خون کی فراہمی تمہاری ذمے داری ہوگی۔ پریہ یہ سن کر بہت خوف زدہ ہوتی ہے۔ شگفتلا اس سے کہتی ہے کہ اگر یہ بات کسی کو پتا چلی تو وہ پریہ کا خون کر دے گی، دوسری صورت میں اسے تابانہ کی حکومت میں اعلیٰ عہدہ دیا جائے گا۔ پریہ مہارانی کے حکم کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔

مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شگفتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گروزائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شگفتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شگفتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شگفتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلکرام شگفتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ شگفتلا سامری جادوگر کو یاد کرتی ہے تو سامری جادوگر فوری حاضر ہو جاتا ہے۔ گروزائن بھی سامری سے خوف زدہ ہو کر فرار ہو جاتا ہے اور کلکتہ میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ اب سامری اور شگفتلا سے مقابلے کے لیے اسے کالی کے مندر میں ایک کنیا کا بلیدان کر کے تیرتھ جاپ نو دن کرنا تھا اور اس جاپ کے لیے نوجوان لڑکی کو کالی کے چرنوں میں قربان کرنا ضروری تھا۔

کالی کے مندر میں گروزائن کی نظر پندرہ سولہ سالہ دوشیزہ پر پڑتی ہے۔ وہ اس لڑکی کے بلیدان کا فیصلہ کرتا ہے اور اور جمل جاپ کا منتر الاپنے لگتا ہے۔ منتر مکمل ہوتے ہی وہ سب کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اور اسی عالم میں لڑکی کو دبوچ کر خنجر کی مدد سے اس لڑکی کی گردن پر وار کرتا ہے۔ اور اگلے ہی لمحے خون کالی کے چرنوں میں بکھرا ہوا تھا۔ بلیدان کا عمل مکمل کر کے وہ ناگن شگفتلا کو اپنا غلام بنانے کے لیے مندر سے ملحقہ شمشان گھاٹ میں جا پہنچتا ہے اور تیرتھ جاپ شروع کر دیتا ہے۔

سامری شگفتلا، بلکرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شگفتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شگفتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بن چکی تھی۔ کالی دیوی کے پیروں کے بجائے مہابیر اس کے قبضے میں تھے۔ پریہ اس کے لیے ہر روز ایک خوب صورت نوجوان مہیا کرتی۔

شگفتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شگفتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔

شگفتلا خسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گروزائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداد کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسکران سے ہوتی ہے۔ شگفتلا، شکران اور سامری تینوں گروزائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گروزائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خسکران دونوں کو لے کر کلکتہ سے دور لے جاتا ہے اور ان دونوں سے کہتا ہے کہ میں اپنی سلطنت واپس جا کر اپنے باپ اور دوسرے عقلمندوں سے اس بارے میں مشورہ کرتا ہوں۔ سامری بھی اپنے گرو شداد جادوگر سے رابطہ کرنے کے لیے شگفتلا کو اکیلا چھوڑ جاتا ہے۔ شگفتلا اپنے بیر چنکار کو حاصل کرتی ہے اور اس سے انسانی خون طلب کرتی ہے۔ چنکار بتاتا ہے کہ جس گھر میں آپ موجود ہیں اس گھر میں زندہ انسان موجود ہیں جو اس گھر کے مالک ہیں اور خسکران نے انہیں قید کر رکھا ہے۔ گروزائن کو شگفتلا کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ مہاپنڈت لکشم ناتھ سے اس سلسلے میں مدد طلب کرتا ہے۔ مہاپنڈت شگفتلا سے فائدہ اٹھانے کے وعدے پر اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شگفتلا گھر میں ہی قید نوجوان سلیمان کے خون سے اپنی بھوک مٹاتی ہے اور اس کی بہن رقیہ اور بیوی کنیز فاطمہ پر تشدد کرتی ہے۔ گروزائن اور لکشم ناتھ شگفتلا دیوی تک پہنچ جاتے ہیں۔ گروزائن شگفتلا کو کہتا ہے کہ وہ اپنے مہابیروں کو حکم دے کہ وہ ہم سب کو ریاست کلکتہ کالی ماتا کے استھان کے اندر لکشم ناتھ کے کمرۂ خاص میں لے چلیں۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

شگفتلا تذبذب کے عالم میں تھی۔ اب اس کے سر کو درد نہیں ہو رہا تھا، لیکن اس کو زبان سے گروزائن کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس وقت سامری اور خسکران آ جائیں اور اس مصیبت کا کوئی اپائے کریں، ورنہ تو میں بے موت ماری جاؤں گی۔ میری حیثیت قید صیاد میں پھڑکتی بلبل کی مانند ہو جائے گی۔ ابھی سوچا ہی تھا کہ دماغ میں درد کی لہریں ہولے ہولے اٹھنے لگیں اور آہستہ آہستہ ان کی شدت بڑھنے لگی، جیسے کوئی ان دیکھی شکتی اسے گروزائن کا حکم ماننے پر مجبور کر رہی ہو۔ درد میں پھر شدت آنے لگی۔ شگفتلا سر پر ہاتھ رکھ کر سسکنے لگی اور پھر انہی سسکیوں کے درمیان مجبور ہو کر بولی۔

”چنکار......!“

”جی مالکن۔“ چنکار کی آواز آئی...... ”گروزائن نے جیسا کہا ہے ویسا اس پر عمل کرو......“ یہ کہتے ہوئے شگفتلا بے بسی سے باقاعدہ رونے لگی۔

”مالکن آپ ان دونوں کے ہاتھ پکڑ لیں۔“ شگفتلا آگے بڑھ کر گروزائن اور لکشم ناتھ کے درمیان کھڑی ہوگئی اور



دونوں کے ہاتھ تھام لیے۔ اچانک گھپ اندھیرا چھا گیا اور پھر گروزائن کو یوں محسوس ہوا کہ پاؤں کے نیچے سے سخت فرش ہٹ گیا ہو اور نرم گدا کسی نے بچھا دیا ہو۔

اندھیرا چھٹنے لگا۔ روشنی پھیلنے لگی۔ اچانک گروزائن کے منہ سے نکلا۔

''ارے لکشم ناتھ ہم واپس کلکتہ آ گئے...... یہ تو تمہارا کمرۂ خاص ہے۔''

لکشم ناتھ نے سر گھما کر دیکھا تو واقعی یہ کمرۂ خاص ہی تھا۔

''ہاہاہاہاہاہا...... ہوہوہوہوہو...... گروزائن اب بہت بڑی طاقت ہے۔ گروزائن کی شکتیاں لامحدود ہیں۔'' گروزائن خوشی سے پاگل ہو کر ناچنے لگا۔ ''آؤ لکشم ناتھ تم بھی ناچو یار...... تمہاری سہائتا کے بغیر میں اپنے مقصد میں اتنی جلدی سپھل نہ ہوتا......'' دونوں خوشی سے ناچ رہے تھے اور شکنتلا ایک طرف سر جھکائے کھڑی تھی۔ رقیہ اور کنیز فاطمہ پر کوڑے برستے وقت چہرے پر جو خوشی، رعونت اور فاخرانہ پن تھا۔ اب وہ اڑنچھو ہو چکا تھا، وہ اس وقت حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

ناچتے ناچتے گروزائن نے شکنتلا کو آگے بڑھ کر دبوچ لیا اور اپنی بانہوں میں کسنے لگا۔ ''اب تو میری ہے تیری شکتیاں بھی میری ہیں۔'' گروزائن نے شکنتلا کو بانہوں میں اٹھا لیا...... ''لو، لکشم ناتھ عیش کرو۔'' یہ کہتے ہوئے گروزائن نے شکنتلا کو ہوا میں اچھال کر پھینکا تو لکشم ناتھ نے اسے ہوا میں ہی دبوچ لیا اور اس کے سرخ و سپید گالوں پر اپنے بھدے ہونٹ رکھ دیے۔

کافی دیر ناچنے کے بعد دونوں پسینے سے شرابور ہو کر بیٹھ گئے اور ہانپنے لگے۔ ''شکنتلا ہمارے لیے شراب منگواؤ......''

''چنکار...... '' شکنتلا سر جھکائے افسردگی سے بولی۔ ''شراب لاؤ۔'' چھن کی آواز کے ساتھ چاندی کی صراحی اور دو بلوریں جام نمودار ہو گئے۔ دونوں پجاری تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

''شکنتلا ہمارے لیے جام بھرو۔'' گروزائن نے اسے حکم دیا۔

طوعاً و کرہاً شکنتلا اٹھی اور جام بھرنے کے بعد دونوں کو پیش کرنے لگی۔ لکشم ناتھ بولا۔ ''گروزائن...... شراب بھی حاضر ہے اور دنیا کا حسین ترین شباب بھی۔ آج رات ہم جشن فتح منائیں گے۔ شراب اور شکنتلا کے شباب کے ساتھ۔'' یہ کہہ کر لکشم ناتھ نے کمر میں ہاتھ ڈال کر شکنتلا کو اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

گروزائن بھی آگے بڑھ آیا اور شکنتلا کے کھلے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا تو سسکی کے ساتھ شکنتلا کے آنسو نکل آئے...... لیکن مجبور تھی اور یوں رات گزرتی رہی اور شکنتلا دو کتوں کے درمیان ایک ہڈی کی مانند کبھی اس کے منہ اور کبھی اس کے منہ جانے لگی۔ ریاست تابانہ کی ملکہ کی مٹی پلید ہو رہی تھی...... وقت کا پہیہ الٹا چل پڑا تھا۔ اسی کا نام مکافات عمل ہے۔

☆......☆

صبح کی سپیدی نمودار ہونے تک شکنتلا تھکن سے چور ہو چکی تھی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ دونوں پجاری اس وقت نرم قالین پر بے سدھ سوئے ہوئے تھے۔ شکنتلا نے ہولے سے چنکار کو طلب کر کے کہا۔

''چنکار مجھے یہاں سے اتنی دور لے جا کہ یہ دونوں وہاں نہ پہنچ سکیں۔'' چنکار سر جھکا کر بولا۔ ''مالکن اب میں آپ کا وہی حکم مان سکتا ہوں جس کی اجازت گروزائن نے آپ کو دی ہو۔'' اس کے یہ الفاظ سن کر شکنتلا بھونچکا رہ گئی۔ اس کے بعد اس نے سانپ بننے کی کوشش کی تاکہ ان کا خون پی لے، لیکن یہ کیا؟ وہ انسان ہی رہی، کئی دوسرے جانداروں کا خیال ذہن میں لا کر اس نے فرار ہونے کا سوچا، لیکن غالباً شکنتلا کی تمام طاقتیں اب گروزائن کے حکم کے تابع ہو چکی تھیں۔ وہ اب صرف ایک عام اور کمزور لڑکی بن کر رہ گئی تھی جو گروزائن کی باندی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر فرار ہونے کی کوشش کی لیکن چنکار سامنے آ گیا اور بولا۔ ''مالکن مجھے گستاخی پر مجبور نہ کریں۔ آپ گروزائن کی مرضی کے خلاف یہاں سے نہیں جا سکتیں۔''

شکنتلا کا دل بے اختیار بھر آیا اور وہ اونچی آواز میں زار و قطار رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر گروزائن کی

آنکھ کھل گئی۔ شکنتلا کو روتے دیکھ کر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔

''ملکہ عالیہ شکنتلا......! جس کی ایک جنبش ابرو پر زندگیوں کے فیصلے ہو جاتے تھے آج رو رہی ہے آ...... ادھر آ میرے پاس......'' لیکن شکنتلا بیٹھی مسلسل روتی رہی۔

''شکنتلا!'' گروزائن دھاڑا تو شکنتلا ایک دم خاموش ہو کر اسے تکنے لگی...... ''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میرے پاس آؤ......'' شکنتلا اٹھ کر بے دلی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ گروزائن بھی کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی شکنتلا اس کے قریب آئی، اس نے فوراً ہی اس کی زلفیں مروڑ کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیں۔ شکنتلا نے درد کی شدت سے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ گروزائن نے حقارت سے اس کے بال اپنی مٹھی میں پورے زور سے جکڑ رکھے تھے۔ بال گروزائن کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے شکنتلا کا سر جھکا ہوا تھا۔ گروزائن شکنتلا کو اسی حالت میں لیے کمرے میں قدم قدم چلنے لگا۔

''آج کے بعد تجھے چند باتیں یاد رکھنی ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ تو میری غلام ہے۔ میرا ہر حکم پہلی آواز پر مانے گی اور دوسری یہ کہ کھانا تو اس وقت کھائے گی جب گروزائن چاہے گا۔ آرام تو میری مرضی سے کرے گی۔ سن لی تو نے میری باتیں؟'' گروزائن اس کی زلفوں کو زور سے جھٹک کر بولا۔

''ج...... جی۔'' شکنتلا کی سسکتی ہوئی آواز نکلی۔

''اور مجھے صرف آقا کہہ کر مخاطب کرے گی، بول جی میرے آقا۔''

''جی میرے آقا۔'' شکنتلا نے بال کھنچے ہوئے ہونے کی وجہ سے شدید درد سے لاچار ہو کر کہا۔

''تو ایسی کمینہ خصلت عورت ہے کہ جس راجہ نے تجھے پناہ دی اور پھر تیرے ساتھ شادی کی، تو نے اس کا تختہ الٹ دیا، پھر اسے چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پوری ریاست تابانہ میں تو نے ظلم و بربیت کا بازار گرم کر دیا۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر سیکڑوں انسان تو نے بے بسی کی موت مروائے۔ تیری ساری باتوں کا مجھے پتا چلتا رہتا تھا۔ دوسروں کی تکلیف پر تو خوش ہوتی تھی اور اب صرف اپنے بالوں کی تکلیف سے تیرے آنسو نکل رہے ہیں۔'' گروزائن نے اس کا چہرہ اپنے منہ کے سامنے کر کے کہا۔

شکنتلا کا خوب صورت چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی ساری شکتیاں معطل ہو چکی تھیں اور وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی جس کے بال ایک ہٹے کٹے مرد نے پکڑ رکھے تھے۔ لکشم ناتھ بھی جاگ چکا تھا اور گروزائن کی باتیں سن رہا تھا۔

''چھوڑو یار گرو...... کوئی ناشتا منگواؤ......'' لکشم نے آواز لگائی تو گروزائن نے اس کے بال چھوڑ دیے اور لکشم کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''لکشم ناتھ تو اس کو نہیں جانتا۔ یہ ناگن ہے انسانی خون میں غسل کرنا اس کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہر وقت عیش و عشرت کرنا اور انسان کو اذیت ناک موت سے ہمکنار کرنا اس کا من پسند مشغلہ ہے۔ اب میں اس کو جیون کا وہ رُخ دکھاؤں گا کہ اس کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔''

''شکنتلا......'' گروزائن نے آواز لگائی۔

''جی......'' شکنتلا آنسو صاف کرتے ہوئے بھرائی آواز میں بولی۔

''ہمارے لیے بہترین ناشتے کا بندوبست کرو۔''

''چنکار......''

''جی مالکن......''

''ناشتا لاؤ......'' پلک جھپکتے ہی قالین پر پرتکلف ناشتا حاضر تھا۔

''شکنتلا'' گروزائن غرایا۔

''جی میرے آقا......''

”چنکار سے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکن نہ کہے بلکہ براہ راست میرا حکم مانے۔“
”چنکار...... مجھے مالکن نہ کہا کرو بلکہ گروزائن میرے آقا کی آواز پر عمل کیا کرو۔“
”جی اچھا......“
”چنکار“
”جی میرے آقا......“ بہت خوب گروزائن مسرت سے بولا۔
”ایک کوڑے سے شکنتلا کو خوب مارو، لیکن اس کی چیخیں ہمارے سوا کوئی نہ سن پائے۔“
یہ حکم سنتے ہی شکنتلا کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں اور وہ دوڑ کر گروزائن کے قدموں سے لپٹ گئی۔
”معاف کردو میرے آقا، میں آپ کی باندی ہوں، آپ کا ہر حکم فوراً مانوں گی، مجھ پر دیا کرو۔“ لیکن شڑاپ کی آواز کے ساتھ شکنتلا کی چیخ نکل گئی۔ کوڑا اس کے وجود کو سرخ کرتا گیا۔ درد کی شدید لہر اس کے پورے بدن میں دوڑ گئی، گروزائن نے اس کی آہ وزاری پر قطعاً کوئی توجہ نہ دی اور لکشم ناتھ کو مسکرا کر ناشتا کرنے کا اشارہ کیا اور دونوں تسلی سے ناشتا کرنے لگے۔ چنکار سرعت سے کوڑے برسانے لگا۔ شکنتلا کمرے میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ اس کی دلدوز چیخوں سے کمرہ گونج رہا تھا، لیکن اس کی آواز باہر کسی کو نہ سنائی دے رہی تھی۔ وہ بار بار گروزائن کے قدموں میں گر رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ رہی تھی، لیکن نہ تو گروزائن نے کوئی توجہ دی اور نہ ہی چنکار کا ہاتھ رکا اور شکنتلا اپنے ہی خون میں لہولہان ہوتی رہی۔ آج اس کو تکلیف کا باقاعدہ احساس ہوا تھا اور یہ پتا چلا تھا کہ لوگ درد سے کیوں چلاتے ہیں۔
ناشتا کر چکنے کے بعد گروزائن نے چنکار کو بس کرنے کا حکم دیا تھا۔ شکنتلا کا تمام لباس پھٹ چکا تھا۔ سارا جسم زخموں سے چور تھا اور وہ کمرے کے فرش پر پڑی اپنے زخم چاٹ رہی تھی اور بُری طرح تڑپ رہی تھی۔
”چنکار“
”جی میرے آقا“
”اس کی تکلیف ختم کردو۔“
اور پھر اگلے ہی لمحے شکنتلا کی تمام تکلیف ختم ہوگئی اور زخم بھر گئے تو شکنتلا نے سکھ کا گہرا سانس بھر لیا۔
”شکنتلا......!“
”جی......“ گروزائن کی آواز سن کر وہ فوراً بولی۔
”اپنا لباس انتہائی خوب صورت کرلو۔“ حکم سن کر شکنتلا نے لوٹ لگائی اور ناگن بن گئی، پھر لوٹ لگائی تو انتہائی شاہانہ لباس میں نکھرے نکھرے حسن کے ساتھ موجود تھی۔ بکھری زلفوں سے جھانکتا گلابی چہرہ لکشم اور گروزائن کو پاگل بنا رہا تھا۔ دونوں ناشتا ختم کرکے اس کی طرف بڑھے اور شکنتلا ان دونوں کے درمیان پھر کھلونا بن گئی۔

☆......☆

سامری جب واپس وادی والے مکان میں پہنچا تو شکنتلا موجود نہ تھی۔ رقیہ، کنیز فاطمہ اور اسد اللہ اُداس بیٹھے سلیمان کی دردناک موت کا ماتم کررہے تھے۔
سامری کو اچانک سامنے پاکر تینوں سہم گئے اور سوچنے لگے کہ الٰہی خیر ہو کہیں دوبارہ کوئی مصیبت تو نہیں آنے والی۔ سامری دروازے میں کھڑا تینوں کو گھورنے لگا اور بولا۔
”شکنتلا کہاں ہے؟“
”ہمیں کچھ پتا نہیں بیٹا میں تو پنجرے میں بند تھا کہ اچانک ہی پنجرہ غائب ہوگیا۔ وہاں سے اٹھ کر اس کمرے میں آیا تو بہو اور بیٹی کو لہولہان پایا۔ صبح تک بڑی مشکل سے انہیں ہوش آیا تھا۔ انہی کی زبانی پتا چلا کہ شکنتلا نے رات کو عجیب الخلقت مخلوق سے ان دونوں بے چاریوں کو کوڑوں سے پٹوایا۔ مار کھا کر یہ دونوں بے ہوش ہوگئیں اور کسی بات کا ہمیں کچھ پتا نہیں۔ ہم غریب مظلوم لوگ ہیں۔ ہم نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا، پھر تم لوگ کیوں ہمیں تنگ کرتے ہو؟“

”بکواس نہ کر بڈھے ورنہ خون پی جاؤں گا تیرا۔“ سامری نے غصے سے کہا اور پھر غائب ہوگیا۔ دونوں لڑکیاں چیخنے لگیں۔ بوڑھے اسد اللہ نے آگے بڑھ کر دونوں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی آیت الکرسی کا ورد شروع کردو، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔“
اور پھر سب مل کر آیت الکرسی پڑھنے لگے اور دم کیا ہوا پانی گھر کے ہر کونے میں چھڑکنے لگے۔

☆......☆

سامری سمجھ گیا تھا کہ کسی طریقے سے گروزائن کے آنے کی اطلاع پاکر شکنتلا کہیں روپوش ہوگئی ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے سامری نے کلکتے کالی کے مندر میں پہنچنے کا فیصلہ کیا اور سیدھا مندر کے شمشان گھاٹ میں نمودار ہوا۔ اس نے سوچا کہ شکنتلا کی خبر لینی چاہیے۔ رات اس کے گرو کی بدروح نے اسے تنبیہ کردی تھی کہ پرائی آگ میں چھلانگ لگانے سے پہلے اس کی حدت کا اندازہ کرلینا، کیوں کہ شکنتلا کے مہابیر آپس میں ٹکرائیں گے اور گروزائن تو اوجھل جاپ سے غائب ہوجائے گا نقصان شکنتلا کا ہوگا یا پھر سامری کا...... لہٰذا سامری نے کالی کے مندر میں ظاہر ہوکر گروزائن اور شکنتلا کی دور سے نگرانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے مندر کی طرف چل دیا۔ مندر کی سیڑھیوں کے قریب آکر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا اور آہستہ آہستہ مندر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ جوں جوں سیڑھیاں چڑھتا جاتا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی۔
”سامری واپس چلو......“ اچانک اس کے مہابیر نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ سامری چونک اٹھا اور واپس مڑنے ہی لگا تھا کہ ایک بھاری جسم اچانک ہی پیچھے سے اس کے اوپر آگرا اور سامری سے لپٹ گیا۔ سامری اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور بھاری جسم کے ساتھ ہی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکنے لگا اور اس سے قبل کہ سامری کچھ اپائے کرتا اچانک اسے زوردار چبھن کا احساس ہوا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆......☆

پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے ہیں نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا خسکران کی بھی کوئی خبر ہے۔ پریہ کو یہ پتا تھا کہ گروزائن کوئی عمل کرکے شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ پہلی دفعہ شکنتلا کے سر میں شدید درد جب اٹھا تو اس وقت صرف پریہ ہی موجود تھی۔ ہوسکتا ہے شکنتلا غلام بن گئی ہو، لیکن سامری اور خسکران کو تو واپس آنا چاہیے۔ شکنتلا کا غلام بن جانا ہی بہتر ہے۔ اس نے دل میں سوچا، تاکہ میں کسی طریقے سے حکومت پر قبضہ کرلوں، کیا میں ملکہ بن سکتی ہوں؟ اس نے سوچا۔ ایسا ہوجائے تو مزے ہوجائیں۔ مجھے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے شکنتلا واپس نہ آئے۔ ابھی تک تو کسی کو نہیں پتا کہ وہ کہاں گئی ہے، اسی لیے حکومت کے تمام اہل کار اور درباری ابھی تک اسی کی عزت کرتے اور اس سے ڈرتے ہیں۔ سب کو پتا تھا کہ یہ شکنتلا کی نائب ہے۔ پورے محل اور دربار میں شکنتلا کے بعد اسی کا ہی سکہ چل رہا تھا۔ اس وقت پریہ اپنا وسیع وعریض سجی سجائی خوب صورت خوابگاہ میں موجود تھی۔ شام کا وقت تھا۔ وہ خوب صورت زرق برق لباس میں آرام دہ تخت پر نیم دراز تھی۔ دو کنیزیں مورچھل جھل رہی تھیں اور دو زمین پر بیٹھی اس کے پاؤں داب رہی تھیں۔ پریہ اعلیٰ درجے کی شراب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ گردن غرور سے اکڑی ہوئی تھی۔ درجنوں کنیزیں اور غلام کمرے کی دیوار کے ساتھ کسی بھی حکم کے منتظر مؤدب کھڑے تھے۔ کمرے کے درمیان دن بھر مختلف غلطیاں کرنے والے غلام اور کنیزیں مرغا بنے ہوئے تھے اور ان کی پشت پر وزنی پتھر رکھے گئے تھے۔ یہ عمل خاصی دیر سے جاری تھا۔ جیسے ہی کوئی سسکتا یا آہ بھرتا، قریب کھڑا ایک ہٹا کٹا غلام اس کے عریاں بدن پر ہنٹر برسا دیتا۔ درد کی شدت سے وہ بلبلا اٹھتے اور پریہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ اس کی جان تب ہی چھوٹتی جب پریہ کا جی اس منظر سے بھر جاتا۔
اب صرف کملا اور پونم اس کے پاس رہ گئیں۔ پریہ تخت سے اٹھ کر اپنے نرم ریشمی بستر کی طرف چل دی جس کے تین اطراف چھت سے فرش تک تازہ پھول اور کلیاں پرو کر لٹکائی گئی تھیں۔ کمرے میں خوشبو بکھیر کر رومانی ماحول پیدا کررہی تھی۔ پریہ کے بستر پر بیٹھتے ہی پونم فوراً جھکی اور اس کے پاؤں سے سونے کے کام والے جوتے اتارنے لگی۔ کملا نے پریہ

کے پاؤں اٹھا کر بستر کے اوپر رکھ دیے۔

''اس نوجوان کو ہماری خواب گاہ کے اندر بھیج کر کواڑ بند کر دو اور تم دونوں ہمارے کسی بھی حکم کی تعمیل کے لیے باہر کھڑی رہو۔''

''جی بہتر۔''

پونم اور کملا دونوں پریہ کو فرشی آداب کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد ایک دراز قد گوری رنگت سیاہ کالی آنکھوں اور لمبے بالوں والا بیس بائیس برس کا سہما ہوا لڑکا خواب گاہ کے اندر داخل ہوا۔ پریہ شراب کا جام پکڑے تکیے کے ساتھ پشت لگائے پُر اشتیاق نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ لڑکا پریہ کو دیکھ کر مزید سہم گیا اور وہیں دروازے کے پاس ہی ساکت ہو گیا۔

''ادھر آؤ لڑکے......'' پریہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو لڑکا ہولے ہولے لرزنے لگا۔ پریہ کو دیکھ کر وہ بُری طرح خوفزدہ ہو چکا ہے۔

''ہمارا حکم تم نے سنا نہیں! ادھر آؤ۔'' پریہ نے مزید بارعب انداز میں کہا تو لڑکا تیز تیز چلتا ہوا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکا بلکہ جوان مرد خوف سے بُری طرح کانپ رہا تھا۔

پریہ اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی پرتھوی......''

''میرا نام تجھے معلوم ہے؟''

''جی نہیں......'' نوجوان اب بھی خوفزدہ تھا۔

''میرا نام پریہ ہے......'' پھر پوری تمکنت سے مسہری پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں تابانہ کی نائب ملکہ اور اپنی مرضی کی آپ مالک ہوں۔ میں چاہوں تو ابھی جلاد بلا کر یا خود خنجر کے ساتھ تیری بوٹی بوٹی الگ کر دوں...... اور چاہوں تو اپنا خوب صورت جسم تجھے سونپ دوں اور اس کے بعد تمہیں رہا بھی کر دوں، لہٰذا جیسے میں کہتی جاؤں ویسے کرتے جاؤ۔''

''جی بہتر......'' نوجوان کی کچھ ڈھارس بندھی۔ اب وہ پریہ کا مطلب کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔

پریہ چند لمحے اسے خمار آلود نگاہوں سے تکتی رہی اور پھر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

اور پھر...... کب صبح ہوئی پریہ اور پرتھوی دونوں کو پتا نہ چلا۔

☆......☆

پریہ کی جب آنکھ کھلی تو باہر سے کنیز ہولے ہولے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ پرتھوی اوندھے منہ لیٹا گہری نیند سویا ہوا تھا اور باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں سے صبح کا اجالا چھن چھن کر آ رہا تھا۔

پریہ بستر سے نیچے اتری اور ہلکے ہلکے قدم چلتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ دروازے کے قریب بھی نہ پہنچی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اس کو دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر فضا میں بلند کر دیا۔ اس نے ایک دم گردن موڑ کر دیکھا...... تو مارے خوف کے اس کی سٹی گم ہو گئی۔

☆......☆

شکنتلا کی جان عجیب عذاب میں پھنس گئی تھی۔ گروزائن اور لکشم کو اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ رات سے لے کر اب دوپہر تک وہ ایک ہی راگ الاپتے رہے تھے۔ اب بھی شکنتلا چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہی تھی اور بار بار ہاتھ جوڑے جا رہی تھی۔ رات سے اب تک گروزائن نے اس کو کھانے کے لیے بھی کچھ نہ دیا تھا۔ بھوک سے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا وہ تو بھوک سے پہلے کھانے کی عادی تھی۔ پیاس سے اس کے ہونٹوں پر خشکی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

''میرے آقا......'' شکنتلا عاجزی سے گروزائن سے مخاطب ہوئی۔

''میرے آقا مجھے کھانے کو کچھ دو، بھوک سے میرا بُرا حال ہو رہا ہے۔''

''اچھا ملکہ عالیہ؟'' گروزائن طنزیہ لہجے میں بولا۔

''تو مجھے کھا لو...... تم تو انسان کا انسان کھا جاتی ہو......''

''نہیں آقا......!'' شکنتلا اس کے پیروں پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

''مجھ پر دیا کرو، اب تو میں تمہارے قبضے میں ہوں، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''تُو جا بھی کہاں سکتی ہے؟'' گرو اس کی پتلی کمر کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

''اور کھانے پینے کو تو تجھے کل صبح ہی مل سکتا ہے، تجھے احساس بھی تو ہو کہ جن لوگوں کو تو بھوک اور پیاس کی اذیت سے قتل کرتی رہی ہے، ان کو کیسی تکلیف ہوتی تھی۔ میں تجھے ہر وہ تکلیف دوں گا جو تو دوسروں کو دیتی رہی ہے۔'' یہ باتیں ابھی وہ کر ہی رہے تھے کہ چنکارا ایک دم ظاہر ہو گیا اور تیزی سے بولا۔

''مالک۔ سامری مندر کی طرف شکنتلا کی تلاش میں آ رہا ہے۔'' اس کی بات سنتے ہی شکنتلا کی آنکھوں میں اُمید کی کرن چمکی، لیکن گروزائن فوراً کھڑا ہو گیا اور گرج کر بولا۔ ''آج سامری بچ کر نہیں جا سکتا۔ چنکارا سب مہابیر اس کا راستہ روکنے پر مامور کر دو۔''

''مالک'' چنکارا ادب سے بولا۔

''سامری بہت بڑا جادوگر ہے اور اس کے قبضے میں بھی بڑے مہابیر ہیں۔ ہمارا فتح یاب ہونا بہت مشکل ہے۔ البتہ آپ شکنتلا کو حکم کریں کہ وہ چھپ کر اس پر وار کرے اور اسے ڈس لے۔ زہر کے اثر سے وہ بے ہوش ہو جائے گا اور آپ اس کو با آسانی قابو کر لیں گے۔'' چنکار نے مشورہ دیا۔

''واہ...... چنکار واہ'' گروزائن نے مسرت کا اظہار کیا۔

''اس سے اچھی ترکیب ہو ہی نہیں سکتی۔''

''شکنتلا۔''

''جی میرے آقا......؟'' شکنتلا نہ چاہتے ہوئے بھی کھڑی ہو گئی۔

''تم فوراً ایک مکھی کا روپ دھار کر مندر کی سیڑھیوں پر پہنچ جاؤ اور جیسے ہی سامری قریب آئے ایک بہت بڑے اژدہے کا روپ دھار کر اس کے اوپر جا گرو اور اس کو ڈس لو...... سامری کا مرنا آسان نہیں لیکن وہ ہوش سے بیگانہ ہو جائے گا۔''

شکنتلا کی خواہش تھی کہ سامری پہنچ جائے اور اس کو آزاد کرائے، اس لیے وہ تاخیر کرنے لگی، لیکن فوراً ہی اس کے دماغ کی رگوں میں شدید کھنچاؤ پیدا ہوا۔ اس کو سامری یاد نہ رہا اور اس کو رگیں پھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں، لہٰذا اس نے فوراً لوٹ لگائی اور ایک مکھی بن کر کمرے میں اڑنے لگی۔ چنکار نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ''شکنتلا میری ہتھیلی پر بیٹھ جاؤ۔'' یہی وہ وقت تھا جب سامری سیڑھیاں چڑھنا شروع کر چکا تھا۔ شکنتلا مکھی کے روپ میں سامری کی طرف بڑھنے لگی۔ اسی وقت سامری مہابیر کی آواز سن کر نیچے کی طرف پلٹا، لیکن شکنتلا پھرتی سے بہت بڑے اژدہے کی شکل میں آ کر سامری کے اوپر آ گری اور اس سے پہلے کہ سامری سنبھلتا شکنتلا نے تیزی سے اس کے شانے میں دانت گاڑ دیے۔ سامری کے جسم میں کثیر مقدار میں زہر داخل ہو گیا جس کے اثر سے وہ فوراً بے ہوش ہو گیا۔

اژدہے کی اچانک آمد اور ایک آدمی پر حملے سے مندر کی سیڑھیوں پر آتے جاتے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بھگدڑ میں چنکار نے بے ہوش سامری کا ہاتھ تھاما۔ اس کے ساتھ ہی شکنتلا نے لوٹ لگائی اور دوبارہ مکھی بن کر چنکار کے دوسرے ہاتھ پر بیٹھی۔ لمحوں کے بعد یہ تینوں دوبارہ لکشم ناتھ کے کمرے میں موجود تھے اور مندر کی سیڑھیوں پر صرف چہ میگوئیاں رہ گئی تھیں۔ لکشم ناتھ اور گروزائن بے ہوش سامری کو اپنے قدموں میں پا کر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ شکنتلا ایک بار پھر انسانی روپ میں کمرے کے کونے میں ہاتھ باندھ کر باادب اُداس کھڑی ہو گئی۔

''بڑا جادوگر بنا پھرتا ہے......'' گروزائن فخریہ لہجے میں بولا۔

''لیکن اونٹ جب پہاڑ کے نیچے سے گزرتا ہے تو اس کو معلوم پڑتا ہے اس سے بلند چیزیں بھی دنیا میں موجود ہیں۔

ہر نبلے کے لیے دہلا موجود ہوتا ہے اور دیکھ شکنتلا۔'' گروزائن اس کو بالوں سے پکڑ کر بولا۔''آج تیرا خاص یار بھی میرے قدموں میں ہے۔ اب میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ اس کی آتما بھی نرکھ میں بلبلاتی رہے گی اور کون کون ہے تیرا یار...... جلدی بتاؤ۔'' گروزائن شکنتلا کے بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولا۔ تکلیف اور بے بسی سے شکنتلا کے آنسو نکل آئے۔ اس سے زیادہ بے بس وہ کبھی نہ ہوئی تھی۔ گروزائن کام بھی سارے اس سے ہی مکمل کرواتا اور ذلیل وخوار اور زدوکوب بھی کرتا، شکنتلا کی دماغی کیفیت ایسی ہو چکی تھی کہ گروزائن کے کسی سوال کا صحیح جواب نہ دینا اس کے بس میں نہ تھا، اس کے ہونٹوں اور ذہن پر سے اس کا اپنا کنٹرول ختم ہو چکا تھا۔

''جلدی بتا...... کتیا...... اور کون ہے تیرا یار؟''

''جی...... حشکران......'' شکنتلا کو نہ چاہتے ہوئے بھی بتانا پڑا۔

''یہ کون ہے؟''

''یہ ایک جن ہے میرے آقا اور یہ میرا گہرا دوست ہے۔''

''ہوں......'' گروزائن اس کے بالوں کو چھوڑتے ہوئے بولا۔

''اس کا مطلب ہے وہ بھی ضرور حملہ آور ہوگا۔''

اور شکنتلا اس کی باتیں سن کر تھرا اٹھی، کیوں کہ اب صرف حشکران ہی اس کے لیے امید کی واحد کرن تھا۔ اگر وہ بھی گروزائن کے ہتھے چڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر ہی شکنتلا کا دل ڈوبنے لگا۔

''گروزائن یہ کیا؟'' اچانک لکشم ناتھ کی آواز گونجی۔ وہ بے ہوش سامری کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ سب نے اس کی طرف دیکھا تو وہاں ایک اور ہی منظر تھا۔

☆......☆

پریہ نے جب سر گھما کر دیکھا تو اس نے اپنے آپ کو ایک ایسی مخلوق کے شکنجے میں پایا جس کے پاؤں فرش پر اور سر چھت کے ساتھ لگا ہوا تھا اور گز بھر لمبی زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ آنکھیں ڈیلوں سے باہر اُبل رہی تھیں۔ بڑے بڑے پیلے نوکیلے دانت منہ سے باہر آ رہے تھے۔

پریہ مارے خوف کے چلّانے لگی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ ساری شوخی ہرن ہو گئی اور اس سے قبل کہ وہ بے ہوش ہو جاتی حشکران اپنی انسانی شکل میں آ گیا۔ حشکران کو دیکھ کر پریہ کے حواس درست ہونے لگے اور وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

''حشکران کے بچے تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔'' پریہ دونوں ہاتھ اس کے سینے پر مارتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولی، پھر اچانک چونکی اور حشکران کے دونوں ہاتھ تھام کر سوال کرنے لگی۔

''حشکران شکنتلا جی کہاں ہیں؟ سامری بھی واپس نہیں آیا اور تم آج اتنے دنوں کے بعد نظر آئے ہو؟''

''ملکہ عالیہ گروزائن کی غلام بن گئی ہے۔''

''کیا......؟'' پریہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے ایسے جواب کی قطعاً توقع نہ تھی۔

''یہ کیسے ہوا حشکران......؟'' وہ بے تابی سے بولی۔

''گروزائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم، جان، روح اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور اب ملکہ عالیہ اس کی بھاؤنا کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتیں اور سامری جی بھی گروزائن کے پاس قید ہو چکے ہیں۔''

''کیسی بُری بُری خبریں سنا رہے ہو حشکران۔''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ اب شکنتلا جی کا واپس آنا بہت مشکل ہے۔ وہ اب گروزائن کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کرسکتیں اور سامری اس کی گرفت میں بے ہوش پڑا ہے۔'' حشکران پُرسوچ لہجے میں بول رہا تھا۔

''تو...... تو...... اب تابانہ کی سلطنت کون سنبھالے گا؟'' پریہ دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے بولی۔

''تابانہ کی وارث صرف ملکہ عالیہ شکنتلا ہی ہیں پرنتو...... جب تک ملکہ گروزائن کی قید میں ہیں، سارے انتظامات کی

نگرانی تم ہی کرو گی۔'' حشکران فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

حشکران کی بات سن کر پریہ کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ وہ یہی تو چاہتی تھی۔ وہ دوڑ کر حشکران سے لپٹ گئی اور بولی۔

''حشکران تمہاری سہاتا کے بغیر تو پریہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ شکنتلا جی کے آنے تک ہم دونوں مل کر ان کی سلطنت کو سنبھال لیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مکاری سے رونے لگی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

''رام کرے گروزائن کو کیڑے پڑیں جس نے ہماری ملکہ عالیہ کو غلام بنایا ہے۔''

''حوصلہ رکھو پریہ......!'' حشکران اس کے کومل وجود کو الگ کرتے ہوئے بولا۔

''گروزائن کی ایسی گردن ناپوں گا کہ اس کی آنے والی کئی نسلیں برہمچاری بننے کا خیال من سے کھرچ دیں گی۔''

ان دونوں کی گفتگو سے پرتھوی جاگ گیا تھا اور خوفزدہ نگاہوں سے دونوں کو تکے جا رہا تھا۔ گزرے ہوئے لمحات اسے ابھی تک سحر میں جکڑے ہوئے تھے۔ پریہ اور حشکران نے اسے قطعاً اہمیت نہ دی۔ پریہ نے طائرانہ نظروں سے ایک لمحے کو اسے دیکھا اور پھر حشکران کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

''گروزائن نے اس وقت شکنتلا جی کو کہاں قید کر رکھا ہے؟''

''کلکتے میں کالی کے استھان پر۔''

''تو تم اس کے مقابلے پر کیوں نہیں جاتے؟'' پریہ نے گروزائن کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لیے حشکران کو ٹٹولا۔

''اس وقت گروزائن انتہائی چوکنا ہے اور کالی کے استھان کا پجاری لکشم ناتھ جس کے قبضے میں بہت سی شکتیاں ہیں، وہ بھی گروزائن کا ساتھی ہے۔ اس کے علاوہ سامری بھی انہی کی قید میں ہے اور پھر شکنتلا کی ساری شکتیاں بھی گروزائن کے ہاتھ میں ہیں۔ ایسے میں میرا اکیلے وہاں جانا دانش مندی نہیں، ہمیں سمے کا انتظار کرنا ہوگا۔''

حشکران کسی گہرے منصوبے کے تانے بانے بن رہا تھا۔ پریہ نے حساب لگا لیا تھا کہ شکنتلا گروزائن کے جال میں بُری طرح جکڑی جا چکی ہے۔ اب جلدی اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں اور تابانہ کے تخت پر بیٹھنا اب پریہ کا حق ہے۔ پریہ کی زیرلب مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔

☆......☆

سامری کے بے ہوش جسم کے گرد گہری سرخ رنگ کی روشنی کا ہالا بن رہا تھا۔ یہ روشنی سامری کے بے ہوش جسم کو اپنے جلو میں لے رہی تھی۔ گروزائن اور لکشم ناتھ کچھ حیران، کچھ خوفزدہ اور شکنتلا پُرامید نظروں سے سامری کے بے ہوش وجود کو دیکھنے لگی۔

سرخ روشنی کے ہالے لحہ بہ لحہ گہرے ہونے لگے اور پھر سامری کے بے ہوش جسم میں کسمساہٹ پیدا ہوئی اور اچانک سامری زوردار جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ روشنی اب بھی اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔ سامری کی آنکھیں کھلنے نہیں اور اس کے ساتھ ہی گروزان اور لکشم ناتھ کے ہونٹ ہلنے لگے۔ لکشم ناتھ نے سامری کو دوبارہ بے ہوش کرنے کی غرض سے منتر پڑھ کر منہ غبارے کی طرح پھلا کر سامری کے گرد سرخ لہروں کے بالکل قریب جا کر زوردار انداز میں پھونک ماری۔ لیکن ردعمل بڑا حیران کن ثابت ہوا۔ جب لکشم ناتھ کی پھونک سرخ شعاعوں سے ٹکرا کر گونجتی آواز کے ساتھ پلٹی اور لکشم ناتھ کے نتھنوں میں گھس گئی۔ لکشم ناتھ کی آنکھیں ایک دم اوپر کو چڑھ گئیں اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند گرتا چلا گیا۔

ادھر گروزائن بھی اپنا جاپ مکمل کر چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی شکنتلا کو بھی آنکھوں سے سامری سے فوراً نمٹنے کا حکم دیا تو شکنتلا کے سر میں درد کی شدید لہریں پیدا ہونے لگیں۔ شکنتلا نے چنکار کو طلب کر لیا۔ گروزائن نے اپنا جاپ مکمل کرتے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ لیے اور جے کالی کا نعرہ بلند کر کے ڈنڈوت کرنے لگا۔ یکبارگی چاروں طرف سے سیاہ کالا دھواں پیدا ہوا اور سامری کے گرد ہالہ بنانے لگا۔ کڑوا کسیلا دھواں سامری کے نتھنوں میں گھسا تو سامری بُری طرح کھانسنے لگا، حالاں کہ اس وقت بھی سامری کے گرد سرخ لہریں موجود تھیں اور سامری کو اُمید تھی کہ دھواں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن اسی خوش فہمی میں دھواں سرخ لہروں کو چیرتا ہوا سامری کے منہ اور ناک میں گھس گیا اور سامری کو کھانسی کا

شدید دورہ پڑ گیا۔ اسی اثناء میں شکنتلا نے نہ چاہتے ہوئے بھی طوعاً وکرہاً سامری کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا، کیونکہ اس کے سر میں درد کی لہریں دماغ کی رگیں پھاڑنے لگی تھیں۔ شکنتلا نے چنکار کو اشارہ کیا تو چنکار حرکت میں آ گیا اور سرعت کے ساتھ چند قلابازیاں لگا کر ایک ہاتھ آسمان کی جانب بلند کیا تو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کے اندر بجلی چمک گئی ہو۔ اس کی کڑک سے در و دیوار تھرا اٹھے اور کمرے میں موجود ذرہ ذرہ چمک اٹھا، بجلی کڑکڑاتی ہوئی سامری کی طرف لپکی، لیکن سامری بجلی کے چمکنے سے پیشتر ہی کھانسی کے شدید دورے کے دوران چیخ اٹھا۔

"کارتیکا...... کارتیکا...... دیوتا سہائتا کرو......" سامری کی آواز اور بجلی کی کڑک ایک ساتھ پیدا ہوئیں اور پھر ایک دم جنگ و جدل کے دیوتا کارتیکا کی شبیہ سرخ لہروں کے اندر جذب ہو گئی۔ یوں سامری یقینی موت سے بچ نکلا اور اگلے ہی لمحے وہ کھانسی سے نجات پا چکا تھا۔ اب جے کارتیکا...... کا نعرہ بلند کر کے سامری نے قدم بڑھائے تو سرخ لہروں اور کارتیکا کی شبیہ بھی سامری کے قدموں کی حرکت کے ساتھ حرکت کرنے لگیں۔ سامری کو چلتے دیکھ کر گروزائن نے پھر منتر پڑھنا شروع کر دیا لیکن دیوتا کی شبیہ پیدا ہونے سے اس کے قدم ڈولنے لگے تھے، جبکہ چنکار بدک کر ایک دم غائب ہو گیا۔ سامری نے تیزی سے قدم بڑھائے اور شکنتلا کے سر پر پہنچ گیا اور شکنتلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے بعد گروزائن کی طرف منہ کر کے زور سے گرجا۔

"اوئے پدی کے شوربے! جادوگروں کے شہنشاہ سامری سے ٹکرانے کا وچار اپنے من سے اوش نکال دے، کتے کی موت مارا جائے گا......" اسی اثناء میں گروزائن منتر مکمل کر کے بائیں پاؤں کی ایڑھی پر لٹو کی طرح گھوما اور گھومتے ہی سامری سے جا ٹکرایا تو یکبارگی نیلی آگ کے شعلے نمودار ہوئے اور شعلوں نے سامری اور شکنتلا کو گھیرے میں لے لیا۔ گروزائن خود بھاگنے لگا لیکن شکنتلا نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گروزائن کو گرتے سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ پلک جھپکنے میں گرو بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

اب تینوں کی دلخراش چیخیں آگ کے شعلوں کے درمیان سے اُبھر رہی تھیں اور ان کے جسم بُری طرح آگ میں تڑپنے لگے۔ تینوں برائیاں ایک جگہ اکٹھی مرنے کے لیے جلنے لگیں۔

تیز دھوپ آنکھوں میں پڑنے سے شکنتلا کی آنکھ کھل گئی! کچھ دیر تک اس کا ذہن خالی رہا، پھر آہستہ آہستہ ذہن کے پردے پر خیالات کا ہجوم رقص کرنے لگا۔ ہولے ہولے اس کو گزری باتیں یاد آنے لگیں!

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ سخت جلن محسوس ہونے لگی۔ تب اسے یاد آیا کہ حواس کے آخری لمحات میں سامری گروزائن اور وہ آگ کی لپیٹ میں تھے۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہ تھا!

وہ فوراً اُٹھی، لیکن یہ کیا اس سے تو اٹھا بھی نہیں جا رہا، اس کا رواں رواں دُکھ رہا تھا۔ شکنتلا نے فوراً آنکھیں کھول کر اپنے جسم پر نظر ڈالی تو کانپ کر رہ گئی۔ اس کا جسم جابجا بُری طرح جلا ہوا تھا۔ سارے جسم پر جلنے کے نشانات تھے اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی۔ ٹانگیں بھی جلی ہوئی تھیں اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ شکنتلا شدید جلن اور زخموں پر مکھیوں کے بھنبھنانے سے بے حد اذیت محسوس کر رہی تھی۔ شکنتلا کا دل بے اختیار بھر آیا۔ ضبط کے بندھن کرچی کرچی ہونے لگے اور وہ رو پڑی۔ گھٹنوں میں سر دیے جانے کتنی دیر روتی رہی۔ وہ سوچنے لگی "میں کتنی بااختیار تھی اور آج کتنی لاچار ہوں، کیا میری انسانی زندگی کا عبرتناک انجام یہی تھا۔ آنے والے وقت کا تصور کرتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خاصی دیر رونے سے اس کا جی کچھ ہلکا ہو گیا۔"

اب اس نے سر اٹھا کر گردوپیش کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ ایک ویران جگہ تھی زمین بھی بنجر تھی۔

تیز دھوپ اس کے جسم کو جلائے جا رہی تھی۔

دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اچانک شکنتلا کو احساس ہوا کہ وہ بہت بھوکی ہے۔ بھوک سے اس کے جسم میں نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔

لیکن کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ کوئی شجر سایہ دار بھی آس پاس نظر نہ آ رہا تھا۔

"اب کیا کروں ناگ دیوتا" اس کی آنکھوں میں پھر نمی تیرنے لگی۔ "تو ہی سہائتا کر تیری پجارن آج اتنی بے بس اور حقیر ہو گئی ہے۔" شکنتلا پھر رونے لگی، دھوپ کی بے پناہ تپش نے پیاس کی شدت بھی پیدا کر دی تھی! اس نے زبان

ہونٹوں پر پھیری تو وہاں پپڑیاں چبھنے لگی تھیں۔

"مجھے کچھ کرنا چاہیے۔" شکنتلا نے سوچا۔ "ورنہ یہاں ہی میرا مرگھٹ بن جائے گا۔"

اب شکنتلا نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور اپنی دونوں ٹانگیں آہستہ آہستہ سے آگے بڑھائیں۔ وہ پیٹھ کے بل بیٹھی تھی، اب دونوں ہاتھ اس نے زمین پر رکھے اور ہاتھوں پر اپنا وزن ڈالا اور پیٹھ اٹھا کر تھوڑا آگے کو سرکی۔ پھر اپنے پاؤں مزید آگے کیے اور دونوں ہاتھوں پر اپنے جسم کو پھر اٹھایا اور مزید چند انچ آگے ہو گئی۔

اب وہ اسی طرح قدم قدم آگے بڑھنے لگی جس طرح لنگڑے لولے اور اپاہج فقیر بیٹھے بیٹھے ہاتھوں کے سہارے چلتے ہیں، ابھی تھوڑا سا ہی چلی تھی کہ زخموں کی تکالیف اور بھوک پیاس کی شدت سے ہانپنے لگی۔ شکنتلا کے لیے تو یہ سب کچھ بالکل نیا اور نرکھ کی مانند تھا۔ اس نے تو سارا جیون پر تعیش بسر کیا تھا۔ جب وہ سانپ تھی تو بھی گرو مہاراج اور ان کے آباؤ اجداد نے شیش ناگ کی جوڑی کی پرورش بڑے ناز و نعم سے کی تھی اور انسان بنتے ہی کامیابیاں اور عیش و عشرت اس کی لونڈیاں بن گئی تھیں، لہٰذا یہ افتاد شکنتلا کے لیے عذاب النار بن گئی تھی۔

وہ تھوڑا سا چلتی اور پھر رک جاتی، پھر تھوڑا گھسٹ گھسٹ کر سفر کرتی اور پھر ہانپنے لگتی۔ سورج دیوتا اب پورے نصف النہار پر جوش و خروش سے آگ برسا رہا تھا اور شکنتلا کے آس پاس سایہ تک نہ تھا۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ اس کی منزل اس وقت پانی کے چند گھونٹ اور پیٹ پوجا کا سامان تھا جو کہیں دکھائی نہ دے رہے تھے!

وہ نڈھال ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر بے ہوش ہو گئی تو پھر دوبارہ ہوش آنا ممکن نہ تھا۔ بھوک پیاس کی شدت زخموں سے چور بدن، شدید جلن، مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور قیامت خیز گرمی آتما اور شریر کا رشتہ توڑ کر رکھ دے گی۔ یہ بھی ممکن ہے بے ہوشی میں گدھوں کے کسی ٹولے کا نشانہ بن جائے اور وہ اس کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔

اسی جاں بلب عالم میں شکنتلا سسکتی اور تڑپتی رہی جانے کتنی دیر چلتی رہی سورج اب مغرب کی طرف اتر رہا تھا۔ شکنتلا نے ایک بار پھر سامنے کی طرف نظر دوڑائی تو دور بہت دور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کچھ آبادی کے آثار ہیں۔

شکنتلا کی آنکھوں میں ہلکی سی امید کی چمک ابھری اور وہ تمام تکالیف کو بھول کر جسم کو گھسیٹنے لگی، تپتی دھرتی پر ہاتھوں اور پاؤں کے سہارے چلنے سے چھالے پڑ گئے تھے۔ یہ ایک نئی آفت کا آغاز تھا۔ اسی طرح شام کی سرخی پھیلنے لگی اور پھر آہستہ آہستہ سورج اپنا سفر مکمل کر کے مغرب کی آغوش میں چھپ گیا اور دھرتی رات کی سیاہ چادر اوڑھنے کی تیاری کرنے لگی اب ہوا ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ شام کے اسی ملگجے میں شکنتلا کو دور کسی گاؤں کے آثار گہرے دکھائی دینے لگے۔ گاؤں کے مکانوں سے دھوئیں کے مرغولے بھی اُٹھ رہے تھے لیکن ابھی تک کسی انسان کے آثار نظر نہ آئے تھے۔ شکنتلا کے چہرے پر امید کے آثار بندھنے لگے۔ اس نے سوچا کہ کسی طریقے سے اس گاؤں تک پہنچ جائے تو زندگی کی ڈور عارضی طور پر بحال رکھی جا سکتی ہے، لیکن ابھی آبادی خاصی دور اور اس کے چلنے کی رفتار بہت کم تھی اور اب تو اس پر نقاہت بھی طاری ہونے لگی تھی۔ ادھر اب اندھیرا بھی چھانے لگا تھا، لیکن جب تک سانس تب تک آس، شکنتلا سسکتی اپنے وجود کو گھسیٹتی رہی!

رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ شکنتلا کا سفر جاری تھا۔ گاؤں کی ٹمٹماتی روشنیاں ہر لحظہ قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ شکنتلا کا سارا شریر تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ زخموں کی تکلیف الگ تھی۔ لیکن وہ چلتی رہی کسی انجانی منزل کی تلاش میں۔ اب گاؤں کے اکا دکا کھیت شروع ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں سے کتوں کے بھونکنے یا جانوروں کے گلے میں بندھی گھنٹی کی ٹن ٹن کی آوازیں بھی مدہم مدہم سنائی دینے لگی تھیں۔

سیاہ کالی رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شکنتلا ہولے ہولے رینگ رینگ کر چل رہی تھی، لیکن اب اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ زخموں کی جلن ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ بھوک اور پیاس کی شدت روح و جسم کا ناتا توڑنے کو بے چین تھی۔ حواس اس کا ساتھ چھوڑنے پر تل گئے آبادی اب قریب آ چکی تھی۔ اچانک اسے کتوں کے بھونکنے اور تیز تیز بھاگنے کی آوازیں محسوس ہوئیں، یہ آوازیں پیچھے سے آ رہی تھیں۔ شکنتلا نے گردن موڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اتنے

ہے میں بکتے اس کے اوپر ہی آ پڑے اور پھر اسے اپنے جسم کے مختلف حصوں میں تیز دانتوں کی چبھن محسوس ہوئی۔ درد کی شدید لہروں نے سر اٹھایا اور شگفتلا کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ شگفتلا بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆......☆

سائیں مرچو کا ڈیرہ پہاڑی کی چوٹی پر تھا جس پر پہنچنے کے لیے ایک پگڈنڈی تھی۔ پہاڑی کے ایک طرف شفاف پانی کی جھیل، دوسری طرف تاحد نظر جنگل اور تیسری جانب کچھ دور آبادی اور چوتھی جانب کیلے، سیب اور امرود کے باغات تھے۔ سائیں مرچو کے ڈیرے کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں کسی مرید کو رات ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی۔ کہتے تھے کہ شام ڈھلے سے پو پھٹنے تک جنات ان کے پاس حاضری دیتے تھے! لیکن دلاور جس وقت پگڈنڈی پر چلتا ہوا سائیں مرچو کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا، اس وقت سورج اپنا سفر مکمل کر کے مغرب کی گود میں پناہ لے رہا تھا۔ پہاڑی کے اوپر سے نیچے آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور مغرب کے بعد یہاں کسی زائر کو ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی...... اوپر کی طرف جانے والا دلاور اکیلا تھا اور تمام لوگ اسے حیرانگی سے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے! لیکن دلاور اپنے غموں سے اس قدر چور تھا کہ کئی لوگوں کے کہنے کے باوجود بھی نہ رکا اور سائیں مرچو کے ڈیرے پر اس وقت پہنچ گیا جب سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا تھا۔ اس وقت تک یہاں ویرانی چھا چکی تھی اور کوئی ذی روح اس کو نظر نہ آئی اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا! یہ ایک بہت بڑی چار دیواری تھی جس کے صدر دروازے والی جگہ خالی تھی اور کوئی دروازہ وغیرہ نہ تھا! چار دیواری میں وہ بے دھڑک گھسنے ہی لگا تھا کہ اچانک اسے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا، اس نے آہستگی سے پلٹ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت ابھر آئی صرف ایک لنگوٹی پہنے ماتھے پر تلک لگائے اور جسم پر سیندور ملے ہوئے یہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ نما سادھو تھا، جس کے ہونٹ موٹے اور سیاہ کالے تھے، جبکہ چہرہ بالکل کسی بچے کی طرح اور سوکھا ہوا تھا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور ہاتھ میں لکڑی کی کوئی مورتی نما شے پکڑے ہوئے دائیں کاندھے پر ایک میلا کچیلا تھیلا لٹک رہا تھا۔

''بچہ'' سادھو کی کھردری آواز نکلی۔

''غزالہ کو پانا چاہتا ہے!'' سادھو کے منہ سے یہ جملہ سن کر دلاور کو حیرت سے جھٹکا لگا اور وہ بے اختیار ایک قدم واپس پلٹ آیا۔

''آں...... ہاں......'' غزالہ کا نام سنتے ہی دلاور کی اُداس آنکھوں میں چمک ابھر آئی!

''آ میرے ساتھ'' یہ کہہ کر سادھو منہ موڑ کر چل پڑا تو دلاور بے اختیار سادھو کے پیچھے لپکا لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے پیچھے سے کسی نے اس کی قمیص کا کالر پکڑ کر زور سے کھینچا ہو، جھٹکا اتنا زوردار تھا کہ دلاور کئی قدم پیچھے کی جانب چار دیواری کے اندر جا گرا اور گرتے ہی اُٹھ کر تیزی سے پھر سادھو کی طرف بڑھا لیکن اب اسے سادھو کہیں نظر نہ آیا۔ وہ شام کے ملگجے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن سادھو ایسے غائب تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ، ابھی دلاور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہی تھا کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا، اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔''

☆......☆

کسی نے جھنجھوڑ کر دلاور کو جگایا۔ دلاور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک سفید ریش نورانی چہرہ بزرگ سامنے کمرے میں کھڑے ہیں اور دائیں ہاتھ میں تسبیح تھام رکھی ہے۔ سفید براق لباس پہنے ہوئے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے چل پڑے۔ وہ غیر ارادی طور پر اُٹھ کر سفید ریش بزرگ کے پیچھے چل پڑا بزرگ چلتے چلتے برآمدے میں آ گئے اور ایک کمرے میں گھستے چلے گئے دلاور بھی چلتا ہوا کمرے کے اندر آ گیا اندر داخل ہوتے ہی کھٹاک کی آواز سے دروازہ بند ہو گیا۔ دلاور نے تیزی سے پیچھے دیکھا اور پھر بزرگ کی طرف متوجہ ہوا تو حیران رہ گیا کہ پورا کمرہ سفید روشنی سے اچانک منور ہو چکا تھا، جبکہ کھٹاک کی آواز آنے سے پہلے کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ دلاور بھی ان کے سامنے ادب سے بیٹھ گیا!

''پریشان ہو؟'' سفید ریش بزرگ جو دلاور کی نظر میں سائیں مرچو تھے نے اپنائیت سے کہا تو ''بابا جی'' دلاور سسکنے لگا۔

''میرا وجود کرچی کرچی ہو گیا ہے۔'' دلاور رو پڑا۔ ''میری بچی مر گئی، میری بیوی عنقبوت لے گیا، میرے لیے دنیا اندھیر

ہو گئی۔'' دلاور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ ''مجھے سکون چاہیے بابا جی۔''

''نماز پنجگانہ قائم کر لو دلاور بیٹا'' بزرگ نے پیار بھرے لیکن گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

''آپ آپ سائیں مرچو ہیں؟''

''ہاں!'' مختصر جواب ملا۔

''مجھے اپنی پناہ میں لے لیں میں بڑی دور سے آ رہا ہوں۔''

''ابھی تجھے بہت دور تک جانا ہے...... زادِ راہ ساتھ کر لے۔''

''میری روح اور جسم دونوں زخم خوردہ ہو چکے ہیں بابا جی۔''

''دکھ اور سکھ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔'' بابا جی نے دلاور کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ جیسے دھوپ چھاؤں۔ جیسے رات اور دن، جیسے بادل اور بجلی اور جیسے پھول اور خوشبو ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اسی طرح دکھ اور سکھ کا ساتھ بھی ازل سے ابد تک چلے گا۔''

بابا جی جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے!

''مجھے غزالہ کا پتا بتا دیجیے بابا جی؟''

''علم الغیب سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ سائیں مرچو سنجیدگی سے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے بولے۔''

''لیکن پھر آپ کو میرا نام اور آنے کا مقصد کیسے معلوم ہو گیا؟''

''اکثر لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے ہوتے ہیں لیکن کچھ گنہگار میری طرح آنکھیں نہ ہونے پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

''آپ...... آپ اندھے ہیں بابا جی؟'' دلاور نے بغور ان کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اسے احساس ہوا کہ بابا جی کی آنکھیں کھلی ضرور تھیں لیکن بے نور تھیں۔ دلاور اور حیران رہ گیا جس طرح بابا اسے صحن سے کمرے تک لائے تھے، اس سے دلاور کو کہیں یہ احساس نہ ہو سکا کہ سائیں مرچو اندھے ہیں۔

''ہاں...... میری بصارت نہیں، لیکن بصیرت الحمدللہ موجود ہے۔''

''مجھے غزالہ سے ملوا دیجیے بابا جی یا عنقبوت کا پتا ہی بتا دیجیے۔'' دلاور بے تاب تھا۔

''بندے کو اتنا ہی ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے!''

''میں غزالہ کو پانے کے لیے ہر کوشش کروں گا سائیں بابا۔''

''اتنی کوشش اگر اللہ کو پانے کے لیے کرے تو غزالہ خود ہی تیرے پاس پہنچ جائے۔''

''میں آپ کی باتوں پر عمل کروں گا بابا جی۔''

''صرف اللہ جل جلالہ کے احکامات اور اس کے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرو۔''

بابا جی کی باتوں سے دلاور کا سر ندامت سے جھک گیا۔

''میں بہت گنہگار ہوں بابا جی میں نے تو شاید ایک زمانے سے نماز بھی نہیں پڑھی۔''

''احساس گناہ بذات خود توبہ ہے۔ اللہ کے حضور ندامت کے دو آنسو بھی عبادت ہیں، جا اس کے حضور جھک جا، جو تمہارا بھی رب ہے اور عنقبوت کا بھی، اپنا مقدمہ اسی کے حضور پیش کر جو ہم سب کا خالق اور مالک ہے!''

''میں ضرور جھکوں گا بابا جی۔ میرا اللہ میرے ساتھ ضرور انصاف کرے گا۔''

''اللہ سے انصاف نہیں ہمیشہ رحمت کا طلبگار رہنا چاہیے۔''

''مجھے عنقبوت کے بارے میں کچھ بتائیے بابا جی؟''

مشرق کی طرف ناک کی سیدھ میں چلنا شروع کر دے۔

''عنقبوت بہت بڑی طاقت ہے بابا جی میں ناتواں اس کا مقابلہ کیسے کروں گا؟''

''آیت الکرسی کا ورد ہر جادو ٹونے اور سفلی عمل سے مسلمان بندے کو محفوظ رکھتا ہے اور ہمیشہ باوضو رہا کر۔''

"اللہ اکبر......اللہ اکبر......" دور کسی مسجد میں اذان کی آواز گونجی تو باباجی چونک پڑے۔ "اللہ کا پیام بندوں کو بھلائی کی طرف بلا رہا ہے۔ باباجی نے کہا اور اُٹھ کھڑے ہوئے......

"دلاور بھی ان کی پیروی میں تیزی سے اُٹھا تو اس کی آنکھوں کے آگے اچانک اندھیرا چھا گیا اور اس کا سر چکرانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ کیوں کہ وہ کمرے میں نہیں بلکہ سائیں مرچو کی چار دیواری کے دروازے سے چند قدم اندر زمین پر پڑا ہوا تھا۔"

دلاور اُٹھ کھڑا ہوا، دیکھا تو مشرق سے صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی! پرندے چہچہا رہے تھے باباجی کا دور تک پتا نہ تھا۔ وہ اُٹھا اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ آج بابا سائیں مرچو سے دوبارہ ملے گا۔

سورج ذرا بلند ہوا تو زائرین آنے لگے۔ دلاور نے ایک آدمی جو شکل سے مجاور نظر آتا تھا، کو روک کر پوچھا کہ سائیں مرچو کس وقت شرف ملاقات بخشتے ہیں تو وہ ملنگ سا آدمی اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اسے دلاور کی دماغی صحت پر شک ہو اور پھر بولا۔

"سائیں مرچو اب قبر سے باہر آ کر تم سے ملاقات کریں گے۔" تو دلاور کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کچھ اور لوگوں سے پوچھنے پر اسے پتا چلا کہ سائیں مرچو تو کئی سال ہوئے انتقال کر چکے ہیں۔

دلاور کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا اور اسے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوا تو کیا سائیں مرچو اس کے خواب میں آئے تھے؟ اور اسے رستہ دکھا گئے ہیں۔ وہ اپنی سوچوں میں غرقاب آہستہ آہستہ سائیں مرچو کے ڈیرے سے نکل کر مشرق کی طرف چلنے لگا۔

☆......☆

دلاور چلا جا رہا تھا۔ آج اسے کئی دن ہو گئے تھے! پیدل چلتے چلتے اس کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ جیب میں موجود سکے ختم ہو گئے اور اب فاقے کی نوبت آنے لگی۔ گزشتہ دو دنوں سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا جہاں رات پڑتی پڑ کر سو رہتا، صبح آنکھ کھلتے ہی پھر انجانی منزل کی تلاش میں چل نکلتا۔ نماز کے وقت قریبی مسجد میں جا کر وضو کر کے نماز پڑھ لیتا، مسجد نہ ہوتی تو خاک پر ہی سجدے کر لیتا، لیکن اب بھوک نے خاصا ستانا شروع کر دیا تھا۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اس کی نظر میں گناہ تھا!

لیکن بھوک تو آخر بھوک تھی۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اب اس کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں! وہ اس وقت ایک بازار سے گزر رہا تھا۔ صبح کا وقت اور جانے کون سا قصبہ تھا! لوگ آ جا رہے تھے، دکانیں کھل چکی تھیں۔ قہوہ خانوں اور طباقوں سے کھانے پینے کی خوشبو آ رہی تھی! کھانوں کی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسی تو وہ بے چین ہو گیا! اس کی حالت فقیروں جیسی بن چکی تھی! وہ اپنی سوچوں میں غرقاب چلا جا رہا تھا کہ کسی نے اس کے شانے پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیا اور رک گیا اور آہستگی سے مڑ کر دیکھا تو یہ وہی سادھو تھا جو اسے سائیں مرچو کے ڈیرے کے باہر ملا تھا۔

"پریشان ہو بچہ؟ آؤ میرے ساتھ۔" جانے سادھو کی آنکھوں میں کیا سحر تھا کہ دلاور کوئی مزاحمت نہ کر پایا اور کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چلنے لگا۔

سادھو جانے اسے لیے کتنی دیر چلتا رہا۔ مختلف بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے خاصی دیر کے بعد وہ ایک بظاہر نہایت بوسیدہ سے مکان میں داخل ہو گیا! مکان کے اندر گھستے ہی دلاور کو خنکی کا احساس ہوا۔

مکان کی ڈیوڑھی خاصی تاریک تھی! ڈیوڑھی کے بعد تنگ سا صحن تھا۔ صحن عبور کرتے ہوئے ایک کمرہ آ گیا، اس کے بعد دوسرا کمرا اور پھر کئی کمروں سے گزرتے ہوئے سادھو دلاور کو لے کر ایک بہت بڑے کمرے میں آ گیا۔

اس کمرے میں داخل ہوتے ہی دلاور کی ناک میں انواع و اقسام کھانوں کی خوشبو آئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ کمرے کے فرش پر چٹائی پڑی ہوئی ہے! اور دسترخوان سجا تھا! تازہ کھانوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ کھانا دیکھتے ہی اس کی بھوک دو چند ہو گئی۔

"کھاؤ......" سادھو مخصوص آواز میں بولا تو دلاور ایک دم فرش پر بیٹھ گیا اور ندیدوں کی طرح کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ٹھہرو۔" سادھو کڑک کے بولا۔ "کھانا کھانے سے پہلے اپنی پتنی غزالہ سے تو مل لو۔" سادھو کی بات سن کر دلاور بری طرح چونکا اور اُٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے سادھو کے دونوں شانے پکڑ کر ہلاتے ہوئے اکھڑی سانسوں اور تیز آواز میں بولا۔

"کہاں ہے میری بیوی کیا تمہیں غزالہ کا پتا معلوم ہے......؟"

"ہاں۔" سادھو اس کے دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا کر چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "پر نتو تمہیں ایک وچن دینا ہوگا سادھو کوٹھاری کو۔ ایک کام کرنا ہوگا کوٹھاری کا۔" سادھو اپنی چمک دار آنکھیں دلاور کے چہرے پر گاڑتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔

"بولو بولو مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔" دلاور اب کھانے کو بھول چکا تھا اور اس پر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

"وہ دیکھو۔" سادھو کمرے کے اندر موجود ایک دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ دلاور نے دیکھا تو اس کی بیوی غزالہ دروازے کا در تھامے اسے اُداس نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ دلاور نے غزالہ کی غزالی آنکھوں میں تیرتی نمی کو صاف محسوس کر لیا تھا۔"

"غزالہ۔" دلاور دیوانوں کی طرح غزالہ کی طرف جھپٹا لیکن پلک جھپکتے ہی لوہے کی سلاخوں سے بنا ایک پنجرہ دلاور کے اوپر آ گرا اور دلاور پنجرے کے حصار میں قید ہو گیا اور غزالہ کو پیچھے سے کسی نے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی دلاور کے گرد پنجرہ غائب ہو گیا اور دلاور دوڑ کر دروازے تک پہنچ گیا اور اسے کھینچ کر اور دھکے دے کر کھولنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ غزالہ کہاں ہو دروازہ کھولو کی آوازیں لگانے لگا اور اندر سے غزالہ کی ہچکیاں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں لیکن مضبوط لکڑی سے بنا دروازہ دلاور سے ٹس سے مس نہ ہو سکا۔

"دیوار کو دھکا لگانے سے کچھ نہ ہوگا دلاور۔" سادھو کی گونجدار کڑکتی آواز سن کر دلاور رک گیا اور پھر آہستگی سے پلٹا۔

"کیوں قید کر رکھا ہے میری بیوی کو۔" دلاور کے لہجے میں غراہٹ اب نمایاں تھی۔

دلاور کا لہجہ محسوس کر کے سادھو مکاری سے ہنسا۔ "ہی ہی ہی۔"

"کوٹھاری کچی گولیاں نہیں کھیلا ہے دلاور...... تمہارے کمزور بازو کوٹھاری کی مضبوط گردن کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے سکتے۔"

"میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔" دلاور نے لپک کر کوٹھاری کی گردن دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں کس لی لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی ٹھنڈے ٹھار لوہے کو پکڑ لیا ہو دلاور کے ہاتھ ٹھنڈک سے سن ہو کر رہ گئے اور اس نے فوری طور پر سادھو کی گردن سے ہاتھ ہٹا لیے۔"

دلاور کی ناکامی محسوس کر کے سادھو چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔ "کچھ لو اور کچھ دو۔ تمہیں غزالہ مل جائے گی پر نتو تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"جلدی بتاؤ۔" دلاور تلملاتے ہوئے لہجے کے ساتھ نچلا ہونٹ دانتوں تلے چباتے ہوئے بولا۔

"پہلے ارمان سے بھوجن کرو پھر باتیں ہو جائیں گی بہت سے پڑا ہے! تم کھانا کھاؤ میں ابھی آیا۔" یہ کہتے ہوئے کوٹھاری جس راستے سے دلاور کو لے کر آیا تھا اسی دروازے سے باہر نکلتا چلا گیا اور جاتے ہوئے زور دار آواز سے دروازہ بند کر گیا! دلاور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بھوک خیالات پر حاوی ہوتی چلی گئی اور بے اختیار اس کا ہاتھ دسترخوان کی طرف بڑھ گیا۔"

☆......☆

دلاور کھانا کھا کر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ جانے کتنی دیر وہ سوتا رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو خاصا وقت گزر چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کوٹھاری کہاں چلا گیا؟ اور وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ غزالہ کو اس نے ساتھ والے کمرے میں کیوں قید...... غزالہ کا خیال آتے ہی وہ یکدم اٹھ بیٹھا اور تیزی سے اس دروازے کی طرف بڑھا تو دروازہ یکدم کھل گیا بلکہ دروازہ تو شاید پہلے سے کھلا ہوا تھا اور دلاور اپنے ہی زور میں دروازے کے دوسری طرف زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ گرتے ہی اسے احساس ہوا کہ جیسے زمین سے اُڑ کر ریت اس کے منہ میں آ گئی ہو! وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا کیوں کہ اس نے اپنے آپ کو تاحد نظر ریگستان میں پایا۔

دلاور نے تیزی سے چاروں طرف گھوم کر دیکھا تو تینوں اطراف اسے ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی وہ کسی خیال سے

واپس کمرے میں آیا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جہاں سے وہ کوٹھاری باہر گیا تھا۔ دروازے کو ہاتھ لگاتے ہی دروازہ کھلتا گیا۔ تو دلاور کو یوں لگا جیسے پاگل ہو جائے گا۔ کیوں کہ یہاں بھی ہر طرف ریت کے ٹیلے نظر آرہے تھے! جبکہ اسے یاد تھا کہ یہاں تک آتے آتے وہ کئی کمروں سے گزر کر آئے تھے۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ سادھو کوٹھاری کوئی بہت بڑا جادوگر ہے اور اس نے اسے یہاں قید کر دیا ہے تاکہ وہ فرار نہ ہو پائے۔" سوچتے سوچتے دلاور کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں اور وہ کمرے میں پھر آ کر لیٹ گیا اور کافی دیر سوچتا رہا۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ طاغوتی شکتیوں کے گھیرے میں آ گیا ہے۔ کافی دیر کے بعد وہ پھر باہر آیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت شام کا وقت ہو رہا تھا اور سورج مغرب کی طرف خاصا جھک چکا تھا دلاور کو سائیں مرچو کی نصیحت یاد آ گئی کہ نماز قائم کرو۔ اس نے فوراً زمین پر بیٹھ کر ریت سے تیمم کیا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ اب دلاور نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے میں بہنے کے لیے تیار کر لیا تھا، کیوں کہ پے در پے اعصاب شکن واقعات کے بعد اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔

اندھیرا پھیلتے ہوئے واپس کمرے میں آ گیا اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی!

صبح منہ اندھیرے اس کی آنکھ کھل گئی وہ دوبارہ باہر نکلا تو صحرا میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور صبح کا نور رات کے اندھیرے پر حاوی ہونے کو تیار ہو رہا تھا۔ اس نے پھر تیمم کرنے کے بعد فجر کی نماز ادا کی اور رب العزت سے اپنے گناہوں کی معافی اور ذہنی و قلبی سکون کی دعا کی تو نماز کے بعد اس نے اپنے آپ کو ہشاش بشاش پایا۔ واپس کمرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سادھو کوٹھاری کمرے کے وسط میں چٹائی پر بیٹھا مکروہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"سجدے کر آئے نہ دکھائی دینے والے کو۔" کوٹھاری چھوٹتے سے سر کو ہلا کر طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"بکواس مت کرو کوٹھاری۔" دلاور نے پر اعتماد لہجے میں اسے گھورا۔

"میں تم سے مطلب کی بات کرنے آیا ہوں مسلے۔" کوٹھاری بیٹھے بیٹھے بولا۔

اگر باقی ماندہ جیون عیش و عشرت سے گزارنا اور غزالہ کو پانا چاہتے ہو تو کوٹھاری کی تمام باتوں پر بلا چوں چراں عمل کرتے جاؤ۔ پھر دیکھو گے کوٹھاری تمہارے جیون میں خوشیوں کے رنگ کیسے بھرتا ہے اور اگر گڑبڑ گھٹالہ کرو گے تو کوٹھاری تمہیں خارش زدہ کتے کی طرح کر دے گا۔" کوٹھاری کے لہجے میں بلا کا اعتماد و سفا کی دیکھ کر دلاور نے دل میں سوچا کہ اس کی بات پر عارضی طور پر عمل کر لیا جائے اور حالات سدھرتے ہی اس کی گردن ناپی جائے!

"بولو۔ میں تمہارے کیا کام آ سکتا ہوں۔" دلاور بے دلی سے بولا۔

"کسی مسلمان عورت کی میت کے بال کاٹ کر اور نوجوان دوشیزہ اغوا کر کے لانی ہے۔ اور میرے کہنے کے مطابق مزید عمل کرنا ہے۔ بس اتنا سے تیرا کام اور پھر ہی ہی ہی آگے کام کوٹھاری کا شروع ہو جائے گا اور باقی سارا جیون تو راج کماروں کی طرح بسر کرے گا تجھے اتنی دولت دوں گا کہ محل نما حویلی، درجنوں کنیزیں اور غلام تو رکھ سکے گا اور غزالہ بھی تجھے دلا دوں گا۔"

"لیکن میں ایک مضبوط ایمان والا مسلمان ہوں سچی بات تو یہ ہے کہ یہ کام دلاور کے بس کا نہیں!" دلاور دھیمے لیکن اعتماد بھرے انداز میں بولا۔

"اب بھی سمے ہے کہ تو راہ راست پر آ جا۔ نادانوں والی بات نہ کر دلاور تو ابھی کوٹھاری کی شکتی سے واقف نہیں!" سادھو اپنے کالے اور بھدے ہونٹوں پر اپنی پیلی اور سرخ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں خوب اچھی طرح سوچ لے۔" یہ کہتے ہی سادھو کوٹھاری چھلاوے کی طرح اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی خوف سے دلاور پر کپکپی طاری ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ پرسکون ہوا تو اس نے سوچا کہ باہر نکل کر ہوا خوری کی جائے تاکہ پراگندہ ذہن کچھ تر و تازہ ہو جائے۔ باہر نکلنے کی نیت سے اس نے جیسے ہی دروازہ کھول کر قدم باہر نکالا تو ایک لمحے کو چکرا کر رہ گیا۔ باہر ریگستان کی بجائے ٹھاٹھیں مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

توازن قائم نہ رکھ سکا اور غڑاپ سے پانی کے اندر جا گرا اور غوطے کھانے لگا۔

پانی اس کے منہ اور ناک میں گھس گیا اور پھر دلاور کو کوئی ہوش نہ رہا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

دلاور کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک دریا کے کنارے ریت پر پڑے ہوئے پایا۔ بہت سے لوگ اس کے اوپر جھکے ہوئے تھے اور اس کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ دلاور کو ہوش میں آتے دیکھ کر ایک شخص بولا۔

"کسی اچھے گھر کی لگتی ہے رام جانے کس نے اس کو دریا میں پھینک دیا۔"

"ارے...... ایک تیسری آواز ابھری یہ تو مکھیا کی داشتہ ہے! جس کو مکھیا نے ایک تاجر سے خریدا تھا۔"

"چلو چلو اسے مکھیا کی حویلی لے چلتے ہیں۔" اور پھر کچھ لوگوں نے مل کر اسے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور کچھ دور جا کر ایک چارپائی کے اوپر ڈال کر چل دیے! دلاور جواب پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا! صورت کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ لوگ اسے لڑکی اور داشتہ کیوں کہہ رہے ہیں۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ اسے ایک حویلی میں لے گئے اور چارپائی حویلی کی ڈیوڑھی میں رکھ دی۔

"واپس چلے جاؤ تم سب۔" ایک موٹی اور کرخت آواز آئی، دلاور اٹھ بیٹھا۔ دیکھا کہ اسے لانے والے سب لوگ آہستہ آہستہ حویلی سے باہر نکل گئے اور ایک انتہائی صحت مند سیاہ کالے بالوں اور بڑی گھنی مونچھوں والا شخص دھوتی کرتے میں کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

"کیوں بھاگی تھی ری۔" وہ شخص دلاور کے قریب آ گیا۔

"میں...... میں...... لڑکی نہیں...... میرا نام دلاور ہے۔" دلاور بولا۔ لیکن خود ہی چونک اٹھا کیوں کہ اس کے حلق سے ایک انتہائی باریک اور سریلی آواز نکلی تھی۔ اب جب سٹ پٹا کر اس نے اپنے آپ کو دیکھا تو مارے حیرت کے اسے چکر آ گئے۔

وہ ایک سرخ رنگ کی ساڑھی میں تھا اور اس کا جسم جسامت کے لحاظ سے بھی ایک سڈول اور سانولے رنگ کی خوب صورت لڑکی جیسا تھا، فوری اور غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اپنے سر پر گیا تو گدی کے پیچھے بالوں کا گھنا جوڑا محسوس کر کے دلاور کا دل ڈول گیا۔ شاید سادھو کوٹھاری نے اسے اذیت دینے کی غرض سے یہ روپ دے دیا تھا۔

اور دلاور کے لیے یہ روپ تھا بھی بڑا شرمناک...... لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لڑکی بن چکا تھا اور بقول لوگوں کے اس مکھیا کی داشتہ بھی تھا۔

"جواب کیوں نہیں دیتی کنچن۔ کیا تجھے کسی نے پانی میں پھنکوایا یا خود بھاگی تھی!"

دلاور جس کو کنچن کے نام سے پکارا گیا تھا پریشان تھا کہ کیا جواب دے۔ خاموش بیٹھا رہا پھر اچانک اس کے ذہن میں جھپاکہ ہوا اور اس کا ذہن کھلتا چلا گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آ رہی ہو۔

"مجھے آپ کی پتنی شریمتی شالیپا جی نے اپنے خاص ملازموں کی مدد سے بے ہوش کر کے دریا میں پھنکوا دیا تھا۔ آپ مجھ سے بہت پریم کرتے ہیں نا اسی لیے انہوں نے راستے سے ہٹانے کے لیے مجھے قتل کروانا چاہتا تھا تاکہ آپ کی توجہ حاصل کر سکے۔"

دلاور کے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ الفاظ خود نکلتے گئے اور وہ خود بھی اپنے رویے اور باتوں پر حیران ہو رہا تھا لیکن اب اس کا ذہن اس کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔

"ہاں ہاں کنچن میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔" مکھیا نے آگے بڑھ کر دلاور کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور دلاور شرم سے زمین میں گڑھنے لگا۔ اس کو بے حد ہتکی اور شرم محسوس ہو رہی تھی کہ کہاں تو وہ مونچھوں والا گبرو جوان تھا لیکن کوٹھاری کی شرارت سے وہ ایک لڑکی بلکہ مکھیا کی داشتہ بن گیا تھا۔

☆......☆

"ہوش میں آ رہی ہے۔ اب اسے ہوش آ رہا ہے۔" ملی جلی آوازیں شکنتلا کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمسانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

میں آچکی تھی اور خالی خالی نگاہوں سے اپنے گرد و پیش میں کھڑے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

حواس بحال ہوئے تو شکنتلا نے دیکھا کہ یہ ایک گھر کا اندرونی حصہ ہے۔ ایک لڑکا، ایک نوجوان لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور ایک سیاہ کالی نوکدار مونچھوں والا سانولے رنگ کا صحت مند سن رسیدہ مرد اس کے گرد کھڑے تھے۔

شکنتلا سرہانے کے ساتھ ٹیک لگا کر سیدھی ہونے لگی!

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' لڑکی نے آگے بڑھ کر شکنتلا کے شانے پر ہاتھ رکھا! شکنتلا اسے خالی الذہن نظروں سے دیکھنے لگی۔ شاید پے در پے الٹے سیدھے واقعات نے اس کا دماغ سن کر دیا تھا۔

''کون ہو تم...... کہاں سے آئی ہو...... جلی کس طرح سے ہو؟؟''

لڑکی نے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر دیئے!

شکنتلا نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا اور گردن موڑ کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔

''م...... میں...... کہاں...... ہوں؟'' شکنتلا نے بمشکل جملہ پورا کیا۔

''تم ہمارے گھر میں ہو پتری۔'' ادھیڑ عمر عورت نے آگے بڑھ کر شکنتلا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''سندری کے پتا تجھے اپنے کھیتوں سے اٹھا کر لائے تھے! تو بہت گھائل تھی تا گاؤں کے وید نے تیری مرہم پٹی کر دی ہے۔ بھگوان کی کرپا سے جلدی بھلی چنگی ہو جائے گی۔''

مرہم پٹی کا نام سنتے ہی شکنتلا نے اپنے سراپے کو دیکھا تو اسے اپنے سارے شریر پر مرہم کی لیپ دکھائی دی، جبکہ کتوں کے کاٹنے والی جگہوں پر پٹیاں کر دی گئی تھیں!

''لو دودھ پیو۔'' سندری نے دودھ کا بڑا سا پیالہ اس کے ہاتھ میں پکڑایا تو شکنتلا کی بھوک اور پیاس ایک دم زور پکڑ گئی! اور وہ پیالہ ہونٹوں سے لگا کر غٹاغٹ پی گئی۔

سندری فوراً ہی ایک اور پیالہ بھر لائی۔

دوسرا پیالہ پینے سے شکنتلا کو کوئی سدھ بدھ محسوس ہوئی!

''ایک بات تو بتاؤ'' نوک دار مونچھوں والے شخص نے آگے آتے ہوئے کہا! جس جگہ تو بے ہوش پڑی تھی وہاں تین کتے بھی مردہ حالت میں پڑے تھے جنہوں نے تجھے کاٹا تھا!''

''آں...... ہاں......'' شکنتلا چونکی۔ ایک پل میں ساری حقیقت اس پر واضح ہو گئی لیکن اس نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور یوں آنکھیں موند لیں جیسے نقاہت کے باعث سونا چاہتی ہو۔ تو سندری کی ماں نے اس کے پتا کو آنکھ کے اشارے سے مزید سوالات کرنے سے روک دیا اور وہ سب کمرے سے باہر نکل گئے تاکہ شکنتلا سو سکے۔

☆......☆

شکنتلا کو اس گھر میں قیام پذیر ہوئے آج پانچواں روز تھا۔ ان پانچ دنوں میں اسے کئی باتوں کا پتا چل گیا تھا کہ سندری کا باپ سوراد یا گاؤں سموگھی کا پنچ تھا اور اثر رسوخ والا بڑا زمیندار بھی اور سندری کے بھائی کا نام کنگن تھا، یہ کوئی کام کاج نہ کرتا تھا۔ گاؤں میں ان کی بہت بڑی حویلی تھی جس میں وہ شکنتلا کو لائے تھے، شکنتلا انہی کے کھیتوں میں بے ہوش پڑی تھی۔

سندری جو اپنے نام کی طرح ہی سندر تھی، اس کی گہری سکھی بن چکی تھی۔ یہ ماتا پتا کی لاڈلی اور نہایت شوخ تھی پورے گاؤں میں ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی!

سوراد یا شکنتلا کو اس خیال سے حویلی میں لے آیا تھا کہ اس کے زخم مندمل ہو جائیں تو اس کے گھر کا پتا معلوم کر کے اس کو بحفاظت گھر چھوڑ دیتا لیکن اس بے چارے کو کیا معلوم کہ یہ کس آفت کی پرکالہ کو گھر میں اٹھا لایا ہے!

ان تینوں دنوں میں سندری اور اس کی ماں نے بھی اس کا بڑا خیال رکھا تھا۔ سندری تو گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔ شکنتلا نے اس سے پوچھا کہ میرا حلیہ اور جسمانی حالت تو بالکل فقیروں اور بھیک مانگنے والوں جیسی تھی تم لوگ مجھے کیوں گھر لائے ہو تو اسی نے شکنتلا کو بتایا کہ ٹھیک ہے دیدی کہ تمہاری ظاہری حالت بالکل خراب تھی مگر تمہارا پھٹا اور کئی جگہ سے جلے

ہوئے لباس کا کپڑا اس قدر قیمتی اور نیا تھا کہ پتا جی کو وشواس ہو گیا کہ تمہارا تعلق کسی بہت اچھے خاندان سے ہے، پھر تم جلی ہونے کے باوجود بھی خوب صورت تھی۔ اسی ناتے پتا جی تمہیں اٹھا کر گھر لائے کہ کسی بڑے خاندان کی مصیبت کی ماری معلوم ہوتی ہے۔

''لیکن دیدی ایک بات تو بتاؤ۔'' سندری اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ''جن کتوں نے تجھے کاٹا تھا، وہ تینوں کیسے مر گئے، ان کے جسم تو یوں نیلے پڑے تھے جیسے انہیں کسی نے زہر دے دیا ہو! یا کسی سانپ نے انہیں کاٹا ہو!''

''مجھے کیا پتا۔'' شکنتلا بھولپن سے بولی۔ ''ہو سکتا ہے کسی دیکھنے والے نے مجھ پر کرپا کر کے انہیں مار دیا ہو۔''

شکنتلا اپنا راز کسی صورت ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی! اس کی حالت زیادہ بہتر نہ تھی تاہم پھر بھی علاج، اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے! ایک بات جو اس نے محسوس کی تھی کہ سندری کا بھائی کنگن جو ایک تنومند نوجوان تھا روزانہ آدھی رات کو دبے قدموں اٹھ کر باہر نکل جاتا اور رات کے آخری پہر صبح ہونے سے قبل اسی رازداری سے واپس آ جاتا۔ اس بات کا شکنتلا کو ایسے پتا چلا کہ وہ تو ناگن تھی اور نیند کی اس کو کوئی خاص ضرورت نہ تھی تاہم اپنی مرضی سے سو سکتی تھی۔

ایک بار رات کو جب سندری جو اس کے پاس ہی سوتی تھی۔ سو گئی اور شکنتلا ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی تو اچانک اسے کھٹکا محسوس ہوا، کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی باہر آئی تو کنگن کو اس نے کشادہ صحن سے گزر کر مردان خانے کی طرف جاتے دیکھا اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کنگن بڑا کواڑ کھول کر باہر نکل گیا اور شکنتلا نے رات کے آخری پہر اسے اسی رازداری سے واپس آتے دیکھا!

اگلے دن اور پھر اس کے اگلے دن بھی ایسا ہی ہوا تو شکنتلا کو یقین ہو گیا کہ کنگن کسی خاص مقصد سے باہر جاتا ہے اور صبح دن چڑھے تک سوتا رہتا ہے اور پھر رات کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔ شکنتلا کنگن کی اس حرکت کو شاید نظر انداز کر دیتی، کیوں کہ اس کے خیال میں کسی عشق وغیرہ کے چکر میں ہوگا۔ لیکن ایک دن سندری اسے کہنے لگی۔

''دیدی پتا نہیں بھیا کو کیا ہو گیا ہے۔ کئی دنوں سے نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ دن چڑھے تک سوتا رہتا ہے! اور اس کی سرخ و سپید رنگت پیلی زرد پڑتی جا رہی ہے! کسی سے کوئی بات نہیں کرتا اور ہر وقت کھویا کھویا رہنے لگا ہے۔ صحت بھی کنگن بھیا کی تیزی سے گرتی جا رہی ہے! اور کبھی کبھار تو وہ کمزوری سے گر پڑتے ہیں۔ جیسے جسم میں خون ہی نہ ہو!''

''خون؟'' شکنتلا کو ایک جھٹکا لگا۔ اسے تیزی سے اپنی خونی پیاس کی شدت محسوس ہوئی! اور کنگن کے جسم میں خون کی کمی کا سن کر اسے خیال آیا کہ کیا وہ کسی ماورائی شکتی کے زیر اثر ہے! جو اس کا خون ہولے ہولے چوس رہی ہے! سندری کے جانے کے بعد بھی وہ ایسی ہی باتیں سوچتی رہی۔ اچانک اس کے دل میں خواہش دعا بن کر نکلی کہ کاش اس وقت چینکارا آ جائے اور مجھے کہیں سے خون کا بندوبست کر دے ورنہ تو میں مر جاؤں گی اور ایسی معذوری میں تو میں خود بھی بندوبست نہیں کر سکتی۔

یہ الفاظ ابھی اس کی زبان پر ہی تھے کہ اس کو گرم ہوا کا تھپیڑا لگا، گرم ہوا کے اس مانوس جھونکے سے شکنتلا بری طرح چونک اٹھی، نظریں اٹھا کر دیکھا تو چینکارا اس کے قریب کھڑا خوفناک انداز میں مسکرا رہا تھا۔ شکنتلا بھونچکاں رہ گئی اور کئی لمحے اس کو حیرت سے دیکھتی رہی پھر گویا ہوئی۔

''تت تم؟''

''جی مالکن میں...... آپ کا غلام بد شکلا۔''

''تم پہلے کہاں تھے؟'' شکنتلا کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

''مالکن میں تو ہر دم آپ کے آس پاس رہا، آپ نے خود ہی مجھے طلب نہ کیا اور میں آپ کی پرارتھنا کے بغیر کیسے ظاہر ہو سکتا ہوں۔''

''تو...... تو کیا میری شکتیاں مجھے واپس مل گئی ہیں؟''

☆......☆

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول
کی اگلی قسط ماہ جولائی میں ملاحظہ کیجیے)

شعلہ ساماں تحریریں

نصیب کی بارش

ڈاکٹر محمود آکاش

ایک مرد کی خاطر معصوم بچیوں کی خواہشات کو خون میں رنگنے والی ایک حسینہ کی داستان

شائستہ کی موت پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ وہ تھی ہی ہر دل عزیز، ہر ایک کا خیال رکھنے والی۔ جو بھی اس سے ایک بار مل لیتا وہ دوبارہ بھی ملنے کی خواہش رکھتا۔ وہ گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کی خدمت میں کوئی کمی نہ رہنے دیتی تھی۔

صبا اور روحانہ شائستہ کی کل کائنات تھے۔ صبا دس سال کی اور روحانہ سات سال کی، لیکن جب وقت آجائے تو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ شائستہ کو چند دنوں کے بخار نے ختم کر دیا تھا۔

دلاور کو شائستہ سے بہت محبت تھی۔ دلاور بہت زیادہ امیر نہ سہی، مگر ان کی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ بیوی کے مرنے کے بعد دلاور کی زندگی میں ایک خلا سا آگیا تھا۔ بچیاں ابھی چھوٹی تھیں۔ کھانا بنانا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی وغیرہ، یہ سب کیسے ہوں گے، اسے یہ فکر لاحق تھی۔ دلاور جس فیکٹری میں کام کرتا تھا، وہاں سے اسے ایک ہفتے کی چھٹی تو ملی ہوئی تھی، مگر اس سے زیادہ کام سے غیر حاضر رہنا ممکن نہ تھا اور اگر نوکری بھی جاتی رہتی، تو مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا اور روز روز اچھی نوکریاں ملتی بھی تو مشکل سے ہیں نا۔

☆......☆

موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ ہر طرف تر و تازہ، رنگ برنگی پھول ہی پھول کھلے ہوئے نظر آرہے تھے، لیکن ایک دلاور تھا جس کے گھر اور چہرے پر خزاں کا رقص جاری تھا۔ گلی محلے والے، رشتے دار اور فیکٹری میں ساتھ کام کرنے والے دوست، سب اسے دوسری شادی کا مشورہ دے رہے تھے، مگر دلاور اس بات پر رضامند نہ تھا۔

چوں کہ بچیاں ابھی بہت چھوٹی تھیں اور کل کو ان کو بڑا بھی ہونا تھا اور جوان بچیوں کو وہ گھر میں اکیلا چھوڑ کر کہیں آ جا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہی سوچ سوچ کر دلاور کا دن کا چین اور راتوں کی نیند ختم ہو گئی تھی۔

شائستہ کے انتقال کو ابھی چند دن ہی گزرے تھے اور شائستہ کی امی اور چھوٹی بہن نبیلہ بھی اس دن سے وہیں پر تھیں اس لیے دلاور تھوڑا بہت ریلیکس تھا۔ صبا اور روحی نے بھی اسکول جانا شروع کر دیا تھا، لیکن ایک دن تو انہوں نے اپنے گھر جانا ہی تھا۔ نبیلہ کو صبا اور روحی سے بہت پیار تھا اور ماں کے جانے کے بعد ان دونوں نے بھی خالہ کے ساتھ رہنا شروع کیا تو انہیں کافی حوصلہ ملا تھا، مگر جب وہ لوگ چلے گئے تو دلاور کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

شادی وہ کر نہیں سکتا تھا، کیوں کہ کوئی بھی عورت بچیوں کو ماں کا پیار نہیں دے سکتی تھی۔ آخر کرے بھی تو کیا کرے، یہی سوچ سوچ کر دلاور پاگل ہوا جا رہا تھا۔

☆......☆

موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا اور مئی کے ابتدائی دن تھے۔ گندم کی کٹائی جاری تھی۔ چارپائیاں صحن میں بچھا کر سب لوگ لیٹ گئے تھے، صبا لیکن ابھی پڑھ رہی تھی، جبکہ روحی جلد ہی سو گئی تھی اور دلاور چارپائی پر لیٹا ہوا آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ شائستہ تم اتنی جلدی کیوں چلی گئیں ہم سب کو چھوڑ کر۔ ذرا آ کر دیکھو کہ میں کتنا تنہا ہو گیا ہوں تمہارے بنا۔ آخر کیوں تقدیر نے ہمیں جدا کر دیا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ خوشیاں میری قسمت میں ہیں ہی نہیں، پیار مجھے ملنا ہی نہیں یا وہ اس وہم کا شکار ہے کہ مسکراہٹ میں میرا کوئی حصہ نہیں تو ایسے شخص کی مثال اس کسان کی طرح دی جا سکتی ہے جو اس ڈر کے ساتھ اپنے کھیت کو تیار نہیں کرتا کہ اس سال تو بارش آئے گی نہیں، خشک سالی ہی ہو گی۔

"پاپا...... پاپا...... اٹھیں دیکھیں روحی کو کیا ہو گیا ہے۔" اچانک صبا کی آواز پر دلاور کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا تو دیکھا کہ روحی بار بار قے کیے جا رہی ہے۔ دلاور اور صبا نے روحی کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی، مگر قے رک ہی نہیں رہی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے اور اس وقت تو محلے میں کوئی ڈاکٹر کے ملنے کے بھی امکانات نہیں تھے، مگر دلاور نے فوری طور پر روحی کو اٹھایا اور صبا کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا، کیوں کہ اکیلی صبا کو بھی تو گھر پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے، اس لیے رات کے اس ٹائم بھی اسے ایک رکشا مل ہی گیا۔ اگر سردی ہوتی تو رات کو نو بجے کے بعد ہی سے کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ وہ روحی کو لے کر سرکاری اسپتال پہنچا جہاں اس کا فوری طور پر علاج شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ "باسی کھانا کھانے کی وجہ سے اس کے معدے میں انفیکشن ہو گیا ہے جس کی وجہ سے قے ہوئی ہے اور قے زیادہ ہونے کی وجہ سے پانی کی کمی ہو گئی ہے اس لیے اسے دو دن اسپتال رہنا پڑے گا۔"

"ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے نا......" دلاور پریشان زدہ لہجے میں بولا۔

"ارے نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ نے اچھا کیا جو اسی وقت لے آئے، ورنہ اگر آپ صبح ہونے کا انتظار کرتے تو شاید پانی کی شدید کمی ہو جاتی۔ آپ بالکل بھی پریشان مت ہوں، ان شاء اللہ جیسے ہی ڈرپ



ختم ہوگی، آپ کی بیٹی کو ہوش آجائے گا۔"

"شکریہ، ڈاکٹر صاحب۔"

"ارے اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے، یہ تو ہمارا فرض اور ہماری ڈیوٹی ہے اور ہم اس کی باقاعدہ تنخواہ لیتے ہیں۔ اوکے خدا حافظ۔"

پھر جیسے ہی ڈاکٹر صاحب گئے، دلاور کے ذہن میں باسی کھانا کھانے والی بات آ گئی تو صبا نے بتایا کہ پاپا میں نے روحی کو منع بھی کیا تھا کہ ماما کہتی تھیں گرمیوں میں سالن خراب ہو جاتا ہے، اس لیے کل کا بچا کھانا نہیں کھانا چاہیے، مگر روحی نے زبردستی کھا لیا، اسی کی وجہ سے اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔

دلاور کو آج پھر شائستہ بہت یاد آئی تھی اور پھر اس نے صبا کو گلے سے لگایا اور اپنے پاس ہی لٹا لیا کہ بیٹا رات کافی ہوگئی ہے آپ کچھ دیر کے لیے سو جاؤ، روحی اب بالکل ٹھیک ہے۔

صبح ہوتے ہی نبیلہ اور اس کی امی بھی اسپتال پہنچ گئے۔ روحی کو ہوش آ چکا تھا اور وہ پہلے سے بہت بہتر تھی اور پھر مزید ایک دن رکنے کے بعد روحی کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ دلاور نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی بچی بالکل ٹھیک ہو کر گھر واپس آ گئی ہے۔

"نبیلہ آنٹی آپ ہی رہا کریں نا، میرا آپ کے بنا دل نہیں لگتا اور پتا ہے آپ کے جانے کے بعد نہیں کھانا بھی تازہ نہیں ملتا۔ پاپا ہوٹل سے لے آتے ہیں اور وہی گرم کر کے دو دن کھا لیتے ہیں اور کبھی کبھار جب گھر میں بنتا ہے تو وہ ٹھیک طرح سے بن ہی نہیں پاتا۔"

روحی باتیں کر رہی تھی آنٹی نبیلہ سے، جبکہ دلاور دروازے کے پاس سے گزرتا ہوا سن رہا تھا، تو ایک دم سے دلاور کو خیال آیا کہ اسے اپنے بچوں کی خاطر شادی کر ہی لینی چاہیے، مگر کس سے......؟ کیسے......؟ اور آخر وہ کس طرح اور کس سے اس سلسلے میں بات کرے، کیوں کہ اس کے اپنے ماں باپ تو تھے نہیں، آخر ایک ساس ہی تو ہیں، وہ بھی کیا سوچیں گی اور پھر دلاور نے سوچ لیا کہ وہ ان سے ضرور بات کرے گا۔

☆......☆

مئی کے اختتامی دن تھے۔ عصر کے بعد سے لے کر مغرب تک شدید آندھی چلنے کے بعد موسم کافی حد تک صاف ہو گیا تھا۔ روحی کی ضد تھی کہ مجھے ابھی باہر لے کر چلیں اور آئس کریم کھلا کر لائیں۔ نبیلہ بھی آئی ہوئی تھی، آخر دلاور مان ہی گیا، کیوں کہ جب سے شائستہ دنیا سے گئی تھی، تب سے وہ بھی کہیں نہیں گیا تھا۔ صبا بھی بہت خوش ہوئی تھی اور روحی تو بہت زیادہ خوش تھی، پھر وہ لوگ رات گئے تک گھومتے رہے۔ دلاور نے محسوس کیا کہ صبا اور روحی نبیلہ کے ساتھ کافی خوش ہیں۔

چوں کہ نبیلہ ابھی کچھ دن یہیں رہنے کی غرض سے رکی ہوئی تھی، اس لیے دلاور نے ساسو ماں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے گھر چلا آیا۔

ماں دلاور کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ "سب خیریت تو ہے نا بیٹا۔"

"جی، سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں ویسے ہی ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ آپ سے مل لوں۔"

وہ بولیں۔ "بیٹا تم بچوں کو بھی لے آتے۔"

"ارے نہیں ماں جی، ان کا اسکول کا حرج ہوتا ہے۔ وہ دراصل بات یہ ہے کہ ماں جی کہ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ میرا آپ لوگوں کے سوا ہے ہی کون، جس سے میں بات کروں۔ تو اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے ہی بات کر لی جائے تو بہتر ہے۔"

"ہاں، ہاں بیٹا تم بولو کیا بات ہے۔"

"دراصل امی آپ کو تو پتا ہی ہے کہ شائستہ کے جانے کے بعد ہم سب کس مشکل صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ بچیاں ابھی چھوٹی ہیں۔ ان کو کھانا بنانا نہیں آتا اور پھر کل کو جب وہ بڑی ہو جائیں گی اور میں سارا دن فیکٹری میں ہوتا ہوں تو اس لیے بہت ضروری ہے کہ میں...... آپ بات کو سمجھ رہی ہیں نا...... کہ جوان بچیوں کا گھر میں اکیلے رہنا کسی بھی صورت ٹھیک نہیں ہے۔ تو مناسب یہی ہے کہ آپ ہی کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر میری شادی...... پلیز ماں جی مجھے غلط مت سمجھئے گا۔ مجھے بیوی کی نہیں مگر میرے بچوں کو ماں کی ضرورت ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں بیٹا تمہاری بات، تمہارے احساسات اور یہ بھی کہ شائستہ کا خلا پُر نہیں کیا جا سکتا، مگر بیٹا، مجھے سوچنے سمجھنے کا کچھ ٹائم چاہیے۔ ان شاء اللہ کوئی

نہ کوئی بہتر حل نکل آئے گا۔ خدا بہتر کرے گا۔"

☆......☆

"نبیلہ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔"

"جی امی، کہیے۔"

"وہ بیٹا دراصل بات یہ ہے کہ دلاور، صبا اور روحانہ کا ہمارے علاوہ کوئی نہیں ہے اور ہمارا بھی اور پھر جب سے شائستہ ہم سے روٹھ گئی ہے، تب سے صبا اور روحی باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو گئی ہیں بیٹا، کیوں کہ جس طرح ایک ماں اپنے بچوں کی پرورش کر سکتی ہے، اس طرح باپ نہیں کر سکتا۔"

"جی امی میں یہ سب باتیں سمجھتی ہوں۔ شائستہ باجی کے جانے کے بعد ہم سب بہت ادھورے سے ہو گئے ہیں۔"

"ہاں بیٹا اور میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ یہ ادھورا پن ختم ہو جائے اور تمہاری شادی دلاور سے کر دی جائے۔"

"ارے امی یہ آپ کہہ رہی ہیں، ایسا کیسے ممکن ہے؟ میں دلاور بھائی سے...... نہیں امی ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اور ظہیر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ میرا ضمیر مجھے ایسا کرنے سے روک دے گا اور آپ دلاور بھائی کی شادی کہیں اور بھی تو کروا سکتی ہیں نا۔ اگر انہوں نے ضرور شادی کرنا ہے تو......"

"کہیں اور شادی کرنے سے دلاور کو بیوی تو مل جائے گی مگر صبا اور روحی کو ماں نہیں مل سکتی نبیلہ بیٹی...... صرف تم ہی ان کو ماں بن کر پال سکتی ہو اور وہ تم سے بہت زیادہ اٹیچ بھی تو ہیں۔ تمہیں یہ قربانی دینا ہی پڑے گی۔ مجھے کل تک سوچ سمجھ کر اپنا فیصلہ سنا دو اور ہاں یاد رکھنا، مجھے فیصلہ ہاں میں ہی چاہیے، کیوں کہ مجھے اپنی بیٹی کی روح کو ناراض نہیں کرنا ہے۔"

☆......☆

ظہیر نبیلہ کا تایا زاد تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن ابھی باقاعدہ کوئی رشتہ طے نہیں ہوا تھا۔ ظہیر نبیلہ کو کالج چھوڑنے اور لینے جایا کرتا تھا اور وہیں دونوں کے مابین عہد و پیمان ہوئے تھے، مگر ابھی اس بات کا ظہیر کے گھر والوں کو علم نہ تھا۔

نبیلہ نے صاف صاف ماں کو انکار کر دیا کہ وہ دلاور بھائی سے شادی کے لیے رضامند نہیں ہے، مگر ماں جی نے زبردستی شادی کروانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور دلاور کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر نکاح کی تیاری کر لے۔ ابھی دلاور کے علم میں یہ بات بالکل نہیں تھی کہ شادی ہو کس کے ساتھ رہی ہے۔

جب صبا اور روحی کو دلاور نے اعتماد میں لینے کی کوشش کی اور صبا نے بہت تحمل مزاجی سے بات کو سمجھتے ہوئے پاپا سے کہا کہ پاپا ہمیں آپ کی شادی کرنے پر تو کوئی نہیں ہے، مگر میں چاہتی تھی کہ اگر...... میرا مطلب ہے پاپا کہ "پاپا اگر نبیلہ آنٹی اس گھر میں آ جائیں تو اچھی بات ہوتی۔"

"بیٹا وہ آخر کب تک یہاں رہ سکتی ہیں، آخر ایک نہ ایک دن تو ان کی بھی شادی ہو جانی ہے، پھر بھی تو آپ کو اکیلے ہی رہنا پڑے گا اور اس سے بہتر ہے کہ ہم ابھی سے......"

"پاپا آپ میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں، میرا مطلب ہے کہ آپ نبیلہ آنٹی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ پاپا وہ ہم سب سے بہت پیار کرتی ہیں اور پاپا اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کوئی دوسری عورت ہمیں ماں کا پیار دے سکتی ہے۔ پاپا نبیلہ آنٹی سے بہتر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔"

"مگر بیٹا آپ کے اس چھوٹے سے دماغ میں یہ بات آئی بھی کہاں سے اور بیٹا وہ کبھی بھی اس رشتے پر رضامند نہیں ہوں گی اور ہم ان کو مجبور بھی تو نہیں کر سکتے نا۔"

"جی پاپا آپ کی بات ٹھیک ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہیں کریں گی۔ اگر آپ بات نہیں کر سکتے تو میں خود نانی ماں سے بات کروں گی۔"

"مگر بیٹا آپ کی نانی ماں مجھے اطلاع دے چکی ہیں کہ شادی کی تیاری کروں۔ ایک ہفتے بعد نکاح ہے۔

The Mother's Pride

تم نہ سمجھو گے عورت کا غرور بھی
کتنا خوش گوار ہے تخلیق کا کرب بھی
اک لفظ کہہ کر جنت بھی قدموں تلے کر دی
میرے بچے نے "ماں" کہہ کر پکارا جو ابھی

عنبرین نعیم

اب تجھے یہ تو معلوم نہیں کہ نکاح کس کے ساتھ ہورہا ہے۔ بیٹا انہوں نے آپ لوگوں کی بہتری کے لیے ہی کیا ہوگا نا انتظام۔"

"نہیں پاپا، میں اس بات پر رضا مند نہیں ہوں۔ آپ کی شادی ہوگی تو آنٹی کے ساتھ ورنہ نہیں۔ ہم کسی بھی دوسری عورت کے ساتھ کبھی بھی نہیں رہ پائیں گے۔ آپ مجھے نانی ماں کے گھر چھوڑ کے آئیں، میں خود بات کروں گی ان سے۔"

☆......☆

اتوار کا دن تھا، ناشتے کے بعد دلاور، صبا اور روحی کو لے کر نانی ماں کی طرف نکلا ہی تھا کہ گلی سے ماں جی آتی نظر آ گئیں۔ صبا اور روحی نانی ماں سے لپٹ گئیں اور جب نانی ماں کو پتا چلا کہ سب لوگ ان کی طرف ہی جانے والے تھے تو وہ دونوں نواسیوں کو بہت پیار کرنے لگیں کہ مجھے پتا تھا کہ میری بیٹیاں اُداس ہوگئی ہیں، میں اسی لیے تم سے ملنے خود چلی آئی۔ صبا اور روحی بہت خوش ہوئیں۔

"اچھا ماں جی آپ سب باتیں کریں، میں آپ کے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔" دلاور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆......☆

روحی ہوم ورک کرنے لگ گئی اور صبا نانی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ نانی ماں صبا کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں اور بولیں۔

"دیکھو صبا بیٹی! تم ماشاءاللہ سے اب بڑی ہوگئی ہے اور ہر بات کو سمجھتی ہوں اور بیٹا میرا تم لوگوں اور نبیلہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوجائے تو نبیلہ کو کون سنبھالے گا اور بیٹا شائستہ کے جانے کے بعد مجھے تم دونوں کی بھی بہت فکر لگی رہتی ہے۔ دلاور بہت اچھا بیٹا ہے، مگر بیٹی وہ ہر وقت تو تم لوگوں کے پاس نہیں نا بیٹھ سکتا۔ اس لیے میں نے دلاور کی شادی کا فیصلہ کیا ہے۔"

"سوری نانی ماں میں آپ کی بات کاٹ رہی ہوں، مگر نانی ماں کوئی بھی فیصلہ سنانے سے پہلے آپ کو میری بات نہ صرف سننا ہوگی بلکہ ماننا بھی پڑے گی۔"

"جی بیٹا کہو تم کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"نانی ماں میں مانتی ہوں کہ میں بچی ہوں۔ مجھے زیادہ سمجھ بوجھ نہیں ہے، مگر نانی ماں میں یہ بات تو سمجھ ہی سکتی ہوں نا کہ کوئی بھی دوسری عورت سوتیلے بچوں کو ماں کا پیار اور بچے اس کو ماں کا درجہ نہیں دے پائیں گے۔ اور نانی ماں آپ یہ بھی تو چاہتی ہیں نا کہ نبیلہ آنٹی کا فرض بھی ادا ہوجائے تاکہ آپ کی پریشانی ختم ہوجائے، تو کیوں نا نبیلہ آنٹی ہی کو ہماری ماں بنادیا جائے۔ میرا مطلب ہے نانی ماں کہ کیوں نہ پاپا اور نبیلہ آنٹی...... آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا...... نانی ماں۔"

یہ کہنا تھا کہ نانی ماں کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگا اور انہوں نے اپنی معصوم سی صبا کو سینے سے لگالیا۔ دلاور بھی گھر میں داخل ہورہا تھا، وہ بھی ماں بیٹی کی باتیں سن کر ماں جی کا فیصلہ سننے کا منتظر تھا اور جب ماں جی نے صبا کو یہ بتایا کہ انہوں نے خود یہی فیصلہ کیا ہے اور ایک ہفتے کے اندر اندر نکاح کردیا جائے گا تو دلاور کو اطمینان سا ہوگیا۔

☆......☆

نبیلہ اس نکاح پر رضا مند نہ تھی، کیوں کہ وہ ظہیر کو پسند کرتی تھی، مگر ماں جی کے حکم پر اس کو دلاور کے ساتھ نکاح کرنا پڑا، مگر چوں کہ وہ خوش نہ تھی اس لیے اس نے آتے ہی تیور بدلنا شروع کردیے جس کو صبا جیسی سمجھ دار لڑکی نے فوراً محسوس کرلیا، کیوں کہ وہ آنٹی جوان دونوں سے بے انتہا پیار کرتی تھی، جب رشتہ بدلا اور وہ ماں کے درجے پر آ گئی تو اتنی لاپروا ہوجائے گی، ایسا تو پرائے بھی نہ کرتے۔ کچھ دن تک تو صبا نے ساری ذمے داریاں خود نبھائیں۔ کھانا بنانا وہ تھوڑا بہت سیکھ ہی چکی تھی۔ صفائی وغیرہ بھی وہ دونوں بہنیں خود ہی کرتیں، کیوں کہ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ نبیلہ کا زیادہ تر وقت ٹی وی دیکھتے یا موبائل پر باتیں کرتے گزرتا تھا۔

صبا اس بات کو دل سے محسوس کرتی کہ آخر آنٹی سارا سارا دن کس سے باتیں کرتی ہیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ نبیلہ جب سے آئی تھی اس نے کبھی پاؤں بیڈ سے نیچے نہیں اتارا تھا۔ روحی چھوٹی تھی اس کو ان باتوں کی کچھ سمجھ نہیں تھی۔ وہ صبا سے پوچھتی تو صبا کہہ دیتی کہ آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ ٹھیک ہوجائیں گی تو کھانا وہی بنایا کریں گی۔" یہ سن کر روحی خاموش ہوجاتی۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوگئیں، اسکول کھل گئے۔

اب دونوں بچیوں کو ٹائم پر اسکول جانا تھا۔ انہیں ناشتا اور یونیفارم تیار ملنے چاہیے تھے، مگر نبیلہ کی روٹین نہ بدلی۔ آج بھی سب کام صبا کو خود ہی کرنا پڑتے تھے۔ وہ اپنے اور روحی کے لیے ناشتا بنانے کے ساتھ ساتھ پاپا کو بھی ناشتا کروادیا کرتی اور پھر پاپا فیکٹری جاتے ہوئے راستے میں ان کو اسکول چھوڑ دیتے۔

دلاور کو شائستہ یاد آتی اور پھر وہ اپنے فیصلے پر بہت پچھتاتا کہ کاش وہ دوسری شادی ہی نہ کرتا، مگر جو کچھ اس نے سوچا تھا، ویسا نہ ہوسکا، پھر وہ تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر چپ کرجاتا۔

☆......☆

سردیاں اپنے اختتام کو تھیں۔ دن کو موسم گرم اور راتیں سرد ہوگئی تھیں۔ خدا نے نبیلہ کو ایک خوب صورت بچے کی ماں بنادیا تھا، مگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئی۔ اس کو جیسے دلچسپی ہی نہ تھی کہ خدا نے اسے دنیا کے سب سے خوب صورت روپ سے نوازا ہے۔ صبا اور روحی کو تو جیسے ایک کھلونا مل گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں اور ہمہ وقت مُنے کو اٹھائے رکھتیں۔ یہاں تک کہ نبیلہ نے بچے کو اپنا دودھ تک پلانا گوارا نہ کیا اور بچہ ڈبے کے دودھ پر پرورش پانے لگا۔

دلاور کو بہت غصہ آتا، مگر وہ اپنی بچیوں اور ماں جی خاطر خاموشی سے وقت پاس کرتا رہا۔ ماں جی نبیلہ کو بہت سمجھاتیں، مگر اس کا جواب یہی ہوتا کہ میں نے آپ کو کہا تھا کہ میں اس شادی کو قبول نہیں کرسکتی، پھر ایک روز جب صبح ماں جی نماز کے لیے اٹھیں تو صبا بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کر وضو کرکے نماز ادا کررہی تھی تو مُنے کی رونے کی آواز پر صبا جب کمرے میں گئی تو نبیلہ کو نہ پاکر اس نے ہر جگہ دیکھا۔ واش روم میں چیک کیا، مگر نبیلہ ہوتی تو ملتی، پھر جب اس نے آکر نانی ماں کو بتایا تو ان کے لیے یہ خبر جان لیوا ثابت ہوئی۔

نبیلہ کا یوں ظہیر کے ساتھ بھاگ جانا اور پھر ماں جی کا دنیا چھوڑ جانا یہ ایسے صدمات تھے جنہوں نے دلاور کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ دو جوان بچیاں اور دو ماہ کے بچے کو پالنے کی فکر نے دلاور کو وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔ صبا نے اسکول چھوڑ دیا تھا اور مکمل ذمے داری کے ساتھ گھر سنبھالنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا تھا تاکہ گھر میں دل بھی لگا رہے اور کچھ حالات بھی ٹھیک ہوجائیں۔ روحی باقاعدہ سے اسکول جاتی اور واپس آکر مُنے کو اٹھالیتی، تب تک صبا گھر کے کام وغیرہ کرلیتی تھی۔

☆......☆

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ویسے ویسے دلاور کی فکر بڑھتی جارہی تھی۔ صبا کے دو ایک اچھے رشتے بھی آرہے تھے اور دلاور غور کررہا تھا کہ اگر باعزت طریقے سے اپنے گھر کی ہوجائے تو اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ مُنا اب اسکول جانے لگ گیا تھا اور روحی بھی کافی حد تک کھانا بنانا سیکھ چکی تھی۔

شائستہ کی ایک دو چیزیں بھی گولڈ کی پڑی ہوئی تھیں اور تھوڑا بہت سامان بھی شائستہ نے بنایا ہوا تھا۔ اس لیے دلاور نے اچھی طرح چھان بین کے بعد ایک رشتے کی ہاں کردی اور شادی کے لیے ایک ماہ کا ٹائم دے دیا گیا۔

صبا ابھی شادی کے لیے تیار نہ تھی، مگر وہ پاپا کی مجبوریوں سے آگاہ تھی۔ اس لیے اس نے کوئی بات نہ کی۔ وہ ہمہ وقت روحی کو سمجھاتی کہ کس طرح گھر کو سنبھالنا ہے۔ لڑکا کراچی کسی فرم میں کام کرتا تھا اس لیے شادی کے بعد صبا کو بھی کراچی ساتھ ہی رہنا تھا۔

☆......☆

مُنا ساتویں کلاس میں تھا، جبکہ روحی میٹرک کے بعد گھر میں ہی رہتی تھی۔ وہ صبا کی جگہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی اور گھر کا خیال رکھتی اور پاپا سے جب وہ آتے تو ڈھیروں باتیں کرتی اور صبا بھی روز ہی فون کرکے سب سے بات کرتی تھی۔ خدا نے اس کو بیٹی سے نوازا تھا۔ اس کا شوہر بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ دونوں خوش تھے۔ دلاور بھی اب پہلے سے کافی ریلیکس رہتا تھا۔

ایک روز کی بات ہے، اتوار کا دن تھا۔ صبا اور اس کا شوہر دونوں بیٹی کو ساتھ لے کر سیر کو نکلے۔ دونوں بہت خوش تھے، سارا دن پکنک مناتے گزر گیا۔ جب شام سے ذرا پہلے انہوں نے واپسی کا پروگرام بنایا تو ایک مانگنے والی نے صدا لگائی۔ "اللہ کے نام پر کچھ مدد کردو، میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔"

صبا نے پرس سے دس کا نوٹ نکال کر بیٹی کو دیا کہ

جاؤ مانگنے والی کو دے آؤ اور خود چیزیں سمیٹنے لگی۔
"خدا تمہارا بھلا کرے۔ خدا تمہیں لمبی زندگی دے، خدا تمہارے ماں باپ کے مابین ہمیشہ محبت رکھے۔" مانگنے والی کی آواز پہ صبا کو ایک شاک سا لگا اور پھر اس کی نظروں نے فوراً ہی پہچان لیا کہ یہ کوئی اور نہیں اس کی نبیلہ آنٹی کی ہی آواز ہے۔ صبا فوراً نبیلہ کی جانب دوڑی اور جاتے ہی آنٹی کہہ کر ان سے لپٹ گئی، جبکہ اس کا شوہر حیران تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟
"آنٹی آپ ہمیں چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اٹھیں میرے ساتھ گھر چلیں۔"
"ارے نہیں بیٹا، میں اس قابل کہاں کہ کوئی مجھے گھر رکھے۔ میں تم سب کی مجرم اور بہت گنہگار ہوں۔ خدا نے مجھے میرے کرموں کی سزا جو دی ہے جو ابھی بہت کم ہے، ابھی تو مجھے اور سزا ملنی چاہیے۔ جاؤ بیٹی خدا تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ میرے پاس ان دعاؤں کے سوا تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے اور بیٹی میرے لیے کبھی دعا نہ کرنا، کیوں کہ میں دعا کے قابل ہی کہاں ہوں۔ میں نے اپنی بہن کے بچوں کی قدر نہ کی، تو تم بھی میری قدر نہ کرو۔ مجھے میرے حالت پر چھوڑ دو، جاؤ بیٹی اپنے گھر جاؤ۔"
"نہیں آنٹی پلیز آپ ایسی باتیں مت کریں۔ ہم آپ کو معاف کر چکے ہیں، ہمیں آپ جیسے بزرگوں کے سائے کی ضرورت ہے۔ پلیز آنٹی میرے ساتھ چلیے۔ ہم آپ کو ایک بار پھر کھونے کی ہمت نہیں رکھتے، پلیز اٹھیے آنٹی۔"
اور پھر صبا اور اس کے شوہر نے زبردستی نبیلہ کو ساتھ لے جانے پر رضامند کر ہی لیا۔ صبا نے جب بیٹی کو بتایا کہ یہ اس کی نانی ماں ہیں تو وہ ان کی گود سے باہر ہی نہ نکلتی۔
دلاور اور روحی بھی منّے کو ساتھ لے کر صبا کے ہاں ہی آ چکے تھے اور پھر جو کہانی نبیلہ نے دلاور کو سنائی وہ کچھ یوں تھی کہ میں اپنے کزن ظہیر کے ساتھ جب گھر سے نکلی تو وہ مجھے لے کر اپنے ایک دوست کے فلیٹ پر آ گیا اور مجھے یہ کہہ کر میں علیحدہ گھر کا بندوبست کرتا ہوں، باہر چلا گیا۔ جب وہ شام تک نہ آیا تو مجھے پریشانی ہوئی کہ آخر ظہیر چلا کہاں گیا ہے، پھر رات ہوئی اور میری آنکھ لگ گئی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ شور کی آواز پر کھل گئی۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے سننا چاہا تو پتا چلا کہ ظہیر اور اس کا دوست کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔
ظہیر اس کو کہہ رہا تھا کہ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ خالی ہاتھ آ جائے گی۔ میرا تو خیال تھا کہ کم از کم تھوڑا بہت زیور تو ضرور ہی ساتھ لے کر آئے گی، مگر یہ تو بالکل ہی کنگلی نکلی۔"
"بالکل تو کنگلی خیر نہیں ہے یہ، میرے خیال میں تو جو دولت اس کے پاس ہے وہ کسی اور کے پاس ہو ہی نہیں سکتی۔" ظہیر کا دوست بولا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا...... تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔"
"میرا مطلب تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو ظہیر اور اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہیں ہے، کیوں کہ مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے تو اب ہم اس کو رکھ نہیں سکتے نا، میرا مشورہ مانو تو اس کو بیچ دیتے ہیں۔ کم از کم ایک لاکھ تو مل ہی جائے گا اور پھر تم نے کون سا نکاح کرنا ہے اس کے ساتھ۔"
جب ظہیر کے دوست نے یہ بات کی تو میرا خیال تھا کہ ظہیر اس کے منہ پر تھپڑ مارے گا اور اس کو کہے گا کہ نبیلہ میری عزت ہے۔ میں اس سے پیار کرتا ہوں اور نکاح کروں گا، مگر ظہیر کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ دیکھ کر میرے سپنے ٹوٹ گئے اور میری اُمید کا دامن ٹوٹ گیا۔ تب میں اپنے فیصلے پر بہت پچھتائی۔ مجھے رہ رہ کر تمہارا اور بچوں کا خیال آتا رہا، مگر تب وقت سر سے گزر چکا تھا۔ اور پھر میں ایک لاکھ میں بک گئی۔ مجھے اسی فلیٹ سے جن لوگوں نے خریدا تھا لے گئے، مگر مجھے اس دن کے بعد سے کبھی بھی ظہیر اور اس کا دوست نظر نہ آئے اور نہ ہی میں ان کو دیکھنا چاہتی تھی، یہاں تک کہ مجھے ظہیر سے بھی کوئی گلہ نہیں تھا، کیوں کہ قصور تو میرا تھا، جس نے اپنا ہنستا بستا گھر خود اجاڑا۔ کاش میں تقدیر کے فیصلے کو مان کر تمہیں دل سے قبول کر لیتی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو دلاور۔ صبا بیٹی بہت عظیم ہے۔ میں نے اس بن ماں کی بچی پر بہت ظلم کیا، مگر اس نے پھر بھی مجھے گلے لگایا، ورنہ میرے نصیب کی بارش مجھ پر کبھی نہ برستی۔

☆......☆

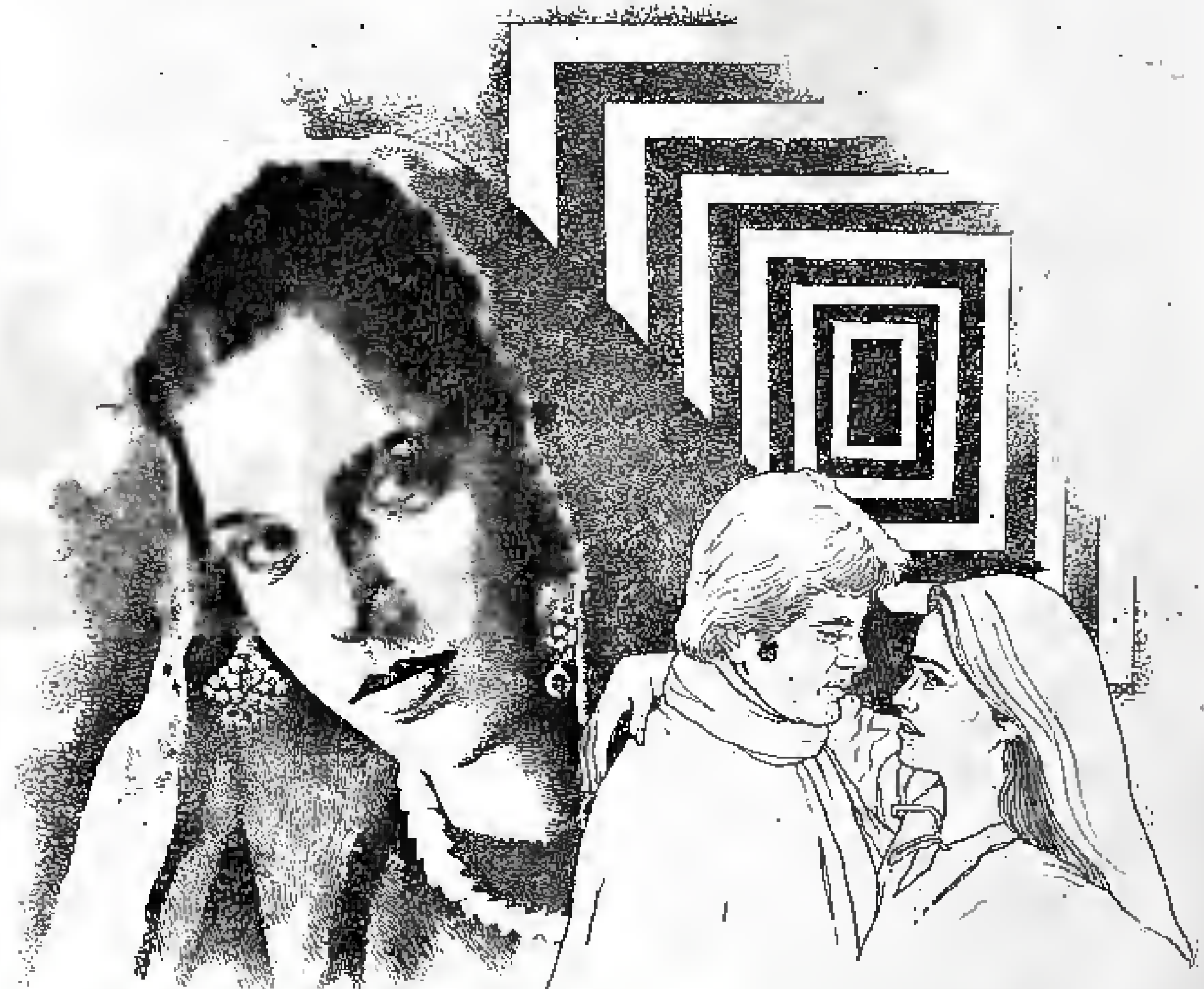
بیٹی بھی جلتی ہے



عادل حسین

مردوں کی انا کی بھینٹ چڑھنے والی ایک بیٹی کی کہانی

نعیم صاحب سرکاری ملازم تھے۔ نماز روزے کے پابند، ملنسار اور اچھے گھرانے سے تعلق تھا۔ اسد، نعیم صاحب کا بڑا بیٹا تھا۔ میٹرک کے بعد اچھے کالج میں پری انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ باپ کی



طرح ہی مذہبی، ملنسار، ہم جن فلیٹوں میں آباد تھے وہیں نعیم صاحب بھی رہائش پذیر تھے۔

رزاق صاحب کی بیٹی سارہ میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوئی تھی اور رزلٹ کے انتظار میں اپنے فارغ وقت کو انگلش لینگویج سیکھنے میں کارآمد بنا رہی تھی۔ رزاق صاحب کا شمار بھی پڑوسیوں میں ہوتا تھا۔ سارہ اسد کو جانتی تو تھی مگر بات چیت کا کوئی سلسلہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس سے باقاعدہ طور پر ملاقات اور گفتگو کوچنگ کی کلاسز کے دوران ہی ہوئی تھی۔ کنورسیشن سے بات دوستی تک اور دوستی سے محبت تک جا پہنچی۔

میرا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا جو اسد کو ایک اچھا انسان مانتے تھے۔ ہم عمر ہونے کی وجہ سے میری اس سے اچھی خاصی دوستی تھی۔ اسد سارہ سے دیوانگی کی حد تک محبت کرنے لگا تھا۔ اس نے مجھے اپنی تمام باتوں کا رازدار بنا رکھا تھا۔ ان دونوں کی محبت میں دو سال کا عرصہ پر لگا کر اڑ گیا تھا۔ ان دو سالوں میں اسد نے کوئی ایسا کام نہ کیا تھا کہ جس سے سارہ کی طرف کوئی انگلی بھی اٹھا سکے۔ بات خط و کتابت اور موبائل پر میسج کے ذریعے سے چل رہی تھی۔ وہ چاہتا تو رشتہ بھی بھیج سکتا تھا، لیکن اپنی تعلیم مکمل کر کے اچھی نوکری حاصل کر لینے کے بعد پیغام بھیجنے کو زیادہ بہتر تصور کرتا تھا۔

رزاق صاحب اخلاقاً کچھ اچھے واقع نہیں ہوئے تھے، جس کو سب ہی لوگ جانتے تھے۔ آئے دن کسی نہ کسی سے جھگڑا کرنا۔ بات بے بات الجھتے رہنا۔ جیسے یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ شاید اعلیٰ عہدے پر افسر اور زیادہ دولت نے انہیں کچھ گھمنڈی طبیعت کا مالک بنا دیا تھا۔

☆......☆

ایک دن اسد نے مجھے بتایا کہ اس نے سارہ کی بات اپنے گھر والوں سے کر لی ہے اور اس کے گھر والے بھی اس کی اس خوشی میں شریک ہیں۔ امی ابو رشتہ لے کر فوری جانا چاہتے تھے مگر میں نے یہ کہہ کر روک لیا کہ پہلے میں کوئی نوکری ڈھونڈ لوں اس کے بعد رشتہ لے کر جانا بہتر ہوگا۔

سارہ خوب صورتی کا پیکر تھی۔ سیاہ گھٹاؤں جیسی دراز زلفیں، بڑی بڑی آنکھیں جن پر گھنی پلکیں، چوڑی چاند جیسی پیشانی اور گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ، لمبے قد اور صاف رنگت کی مالک اور اسد؟ لمبے قد اور بھرے ہوئے سینے کا گبرو جوان۔ چال ڈھال میں بردباری اور پرکشش شخصیت۔ سب سے اچھی بات اس کی آنکھوں کی حیا تھی جو کہ آج کے بگڑے ہوئے لڑکوں سے بالکل مختلف تھی۔ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ دونوں کی جوڑی میری نظر میں بہت خوب صورت تھی۔ دونوں اپنی زندگی میں مگن، آنکھوں میں آنے والے دنوں کے حسین خواب سجائے اچھے بھلے جی رہے تھے۔ دنیا کی دنیاداری سے بھی انجان ہو چکے تھے۔ ان کے لیے ان کی محبت ہی دنیا تھی اور محبت ہی زندگی۔

☆......☆

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ تو بھلا سارہ کی آنکھوں میں رہنے والی ہر وقت کی چمک اور بے وجہ کی مسکراہٹ اس کے پیار کو کیسے چھپنے دیتی؟ بھید کھلنا تھا سو کھل گیا۔ جانے کیسے رزاق صاحب کی فیملی کو بھی اس عشق کی بھنک پڑ گئی۔ سارہ سے زبان سے تو کسی نے کچھ نہ پوچھا، مگر گھر والوں کے رویے نے اسے سب سمجھا دیا تھا۔ بات اسد تک پہنچی تو اس نے والدین کو رشتہ لے کر بھیج دیا۔ یہ بات رزاق صاحب کے لیے شاید بیٹی کے عشق سے زیادہ خطرناک تھی۔ انہوں نے آگ بگولہ ہو کر اسد کے والدین کی تذلیل کر دی اور انہیں احساس دلایا کہ ان کی حیثیت میں بہت فرق ہے اور رخصت کرتے لمحے یہ بات بھی بتائی کہ سارہ کا رشتہ وہ اپنے افسر کے بیٹے سے کر رہے ہیں۔ اسد کے والدین نے بہت ہاتھ پیر جوڑے مگر بے سود۔ دولت کا نشہ اتنی آسانی سے اترنے والا تھوڑی ہوتا ہے۔ بے چارے خالی ہاتھ ذلت اٹھا کر گھر واپس لوٹ آئے۔

سارہ سے موبائل فون چھین لیا گیا۔ آنے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ سارہ پر جو بیت رہی تھی اس سے میری طرح اسد بھی بے خبر تھا۔ کئی مہینوں تک رابطے کا کوئی سلسلہ نہ بن پایا۔ اسد کی حالت میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہنستے مسکراتے

چہرے پر اداسیوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ لوگوں کے دکھ درد بانٹ کر انہیں حوصلہ دینے والا مایوسی کی باتیں کرنے لگا تھا۔ اس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔

☆......☆

کئی مہینوں بعد سارہ نے کسی ذریعے سے اسد کو خط بھیجا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس پر جو گزر رہی ہے وہ بتا کر تمہیں دکھی نہیں کرنا چاہتی۔ بس اتنا سمجھ لو کہ جسم پر اتنا نشان پڑ چکے ہیں کہ سمجھ نہیں آتا مرہم پہلے کہاں لگاؤں۔ مجھے بات بات پر مارا پیٹا جاتا ہے۔ جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور اگر تمہارا نام بھی بھولے سے زبان پر لے آؤں تو کہا جاتا ہے کہ ہم اسے بھی مار دیں گے۔ اسد تمہاری سارہ ہار چکی ہے۔ نہ زخم سہنے کے لیے جسم پر کوئی جگہ باقی ہے اور نہ آنکھوں میں اتنے آنسو ہیں کہ اگر کوئی تمہیں نقصان پہنچا دے (خدا نہ کرے) تو میں جی بھر کے رو بھی سکوں۔ تم خدارا مجھے بھول جاؤ اور اگر ہو سکے تو یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ تمہیں دیکھنے کو بہت من کرتا ہے مگر کیسے؟ میں اب چاہتے ہوئے بھی تمہارے سامنے نہیں آ سکتی۔ جانتے ہو اسد کیوں؟ جو گھنی زلفیں تمہیں بہت پسند تھیں نا! وہ کاٹ کر پھینک دی گئی ہیں تاکہ میں گھر سے باہر ہی نہ نکل سکوں۔ سوچو میری عمر کی ایک لڑکی گنجا سر لے کر باہر کیسے آ سکتی ہے؟ اسد پلیز میری بات مانو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ پلیز اسد پلیز۔''

یہ سب باتیں پڑھنے کے بعد اسد بالکل پاگل سا ہو گیا تھا۔ نہ زندوں میں اور نہ ہی مردوں میں۔ وہ بے بسی کی تصویر بنا زندہ تھا اور موت کی دعائیں مانگنے لگا تھا۔ لیکن موت کا تو وقت متعین ہے نا؟ کس کو پہلے آنی ہے یہ کون جانتا ہے۔

ایسے میں اگر میرا ساتھ نہ ہوتا تو شاید اسد اپنے آپ کو ختم کر چکا ہوتا۔ میں اس کے والدین کے بارے میں اسے بتا بتا کر کوئی بھی غلط قدم اٹھانے سے روکے ہوا تھا۔ اسد کی چھوٹی بہنوں کے چہرے دکھا دکھا کر اسے سمجھاتا کہ ان کا کیا قصور ہے؟ جن کی ذمے داریاں تم نے اٹھانی ہیں اور سارا کے گھر والوں کی سزا تم اپنے گھر والوں کو کیوں دینا چاہتے ہو؟ سارہ تو تم سے محبت کرتی ہے نا؟ تو اس کا ہی سوچو! وہ لڑکی ہو کر جب اتنی تکلیفیں برداشت کر سکتی ہے تو تم کیوں نہیں؟ تم تو اس کے حالات سن کر مرنا چاہتے ہو اور اس بے چاری پر تو یہ سب کچھ گزر رہا ہے۔ تم خدا سے دعا کیا کرو، دعا تقدیر بدل دیتی ہے میرے دوست! اور پھر وہ بے چارہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا۔ کہتا تو وہ ٹھیک ہی تھا۔ ایسے میں کس محبت کرنے والے کا من جینے کو چاہتا ہے، لیکن زندگی کی یہی مجبوری ہے کہ موت کے انتظار میں جینا پڑتا ہے۔

میں نے اسد کو مشورہ دیا کہ سارہ کی بات مان لو اور کچھ دنوں کے لیے کہیں اور چلے جاؤ۔ ان لوگوں سے اچھی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ جو اپنے خون کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کر سکتے ہیں تو تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں، مگر وہ میری بات نہ مانا۔ میری لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہ گیا۔

میں کوشش کرتا تھا کہ زیادہ تر وقت اسد کے ساتھ ہی گزاروں۔ فارغ ہونے کے سبب اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی تھا، مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ سو ہونی ہو گئی۔

ایک دن اسد کو کچھ لوگوں نے اکیلا دیکھ کر ایک سنسان مقام پر لے جا کر بہت تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کے جسم کو مختلف جگہوں پر 38 ٹانکے لگائے گئے تھے۔ بس اللہ پاک نے جان بچالی تھی بے چارے کی۔ یا یہ کہہ لیں کہ ابھی کچھ مزید قیامتیں ٹوٹتی ہوئی اور دیکھنی تھیں اس کی خون میں ڈوبی آنکھوں نے۔ انہی آنکھوں نے جن میں کچھ مدت پہلے خوشیاں رقص کیا کرتی تھیں۔ جن میں مستقبل کے خوب صورت سپنے سجے تھے۔ چار مہینے تک بستر پر پڑا رہا۔ میں اس کے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کو پیروں پر کھڑا کر دینے میں مدد کو میں احسان نہیں مانتا، مگر اس کے گھر والے میرے احسان مند بنے ہوئے تھے۔ اس نے پھر سے چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا اور سچ کہوں تو

بابل کی تاریخ

بابل 2350 قبل مسیح میں تعمیر ہوا تو ایک چھوٹا سا دیہات تھا جس کا ذکر بائبل مقدس میں ہے۔ سفرناموں اور تاریخ میں درج ہے اس کے ہوا میں معلق باغات، ہینگنگ گارڈن اس کی دولت پرانے زمانے کے سات عجوبوں میں شمار ہوتے تھے۔ بابل نے اتنی ترقی کی کہ 1792 سے 1750 قبل مسیح کے مشہور بادشاہ، قانون دان، معاشرتی ریفارمر حمیرابی کا دارالخلافہ رہا، پھر مختلف بادشاہوں نے اسے سنوارا سجایا اور یہ ایک عظیم شہر بن گیا۔ سکندر اعظم بھی اس شہر میں ٹھہرا۔ دوبارہ 322 قبل مسیح میں آیا تو محسوس ہوا صرف مرنے آیا تھا۔ اس کے ایک کمانڈر نے بغداد کے جنوب میں ایک بستی بسائی تو بابل کی قدر و منزلت کم ہونے لگی لیکن اتنی بھی نہیں کہ ہم اسے دیکھنے نہ جاتے۔ (سفرنامہ عراق، قمر علی عباسی سے اقتباس)

اس کے اندر جینے کی اُمنگ باقی تھی ابھی۔ وہ اللہ سے امید لگائے بیٹھا تھا کہ کوئی معجزہ ہو جائے گا اور کہیں سے سارہ آ کر اس کی ویران زندگی میں پھر سے بہاریں بھر دے گی۔ وہ اس کی دلہن بن جائے گی اور ایک دن اس کے ساتھ ہوگی۔

میں اکثر سوچتا تھا کہ کیا پیار میں ملن کی باتیں صرف فلموں اور ڈراموں تک ہی ہوتی ہیں۔ اصل زندگی میں تو میں نے جدائیاں ہی دیکھی ہیں۔ زمانے کا زمانہ دشمن بن جاتا ہے، دو محبت کرنے والوں کا۔

ایک دن اسد بہت بے چین نظر آیا تو میں نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ آج سارہ کا Birth Day ہے۔ بہت من کر رہا ہے کہ اس کو کوئی خوب صورت سا تحفہ بھیجوں۔ اس کو سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔ اے کاش کہ میں ایک گلاب ہی اس کو دے سکتا آج کے دن۔"

میں نے دل بہلانے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور گھر سے باہر لے آیا۔ باہر قدم رکھا تو وہی بچہ جو سارہ کا خط پہلے بھی لا چکا تھا، موجود تھا۔ ایک خط اسد کی طرف بڑھا کر جانے لگا تو اسد نے روک لیا۔ جلدی جلدی خط پڑھا جس میں لکھا تھا کہ صرف اپنی خیریت سے آگاہ کر دو۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم کو ابو نے غنڈوں سے پٹوایا ہے۔"

اس نے فوراً جواب میں "میں ٹھیک ہوں، لیکن خدارا تم اپنا خیال رکھنا۔ میں تمہارا انتظار زندگی کی آخری سانس تک کروں گا۔" لکھ کر بچے کو دے دیا۔ وہ چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا اس بچے کو دینے کے بعد میں اسد کو اپنے گھر لے آیا۔

شام کا وقت تھا تو چائے بنوالی۔ اس کا دل بہلانے کے لیے میں اِدھر اُدھر کی باتیں نکال کے اسے مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو گھنٹے یوں ہی گزر گئے۔ اچانک ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنائی دی تو ہم دونوں نے باہر نکل کر دیکھا۔ پتا چلا کہ رزاق صاحب کے گھر کے دروازے پر لوگ جمع ہیں۔ اچانک ہمیں وہی بچہ نظر آیا جس کے ہاتھ خط بھجوایا تھا۔ اس کو روک کر خط کے متعلق معلوم کیا تو کہنے لگا کہ وہ رزاق انکل نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے بتایا کہ کچن میں چائے بناتے ہوئے سارہ کے دوپٹے میں آگ لگ گئی۔ گھر میں اس کی جان بچانے کے لیے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ آگ اتنی شدید تھی کہ سارہ مکمل طور پر جھلس گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

پھر پولیس موبائل آئی۔ تفصیلات لکھی گئیں، پولیس ریکارڈ میں پڑی فائلوں میں اضافہ کرنے کے لیے ایک فائل کا اور اضافہ ہو گیا۔

اسد اپنا ہوش کھو بیٹھا تھا۔ میں مردہ قدموں سے گھر واپس لوٹ آیا۔

اب آپ کو آگے کیا سناؤں؟ جو مجھے کہنا تھا وہ تو آپ کو کہہ دیا ہے۔ میری امی بھی کتنی بھولی ہیں۔ کہنے لگیں بیٹا! سارہ اس قدر کیسے جل گئی؟ کیا اس کا شور کسی نے نہ سنا ہوگا؟ اب یہ بات میں امی کو کیسے سمجھاؤں کہ سارا ہو یا سارہ! جو جلائی جاتی ہیں ان کی آوازیں کسی کو نہیں آتیں۔

☆......☆

اپنا بویا کاٹ رہی ہوں

شکیلہ انجم طارق

لاہور سے ماں کے روپ میں ایک ڈائن کی عبرت خیز کہانی

سمیرا اور اس کی ماں چندا اُن شاطر اور عیار عورتوں میں سے تھیں، جن کے دل میں جذبات کی جگہ دولت کو جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کے نت نئے خیالات مجتمع رہتے تھے۔ وہ دونوں اکثر و بیشتر اس دولت کی خاطر جھگڑے اور دوسروں سے دنگا فساد کرنے سے بھی باز نہیں آتی تھیں۔

سمیرا دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ ماں کے بے جا لاڈ، پیار اور بے پناہ اہمیت نے اُسے خود سر اور ضدی بنا دیا تھا۔ ہر معاملے میں چندا اُس سے صلاح مشورہ لینا نہیں بھولتی تھی۔ سمیرا کا باپ، عابد نہایت شریف انسان تھا، جسے ان دونوں ماں بیٹی نے ''ملازم'' سے زیادہ کا درجہ کبھی نہیں دیا تھا اور وہ شریف انسان گھر کو مکان بننے سے بچانے کی تگ و دو میں سگے رشتوں کے درمیان خوب پس رہا تھا اور رہ گئے دونوں بیٹے وہ ماں، بہن کی ہر غلط و صحیح بات پر ایمان لے آتے تھے۔ چندا نے اُن کی تربیت ہی کچھ اس ڈھنگ سے کی تھی کہ وہ ماں، بہن کو ہر معاملے میں حق بجانب سمجھتے تھے۔

چندا کے رنگ ڈھنگ نرالے تھے۔ شوہر کی موجودگی میں ہی اُس سے بے وفائی کر گئی تھی۔ نت نئی الزام تراشیاں کر کے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی خوشیوں کو پرے دھکیل دیا تھا۔ بیوی کی بے وفائی اور طوطا چشمی کے باوجود عابد اُسے طلاق دینے کی ہمت نہ کر سکا، وجہ اس کے بچے تھے۔ کچھ بھی تھا وہ بے وفا عورت اُس کے تین بچوں کی ماں تھی اور وہ بچوں کو اُن کی ماں سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کا اس کی بیوی چندا نے کھل کر فائدہ اٹھایا۔ اس نے اختر نامی ایک شخص سے ناجائز تعلقات استوار کر لیے اور اُس کی مدد سے عابد کی ساری زندگی کی جمع پونجی سے بنا ہوا گھر اپنے نام کرا لیا۔ عابد کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ سر پیٹ کے رہ گیا۔ اُس روز گھر میں خوب ہنگامہ ہوا، نوبت لڑائی مار کٹائی تک آ گئی۔ اس دوران اُس کی تینوں اولادوں نے بھی اپنی ماں کا ساتھ دیا۔ چندا نے اختر کے ساتھ مل کر ایک عیسائی سفلی عمل اور جادو ٹونے کرانے والے سے بھی رابطہ کر لیا۔ چندا بجائے اس کے کہ خود صراطِ مستقیم پر آتی، اپنے کیے پہ نادم ہوتی، اُلٹا اس نے شوہر کو نکیل ڈالنے کے لیے اُس پر الٹے سیدھے عمل کرانے شروع کر دیے...... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عابد نے سب کچھ جان کر وہ گھر بھی چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور ساتھ ہی چندا کو طلاق بھی دے ڈالی۔

اس طلاق کو چندا نے بڑی خوشی سے قبول کیا، جیسے طلاق نہ ہوئی ہو اسے کوئی میڈل مل گیا ہو۔ چوں کہ وہ پہلے بھی غلط راہوں پہ چل رہی تھی، مگر تب تو شوہر نام کی رکاوٹ تھی اور اب تو وہ کھلم کھلا من مانیوں پر اتر آئی۔ ایسے میں اولاد کو بھی شہ مل گئی، تو وہ بھی بے باکی اور غلط راہوں کا حصہ بننے کے لیے چل دی۔

ایک بیٹے نے شوقیہ چوریاں شروع کر دیں اور دوسرا سارا سارا دن گھر سے غائب رہتا اور موٹر سائیکل لیے سڑکیں ناپتا رہتا۔ آزاد خیال بیٹی نے کمپیوٹر کورسز کر کے ایک اچھی کمپنی میں جاب حاصل کر لی اور جاب کے دوران اپنے ہی ایک کولیگ سے دوستی کر لی۔ یہ کولیگ پہلے سے شادی شدہ تھا، لیکن سمیرا ہر قیمت پر علیم سے شادی کرنا چاہتی تھی اور اس شادی کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ علیم کی خاندانی بیوی اور دو بچے تھے۔ اُس کے سر پر بھی سمیرا کے حُسن اور عشق کا جادو چڑھا ہوا تھا، بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے اور سمیرا کے ساتھ خوب دھوم دھام سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد سمیرا نے گا ہے بگا ہے علیم سے خوب روپیہ پیسا بٹورا، کیوں کہ علیم کے پاس کافی زمینیں تھیں اور انہی زمینوں کے لالچ میں اُس نے اس سے شادی بھی کی تھی۔

سچ کہتے ہیں جب دولت کی ہوس بڑھ جاتی ہے تو رشتوں، جذبات اور احساس کی موت ہو جاتی ہے۔ اس بیچ اگر کچھ باقی رہتا ہے تو دولت کا چکر...... اور مال و زر سے اپنی تجوریاں بھرنے کی خواہش ہوتی ہے۔

جیبیں تو بھر جاتی ہیں، پر ہاتھ محبت، اعتماد اور خلوص کی دولت ہی نہیں بلکہ رشتوں کے ریشم سے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ اُدھر سمیرا کی ماں چندا دونوں ہاتھوں سے اختر کو لوٹ رہی تھی۔ اختر جان بوجھ کر اس کے ہاتھوں لٹ رہا تھا۔ اس لٹنے میں بھی اس کا نقصان چندا سے بڑا نہ تھا۔ وہ بڑے دھڑلے اور استحقاق کے ساتھ جب چاہتا، اُسے اپنے بستر کی زینت بنا لیتا اور سمیرا کی ماں ذرا بھی اس پر چوں چاں نہیں کرتی تھی۔ کرتی بھی کیسے اس کا منہ تو اختر کے ہرے، نیلے اور لال لال نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اختر کی رکھیل بن

ہوئی تھی اور اُسی کے دیے ہوئے پیسوں سے چندا کے گھر میں اعلیٰ سے اعلیٰ، بیش قیمت کراکری، فرنیچر اور جیولری میں اضافہ ہوتا گیا۔

اپنی کارکردگی کا گراف بدستور بلند سے بلند ہوتا دیکھ کر چندا خوشی سے پھولے نہ سمارہی تھی، اس کے اندر سے گناہ و ثواب کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ وہ دنیا کے کھیل تماشوں میں مگن تھی۔ یہ بھول گئی کہ اوپر نیلی چھتری والا اس کے ایک ایک اچھے بُرے فعل کا حساب رکھ رہا ہے۔ وہ اُس کو ڈھیل دے رہا ہے۔ اس کی رسّی دراز کر رہا ہے، کسی دن یہی رسّی اس کے گلے کا پھندا ثابت ہونے کو تھی۔ توبہ کے دَر کھلے ہوئے تھے پر توبہ سے فائدہ اٹھانے والی فی الحال دولت اور نام نہاد عشق و عاشقی میں پھنسی ہوئی تھی۔ کس قدر شرم و ذلت کا مقام تھا کہ وہ عزت کا سودا دولت کے ساتھ کر رہی تھی۔ ایک پلڑے میں عزت سسک رہی تھی تو دوسرے میں دولت اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ اُسے عزت سستی لگی، جب کہ دولت معزز اور مہنگی۔ اسی لیے تو اس کم ظرف عورت نے عزت پر دولت کو ترجیح دی۔ جس کے بارے میں مشہور ہے ”دولت کسی کی سگی نہیں ہوتی، آج اس ہاتھ ہے تو کل اُس ہاتھ میں ہوتی ہے۔“ دولت کا کوئی گھر نہیں ہوتا، جب کہ عزت کی جگہ تو ہر شریف انسان کے دل میں، گھر میں ہوتی ہے۔

اس کم عقل عورت نے اپنی نادانی اور بے وفائی سے اپنا شریف شوہر کھودیا۔ اُس میں ذرا بھی عقل ہوتی تو اس مرحلے پر ہی سنبھل جاتی، پر رسوائی کی دلدل میں وہ جان بوجھ کر گر رہی تھی اور اسے اس گہری بدبودار دلدل سے باہر نکالنے والا کوئی نہ تھا۔

ایک اچھی ماں پوری فیملی کو سنوارتی ہے، سجاتی ہے، بگڑنے سے بچاتی ہے، لیکن سمیرا کی ماں نے تو گھر کے ہر فرد کو تنکا تنکا کر کے بکھیر دیا اور ”گھر“ جو کبھی گھر ہوا کرتا تھا، جس میں سب رشتے محبت کے ساتھ سانس لیتے تھے، وہ بکھر کے رہ گئے۔ مکین تماشا بن گئے اور گھر اینٹ گارے اور پتھروں سے بنا اک بے جان مکان رہ گیا۔

میرے پیارے نوجوانو! اس کاہل زندگی کو چھوڑو اور کچھ کام کرو کام کیا ہے؟ آخری نصف رات اور ابتدائی نصف دن سوتے رہو۔ آہ وہ مزیدار خواب جو دھوپ چڑھے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ پھر تمام کس بل دکھا کر اٹھو۔ انگڑائی پہ انگڑائی لو۔ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکو۔ ذرا سا پانی منہ پر ڈالو تاکہ آنکھ کھل جائے۔ کھانا کھالو تاکہ جان بنے پھر تاش کھیلنے بیٹھ جاؤ اور شام تک سو روپے ہارنے کی کوشش کرو۔ ایک نیا کرتا یا نئی شرٹ پہنو اور رقص و سرور کی محفل میں یا سینما میں آدھی رات تک جی بہلاؤ۔ گھر آکر ہاتھ میں اخبار پکڑو اور بستر پر دراز ہوجاؤ۔

(ابوظفر زین)

شادی کے دو سال بعد سمیرا ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن گئی تو فخر و غرور سے اس کی کلف زدہ گردن اور اکڑ گئی۔ حالاں کہ اس میں اُس کا کیا کمال تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی کہ اُس نے اسے بیٹے کی نعمت سے مالا مال کیا اور اگر ربّ کائنات یہ نعمت اسے نہ دینا چاہتا تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ رب کے حضور شکر ادا کرنے کی بجائے فخر و غرور کر کے وہ اپنی اوقات سے بڑھ کر اپنے مقام سے نیچے گر رہی تھی۔

سمیرا نے علیم پر بے پناہ دباؤ ڈالا کہ وہ گھر والوں سے اپنا حصّہ لے اور اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہوجائے۔ علیم سمیرا سے بہت دبتا تھا، کچھ جادو اور تعویذوں کا بھی اس پر اثر تھا، جو سمیرا اور اس کی ماں اکثر و بیشتر اُسے گھول کے پلا دیتی تھیں، نتیجتاً وہ انہی کا ہمنوا بن چکا تھا اور اُن کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض سمجھتا تھا بیوی کو اُس کی طرف سے کھلی چھٹی ملی تو اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے ساس کو اُٹھتے بیٹھتے سنانا شروع کر دیا کہ علیم کا حصہ اُسے جلد دے دیا جائے......

وہ دونوں الگ رہنا چاہتے ہیں۔ ساس بھی منہ

پھٹ تھی کہنے لگی۔ ”ایسا تو اس کے زندہ رہنے تک تو نہیں ہوگا، مرنے کے بعد لے لینا اور مکان بنگلہ بناتی رہنا۔ زن سے تو کوئی آس، کوئی امید نہ رکھے تو اچھا ہے۔ یہ کورا سا جواب سن کر سمیرا کے تن من میں آگ لگ گئی اور وہ دل ہی دل میں ساس کو مزہ چکھانے کا سوچنے لگی۔ آخر ایک دن اُسے موقع مل ہی گیا۔ اس کی ساس اکیلی تھی۔ اُس نے فون کر کے اپنی ماں کو اپنے گھر بلوالیا۔ ماں نے فون کر کے اختر اور دو غنڈوں کا انتظام کرلیا۔ سمیرا نے اختر، ماں اور اس کے لائے ہوئے مسٹنڈوں سے مل کر قابلِ احترام ساس کو خوب مارا پیٹا...... وہ بے چاری اتنے سارے لوگوں کے بیچ اپنا آپ نہ بچا سکی اور مار پیٹ سہتی رہی۔ اس وحشیانہ تشدد کے نتیجے میں اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور کئی پسلیاں بھی متضرب ہوگئیں۔ ناک اور منہ پر گہرے زخم آئے، بازو، کمر اور کہنیاں چوٹوں سے نیلی ہوگئیں۔ اس کے بعد سمیرا بڑے آرام سے اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی۔

علیم کے بہن بھائیوں نے ماں کی یہ حالت دیکھ کر سمیرا، چندا اور اختر کے خلاف پہلی فرصت میں کیس کر دیا۔ پولیس نے سب کو بروقت گرفتار کرلیا، لیکن علیم نے اُن تینوں کو ضمانت پر رہا کرالیا کہ یہ ہمارا آپس کا گھریلو جھگڑا تھا۔ ساس نے بہو کو مارا تو بہو نے زیادہ ہی غصہ دکھا دیا۔ ساتھ ہی بے غیرت علیم نے پولیس کی مٹھی بھی گرم کردی، تو پولیس نے موم ہونے میں دیر نہیں لگائی۔

اُدھر علیم کی ماں اور تمام فیملی ممبران کا غصّے کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ سب سمیرا اور چندا سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ ایک دن سمیرا کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلی۔ بیٹے حمزہ کو وہ ماں کے پاس گھر چھوڑ آئی تھی۔ ابھی چوک تک بھی نہ پہنچ پائی تھی کہ اُس کی تاک میں بیٹھے چند نقاب پوشوں نے اُسے دبوچ لیا۔ اس اچانک افتاد پر وہ گھبرا گئی۔ نقاب پوشوں نے اس کی ہر مزاحمت پر قابو پالیا اور اُسے مٹی کے تیل میں بُری طرح نہلا دیا۔ وہ بُری طرح چیختی چلاتی رہی، مگر یہاں اُس کی چیخیں، آہیں سننے والا کوئی اپنا نہ تھا، دفعتاً ایک دیا سلائی بھڑکی اور اس نے مغرور، گھمنڈی اور مال و زر کی پجاری کو منٹوں میں راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا۔ سمیرا کے ہاتھ میں دبے نیلے، ہرے نوٹ بھی راکھ کا حصّہ بن گئے۔ چندا کے لیے اپنی لاڈلی بیٹی کی اچانک اور بھیانک موت برداشت کرنا دشوار ہوگیا، اُسے سکتہ سا ہوگیا کہ یہ کیا ہوگیا؟

سمیرا اس دُنیا سے کیا گئی کہ چندا کے حصّے میں سُکھ سارے منتقی ہوگئے۔ اُس کے بُرے دن آزمائش بن کر شروع ہوگئے تھے۔ اب اُس کا دل اس دنیا سے اُچاٹ ہوگیا۔ جس دولت کے لیے اُس نے اپنا آپ، اپنا گھر اور اپنی اولاد برباد کی، وہ دولت اُس کے کسی کام نہ آسکی۔ اُس کی حسین جوان بیٹی کو یہ دولت بھی بھیانک موت کے پنجوں سے نہ بچا سکی۔ ذہنی توازن ذرا بگڑا تو اسے اصل میں ہوش آیا کہ اُس کی جھولی میں دُکھوں اور گناہوں کا بوجھ ہے، کچھ بھی اُس کے حق میں نہ رہا۔

اُسے ہوش آیا بھی تو کب آیا جب سارا گھر ہی اُجڑ گیا۔ علیم بھی بیوی کی موت کے بعد پاگل سا ہوگیا۔ علیم کے گھر والوں نے اُس کی ذہنی حالت کے پیشِ نظر اُسے زندہ رہنے دیا ورنہ اُسے مارنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ جو اولاد اپنی نہ بن سکے وہ لوگ اُسے دوسروں کے لیے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے لیکن قدرت نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔

آج اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلی روتی رہتی ہے۔ اللہ سے معافیاں مانگتی ہے، گھنٹوں خلاؤں میں تکتی رہتی ہے، کبھی اپنے بال نوچتی ہے تو کبھی اپنا چہرہ، جب اس کا پیارا نواسہ اپنی توتلی زبان میں پوچھتا ہے کہ اُس کی ماں کہاں ہے؟ تو وہ کہتی ہے۔ بیٹا تیری نانی ڈائن ہے، تیری ماں کو کھا گئی...... نواسہ پھر سوال کرتا ہے۔ نانی یہ ڈائن کیا ہوتی ہے؟ نانی چیخ چیخ کے روتے ہوئے کہتی ہے۔ پُتر ڈائن تیری نانی جیسی ہوتی ہے، نواسہ اپنے سوال کے ادھورے جواب کو سُن کر سہم سہم جاتا ہے اور نانی نواسے کو دیکھ کے روز جیتی ہے، روز مرتی ہے۔ وہ اُس کے معصوم سوالوں پہ تڑپتی ہے، اب یہی اس کی سزا ہے، یہی مکافاتِ عمل ہے جو بویا جائے وہ کاٹنا تو پڑتا ہے!!

☆......☆

ملکھنی



ارشد علی ارشد

[illegible]

ایک مافوق الفہم اسرار بھری عجوبہ داستان

[illegible]

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھدار، اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ، دو بھائیوں اظہر اور مظہر، ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام، غیر شادی شدہ پھپھو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو ساتول سے محبت ہو گئی ہے۔ ملکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردۂ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے۔ محبت اور عشق کی باتیں کرتی گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی ملکھنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ ساتول سے اُس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ ملکھنی کے بھائی اظہر کی دبئی روانگی سے پہلے شادی کر دی جاتی ہے۔ ملکھنی اسی دوران میں ساتول کے گھر اُس سے ملنے جاتی ہے ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اُسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی فاطمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا، ملکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ ملکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن ملکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر ملکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے ملکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھری کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں ملکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملتے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ ملکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راحیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم ملکھنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلوا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو ملکھنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ ملکھنی اُسے دیوار پر محمد بن قاسم کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ ملکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اُسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں ملکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ ملکھنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا فالج کے باعث چارپائی سے لگ گیا ہے، پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو جاتا

ہے، جبکہ اس کا بھائی، باپ کی موت سے پہلے ہی دبئی چلا جاتا ہے۔ اسی دوران میں اس کی شادی بلاول سے ہو جاتی ہے۔

مکھنی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے، معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے لیکن باتیں بہت ذہانت کی کرتا ہے۔

مکھنی کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ کہیں ہوتی ہے اور پھر غیر محسوس طریقے سے ماورائی قوت کے تحت وہاں سے کوسوں دور جا پہنچتی ہے۔ ذہن کی اگلی جست میں وہ اپنے گھر کے نزدیک تھی، اس نے گھر کی طرف قدم بڑھائے پھر روک لیے، گھر والے ڈنڈے اور لوہے کے سریے اٹھائے اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دوڑتے بلاول نے مکھنی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "مکھنی بھاگ جاؤ یہ لوگ تمہارے قتل کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔" مکھنی کے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس نے سوچا، مکھنی تیرے حق میں بھاگنا ہی بہتر ہے۔ میں انہیں کانٹے کی طرح چبھنے لگی ہوں۔ مکھنی حیران تھی کہ امی ابو میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ وہ تھک نہیں رہے۔ گاڑیوں، رکشا، موٹر سائیکلوں اور لوگوں کی بھیڑ سے بچتی بچاتی وہ بھاگی چلی جا رہی تھی۔

"میرے دشمنوں کا کیا حال ہے؟" یہ سوچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک نیزہ اڑتا ہوا آیا اور اس کی آنکھ میں کھب گیا۔ اس کی آنکھوں کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ شیشہ ٹوٹنے کے جھٹکے سے وہ لڑکھڑائی، اسے احساس ہوا کہ وہ پانی سے ٹکرائی تھی۔

جب مکھنی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈروم میں پاتی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک وجیہہ نوجوان ادھیڑ عمر کی باوقار سی ایک خاتون اور جینز اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" مکھنی خود سے سوال کرتی ہے، پھر وہ لوگ ایک ایک کر کے آگے بڑھتے ہیں اور مکھنی کے پاؤں چھوتے ہوئے کمرے سے نکلتے جاتے ہیں۔ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر مکھنی سوچوں کی دنیا سے لوٹ آئی۔ کمرے میں ایک خوب صورت نوجوان داخل ہوتا ہے جو اپنا نام امن چندر دلانی بتاتا ہے۔ وہ مکھنی سے کہتا ہے کہ اس کا نام مہک ہے اور آج اس نے پورے تیرہ ماہ اور دس دنوں بعد مکمل ہوش و حواس میں بات کی ہے۔ اس سے پہلے وہ استعارات میں گفتگو کرتی رہی ہے۔ امن اسے بتاتا ہے کہ وہ اس وقت ضلع گھوٹکی کے نواحی گاؤں گوٹھ چندر من میں ہے۔ مکھنی امن سے پوچھتی ہے کہ اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟ امن سوال سن کر خاموش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے تایا اور بابا نے بتانے سے منع کیا ہے۔ امن مکھنی سے کہتا ہے کہ وہ اس کی آمد کا ذکر بابا سے نہ کرے۔

مکھنی ان لوگوں کا ہاتھ جوڑ کر اس کے احترام میں کھڑا ہونا، اس کو حد سے زیادہ عزت دینا، دیکھ کر سوچتی ہے کہ کہیں یہ لوگ بھی گوتم بدھ کی طرح اس کی پوجا نہ شروع کر دیں۔

امن کراچی سے واپس آتا ہے اور آتے ہی مکھنی کے کمرے میں حاضری دیتا ہے وہ حسب معمول ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کرتا ہے اور دل ہی دل میں کچھ پڑھتا ہے۔ مکھنی امن سے کہتی ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔ میرے روبرو ہاتھ کیوں جوڑے جاتے ہیں، آنکھیں بند کر کے کیا پڑھا جاتا ہے۔ مکھنی کہتی ہے۔ دیکھو امن اس بات کا یقین کر لو کہ میں بھی ایک معمولی سی عام سی لڑکی ہوں۔ آج تم نے مجھے چھو کر بھی دیکھ لیا۔ دیکھو اپنا ہاتھ اسی طرح صحیح سلامت ہے۔ نہ جلا نہ کٹا نہ معذور ہوا۔

امن مکھنی سے وہ سارے حالات و واقعات بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ لاہور میں دریا راوی کے کنارے موجود تھے اور مکھنی انہیں بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی، مکھنی امن سے کہتی ہے کہ دریا میں گرنے سے پہلے کی زندگی کے بارے میں آپ کو کچھ پتا ہے۔ امن بتاتا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں کچھ معلوم نہیں۔ مکھنی امن سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مکھنی کو اپنا شوہر بلاول اور بچہ معاویہ یاد آتا ہے وہ سوچتی ہے خاندان والوں کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا لاہور کا سفر ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ امن کے خاندان کے اذہان و قلوب میں اہم پیغام پہنچانا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ اس دن کے انتظار میں تھی جب تمام لوگ خاص اہتمام کے ساتھ اکٹھے ہو کر اس کے روبرو پیش ہوتے تھے اس کے لیے مکھنی کو ایک خالی سفید دیوار چاہیے تھی جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو مکھنی انہیں ہندو مذہب کے بارے میں سمجھاتی ہے کہ سمجھ نہیں آتا کہ پڑھے لکھے لوگ جانوروں، بیل، کچھوا، پیپل تلسی وغیرہ کو کیسے مقدس سمجھتے ہیں۔ دنیا کے سارے عقیدے توحید پر مبنی ہیں پھر وہ انہیں اسلام کی بابت سمجھاتی ہے اور ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتی ہے۔ مکھنی کی بات سے وہاں ہلچل مچ جاتی ہے اور وہ لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں، تب امن مکھنی کو گھر چھوڑنے کا کہتا ہے، کیوں کہ وہ لوگ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں، مکھنی وہاں سے فرار ہو کر انکل فہیم کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات عظمیٰ سے ہوتی ہے جو کہ انکل فہیم کی بیٹی ہے اور ماضی میں مکھنی کی ملاقات عظمیٰ سے ہم کی صورت میں ہوئی تھی۔ انکل فہیم عظمیٰ سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ مہک یعنی مکھنی کو پہچانتی ہے تو عظمیٰ مکھنی کے متعلق بتاتی ہے کہ یہ مہک بہن مکھنی ہے، میر داد نگر کے رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی۔ تب بچپن سے لے کر لڑکپن اور جوانی تک کے سارے حالات و واقعات مکھنی کی نگاہوں میں گھوم جاتے ہیں۔ انکل فہیم مکھنی کو امن کے فون کا بتاتے ہیں

کہ امن مکھنی سے ملنا چاہتا ہے۔ مکھنی انکار کر دیتی ہے۔ امم مکھنی کو امن سے ملاقات کا کہتی ہے اور کہتی ہے کہ تو امن سے پیار کرنے لگی ہے۔ مکھنی انکار کرتی ہے، وہ کہتی ہے کہ مجھے محمد بن قاسم، سلطان محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی، ٹیپو سلطان، امام اعظم ابو حنیفہؒ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت حمزہؓ سے عشق ہے۔ ان کے بعد کسی عشق کی گنجائش نہیں، پھر مکھنی امم کو امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں بتاتی ہے۔

(اور اب آگے پڑھیے)

"مکھنی! انہوں نے بغاوت کیوں کی تھی۔"

"ہاں یہ بتانا بھول گئی۔ آل عباس نے سادات کے خلاف سفاکانہ اقدام اٹھانے شروع کر دیے تھے تو یہ لوگ بھی سادات میں شامل تھے۔ محمد نفس زکیہؒ تو بہادری کے ساتھ جنگ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ان کے بھائی ابراہیمؒ نے بھی جنگ کی تھی۔ وہ بھی شہید ہوئے تھے۔ امام صاحب نے ابراہیمؒ کا ساتھ دیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے۔ جب منصور نے امام ابو حنیفہؒ کو دربار میں بلایا تو یقیناً سختی کی ہوگی۔"

"تم سختی کی بات کرتی ہو امم۔ اس بدبخت نے بعض سیاسی اسباب کی بدولت امام اعظمؒ کو قید کر لیا۔ اصل میں امام صاحب نے جو اہل بیت کا ساتھ دیا تھا یعنی نفس زکیہؒ اور ابراہیمؒ کے متعلق جو آپ کے لیے خیالات تھے، تو حکومت اس سے خائف تھی۔ قید میں کیا ہوا۔ یہ پھر بتاتی ہوں۔ پہلے ایک دلچسپ بات سنو۔"

"ہاں، ہاں، سناؤ۔"

منصور کے حکم پر جب امام اعظمؒ ان کے دربار میں داخل ہوئے تو دربار میں حجابت کا عہدہ رکھنے والے ربیع بھی وہاں موجود تھے۔ ربیع نے ابو حنیفہؒ کو دربار میں پیش کیا اور کہا۔ "آج دنیا میں یہ سب سے بڑے عالم ہیں۔"

"منصور نے امام صاحب کو دیکھا اور پوچھا۔ "بتاؤ آپ نے کس سے علم کی تحصیل کی۔"

"امام صاحب نے اپنے استادوں کے نام گنوائے۔" سن کر منصور بولا۔

"آپ کو میں قضا کا عہدہ دیتا ہوں۔"

"امام صاحب نے کہا، مگر میں اس عہدے کا اہل نہیں۔"



”امام صاحب کا انکار سن کر منصور غصے میں آ گیا اور غصے میں ہی بولا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہو۔“

”ابوحنیفہؒ بولے۔ ”اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو یہ دعویٰ میرا خود بخود سچا ثابت ہو جاتا ہے کہ میں عہدۂ قضا کی قابلیت نہیں رکھتا، کیوں کہ جو شخص جھوٹا ہو وہ قاضی نہ ہو سکتا۔“

منصور نے جب دیکھ لیا کہ اس عہدے کے لیے اس شخص کے علاوہ کوئی دوسرا اہل نہیں تو وہ قسم کھا کر بولا۔ ”تم کو یہ عہدہ قبول کرنا ہو گا۔“

جواباً امام ابوحنیفہؒ نے بھی قسم کھا کر کہ کبھی قبول نہیں کروں گا۔

جب امام صاحب نے بھی قسم کھائی تو ربیع غصے میں بولا۔ ”ابوحنیفہ تم نے بھی قسم کھا لی، وہ بھی امیر المومنین کے مقابلے میں۔“ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا۔ ”ہاں بالکل۔ اس لیے کہ قسم کا کفارہ ادا کیا جاتا ہے۔ جو میری نسبت امیر المومنین کو ادا کرنا بہت آسان ہے۔

”کیا بات ہے۔ ملکھنی بڑے لوگوں کی بڑی سوچ اور بڑی بات۔“ انم نے پکار کر کہا۔

”انم اسی منصور نے 146 ہجری میں امام صاحب کو قید کیا، مگر یہ قید امام صاحب کی شہرت میں ذرہ برابر کمی نہ لا سکی، بلکہ امام صاحب نے دورانِ قید بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کا بین ثبوت امام محمدؒ ہیں۔“

”یہ امام محمد کون ہیں۔“

”انم امام محمدؒ کو فقہ حنفی کا دست و بازو کہا جاتا ہے۔ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ سے قید خانے میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔“

”تو کیا امام اعظمؒ کو جیل سے رہائی مل گئی تھی۔“

”نہیں انم! 150 ہجری میں امام اعظمؒ کو بے خبری میں زہر دے دیا گیا تھا۔ امام صاحبؒ کو زہر کا اثر ہوا تو آپ سجدے میں چلے گئے اور سجدے کی حالت میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔“

”اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔“ انم تم نے اتنے خلوص سے کہا کہ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ چند لمحے کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”امام اعظمؒ کو حسن بن عمارہ جو شہر کے قاضی تھے، انہوں نے غسل دیا، غسل سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ لوگوں کا جم غفیر جمع ہو گیا۔ پہلی نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار کا مجمع اکٹھا ہوا تھا، مگر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی، یہ سلسلہ اس قدر طویل تھا کہ چھ بار نماز جنازہ ادا کی گئی۔ عصر کے بعد آپ کو سپرد خاک کیا گیا، مگر دفن ہو جانے کے بعد بھی بیس دنوں تک لوگ آپ کی نماز جنازہ ادا کرتے رہے تھے۔“

میں نے دیکھا انم کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر میں نے بات جاری رکھی۔ ”سلطان الپ ارسلان سلجوقی، نے 459 ہجری میں امام صاحب کی قبر پر قبہ تعمیر کیا اور قریب ہی شہید ابوحنیفہؒ کے نام سے مدرسہ بھی بنایا۔ امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے بعد فقہ اسلامی میں آپ کے بیٹے حماد اور پوتے اسماعیل نے ممتاز حیثیت حاصل کی۔ حماد بصرہ کے اور اسماعیل ورقہ کے قاضی تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کے بہت سے شاگردوں نے بھی فقہ اسلامی میں اہم مقام حاصل کیا۔ ان شاگردوں میں بھی بہت بڑے بڑے نام آتے ہیں۔“

”کچھ نام یاد ہیں ملکھنی؟“

”چند نام یاد ہیں۔ امام صاحب کے چالیس اہم شاگرد وہ تھے، جن کی مجلس بنائی گئی تھی۔ یہ چالیس افراد امامؒ صاحب کی سرکردگی میں فقہ کے ابواب مرتب کرتے تھے۔ کم و بیش بارہ لاکھ نوے ہزار سے بھی زائد مسائل ہیں جنہیں مدون کیا گیا۔ ان شاگردوں میں امام ابو یوسفؒ، امام زفرؒ جیسی اہم شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ زفر بن الندیل، داؤد الطائی، ابو مطیع، اسد بن عمرو، حسن بن زیاد لولوی وغیرہ اور انم میں تمہیں بتاؤں۔ ہارون الرشید کے عہد میں فتاویٰ ابی حنیفہؒ سلطنت میں قانون کی حیثیت رکھتے تھے۔ جبکہ مغلوں کے بعد جو خاندان بھی اقتدار میں آیا۔ اکثریت حنفیوں کی تھی۔ اس کے علاوہ تاریخ کے چند اہم حکمران فقہ حنفی سے متاثر تھے۔ محمود غزنویؒ، ان کی کتاب التفرید فقہ حنفی پر کافی شہرت رکھتی ہے۔ سلجوقی، نور الدین زنگی، مصر کے چرکسی، ہندوستان میں آل تیمور، یہ سب حنفی مسلک سے تھے۔ اسی طرح اورنگزیب عالمگیر، ان کے دور کی اہم کتاب فتاویٰ عالمگیری، فقہ حنفی کی عمدہ کتاب شمار ہوتی ہے۔ انم میں تمہیں مشورہ دوں گی کہ تم فتاویٰ عالمگیری کا مطالعہ کرو۔ یہ اردو ترجمہ میں بھی دستیاب ہے اور ہر قسم کی اغلاط و نقائص سے پاک ہے۔“

”ملکھنی! تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں نے زندگی کا سارا حصہ تانگہ کے کوٹھے پر گزارا ہے اور میں لکھ پڑھ نہیں سکتی۔“

”اوہ...... سوری انم۔ مگر علم حاصل کرنے کی کوئی مدت یا عمر نہیں ہوتی۔ تم آج سے ہی یہ کوشش شروع کر دو۔“

”ملکھنی! ڈیڈی میرے لیے ایک لیڈی پروفیسر کا بندوبست کر چکے ہیں۔“

”ویری گڈ! مجھے یقین ہے کہ تم علم کی منزلیں بہت جلد عبور کر لو گی اور جب اردو کو اچھی طرح پڑھنے کے قابل ہو جاؤ تب اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دینا۔“

”ملکھنی! فتاویٰ عالمگیری، فقہ حنفی کی عمدہ کتاب ہے، تو کیا اسے اورنگزیب عالمگیرؒ نے مرتب کیا ہے۔“

”انم۔ اورنگزیب عالمگیرؒ مغلیہ خاندان کے علم و علماء اور بزرگان دین سے محبت و عقیدت رکھنے والے بادشاہ تھے۔ انہوں نے 1658ء سے 1707ء تک حکومت کی۔ اورنگزیب عالمگیرؒ انتہائی بلند پا کردار کے مالک انسان تھے۔ انہوں نے اسلامی روایت کے عین مطابق زندگی گزاری۔ اس بات کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے خود ہاتھ سے ٹوپیاں سیتے اور قرآن مجید لکھتے تھے۔ سرکاری خزانے کو قومی امانت سمجھتے تھے، گو کہ اورنگزیب خود بھی تالیف کے کام میں دلچسپی لیتے تھے، لیکن فتاویٰ عالمگیری کے لیے انہوں نے پوری سلطنت کے کونے کونے سے علم فقہ کے کامل اساتذہ کو جمع کیا تھا۔ ان بڑے علماء میں شیخ نظام، قاضی حسین جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپاموی، ملا جونپوری، ملا محمد اکرم لاہوری، جلال الدین محمد، سید محمد قنوجی اور دیگر بہت سے علماء شامل تھے۔ جن کا مجھے نام یاد نہیں رہا۔ ان تمام جید علماء نے مل کر کم و بیش آٹھ سال کی مدت میں فتاویٰ عالمگیری کے نام سے ایک ضخیم کتاب تیار کی جس میں تمام فقہی مسائل جمع ہیں۔ اس کتاب کی تیاری میں مجموعی طور پر عالمگیری سکے دو لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔“

”ملکھنی میرا جی چاہتا ہے تمہاری پیشانی چوم لوں۔“

”وہ کیوں بھئی۔“

”وہ اس لیے کہ رحیم اللہ ترکھان کے گھر میں پیدا ہونے والی عام سی لڑکی کے پاس اس قدر علم کا ذخیرہ موجود ہے۔“

”انم یاد رکھو۔ علم، فن اور ذہانت کسی کی میراث نہیں ہیں جو بھی ان کے حصول کے لیے کوشش کرے گا، یہ ذات پات سے مبرا ہو کر اس کے دل میں ڈیرہ جما لیں گے۔“

”ملکھنی کیا امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں مزید کچھ باقی ہے۔ اگر ہے تو میں سننے کو تیار ہوں۔“

”انم! وہ اتنی عظیم شخصیت ہیں کہ ان کے بارے میں ہزاروں صفحات کی کئی کتابیں لکھی جائیں تو بھی تشنگی برقرار رہے گی۔ میرے پاس جو کچھ تھا، میں نے تمہیں بتا دیا۔ بس تم یوں سمجھو کہ ان کی زندگی کے بارے میں مختصر ترین باتیں ہوئی ہیں۔“

”ملکھنی میں سوچتی ہوں۔ امن کے گھر والوں نے تمہیں اپنی فطرت اور عقیدے کے مطابق اگر بھگوان کا اوتار سمجھ لیا تو کچھ غلط نہیں کیا۔“

”وہ کیوں انم۔“

”یار تمہاری باتیں ہی ایسی ہیں۔ عقل کو حیران کر دیتی ہو۔ اب نجانے ان کے سامنے کیا کچھ کہا ہو گا۔ جسے سن کر وہ تیری پوجا کرنے لگے۔ ویسے کیا لطف آتا ہو گا۔ جب تجھے دودھ سے نہلایا جاتا تھا۔“ انم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہے، اس کے مسکرانے سے مجھے احسان یاد آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

”انم! احسان اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہے یا اس کے وعدے بھی عام مرد کی طرح ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔“

میرے سوال پر انم کے بارونق چہرے پر گہری سنجیدگی دوڑ گئی۔ میں نے آنکھوں کے اشارہ سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”احسان خبطی قسم کا نوجوان ہے۔ ملکھنی۔“

"ایک منٹ انم! احسان خبطی ہے یا نہیں۔ ہاں تیرے عشق میں شاید جنونی ہو گیا ہو۔"

"چلو جو بھی تم سمجھو۔" انم کا انداز ایسا تھا کہ میری نظروں میں مسکان کا چہرہ گھوم گیا۔ میرا دل یک دم اُداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گیا، مگر اندر کے تاثرات میں نے چہرے تک پہنچنے نہ دیے۔

"اچھا بولو تم!"

"ملغنی! جب خانم کے غنڈوں نے مجھے واپس کوٹھے پر پہنچایا تو کندھے کا زخم گہرا تھا۔ بحالت مجبوری مجھے اسپتال ایڈمٹ کر دیا گیا۔ احسان کو جب تین چار دن میرے کمرے میں نہ بھیجا گیا تو اسے کچھ شک ہوا۔ اس نے میڈم خانم کو گلے سے پکڑ لیا، عنقریب تھا کہ جذبات کی شدت میں وہ گلا ہی دبا دیتا خانم کے محافظوں نے اسے پکڑ لیا، احسان کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا مگر وہ بھی بڑے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اسی دن تھانے سے باہر آ کر خانم کے سامنے پھر چلا آیا، اس بار اس کے خطرناک تیور دیکھ کر میڈم خانم اندر سے خوف زدہ ہو گئی، کیوں کہ احسان ایک رات بھی تھانے میں نہیں رہا، لہٰذا اسے میرے بارے میں بتا دیا گیا، وہ بھاگتا ہوا اسپتال چلا آیا، ملغنی ......" انم کہتے کہتے رک گئی۔

بولو تم۔ میں پوری دلجوئی سے سن رہی ہوں۔

ملغنی میں نے زندگی میں پہلی بار کسی مرد کو روتے ہوئے دیکھا وہ میرے بیڈ کے پاس بیٹھ کر بچوں کی طرح رو پڑا، میں گھبرا گئی وہ ایسے رو یا تھا کہ بات کرنا مشکل ہو گیا، ہچکیاں کچھ تھمیں اور دل ہلکا ہوا تو بولا۔

جانتی نہیں ...... انم ...... تمہیں میرا یقین کیا آئے گا۔

ملغنی۔ احسان کے الفاظ و کیفیت اس پر اعتبار کرنے کے متقاضی تھے، مگر میں بھی مجبوریوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی، مجھے اندازہ ہوا۔ میں اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں، میں نے سر اوپر اٹھا کر اسے دیکھ کر کہا۔

"احسان! اتنا چھوٹا دل ہے تمہارا، پیار کے دعوی دار اس قدر بزدل تو نہیں ہوتے، پیار نہ ملے تو یوں بچوں کی طرح رویا جاتا ہے، اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

"تیری قسم انم! تیرے نہ ملنے پر کون کافر رو رہا ہے، میں تو تمہیں صرف اس حالت میں دیکھ کر تڑپ رہا ہوں۔"

"ملغنی اس وقت مجھے تم بہت یاد آئی تھی۔"

"ایسے ماحول میں، میں یاد آئی۔ مجھے واقعی حیرانی ہوئی"

"ہاں ملغنی! جب احسان نے میری قسم کھائی تو تیری بات یاد آ گئی۔" میں نے احسان سے کہا۔ "احسان کسی بشر کی قسم نہیں کھائی جاتی قسم صرف اللہ کی کھاتے ہیں۔"

وہ فوراً بولا اللہ کی قسم انم۔ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں جتنے دن اسپتال میں رہی وہ متواتر میرے پاس آتا رہا۔ انم احسان کو پتا ہے کہ اب تم کہاں ہو۔"

"نہیں ملغنی میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔"

"اوہ انم۔ اس قدر بے رحمی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا تم نے۔ جو تمہیں نہ پا کر خانم کو گلے سے دبوچ لیتا ہے اور تجھے دیکھ کر بچوں کی طرح ہچکیوں میں روتا ہے، سوچو تا وہ یوں تمہیں مستقل نہ پا کر کیا کر گزرے گا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو ملغنی مجھے انتہائی شدت سے احساس ہے، مگر صدیوں کے پیاسے کو جب پانی کا کٹورا مل جائے تو وہ دنیا و مافیہا کو بھول کر پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ بس مجھے بھی ڈیڈی ملے تو میں سب کچھ بھول گئی۔"

"انم رابطہ نمبر ہے تو احسان سے بات کرو، ورنہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے، میڈم خانم کے کوٹھے کو آگ لگا دے گا، ایسا نہ کر سکا تو خود کو مار دے گا۔ وہ انتہائی قدم اٹھانے میں ذرا گریز نہیں کرے گا۔" انم میری بات سن کر پریشان ہو گئی، وہ پریشانی میں بولی۔ ملغنی ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں۔

"انم سچ بتاؤ۔ احسان کا کردار یاد نہیں آیا، کیا اس کی ذات بھی یاد نہیں آئی۔"

"سوچیں کس حد تک بااختیار رہوتی ہیں ملغنی۔ مگر یادوں پر کسے اختیار۔ احسان مجھے ہر لمحہ یاد آتا ہے۔"

"اور پھر بھی پگلی اس سے رابطہ نہیں کیا۔" انم نے مجھے حیران کر دیا۔

"سچ پوچھو تو ملغنی، اندر کا خوف ابھی تک دور نہیں کر پائی، یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا ہے، اس لیے چاہنے کے باوجود احسان سے رابطہ نہیں کیا۔"

"تمہارے پاس نمبر ہے؟" میں نے پوچھا تو انم اُٹھ کر بیڈ کی دراز کے پاس گئی، دراز کھول کر اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا، یہ اس کا کارڈ ہے۔ میں نے کارڈ لے کر دیکھا اس پر احسان کے آفس اور موبائل، دونوں نمبرز لکھے تھے۔

"موبائل دو انم۔" انم نے لحظہ بھر بعد تپائی کی طرف اشارہ کیا، میں نے تپائی سے موبائل اٹھا کر احسان کا نمبر ملایا۔ گھنٹی جا رہی تھی، میرا دل دھڑکنے لگا، کچھ باتیں لمحوں میں ذہن سوچتا ہے اور بڑی تیز سوچتا ہے، میرا بھی وہی حال تھا، خیالات کہاں سے کہاں جا رہے تھے، دل دعائیں مانگ رہا کہ فون احسان ہی اٹھائے، ہیلو تھوڑی دیر بعد مردانہ آواز آئی۔

"مجھے احسان سے بات کرنی ہے۔"

"احسان ہی بول رہا ہوں۔ آپ کون۔"

"احسان میرا نام ملغنی ہے۔"

"جی بولیے۔"

"احسان بھائی میں انم کی سہیلی ہوں۔" مجھے ایسا لگا جیسے دوسری طرف احسان اُچھل کر کھڑا ہو گیا ہے، اس کی بے چینی اور اضطراب بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ہیلو، انم کہاں ہے۔ پلیز میری انم سے بات کروائیے۔ احسان کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی، میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتی تھی، مگر اس کے انداز تکلم نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں موبائل انم کے حوالے کر دوں، یہ لیجیے انم سے بات کریں، میں نے کہتے ہوئے موبائل انم کی طرف بڑھایا، مگر انم نے فون لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"لو انم بات کرو۔" میں نے کہا تو انم کو جیسے کرنٹ لگا، وہ خیالوں میں گم تھی، ہوش کی دنیا میں آئی تو فون لے لیا اور انتہائی دھیمے لہجے میں ہیلو کہا، وہ دس منٹ تک باتیں کرتی رہی، انم کی باتوں سے مجھے بے حد حوصلہ ہوا، کیوں کہ اس نے احسان کے ساتھ انتہائی دانش مندانہ باتیں کی تھیں اور آخر میں اسے بتا دیا تھا کہ یہ نمبر میرا ہی ہے، تاہم اسے اپنے گھر کا پتا نہیں بتایا۔

"انم! تم نے پوری تفصیل تو احسان کو بتا دی، مگر گھر کا پتا نہیں بتایا۔"

"دانستہ نہیں بتایا ملغنی۔ کہا نا وہ خبطی قسم کا شخص ہے، کل ہی حاضر ہو جاتا۔"

"تم نہیں چاہتیں کہ وہ تم سے ملنے آئے۔" اس بار وہ خاموش رہی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اوپر کرتے ہوئے کہا۔

"انم پیار کرتی ہو نا احسان سے......؟" انم نے خوب صورت آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"مجھ سے کیا پوچھتی ہو ملغنی۔ میرا چہرہ بھی تمہارے سامنے ہے اور آنکھیں بھی، خود ہی پڑھ لو۔"

انم! دونوں میں پیار کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن ہے۔

"ملغنی! احسان نے مجھے ایک دن شعر سنایا تھا۔ سنو گی؟"

"ضرور انم......"

صدیاں تیری سمیٹ کے جو لے گیا قتیل
اب تیرے پاس لوٹ کے وہ پل نہ آئے گا

انم نے ایک بار پھر مجھے مسکان کی یاد دلا دی، میرا دل یک لخت مرجھا گیا۔ انم گزری رات میں نے ایک نظم لکھی تھی۔

"اوہ...... بہت اچھے ملغنی۔ سناؤ نا پلیز۔"

مگر پہلی بار طبع آزمائی کی ہے۔ طبیعت پر گراں گزرے تو درگزر کرنا۔

"او کے سناؤ۔"

ڈائری میں اُتار نہ سکی اس لیے شاید کچھ الفاظ مِس ہو جائیں۔

کوئی بات نہیں تم سناؤ تو سہی۔

''زندگی کیا ہے؟''

تنہائی کا اک سفر
جسے تنہا ہی طے کرنا ہے
دوست، ہم عصر اور ہم سفر، یہ سب تو اک بہانہ ہیں
ہم عصر
جو دل سہارے کے لیے ڈھونڈتا ہے
مگر
کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا
دوست، ہم عصر اور ہمسفر بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں
ہاں مگر ساتھ نبھاتی ہے
تو تنہائی......
صرف تنہائی......

''ملکھنی! شاعری دل کی عکاس ہوتی ہے، مگر مجھے یقین ہے، اللہ کبھی تمہیں تنہائی نہیں سونپے گا۔''

''اس یقین کی وجہ؟''

''ملکھنی! تو اللہ کی سچی اور کھری بندی ہے اور اللہ اپنے کھرے اور سچے بندوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔''

''تیری آخری بات تو بالکل درست ہے، مگر انم میں کیا ہوں، نہ تمہیں پتا ہے نہ مجھے۔ آگے چل کر میرے مقدر میں کیا لکھا ہے، تقدیر جانے اور تقدیر لکھنے والا۔''

''ملکھنی میری بات کا بیّن ثبوت تیرا ماضی ہے، دو سالوں سے اوپر ہو چکے ہیں تمہیں گھر سے غائب ہوئے، دیکھ لو ابھی تک صحیح سلامت ہو، جسمانی، روحانی اور عزت و آبرو۔ ہر لحاظ سے اللہ نے تمہاری حفاظت کی ہے، ورنہ میڈم خانم کے کوٹھے سے کسی بے بس لڑکی کا عزت و آبرو کے ساتھ نکل آنا کسی معجزے سے کم نہیں، وہاں سے نکلی تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں خداؤں جیسی عزت و توقیر دی، وہاں سے بھاگی ہو تو ڈیڈی جیسے شخص کے پاس پناہ گزین ہو، جو تمہارے احسان کے نیچے سر تا پاؤں دبے ہوئے ہیں، میری بھی یہی حالت ہے، اس لیے ملکھنی۔ آگے بھی تیری حفاظت خود سوہنڑاں رب کرے گا۔''

میں وہاں 7 ماہ دس دن قیام پذیر رہی، حالات سازگار ہونے تک میں نے دل پر صبر و ضبط کے پتھر باندھے رکھے، اس دوران دوبارہ امن نے ملنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے ملنے سے انکار کر دیا، ازاں بعد پتا چلا امن کسی ضروری کام کے لیے سعودی عرب چلا گیا ہے، میں نے سکھ کا سانس لیا، امن جب ملنے کا تقاضا کرتا تھا تو مجھے ملنے نہ ملنے کا بھنور گھیر لیتا تھا، میں اپنے آپ سے حالتِ جنگ میں چلی جاتی تھی، اس لیے امن کے بیرون ملک جانے کی خبر نے مجھے دکھ کے ساتھ خوشی بھی دی تھی، دو ماہ دس دن کے بعد میں نے انکل سے اپنے گھر جانے کو کہا تو وہ بلا تامل راضی ہو گئے، آنٹی نے کہا۔

''ملکھنی ہم سب تمہیں چھوڑنے تمہارے گاؤں جائیں گے۔'' انم نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور انکل انہیں ساتھ لے جانے پر راضی تھے، مگر میں راضی نہیں تھی، میں صرف انکل کے ساتھ جانا چاہتی تھی، مہر داد نگر کے حالات کیسے ہیں۔ میں مکمل طور سے لاعلم تھی، اس لیے میں تمام گھر والوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، خصوصاً آنٹی اور انم دونوں عورتیں تھیں، ورنہ میں نے انکل سے کہا۔ ہمارا سفر طویل ہے، اس لیے آپ کوئی دوست ساتھ لینا چاہیں تو میں منع نہیں کروں گی، مگر انکل نے کہا۔

''ملکھنی! عظمٰی اور اس کی ممی ساتھ ہوتی تو اور بات ہے، اگر تم ان کے ساتھ جانے پر رضامند نہیں ہو تو میں

اکیلا ہی جاؤں گا۔''

''انکل! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں ایسا کیوں چاہتی ہوں۔'' میں نے کہتے ہوئے انم کو دیکھا اور بات جاری رکھی بلکہ انم تو بہت بہتر جان سکتی ہے۔

''ہاں ملکھنی۔ تمہاری مجبوری سمجھ کر ہی تو خاموش ہو گئی ہوں، ورنہ تمہیں تمہارے گھر میں داخل کر کے میں لوٹتی۔''

ہم نے شام کو نکلنے کا پروگرام بنایا، تاکہ صبح تک مہر داد نگر پہنچ جائیں، وقتِ رخصت اس گھر میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا، انم کی ہچکیاں بند ہی نہیں ہوتی تھیں، اس نے مجھے تین بار ہاتھوں سے نکالا اور پھر بھر لیا، آخر اسے ڈیڈی نے پکڑ کر مجھے کہا۔ میرے آنسو بھی رکتے نہ تھے، میں نے انکل کو اشارہ کیا کہ انم کو یہاں سے لے جائیں، اس کے بعد آنٹی مجھ سے لپٹ گئیں، میری پیشانی چومی، گالوں کو بوسہ دیا، آنسو بہاتی ہوئی بولیں۔

''ملکھنی! ہم ایک طویل عرصہ تک اولاد کی نعمت سے محروم رہے، اللہ تعالیٰ مہربان ہوا تو اس نے دو اکٹھی بیٹیاں عطا کر دیں، جی نہیں چاہتا کہ میں پھر سے ایک بیٹی کے ہجر میں تڑپوں، مگر کیا کیا جائے قانونِ قدرت ہے بیٹی کو ایک دن گھر چھوڑ کر جانا ہی ہوتا ہے۔

''ملکھنی ایک وعدہ کرو مجھ سے۔'' آنٹی کی محبت کے سامنے کچھ کہنا محال ہو رہا تھا۔ میں نے نم پلکوں سے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

''ملکھنی! اپنی شادی پر مجھے ضرور بلانا، میں اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے ڈولی میں بٹھانا چاہتی ہوں، میں بے اختیار پھر ان سے لپٹ گئی، جس طرح پہلے دن انم نے مجھے چوما تھا، اسی طرح میں نے گھر سے نکلتے وقت آنٹی اور انم کو چوما۔

رات بھر ہم نے سفر کیا، یہ سفر بھی عجیب و غریب تھا، غم و خوشی کا امتزاج، خوف و ہراس کی کیفیت اور امید کی کرنیں، انکل تمام راستے میرا دل بہلاتے رہے۔ ان کی تسلیوں کے طفیل سفر بہت اچھا کٹ گیا، صبح آٹھ بجے کے قریب راولپنڈی کا بورڈ نظر آیا تو میری کیفیت مزید بدل گئی۔ راولپنڈی ساٹھ کلو میٹر رہ گیا تھا۔ یہاں سے مہر داد نگر کا سفر دو گھنٹوں کا تھا، میں دل ہی دل میں آنے والے حالات کے بارے میں سوچ رہی تھی، دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز ہونے لگی تھی، گیارہ بجے کے قریب میر داد نگر کے آثار نظر آنے لگے۔ مہر داد نگر کی ابتدا میں میں نے گاڑی رکوا دی، تھوڑا سا آگے سانول اور چاچا بکرا کے کھیت ہیں، کھیتوں کے سامنے کچا راستہ جاتا ہے، جو آگے جا کر پختہ سڑک سے مل جاتا ہے، اس سڑک کے کنارے مولوی بابا کی زیارت ہے، وہی مولوی بابا جس کی زیارت کے عقب میں سانول اور سکھاں ملا کرتے تھے، زیارت سے تھوڑا آگے مہر داد نگر کے واحد ڈاکٹر عظیم کا کلینک ہے۔ کلینک کے ساتھ چترگاگا کی برآمدے والی دکان ہے، اس سے بچپن میں ہم ٹافیاں، دل شکری اور دال سویاں لیتی تھی، دکان بند ہو تو برآمدے میں سہیلیاں اکٹھی ہو کر پتواں (اک قسم کا کھیل) کھیلا کرتی تھیں۔

''ملکھنی......'' انکل کی آواز نے مجھے گاڑی میں واپس کھینچ لیا، ''کیا بات ہے بیٹی؟ گاڑی کیوں رکوا دی۔''

''انکل ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ میں معذرت خواہ ہوں، آپ کو گھر لے جا کر لسی پانی نہیں کروا سکتی۔''

''ملکھنی بیٹی لسی پانی کا کوئی شکوہ نہیں، مگر بیٹی تمہیں گھر تک تو پہنچا آؤں۔''

''انکل میں دو سالوں کے بعد مہر داد نگر لوٹ رہی ہوں، اتنے عرصے کے بعد یوں نئی نویلی گاڑی سے اتروں گی تو دیکھنے والے ہزار ہا باتیں بنائیں گے، اب بھی نجانے کیا کچھ سوچا ہوگا، مگر رحیم اللہ ترکھاں کی بیٹی نئے ماڈل کی کرولا کار میں بیٹھ کر گھر لوٹے تو......''

میں سمجھ گیا بیٹی۔

کاش انکل میں آپ کو اپنے گھر لے جاتی، کچھ دن آپ کی خدمت کرتی۔ میرے ابا کی کمی دور ہو جاتی، میرے لہجے کی اُداسی بڑھ گئی، جسے محسوس کر کے انکل شفقت سے بولے۔

''مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ملکھنی۔'' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، ہمیشہ سکھی رہو۔ انکل نے کہتے ہوئے ڈیش بورڈ

میں سے ایک لفافہ نکالا۔ ”ملکھنی بیٹی! یہ رکھ لو مگر اسے گھر جا کر کھولنا۔“

میں نے خاکی رنگ کے لفافے کو دیکھا، پھر انکل کو دیکھ کر پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے انکل؟“

”پلیز ملکھنی! کوئی سوال مت پوچھو۔ جب باپ اپنی بیٹی کو گھر سے رخصت کرتا ہے، تو اسے ڈھیر سارا جہیز دیتا ہے، سونا چاندی اور مال و اسباب دیتا ہے، لیکن ملکھنی بیٹی! میں تمہیں صرف دعائیں دے رہا ہوں۔“

”میرے لیے آپ کی دعاؤں سے بڑھ کر کچھ نہیں انکل۔ نہ سونا چاندی نہ مال و اسباب۔“

”یہ رکھ لو بیٹی۔“

”انکل اگر آپ بتا دیتے تو......“

اگر بتا دوں تو باپ اور بیٹی والے رشتے سے محروم ہو جاؤں گا، کیوں کہ باپ بیٹی کو کچھ دے تو بتا کر نہیں دیتا۔ میں نے لفافہ لے کر اپنا سر انکل کے سینے سے ٹکا دیا، وہ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگے، مجھے میرا ابا بہت یاد آیا، میں جتنی دیر انکل سے لپٹ کر روتی رہی ابا میری نگاہوں میں رہے، میں نے لفافہ دوپٹے سے باندھا اور گاڑی سے اتر آئی، سامنے سانول کے کھیت تھے، جی چاہا اس طرف نکل جاؤں، اسے آواز دوں، ماضی کی طرح وہ ہاتھ کا چھجا بنا کر دیکھے، پہچان لینے پر بھاگ کر آئے، میرے لیے بنے پر چادر بچھائے اور میں سکھاں کا پوچھوں۔ ماں اور بھائیوں کا پوچھوں۔ پھوپھو اور رانی بھابھی کے بارے میں سوال کروں، اور وہ جواباً کہے، ”ملکھنی پینتر (بہن) سارے تیڈے انتظار وچ اکھاں بچھائے بیٹھے ہیں، میں سانول کے کھیت کراس کر چکی، سامنے کچا راستہ تھا، انہی راستوں پر چل کر میں بڑی ہوئی تھی۔

جس لڑکی نے سالہا سال والدین اور بہن بھائیوں کی جدائی کا زہر حلق سے اتارا ہو، فطرتاً جب وہ گھر لوٹے تو اس کی چال میں غیر معمولی تیزی اور پھرتی ہوتی ہے، وہ اُڑ کر گھر والوں کے سامنے پہنچ جانے کی تمنا میں چلتی ہے، مگر میرے قدم دھیمے تھے۔ رفتار سست تھی، نجانے کیوں میرا دل ڈر اور خوف سے کانپ رہا تھا۔ یہ ڈر کس بات کا ہے میں سمجھنے سے قاصر ہوں، گاؤں والے پہچان نہ لیں، میں نے دانستہ دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا، کیوں کہ میرے اچھے قسم کے کپڑے توجہ کا باعث بن رہے تھے، بہت سوں نے بغور دیکھا اور کچھ نے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے پہچاننے کی کوشش کی۔

پروین آپا، امتیاز خالہ اور گاؤں کی چند دوسری عورتیں بھی سامنے سے آئیں، مگر میں کنی کترا کے گزر گئی، گاؤں کے لوگ اور گاؤں کی فضا سب کچھ جوں کا توں تھا، بس بدلی تھی تو میری اندر کی دنیا۔ میں سوچوں میں محو گھر کے قریب پہنچ گئی، پہلا گھر راشدہ خالہ کا تھا، اس سے آگے ہمارے پڑوسی سعیدہ ماسی کا کچا گھر ہے اور اس کے ساتھ جڑا ہوا رحیم اللہ ترکھان کا مکان ہے، میں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ رکا۔ دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا، میں بے دھیانی میں تالے کو دیکھنے لگی۔ میرا ذہن زمین اور آسمان کے بیچ کہیں خلا میں اٹک گیا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں، میں بہت دیر کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہیں رکی رہی۔ خیالات اور کچھ سمجھنے کی تمام حسیں یک دم غائب ہو گئی تھیں، نجانے سب کہاں گئے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ تمام گھر والے تالا لگا کر کہیں گئے ہوں، کوئی ایک فرد گھر میں ضرور رہتا ہے، میں پریشان نظروں سے گھر کی در و دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

”اے بیٹی کون ہے تو......؟“ معاً عقب سے ایک آواز نے مجھے چونکا دیا، یہ آواز سعیدہ ماسی کے شوہر فردوس کی تھی، میں نے پلٹتے کہا۔ ”چاچا شہر سے آئی ہوں، سکھاں سے ملنا ہے۔“ سکھاں کا نام لیتے ہوئے میرے حلق میں گولا سا اٹک گیا۔

”سکھاں سے......“ فردوس چاچا نے دھیرے سے دہرایا۔ اس کی بڑبڑاہٹ میں مجھے ایک نئی کہانی چھپی ہوئی محسوس ہوئی، میرے دل میں سیاہ دھواں بھرنے لگا، نہ معلوم کون سی نئی بات سننے کو ملے۔

”بیٹی چل تُو میرے گھر چل۔ پاس ہی میرا گھر ہے۔“

”نہیں چاچا۔ مجھے واپسی بھی جانا ہے، آپ کو پتا ہے، سکھاں اور اس کے گھر والے کہاں گئے ہیں؟“ میرے سوال پر خاموشی چھا گئی۔

میں سمجھی شاید فردوس چاچا چلا گیا ہے، پلٹ کر دیکھا تو وہ کھڑا ہوا تھا، میں نے چہرے سے گھونگھٹ ہٹایا نہیں اس لیے

وہ مجھے پہچان نہیں پایا، میں نے سوال دہرایا تو وہ بولا۔

”کیا بتاؤں بیٹی! بڑے اچھے اور شریف لوگ تھے، اللہ بخشے رحیم اللہ پر اس کوں (بھائی کو) بڑا غیرت مند اور شریف انسان تھا، اُس دی موت دے بعد وچارے لٹے گئے۔“ فردوس چاچا کی بات سن کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے دماغ اور دل اکٹھے ہو گئے ہیں، پتا نہیں کون سی انہونی بات سننے والی ہوں۔

رحیم اللہ دی دھی ملکھنی...... کچھ دیر کی پھر خاموشی اور پھر چاچا کی دھیمی آواز۔ شاید وہ احتیاط سے بولنے لگا تھا۔ ملکھنی دھی کوں تاں چوہدریوں نے اُٹھا لیا، رحیم اللہ کا چھوٹا پُتر وی باپ کی طرح غیرت مند تھا، چوہدری نوں اس کے گھر گھس کر جان توں مار ڈالا۔ آپ پنڈی جیل ٹر گیا اور گھر والاں نوں رب جانڑے راتوں رات کتھے بھیج دیا۔

شاید چاچا نے اس سے آگے بھی کچھ کہا تھا۔ مگر میرے دماغ میں مکے برسنے لگے تھے۔ دل کو زور زور جھٹکے لگنے لگے، میرے اندر کی ساری چولیں لرزہ بر اندام ہو گئیں، میری ٹانگیں کانپنے لگیں، میں نے دیوار کا سہارا لے کر بمشکل خود کو گرنے سے بچایا، مظہر بھائی نے چوہدری راحیل کو قتل کر دیا۔ اوہ میرے خدا...... میرے دل میں آہ گونجی اور پورے جسم کو تیز دھار خنجر کی طرح کاٹ گئی۔ امی، پھوپھو، بھائی اظہر، رانی بھابی سب کہاں چلے گئے۔

ارے بیٹی رکو۔ لسی پانی کر کے جا۔ یہ آواز مجھے کافی دور سے سنائی دے رہی تھی، دیکھا تو پتا چلا میں چاچا فردوس سے کافی دور نکل آئی تھی، میں نے وہ قدم کیسے اٹھائے پتا ہی نہیں چلا۔ میں رُکی نہیں پھر سے چل پڑی، انجان راستوں اور ان دیکھی منزل کی جانب...... میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے، ایک جگہ ٹھوکر لگی تو میں بری طرح زمین پر گر پڑی، یہ زمین فصل کے لیے ہموار کی گئی تھی، کپڑے مٹی سے مٹی ہو گئے۔ میں نے ہمت کی اور کھڑی ہو گئی، مجھے چلنا تھا، یوں گرتی رہی تو طویل خارزار سفر کیسے کٹے گا، میں اُٹھ کر پھر سے چل پڑی، مگر قدم منوں بھاری ہو رہے تھے، بڑی مشقت اور تکلیف کے بعد مولوی بابا کی زیارت تک پہنچ پائی۔ میں زیارت میں داخل ہو گئی، وہاں پہلے سے تین عورتیں اور دو بوڑھے مرد بیٹھے ہوئے تھے، وہاں پہنچتے ہی میں دیوار کی جڑ میں ڈھیر ہو گئی...... میں نے گھٹنوں میں سر دبا لیا، کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی، ایک بوڑھا شخص قبر کے قریب بیٹھ کر بلند آواز میں سیف الملوک پڑھنے لگا۔

باپ مرے سروں سایہ اُٹھدا ، ویر مرانڑ کنڈ خالی
ماواں باج محمد بخشا تے کون کرے رکھوالی
بھائی بھائیاں دے درد ونڈاوندے
تے بھائی بھائیاں دی آں باواں
باپ سراں دے تاج محمد، ماواں ٹھنڈیاں چھاواں

آواز کا سوز اور کلام کی گہرائی میرے اندر دھنستی چلی گئی، آخری مصرعے نے جیسے اندر تک زخمی کر دیا۔

باپ سراں دے تاج محمد...... ماواں ٹھنڈیاں چھاواں...... میرے سر سے تاج پہلے ہی چھن چکا تھا، اب ٹھنڈی چھاؤں کا بھی کچھ پتا نہیں کس دھوپ میں ڈھل چکی ہے، میرے دل میں اُٹھنے والی درد کی ہوک بلند ہونے لگی، میں بلک بلک کر رونے لگی، ادھر آواز کا سوز بڑھتا جا رہا تھا۔

اوچی آں لمبیاں ٹالیاں تے کنڈی آں جھنڈاں دی چھاواں
ہر اک چیز بازاروں لبدی پر نئیں بلائیاں نے ماواں

اس بار ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، میرے حلق سے کربناک چیخیں بلند ہونے لگی، چیخوں میں اس قدر درد اور اذیت تھی کہ سیف الملوک پڑھنے والا شخص بھی کانپ کر اُٹھ گیا، عورتیں بھاگ کر میرے پاس چلی آئیں، میں گال پیٹتے ہوئے رو رہی تھی، میرا دل چاہ رہا ہے اپنے سارے بال نوچ لوں، سینے میں ہاتھ ڈال کر دل مٹھی میں دبوچ لوں، بہت تڑپے تو مولوی بابا کی زیارت کی چھوٹی دیوار پر دے ماروں۔ میں دل کا درد برداشت نہیں کر سکتی، عورتوں نے آ کر مجھے سنبھالا۔

را یہ کڑی کون اے زیتون۔ (یہ لڑکی کون ہے زیتون) ایک آواز کانوں سے ٹکرائی، آنسوؤں کی برسات میں ان کے

چہرے دکھائی نہیں دیے۔

جانکس کوئی پردین لگدی ہے، دوسری آواز آئی، اور بہت دکھی دی ہے بچاری، یہ تیسری آواز تھی، میں نے آنکھوں پر ہاتھ رگڑے تو کچھ دیکھنے کے قابل ہوئی، عورتیں میرے پاس بیٹھی تھیں اور مرد دور پریشان حال کھڑے تھے، ان میں سے کوئی بھی چہرہ میرا شناسا نہیں تھا، وہ مہرداد نگر کے نہیں تھے، شاید کسی دوسرے گاؤں سے زیارت کے لیے آئے تھے۔

”بیٹی کون ہے تُو؟ اور کیا پریشانی ہے؟“ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں، ایک عورت نے میرا چہرہ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ ”ارے کریماں..... تیرے تو مہرداد نگر میں رشتہ داریاں ہیں، تُو بھی نہیں پہچانتی اسے۔“

”نہیں بہن میں نے اسے نہیں دیکھا۔“ دوپٹے سے میرے آنسو پونچھے جانے لگے، میں کھڑی ہوگئی، عورتیں دو قدم پیچھے ہٹیں، انہیں توقع تھی کہ میں کچھ بتاؤں گی، مگر میں نے خاموشی سے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”عجیب کڑی ہے۔“ پیچھے سے آواز سنائی دی، ساتھ ہی مردانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

لوے پینڑ کریماں۔ رایہ مولی بابا کی زیارت ہے۔ ایتھے جیڑا وی آندا عجیب ہی آندا اے۔ چل آ..... سیف الملوک سنڑ، میں چلتی جاری تھی، مولوی بابا کی زیارت سے پُرسوز آواز پھر سے بلند ہونے لگی، میں یہ آواز نہیں سننا چاہتی۔ یہ پُرسوز آواز اور دل کو چیرنے والا کلام میرے کانوں کے پردے پھاڑ دے گا، اگر میں نے مزید کچھ سنا تو دل پھٹ جائے گا، میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بھاگنے لگی۔

میں بدحواسی میں واپس گاؤں کی طرف بھاگ پڑی تھی، سانول کے کھیتوں کے قریب ٹھوکر کھا کر گر پڑی، سانول اس وقت درخت کے سائے میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا، مجھے گرتا ہوا دیکھ کر وہ میرے طرف بھاگ پڑا، میں خود کو پردے میں نہ چھپا سکی، میرے قریب پہنچ کر سانول کو زمین نے پکڑ لیا، اگر حیرت سے موت ہوئی تو شاید وہ مر جاتا، ملکھنی پینڑ..... حیرت سے آواز اس کے حلق میں دب گئی۔ میرے حلق میں پیاس سے کانٹے اگنے لگے تھے، سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی، سانول مجھے اٹھانے کے لیے آگے بڑھا مگر پھر رک گیا۔

پا..... پانی..... میرے خشک ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے، میں بمشکل پانی مانگ سکی، سانول اُلٹے قدموں سے واپس بھاگا، میں نے نڈھال ہو کر سر زمین پر رکھ کر آنکھیں بند کر لی۔

یہ لو ملکھنی..... پینڑ..... پانی..... سانول کی بوکھلائی ہوئی آواز سن کر میں نے پوری طاقت سے بھاری پلکیں پھر اٹھائیں، سانول میرے سامنے پانی کا کٹورا لیے بیٹھا ہوا تھا، لرزتے ہاتھوں سے پانی کا کٹورا لے کر میں نے ہونٹوں سے لگا لیا، میں نے غٹاغٹ پانی پیا تو جان میں جان آگئی، پانی پینے کے بعد حواس کچھ بحال ہوئے اور کھڑی ہو کر سانول کی طرف دیکھا، وہ عجیب حالت سے دوچار تھا، کچھ کہنے کے لیے لب کھولتا مگر بنا کچھ کہے بند کر لیتا۔

میں نے کہا۔ سانول بھراں (بھائی) مجھے اپنے گھر لے جاؤ، میری بات سن کر وہ تیز تیز سر ہلانے لگا۔

ہاں ہاں ملکھنی پینڑ (بہن) چلو۔

مجھے دیکھ کر جس قدر سانول حیران ہوا تھا، اس کے گھر والے اس سے بڑھ کر حیران و پریشان ہوئے، ماں جی کے چہرے پر حیرت و پریشانی کے آثار نقش ہو کر رہ گئے، سانول کی بہنیں الگ سے ششدر تھیں، مگر ان کے والہانہ پن میں کوئی کمی نہیں تھی، ماں جی نے مجھے سینے سے بھینچ لیا، میری نگاہوں میں امی کا چہرہ گھوم گیا، امی کا خیال آتے ہی میں خود پر ضبط نہ کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صبر کر دھیئے صبر..... ماں جی شفقت سے میری پیٹھ سہلا رہی تھی، سوہنڑاں رب بندے نوں ہر طرح نے امتحان لیندا اے، ماں جی مجھے کافی دیر تسلی تشفی دیتی رہی۔ میں سنتی رہی اور روتی رہی۔ ریشم نے آگے بڑھ کر مجھے ماں جی سے علیحدہ کیا، ریشم کے ساتھ ہی زیتون کھڑی تھی..... سانول کی کیفیت تا حال ناقابل بیان تھی، میں نے قیاس لگایا، مجھے دیکھ کر اس کے سوئے ہوئے زخم پھر سے جاگ اُٹھے ہیں، اس کے چہرے پر جذبات کی سرخی دوڑ رہی تھی، ماں جی مجھے چارپائی کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ آ ملکھنی ادھر بیٹھ۔

ریشم! ملکھنی پینڑ واسطے کچھ کھانے کے لیے لا..... سانول کے کہنے پر ریشم ایک طرف چلی گئی، کھانے کا سن کر میرے پپڑیاں جمے ہونٹوں پر پیاس کی شدت نے اضافہ کر دیا، میں نے زیتون سے پانی مانگا۔ وہ جھٹ سے پانی کا کٹورا لے آئی، ٹھنڈے پانی نے میرے اندر کی کاہل زدہ کیفیت کو رفع کیا اور فرحت بخشی، میں نے ماں جی سے پوچھا۔

میرے گھر والے کہاں ہیں ماں جی.....؟ ہمارے گھر کو تالا لگا ہوا ہے۔ سوال پوچھتے ہوئے میری اندرونی کیفیت کا حشر نشر جاری تھا، ماں جی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ یہ آہ سیدھا میرے دل پر تیز دھار خنجر کی طرح پڑی۔ میرا دل زخمی ہو کر دکھنے لگا، اندر کی تاریکی بڑھی، ماں جی نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔

اک تیرے نہیں ملکھنی مہرداد نگر کے کئی گھراں نوں (گھروں کو) تالے لگ گئے نے۔

ماں جی کا جواب خلاف توقع تھا، وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

اِنج لگتا ہے ملکھنی تیرے جانے کے بعد مہرداد نگر تے کسی ویب دا سایہ پڑ گیا ہے، ماں جی کے لہجے میں ایسا کرب تھا کہ میں تڑپ اٹھی۔

میں کچھ بھی نہیں ماں جی، مہرداد نگر پر ویب کا سایہ۔

ہاں ملکھنی پینڑ! ماں جی سے پہلے سانول بول اُٹھا، مہرداد نگر کا ہر مرد دن کو محنت مزدوری کرتا ہے اور رات کو گھر کا پہرہ دیتا ہے۔

آپ لوگوں کی باتیں مجھے الجھا رہی ہیں، سانول بھراں خدا کے لیے مجھے تفصیل بتائیں۔

ملکھنی! تمہیں چوہدری راحیل نے اغوا کیا تھا، یہ واردات چاچا کبیر کے پتر رضوان نے دیکھ لی تھی، وہ سیدھا بھاگم بھاگ تمہارے گھر پہنچا، مظہر بھراں کو پتا چلا تو اس نے کلہاڑی اُٹھالی، تیرے پڑوسی بتاتے ہیں، امی نے مظہر بھراں کے پاؤں پکڑ لیے تھے، مگر وہ غصے میں ہوش و حواس گنوا بیٹھا تھا، مظہر بھراں حویلی گیا مگر وہاں چوہدری راحیل نہ ملا۔ اس کے تیور دیکھ کر چوہدریوں کے بندوں نے اسے پکڑنا چاہا لیکن اظہر بجلی اور طوفان بنا ہوا تھا، وہ تین چار آدمیوں کو بُری طرح زخمی کر کے چوہدری راحیل کے سر پر پہنچ گیا۔

لحظہ بھر سانول نے توقف کیا تو میں بے چین ہو کر بولی۔ پھر کیا ہوا سانول۔

پھر ملکھنی مہرداد نگر کے باسیوں نے ترکھان کے بیٹے کے آگے چوہدری کے بیٹے کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مظہر بھراں چوہدری راحیل پر کلہاڑی کے کئی وار کر چکا تھا، چوہدری راحیل خون میں لت پت جان بخشی کے لیے مہرداد نگر کی گلیوں ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا، مہرداد نگر کے غریب لوگ جنہوں نے کبھی چوہدریوں کے سامنے لب کشائی کی جرات نہ کی، وہ گھر کے دروازوں سے جھانک کر یہ تماشۂ عبرت دیکھنے لگے تھے، مردوں کے ہجوم میں سے کسی کی ہمت نہ تھی کہ مظہر کا ہاتھ روک سکے۔ مظہر بھراں اک ہی گل پوچھ رہا تھا۔

بتا ملکھنی کہاں ہے؟ بتا چوہدری ورنہ اللہ کی قسم تیری بوٹی بوٹی کر دوں گا۔

چوہدری راحیل کو اِنے زخم لگ چکے تھے، کہ وہ بات کرنے کے لیے ہونٹ کھولتا مگر کج (کچھ) کہہ نہ پاتا۔

آخر وہ زخموں کی تاب نہ لا کر گندے (گندے) نالے میں گر پڑا، مظہر بھراں نے اس پر تھوکا اور فارم ہاؤس کی طرف واپس بھاگا، مگر ملکھنی تُو کہیں نہ ملی، سانول خاموش ہو گیا۔ میرا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔ میرے دائیں طرف ماں جی بیٹھی ہوئی تھی اور بائیں طرف زیتون، ماں جی نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ملکھنی! اس کے بعد مہرداد نگر نے بہت ظلم سہے ہیں۔

مجھ میں سکت نہیں تھی کہ مزید کچھ سنا جائے، آنسوؤں کی برسات جاری تھی اور جسم کا ارتعاش ختم نہیں رہا تھا۔

بس کر اماں! ملکھنی پینڑ بھوکی ہے، ریشم کھانا لے آئی ہے، سانول کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ساتھ ہی ریشم بولی۔ آ ملکھنی! کھانا کھا میری پینڑ (بہن)

میری بھوک مر گئی ہے ریشم۔ میں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے، نمکین پانی نے جس منظر کو دھندلا کیا ہوا تھا، وہ

آنسو پونچھنے سے صاف ہوگیا، سامنے چارپائی کے وسط میں کھانا رکھا ہوا تھا، ”اُٹھ میری دھی تھوڑا سا کھالے، پتا نہیں کدھر سے آئی ہو، اور کب کی نکلی ہو، ماں جی نے اٹھتے ہوئے مجھے بازو سے کھینچا۔

تھوڑا سا کھالے ملکھنی۔ ریشم کی التجائیہ نظروں نے مجھے پگھلا دیا۔ ان لوگوں میں خلوص اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی، ان کے خلوص نے مجھے ان حالات میں بھی دو چار لقمے کھانے پر مجبور کردیا۔

یہاں سے مجھے جو کرب انگیز تفصیلات بتائی گئیں، اس نے میرے رونگٹے کھڑے کردیے۔

چوہدری اللہ رکھا کے بعد چوہدری راحیل بھی منوں مٹی کے نیچے دفن ہوگئے، انہیں اونچی پگڑیاں اور بے تحاشا زمین و جائیداد بھی موت سے نہ بچا سکی، دوسرے دن چوہدری راحیل کی تدفین کے بعد چوہدری نثار زخمی سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا ہمارے گھر پر چڑھ دوڑا تھا، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ مظہر بھائی راتوں رات گھر والوں کو لے کر کہیں نکل گیا تھا، ان کی تلاش ہنوز جاری تھی، اس کے بعد مہر داد نگر ظلم دا نگر بن گیا۔ چوہدری نثار جو باپ اللہ رکھا سے زیادہ سفاک اور ظالم مشہور تھا۔ وہ بھائی اور باپ کی اموات کا بدلہ پورے مہر داد نگر سے لینے لگا۔ اس کے انتقام کا اصل منبع رحیم اللہ ترکھان کا گھر تھا، رحیم اللہ کے گھر میں سے ملکھنی نے چونکہ اس آگ کو بھڑکانے کی بنیاد رکھی تھی۔ اس لیے مہر داد نگر والے ہمارے گھر اور خصوصاً میرے خلاف تھے۔ وہ میرے نام سے بھی نفرت کرنے لگے تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے مہر داد نگر والوں پر چوہدری اللہ رکھا کے منجھلے بیٹے چوہدری مشتاق کی حکمرانی ہے۔

چوہدری نثار چھ ماہ پہلے اچانک کہیں غائب ہوگیا تھا۔ اس کے بارے میں دو قیاس آرائیاں تھیں، ایک اسے سیاسی حریفوں نے اغوا کرلیا ہے، آئندہ الیکشن کا دور ہے اور چوہدری مشتاق ضلع بھر کی بااثر شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے، دوسری اسے اظہر نے اغوا کرلیا ہے۔ دوسری قیاس آرائی نے لوگوں میں اس نفرت کو مزید ہوا دی جو وہ رحیم اللہ ترکھان کے گھر والوں سے کرتے تھے۔ مہر داد نگر کی نفرت بھری فضا میں سانول اور اس کے گھر والوں کی محبت دیکھ کر میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کررہی تھی۔

چوہدری مشتاق اپنے تمام تر اثر و رسوخ کے باوجود ابھی تک بھائی چوہدری نثار کو بازیاب نہیں کروا سکا تھا، میں نے ریشم سے چوہدری مشتاق کے بارے میں پوچھا کہ اس نے باپ اور بھائیوں کے انجام سے کچھ عبرت لی، مجھے اندازہ تھا کہ وہ پورا نہیں تو آدھا رحم دل ضرور بن گیا ہوگا، ریشم کا جواب سن کر میں نے تاسف سے سوچا۔ ظلم و ستم چوہدریوں کی گھٹی میں شامل رہتا ہے، وہ بھی خاندانی روایات کو برقرار رکھے ہوئے تھا، بلکہ ان سے دو چار ہاتھ آگے نکلا، رقص و سرور کی محفلیں سجانا تو اس کا معمول تھا۔ چوہدری مشتاق نے باپ اور بھائی سے زیادہ سنگین فطرت پائی تھی، اس کی ہوس پرست فطرت نے مہر داد نگر کے لوگوں سے کھلبلی مچا رکھی تھی، نو بیاہتا دلہن ہو، کنواری کہ ہو سہاگن، کوئی بھی چوہدری کی ہوس پرستی سے محفوظ نہیں تھی۔ ریشم نے سرد آہ بھر کر کہا۔

”سچ پوچھو تو ملکھنی ہمارے ابا اور بھائیوں کی نیندیں بھی حرام ہوگئی ہیں، گھر کا کوئی مرد رات میں نہیں سوتا میں اور زیتون گھر میں قید ہوکر رہ گئی ہیں، بلکہ مہر داد نگر کی ساری عورتیں خوف کے سائے میں زندگی گزار رہی ہیں، دن ہو کہ رات مہر داد نگر میں ہو کا عالم رہتا ہے۔“

ریشم کی بات سن کر میرے اندر نفرت اور غصے کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں، میں نے انتہائی غصے میں کہا۔

ریشم! پورے مہر داد نگر میں صرف مظہر بھائی ہی مرد تھا، جس نے چوہدری راحیل کو گلیوں میں کتے کی طرح بھگایا اور اس کی لاش کو گندے نالے میں بہا دیا، چوہدری مشتاق بھی ایک گولی کی مار ہے، کوئی ایک مرد کا بچہ اٹھے اور اس کے سینے میں داغ دے، میری باتیں سن کر ریشم خاموش ہوگئی۔

سانول کا ابا چھوٹے بیٹے بہادر علی کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو مجھے دیکھ کر اسے زبردست شاک لگا، میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ السلام علیکم چاچا...... میرے سلام کا کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہیں لگی کہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی مجھ سے نفرت کرتا ہے، اس کے چہرے کے تاثرات مجھے ساری کہانی سنا گئے،

بیوی کو ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

”یہ...... ملکھنی ہے نا...... رحیم اللہ ترکھان کی دھی۔“

”ہاں ہاں ملکھنی ہی ہے۔“

”یہ ادھر کیوں آئی ہے؟ اسے بولو فوراً یہاں سے چلی جائے۔“

”کملے یا بچاری دکھاں وی ماری اے۔ گھر والے اس کے ہیں نہیں، کدھر جائے گی۔“

”ساڈی بلا تُوں...... جہاں مرضی ہے چلی جائے، چوہدری کو پتا چل گیا نا...... تو اس کے ساتھ ساتھ ہماری بھی خیر نہیں، سانول کے ابا، ہم بھی دھیوں والے ہیں، بچاری کو کیسے بولیں گھر سے نکل جا...... نہ بابا نہ۔“

”ٹھیک ہے تو نہیں بول سکتی تو میں بول دیتا ہوں۔“

وہ اتنے سادہ لوح لوگ تھے، ساری باتیں ہم سے ذرا ہٹ کے بول رہے تھے، میں با آسانی سب کچھ سن رہی تھی، میرے ساتھ ریشم کھڑی ہوئی تھی، اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ملکھنی! کہیں مت جانا۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”ابا کی باتوں پر دھیان مت دے، چل ہمارے کمرے میں۔“

”نہیں ریشم، مہر داد نگر کے بارے میں اتنا کچھ جان لینے کے بعد میرا یہاں رُکنا محال ہے، قصور تمہارے ابا کا نہیں، وہ حق بجانب ہے، میں جب تک یہاں رہی تم لوگوں کے سروں پر تلوار لٹکتی رہے گی، شام کا اندھیرا پھیل رہا ہے، میرے لیے جانا ہی بہتر ہوگا۔“

”ملکھنی! آگے خالی رات ہے میری پینز، تُو اکیلی لڑکی رات کے اندھیرے میں کہاں بھٹکتی پھرے گی۔“

”میں آج رات اپنے گھر میں گزاروں گی، علی الصبح مہر داد نگر کو چھوڑ جاؤں گی۔ میں جان گئی ہوں مہر داد نگر کی زمین رحیم اللہ ترکھان کے گھر والوں کے لیے بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔“

ادھر ہم دونوں محو گفتگو تھے اور ادھر ماں جی شوہر کے ساتھ الجھ رہی تھیں۔

میں ان کی طرف بڑھی تو سانول بھی تیزی سے آگے آگیا، وہ میرے بولنے سے پیشتر ہی بولا۔

”ابا! ملکھنی پینز آج دی رات یہاں بسر کرے میں صبح اسے چھوڑ جاؤں گا۔“

”تیرا دماغ خراب ہے سانول، تو سب جانتا ہے پھر بھی ایسی باتیں کررہا ہے۔“

”ابا ہم بھی ماں بہن والے ہیں، تُو سوچ ذرا ملکھنی بھی کسی کی عزت ہے سامنے اندھیری رات ہے، بیچاری کہاں جائے گی۔“

”یہ بیچاری نہیں ہے سانول، اس نے اور اس کے گھر والوں نے مہر داد نگر والوں ظلم و ستم کی چکی میں پسنے کے لیے دھکا دیا ہے، جہاں مرضی ہے جائے، ہم اسے اپنے کار (اپنے گھر) رکھ کر چوہدری مشتاق کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔“

”ابا......“

”ایک سنٹ سانول پھراں......“ سانول کو مزید کچھ کہنے سے منع کرتے ہوئے میں نے کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہو چاچا، میں اپنی ذات کی حفاظت کے لیے آپ لوگوں کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتی، بس اتنی مہربانی کیجیے مجھ پر کہ مجھے ایک گھنٹہ مزید یہاں رکنے دیں، اندھیرا گہرا ہوتے ہی میں نکل جاؤں گی۔“

”ملکھنی۔“

”سانول نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر میں نے پھر اسے ہاتھ سے روک دیا، سانول پھراں، حالات کا تقاضا یہی ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔“

پر ملکھنی تو کہاں جائے گی...... چوہدری یا اس کے کسی بندے کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو وہ تیری تکہ بوٹی کردیں گے۔ مجھے اپنے رب پر یقین ہے، جس رب نے میری دو سالوں تک حفاظت کی، آگے بھی وہی خیال رکھے گا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی میں نے ریشم سے بڑی چادر مانگی اور وہاں سے نکل آئی، سانول مجھے گاؤں سے باہر چھوڑنے پر رضامند تھا، مگر میں ایسا نہیں چاہتی تھی، دروازے کے باہر ہی میں نے اسے روک دیا۔

بس سانول بھراں۔ اس سے آگے مکھنی جانے اور مکھنی کا خدا جانے...... آپ واپس گھر کے اندر چلے جائیں۔
تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے پوچھا، سانول! کیا اب بھی سکھاں سے پیار کرتے ہو؟

میرے سوال پر اس نے طویل سانس کھینچا۔ لمحہ بھر چپ رہا، پھر بولا۔

پیار اک واری (ایک بار) ہوتا ہے مکھنی۔ وار و واری پیار نہیں ہوتا۔ میں کل وی سکھاں سے پیار کرتا تھا اور اج وی کرتا ہوں۔

اگر اج وی سکھاں سے پیار کرتے ہو تو پھر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی، پیار رب سے ہو یا اس کے بندے سے گھر سے نکلے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

سانول نے ایک اور سرد آہ کھینچی۔ مکھنی پینڑ! جس طرح فصل نوں کیڑا لگ جائے تو اسے دھیرے دھیرے کھا جاتا ہے، ہجر بھی۔ کیڑے کی طرح بندے نوں کھا جاتا ہے، میری مجبوریوں نے میرے پاؤں میں سنگل (زنجیر) ڈال رکھی ہے۔ ریشم اور زیتون کے چہرے مجھے گھر سے باہر جانے نہیں دیتے۔ بہادر علی چھوٹا اور ابا بوڑا (بوڑھا) ہے، چار بندے ان کے سامنے آ جائیں تو مار کھائیں گے۔

میں سمجھ گئی سانول بھراں۔ میری کل دی رب سے دعا تھی اور اج بھی ہے، رب سائیں تجھے تیرا پیار نصیب کرے۔

مہر داد نگر میں چوہدری مشتاق کے کرتوں اور ظلم نے خوف و ہراس کی چادر پھیلا رکھی تھی، شام کا اندھیرا ابھی گہرا تھا، اس لیے ہر طرف ہو کا عالم تھا، ہاں البتہ بہت سے مکانوں کی چھتوں پر مردوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا، ریشم کی بات سچ تھی۔ مہر داد نگر کا کوئی مرد راتوں میں نہیں سوتا، رات کے سناٹے میں، میں با آسانی مہر داد نگر سے نکل سکتی تھی، مگر میرا دل میرا دماغ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا، دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

مکھنی! تُو اپنے گھر کو دیکھے بنا جا رہی ہو، اس گھر میں تیرے ابا رحیم اللہ اور تیری امی خورشید کی کئی یادیں وابستہ ہیں، جو تو نے گھر والوں کے ساتھ صبح اور شام میں گزاری ہیں، ان کا احوال گھر کی چار دیواری کے اندر تجھے بلا رہا ہے، گھر کی تنہائی تیرے پیاروں کے ہجر میں بین کر رہی ہے، چل نا مکھنی ذرا ان در و دیوار کو تسلی دے آ۔

ابا کی چھوڑی گئی نشانیوں کو چوم انہیں آنکھوں سے لگا، ان سے اپنے دُکھ درد بانٹ لے۔

میں دل کی پکار پر تڑپ اٹھی، میرے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ رات کے مہیب سناٹے میں گھر کا تالا توڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا، پل بھر میں پڑوسیوں کو پتا چل جاتا تھا کہ رحیم اللہ ترکھان کے گھر کا کوئی تالا توڑ رہا ہے، ہمارے گھر کے دائیں بائیں دو گھر ہیں مگر عقبی دیوار خالی ہے، مجھے عقبی دیوار پھلانگ کر اندر جانا ہوگا، دیوار کی جڑ میں پہنچ کر میں سوچ میں پڑ گئی۔

مکھنی! تُو چھوٹے سے قد والی نازک لڑکی یہ اونچی دیوار کیسے پھلانگے گی، اس سوال پر میرا دل اُداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیوار کو دیکھا۔ یہ میری پہنچ سے دور تھی۔ دفعتاً میرے ذہن میں تاریخ کا ایک واقعہ اُبھرنے لگا۔

اہلِ بحرین مرتد ہو چکے تھے، مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے صحابی حضرت علاء بن الحضرمیؓ کو مامور کیا گیا۔ جنہوں نے مرتدین کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ شکست خوردہ مرتدین بھاگ کر خلیج دار بن میں پناہ گزین ہو گئے۔ دار بن میں پہلے سے دشمنانِ اسلام کا اجتماع تھا۔ دونوں کا اجتماع ایک نئی قوت کا باعث بنا۔ اس قوت کو توڑنا بے حد ضروری تھا، حضرت علاء بن الحضرمیؓ کو دو پریشانیاں لاحق ہوئیں، ایک دار بن سمندر کے اس پار کی بستی تھی، بحری جہاز پر اس کی مسافت چوبیس گھنٹوں کی تھی، دوسری دار بن پر حملے کی صورت میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ دشمن عقب سے اصل بحرین پر حملہ آور ہو جائے گا، کچھ قبائل فتنہ ارتداد میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ حضرت علاء بن الحضرمیؓ نے انہیں خط لکھ بھیجا کہ وہ عقب سے دشمن کا راستہ روکیں، اس طرح وہ بحرین کی طرف نہ آنے پائیں گے، وہاں سے تسلی بخش جواب ملنے کے بعد حضرت علاءؓ نے دار بن جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا، مگر دار بن ایک خلیج تھی جس تک پہنچنے کے لیے جہاز یا کشتیوں کی ضرورت تھی، مسلمان ان اسباب سے عاری تھے، حضرت علاء بن الحضرمیؓ نے لشکر اسلام کو جمع کیا اور فرمایا۔

"جب ہم خشک میدان میں دشمن سے مقابلہ کر رہے تھے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد ملی تھی، دہنا جیسے خشک

مقام سے لشکرِ اسلام کے لیے غیب سے پانی نکل آیا تھا، ہمیں اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ذات واحد خشکی کی طرح سمندر میں بھی ہماری مدد فرمائے گا۔

لشکر اسلام نے یک زبان کہا۔ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی چیز سے نہیں ڈرتے۔

اس پر حضرت علاء بن الحضرمیؓ اسلامی لشکر کے ہمراہ دعائیہ کلمات پڑھتے ہوئے داخل ہو گئے۔

میرے ذہن میں یہ سارا واقعہ کسی فلم کی طرح چلنے لگا، مجھے لگ رہا تھا جیسے میں لشکر اسلامی کو ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں چلتے ہوئے دیکھ رہی ہوں، وہ کچھ پڑھ رہے ہیں، میں نے دھیان دیا، اور ذہن پر دباؤ ڈالا تو مجھے وہ دعا یاد آنے لگی۔

يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ، يَا حَكِيمُ، يَا كَرِيمُ، يَا أَحَدُ، يَا صَمَدُ، يَا حَيُّ، يَا مُحْيِيَ الْمَوْتٰى، يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، يَا رَبَّنَا

لشکر اسلامی اونٹ، خچر، گدھوں اور گھوڑوں پر سوار تھا۔ بہت سے لوگ پیادہ پا تھے، مگر جب سمندر میں اترے تو سمندر سمٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ کا کرشمہ ظاہر ہونے لگا۔ پانی اس قدر خشک ہو گیا کہ صرف اونٹ، گھوڑوں کے پاؤں بھیگتے تھے، ہولناک سمندر نے مجاہدین اسلام کو راستہ دے دیا تھا۔ دشمنانِ اسلام تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمان بحری جہازوں یا کشتیوں کے بغیر با آسانی سمندر عبور کر لیں گے۔ وہ چین کی بانسری بجا رہے تھے، لشکر اسلامی نے وہاں پہنچ کر دار بن کو فتح کر لیا۔

میں نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔

"اے اللہ تُو نے مسلمانوں کے لیے سمندر میں اپنے راستے بنائے کہ وہ آرام سے بمع اپنی سواریوں کے سمندر عبور کر گئے، تُو نے بے آب و گیاہ میدانوں میں ان کے لیے پانی کے چشمے جاری کر دیے، اے اللہ میں بھی تجھے ماننے والی مسلمان لڑکی ہوں۔ تیرے محبوب حضرت محمد ﷺ کی امتی ہوں۔ تُو میری بھی سن لے میرے اللہ...... میرے سامنے ٹھوس دیوار حائل ہے، مجھے اس پار جانے کو کچھ سجھائی نہیں دیتا تو میری مدد فرما۔"

دعا مانگتے ہوئے مجھے خیال آیا۔ حضرت علاء بن الحضرمیؓ کی طرح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا واقعہ بھی اسی طرح کا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے عراق و قادسیہ کو فتح کرنے کے بعد دارالسلطنت فارس یعنی مدائن کا مقصد فرمایا۔ مدائن تک جانے کے لیے دجلہ کا منہ زور دریا عبور کرنا ضروری تھا۔ ساٹھ ہزار سواروں کا دریا عبور کر کے مدائن پہنچنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اہلِ فارس نے دجلہ کے ساحل سے تمام کشتیاں ہٹا دی تھیں، دجلہ کی طغیانی جوبن پر تھی۔ اس موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے خواب میں مسلمانوں کا دجلہ میں داخل ہونا دیکھا۔ حضرت سعدؓ نے لشکر اسلامی کو بمع سواریوں کے حصار میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی دعائیہ کلمات کا ورد کرنے کی تاکید فرمائی۔

میں نے ذہن پر زور دیا تو وہ کلمات بھی پوری طرح ذہن کی زمین پر اُترنے لگے۔ میں نے بہت پہلے اس دعا کا ترجمہ پڑھا تھا۔

"ہم اللہ سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ اللہ کافی ہے اور وہ اچھا وکیل ہے۔ قسم ہے اللہ کی، اللہ اپنے دوست کو فتح دے گا اور اپنے دین کو غالب کرے گا اور دشمن کو ہزیمت دے گا، سوائے اللہ کی مدد کے کسی میں قوت نہیں۔"

حضرت سلمان فارسیؓ جو حضرت سعدؓ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، فرماتے ہیں۔

ساٹھ ہزار اسلامی شہ سوار دجلہ پر ایسے چل رہے تھے جیسے باغ میں چہل قدمی کر رہے ہیں، وہ یوں ہی باتیں کرتے اور ورد کرتے ہوئے دریا کے پار چلے گئے، اس سفر میں حیران کن بات یہ بھی تھی کہ چلتے ہوئے جو گھوڑا تھک جاتا، اس کے لیے دریا میں ٹیلہ ظاہر ہو جاتا تھا، جس میں وہ آرام کر لیتا تھا، یہ اتفاق کی بات ہے یا رب کریم نے دانستہ یہ کرشمہ دکھایا کہ ہر گھوڑے کے ساتھ ایسا ہوا، اس دن کو عرب کی تاریخ میں یوم الماء اور یوم الجراثیم کہا جاتا ہے۔

☆......☆

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

پسند اپنی اپنی

عابد حسین

محبوبہ کے گھر کو لوٹنے والے محبوب ڈاکو کی اثر انگیز کہانی

روز کی طرح آج پھر گھر دیر سے آنے پر راجا کا باپ ہاتھ میں ڈنڈا اٹھائے راجا کی دھنائی کر رہا تھا اور راجا روز کی طرح ہاتھ جوڑ جوڑ کر باپ سے معافی مانگ رہا تھا، لیکن شاید آج راجا کا باپ راجا کو جان سے مار دینے کے درپے تھا۔ راجا کی بہن کلثوم اور اس کی ماں ہمیشہ کی طرح راجا کو چھڑانے کے لیے کوشش کر رہی تھی، لیکن آج راجا کا باپ راجا کو کسی قیمت پر نہ چھوڑنے کا عہد کیے بیٹھا تھا۔

''کتے کی اولاد کہاں تھا اب تک تُو؟'' راجا کا باپ راجا کو مارنے کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی دے رہا تھا۔

''تجھے گھر کی بھی کوئی فکر ہے؟ سارا دن تو آوارہ لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہتا ہے اور بھوک لگنے پر گھر کو دوڑا چلا آتا ہے۔ جا...... چلا جا، دفع ہو جا میری نظروں سے۔''

راجا کو تو جیسے اب یہ سب سہنے اور سننے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ روز اپنے آپ سے عہد کرتا کہ اب وہ آوارہ گردی نہیں کرے گا اور باپ کے ساتھ دکان پر جائے گا اور اس کا ہاتھ میں کام بٹائے گا، لیکن صبح ہوتے ہی پھر وہ ہاتھ میں گیند اور بلا پکڑ کر گراؤنڈ کی طرف چلا جاتا۔ یہ اب اس کا معمول بن چکا تھا۔

راجا راولپنڈی کے ایک پس ماندہ علاقے میں رہتا تھا، جہاں زندگی بہت محدود ہوتی ہے، بالخصوص روزگار اور تعلیم کے ذرائع۔ راجا کا باپ غلام قادر ایک چھوٹی سی سبزی اور فروٹ کی دکان چلاتا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی کلثوم، جو راجا سے دو سال بڑی تھی۔ راجا کی عمر 12 سال تھی۔ اس کی ماں بھی سخت طبیعت کی مالک تھی، لیکن راجا کو باپ سے پٹتا دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتی تھی۔

''کتنی بار کہا ہے کہ باپ کے ساتھ کام پر جایا کر، گھر کے حالات پہلے ہی بہت خراب ہیں۔'' راجا کی ماں رات کو راجا کے زخموں پر گرم ریت سے ٹکور کرتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھی۔ دیکھ پتر...... تیرا باپ بہت محنت کر کے چند پیسے کماتا ہے، جن سے بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔

''ٹھیک ہے ماں میں صبح ابا کے ساتھ دکان پر جاؤں گا۔'' راجا نے اپنی ماں کو کہا۔ ''امی کھانا دے دے بہت بھوک لگی ہے۔'' راجا کی ماں سالن گرم کرنے کے لیے چلی گئی۔

راجا اپنے زخموں کو سہلا رہا تھا اور آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا، کیا اس کی پوری زندگی اسی طرح غربت میں گزر جائے گی؟ وہ کچھ بڑا کرنا



چاہتا تھا۔ اکثر امیر لوگوں کی بڑی بڑی گاڑیوں اور محل نما گھروں کو دیکھ کر راجا کا خون کھول اٹھتا۔ وہ سوچتا تھا کہ کیا ان سب آسائشوں پر صرف امیر لوگوں کا ہی حق ہے؟ اتنی دیر میں راجا کی ماں سالن اور روٹی گرم کر کے لے آئی۔

''راجا پتر، تو کیا سوچ رہا ہے؟'' راجا کی ماں نے گہری سوچ میں پڑے راجا سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ماں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ گاڑیاں اور کوٹھیاں اور یہ سب آسائشیں صرف امیر لوگوں کے پاس کیوں ہیں۔ ان سب پر کیا ہمارا کوئی حق نہیں؟''

''دیکھ راجا پتر! یہ بڑے لوگوں کی باتیں نہ کر، ہمارا تو مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ کبھی دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے، کبھی نوبت فاقوں تک آ جاتی ہے اور تو گاڑی اور بنگلے کی بات کر رہا ہے۔''

''نہیں ماں! میں یہ سب حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا ماں، ایک دن میں اتنے پیسے کماؤں گا کہ ابا بھی حیران رہ جائے گا۔''

''اچھا چل باتیں چھوڑ اور روٹی کھا۔ دوپہر کو بھی پتا نہیں کھایا ہے یا نہیں، اب کھانا کھا اور سو جا، صبح ابا کے ساتھ دکان پر جانا ہے۔''

راجا کی ماں نے راجا کے سامنے کھانا رکھا اور پانی لینے کے لیے چلی گئی۔

صبح سویرے راجا اپنے باپ کے ساتھ دکان پر چلا جاتا ہے، لیکن جوں ہی لڑکے اس کی دکان کے سامنے سے ہاتھوں میں گیند اور بیٹ پکڑے گزرتے ہیں تو راجا کا دل بھی چاہتا ہے کہ وہ بھی دکان چھوڑ کر ان لڑکوں کے ساتھ گراؤنڈ کی طرف چلا جائے، لیکن پھر ابا کی مار اور لڑائی سے ڈر کر بیٹھ جاتا ہے، لیکن راجا کا دل دکان پر ذرا بھی نہیں لگتا۔ اتنے میں نائلہ اپنی ماں کے ساتھ سبزی لینے کے لیے دکان پر آتی ہے اور راجا کو دکان پر کام کرتا دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے۔ نائلہ اور راجا ایک دوسرے کے ساتھ بہت پیار کرتے ہیں۔ نائلہ حاجی رفیق کی بیٹی ہے جو راجا سے بہت پیار کرتی ہے۔

''اے راجا تُو دکان پر کیسے؟ آج گراؤنڈ نہیں گیا کیا؟'' نائلہ قدرے خوشی سے راجا سے پوچھتی ہے۔

''دیکھ نائلہ تُو مجھ سے اتنی بے تکلفی سے باتیں نہ کیا کر، اگر ابا نے دیکھ لیا تو خوامخواہ میں میری شامت آ جائے گی۔'' راجا اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نائلہ سے بولا۔

''دیکھ لے...... کیا تو مجھ سے پیار نہیں کرتا ہے؟'' نائلہ نے خفگی سے کہا۔

''نائلہ یہ پیار جو ہوتا ہے نا، یہ بڑے لوگ کرتے ہیں اور جب میں بھی بڑا آدمی بن جاؤں گا تو پھر سوچوں گا۔'' راجا نے شاہانہ انداز میں کہا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ زندگی ایک ہی ڈگر پر رواں

تھی۔ کبھی راجا دکان پر جاتا اور کبھی پھر آوارہ گردی کرتا۔ راجا نائلہ سے پیار تو کرتا تھا، لیکن راجا کے کچھ خواب تھے، بہت بڑے خواب اور وہ ان کی تکمیل کے بعد ہی نائلہ کو اپنا بنا سکتا تھا۔

''اے حرام زادے تُو دکان کھلی چھوڑ کر کہاں دفع ہوگیا تھا؟'' راجا کے ابا نے گالیوں کے ساتھ دو تین لاتیں راجا کو رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھ ابا! تُو جتنا مرضی مار لے مجھے، لیکن گالی نہ دیا کر۔'' راجا نے منمناتے ہوئے کہا۔

''اچھا تجھ کو گالیاں نہ دوں، تُو جو چاہے مرضی کرتا پھرے۔'' اصل میں راجا کے ابا سے نائلہ کے باپ نے شکایت کی تھی کہ تیرا بیٹا میری بیٹی کو چھیڑتا ہے اور اب راجا کا ابا شام کو گھر آتے ہی راجا پر ٹوٹ پڑا تھا۔

''تجھ پر عاشقی کا بھوت کب سے سوار ہوگیا ہے؟ گھر میں کھانے کے لیے پیسے نہیں ہیں اور نواب صاحب چلے ہیں عاشقی کرنے۔'' راجا کا باپ اس پر برس رہا تھا۔ ''دفع ہوجا میرے گھر سے اور آئندہ مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا، کچھ نہیں لگتا تُو میرا۔''

''ابا قسم سے میرا کوئی قصور نہیں ہے، وہ تو خود گلی میں کھڑی ہوئی تھی میرا راستہ روک کر۔'' راجا نے اپنی صفائی پیش کی۔

''میں کچھ نہیں جانتا، ابھی اور اسی وقت دفع ہوجا میری نظروں سے۔'' راجا نے بہت منت کی، باپ کے پاؤں پکڑے، لیکن راجا کا باپ آج کسی قیمت پر راجا کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

راجا کے باپ نے اس کو اسی وقت دھکے مار کے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اب اس صورت حال سے راجا بہت پریشان تھا۔ وہ اب اتنی رات گئے کہاں جائے گا۔ اگر کسی دوست کے پاس گیا تو پھر اسے واپس آنا پڑے گا، اس لیے اب راجا نے بھی عہد کرلیا تھا کہ چاہے جو کچھ بھی ہوجائے، وہ اب کسی صورت اس گھر میں واپس نہیں آئے گا۔ اس کے پاس کچھ پیسے تھے، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب اسے کہاں جانا ہے۔ ساری رات وہ سڑک پر گھومتا پھرتا رہا اور صبح ہوتے ہی وہ لاہور کی بس پر سوار ہوگیا اور لاہور روانہ ہوگیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لاہور میں کس کے پاس جانا ہے۔ بس وہ ایک انجان منزل کی طرف سفر کر رہا تھا۔ راستے میں اس کا بہت دل چاہا کہ واپس چلا آئے لیکن پھر ابا کے غصے کے ڈر کی وجہ سے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ راجا کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ وہ کبھی ایک رات بھی اپنے گھر اور گھر والوں سے دور نہیں رہا تھا، لیکن اب وہ ہمیشہ کے لیے اپنے گھر اور گھر والوں سے دور جا رہا تھا۔

''ارے پتا نہیں میرا بیٹا کہاں چلا گیا۔'' راجا کی ماں اور بہن کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔

''کہیں نہیں گیا، اِدھر ہی کسی آوارہ دوست کے گھر ہوگا۔ آجائے گا واپس گھر مُردار کہیں کا۔'' راجا کا باپ بہ ظاہر تو بہت غصے میں تھا، لیکن اندر سے وہ بھی بہت پریشان تھا۔

''مجھے کچھ نہیں پتا، مجھے میرا بیٹا واپس لادو۔ تم نے اسے گھر سے نکالا ہے۔ تم کیسے باپ ہو، جو ایک معصوم بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگا؟ میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔'' راجا کی ماں رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔

''تم نے ہی اسے سر پر چڑھا رکھا تھا۔ میرا دماغ نہ چاٹو اور کھانا لاکر دو۔ آجائے گا جب بھوک لگے گی تو۔'' راجا کا باپ راجا کی ماں پر برس پڑا۔

شام تک راجا لاہور پہنچ گیا، لیکن اب اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کدھر جائے، اُدھر تو کوئی اس کا جاننے والا بھی نہیں تھا۔ راجا ایک ہوٹل کے باہر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ابھی کچھ رقم تھی، جن سے وہ کچھ دن گزار سکتا تھا، لیکن رقم ختم ہونے کے بعد وہ کیا کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ بہت پریشان تھا۔ انسان پر جب آفتوں کا پہاڑ ٹوٹتا ہے تو وہ سب کچھ تباہ کردیتا ہے۔ راجا نے ہوٹل میں کھانا کھایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ وہ ہوٹل میں آتے اور جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اب آہستہ آہستہ تاریکی بڑھ رہی تھی اور راجا کو سونے کی فکر تھی۔ راجا کافی دیر تک لاہور کی سڑکوں پر پھرتا رہا اور اپنی قسمت کو کوستا رہا۔ اسے اپنی ماں اور بہن کی یاد

آرہی تھی۔ پتا نہیں ان کا کیا حال ہوگا اور وہ میرے لیے کتنے پریشان ہوں گے، لیکن اپنے باپ کے بارے میں سوچ کر اس کا خون کھول اٹھا۔ راجا نے کبھی گھر میں سکھ کا سانس نہیں لیا تھا۔ ہر وقت لڑائی جھگڑا اور اسے اس مقام پر پہنچانے والا اس کا باپ تھا۔ گھر والوں کو یاد کرتے اور ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک پارک میں آگیا اور ایک بینچ پر لیٹ گیا، تھوڑی دیر بعد سفر سے تھکا ہوا راجا نیند کی وادیوں میں چلا گیا۔

صبح کی پَو پھوٹ رہی تھی، جب راجا کی آنکھ سورج کی روشنی سے کھل گئی۔ یہ پہلی رات تھی جو اس نے گھر سے باہر گزاری تھی۔ راجا کو بھوک محسوس ہوئی تو وہ قریبی ہوٹل کی طرف چلا گیا اور ناشتے کا کہہ کر منہ ہاتھ دھوکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب راجا نے ناشتہ کرلیا تو اس نے بل ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا، لیکن یہ کیا...... اس کی جیب تو بالکل خالی تھی۔ راجا بہت حیران تھا کہ رات کو تو اس کے پاس کچھ رقم تھی، مگر اب وہ کہاں گئی؟ بھولے راجا کو کیا پتا تھا کہ یہ گاؤں نہیں شہر ہے اور اِدھر تو لوگ دوسروں کے تن سے کپڑے تک اتار لیتے ہیں۔ اب اسے ہوٹل کے بل کی فکر تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کاؤنٹر پر گیا اور وہاں بیٹھے شخص کو بڑی معصومیت سے اسے رات کی بات بتائی تو کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا آدمی جو دیکھنے سے ہی غصے والا لگتا تھا، راجا کی بات سن کر طیش میں آگیا اور گالیاں دیتا ہوا کاؤنٹر سے راجا کو مارنے کے لیے لپکا۔ راجا نے صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنے بچاؤ کے لیے باہر کی طرف دوڑ لگا دی، لیکن سامنے سے آتے ہوئے ویٹر نے اسے دبوچ لیا، اتنے میں کاؤنٹر والا آدمی بھی آگیا اور راجا کو اتنا مارا، اتنا مارا کہ راجا بے سدھ ہوگیا۔ راجا نے اس کی بہت منت سماجت کی، لیکن ہوٹل کا مالک اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ راجا اپنے زخموں کو سہلاتا ہوا فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ آج اسے گھر کی بہت یاد آرہی تھی، لیکن ابا کا سوچ کر پھر خاموش ہوگیا۔ اب راجا، وہ راجا نہیں رہا تھا۔ اب راجا کے دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر یہ دنیا والے اسے شرافت کا جامہ اتار کر بدمعاشی اور غنڈہ گردی کے لبادے میں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس میں راجا کیا کرسکتا ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ آج اس نے اپنی مار کا بدلہ لینا ہے۔ وہ چپ چاپ فٹ پاتھ پر بیٹھ رہا اور شام ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا، کیوں کہ شام کو ہوٹل کے مالک نے اپنی دن کی آمدن لے کر گھر جانا تھا۔ آہستہ آہستہ دن گزرتا گیا، صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام۔ راجا نے اب اپنے آپ کو پوری طرح تیار کرلیا تھا۔ وہ گاؤں کا زور آور لڑکا تھا اور اب آہستہ آہستہ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ راجا ہوٹل کی طرف سے آنے والی سڑک کے کونے پر درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھا تھا اور ہوٹل کے مالک کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد راجا نے قدموں کی چاپ سنی اور آنے والے آدمی کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاں یہ وہی آدمی تھا، جس نے راجا کو بے دردی سے مارا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، پھر وہ جیسے ہی راجا کے قریب سے گزرا تو راجا خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا، کیوں کہ سڑک پر وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بڑی خراماں خراماں چال چل رہا تھا اور راجا اس سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے تھا۔ راجا کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا اور چہرہ اس نے کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوٹل کا مالک جیسے ہی روڈ سے اتر کر کچی سڑک پر مڑا تو راجا نے دوڑ کر زور سے اس کے سر پر ڈنڈا دے مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلنے پائی تھی اور وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر راجا کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ یہ پہلی بار تھا کہ راجا نے کسی کو مارا تھا۔ گاؤں میں لڑکوں کے ساتھ لڑائیاں تو ہوتی تھیں، مگر وہ معمولی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں۔ راجا نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے آٹھ ہزار اور کچھ روپے اور موبائل فون نکلا۔ راجا نے پیسے اور موبائل فون اپنی جیب میں رکھے اور وہاں سے فرار ہوگیا۔ یہ راجا کی منزل کی طرف پہلی حکمت عملی تھی جو اس نے اپنے لیے متعین کی تھی۔

راجا نے جان لیا تھا کہ اگر اس دنیا میں زندہ رہنا ہے تو شرافت سے نہیں بلکہ بدمعاشی اور غلط کام کرکے ہی زندہ رہا جاسکتا ہے۔ اب راجا کا معمول بن گیا تھا کہ وہ ہر رات کوئی نہ کوئی واردات کرتا تھا۔ اب وہ معمولی ڈاکو نہیں، بلکہ شہر کا ڈان راجا ڈاکو بن گیا تھا۔ اب وہ معمولی وارداتیں نہیں کرتا تھا، بلکہ اب وہ بڑے ہاتھ مارتا تھا۔

اسی طرح دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے اور راجا کو گھر سے بھاگے ہوئے پورے چار سال ہوگئے تھے۔ ان چار برسوں میں اس کا بہت دل چاہا کہ گھر جائے، لیکن پھر وہ نہ جاتا، کیوں کہ ابھی اس نے بہت سے پیسے کمانے تھے۔ پیسے تو اب بھی اس نے کافی سے زیادہ اکٹھے کرلیے تھے، لیکن وہ ابھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔

اس عرصے میں وہ اپنے گھر والوں کی خبر رکھتا رہا تھا۔ راجا کی بہن اب جوان ہوچکی تھی اور ان کا اب ایک بڑا اسٹور تھا اور انہوں نے گھر بھی تبدیل کرلیا تھا۔

راجا کے ماں باپ نے تو راجا کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ انہوں نے متعدد بار راجا کی گمشدگی کا اشتہار بھی اخباروں میں چھپوایا، لیکن راجا اس طرح غائب تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

راجا کے گھر آج کلثوم کو دیکھنے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ "مجھے تو وہ لوگ بہت پسند آئے تھے۔ لڑکا امریکا میں ملازمت کرتا ہے، تم ان کی چھان بین کرواؤ۔ "اے راجا کے ابا تم سے کہہ رہی ہوں کن سوچوں میں گم ہو؟" راجا کی ماں نے راجا کے باپ کو سوچوں کے بھنور سے باہر نکالا، جو نہ جانے کب سے سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

"کچھ نہیں، بس آج راجا بہت یاد آرہا ہے۔ اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور اب مجھ سے اسٹور پر نہیں بیٹھا جاتا۔ آہ کاش اس دن میں نے اپنے بیٹے راجا کو گھر سے نہ نکالا ہوتا۔" راجا کے باپ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"بس کردے راجا کے ابا، میرا بیٹا زندہ ہے وہ ضرور آئے گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔" راجا کی ماں نڈھال سے قدموں کے ساتھ کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دنوں میں کلثوم کا رشتہ طے پاگیا اور تاریخ رکھ دی گئی۔ جب راجا کو معلوم ہوا کہ اس کی بہن کی شادی ہے تو وہ بہت خوش ہوا، لیکن اگلے ہی لمحے اسے اداسی نے گھیر لیا، کیوں کہ وہ اب اپنے گھر نہیں جاسکتا تھا، اس لیے کہ اسے اس گھر سے نکالا جاچکا تھا، لیکن اس نے جانا ضرور تھا، دن کی روشنی میں نہ سہی، رات کے اندھیرے میں ہی سہی۔

مقررہ تاریخ پر بڑی دھوم دھام کے ساتھ کلثوم روتی، سسکتی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر اپنے پیا کے گھر چلی گئی۔ راجا یہ سب کچھ دور سے دیکھتا رہا۔ اپنے ماں باپ اور بہن کو اتنے عرصے بعد دیکھا تو ان سے گلے لگ کر رونے اور باتیں کرنے کو اس کا دل چاہا، مگر نہ جانے کیوں اس کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ واپس آگیا۔

راجا نے اپنی کارروائیاں اب مزید تیز کردی تھیں۔ اب اس کی گینگ میں کافی لڑکے کام کرنے لگے تھے۔ راجا نے اپنا تمام روپیہ بینک میں جمع کروایا ہوا تھا۔ اب راجا کا دل چاہتا تھا کہ وہ سارا مال روپیہ پیسا لے جا کر اپنے باپ کو دے اور فخر سے کہہ سکے کہ دیکھ ابا کتنا روپیہ کمایا ہے میں نے اور پھر اسے نائلہ یاد آگئی جو اس کا انتظار کررہی ہوگی، جس کی وجہ سے وہ زندہ ہے اور پھر یہ کہ وہ اپنے ماں باپ کو نائلہ کے گھر اپنے رشتے کے لیے بھیج سکے۔ راجا اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اس کے ایک شاگرد نے جو گینگ میں بلا کے نام سے مشہور تھا، راجا کو بتایا کہ "فلاں کوٹھی میں آج رات ڈکیتی کرنی ہے۔ کافی امیر لوگ ہیں، آخر ہمارا بھی تو کچھ حق بنتا ہے نا؟"

بلا نے ہنستے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"کیوں نہیں بلے کیوں نہیں، ان امیرزادوں سے میں نے پرانے حساب چکتا کرنے ہیں۔" لیکن بلے میں یہ سوچ رہا تھا کہ راجا کچھ بولتے بولتے چپ ہوگیا، جیسے سوچ رہا ہو کہ وہ بات کرے یا نہ کرے اور پھر بلا سے مخاطب ہوا۔

"دیکھ دوست اس گینگ میں تو سب سے پرانا دوست ہے میرا اور میں نے تجھے اپنے بارے میں سب بتا بھی دیا ہے۔ میں نے اب بہت پیسے کما لیے ہیں اور اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ بس اب اپنے ابا اور اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں اور اپنی نائلہ کو اپنانا چاہتا ہوں، لیکن پھر میری ہمت نہیں ہوتی، کیوں کہ جب میں خود کو مجرم تصور کرتا ہوں تو پھر میرے پیروں میں بیڑیاں پڑجاتی ہیں۔ دیکھ دوست، اگر کبھی مجھے کچھ ہوگیا تو میرے یار، میرا تمام روپیہ تو نکلوا کر میرے ابا کو دے دینا اور میری میت میرے گھر پہنچا دینا۔"

"دیکھ باس راجا ایسی بات نہ کر! تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے کہ میں تیرے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔" بلے نے اپنی وفاداری کا یقین دلوایا اور پھر وہ آئندہ رات کی ڈکیتی کا پلان بنانے لگے۔

راجا سمیت چار لوگ تھے۔ پہلے انہوں نے چوکیدار کو بے ہوش کیا اور بلے نے دیوار پھلانگ کر اندر سے دروازہ کھولا، پھر چاروں اندر گھس گئے۔ رات کے تقریباً 11 بجے کا وقت تھا۔ ایک باہر دروازے پر کھڑا رہا، تاکہ کسی پیش قدمی پر آگے اطلاع کرسکے اور راجا، بلا اور جانی اندر گھس گئے۔ اندر گھس کر انہوں نے گھر کی تلاشی لینی شروع کردی۔

"کون ہے؟ فضلو دیکھو کون ہے اِدھر؟" کسی مرد کی آواز آئی جو شاید قدموں کی آہٹ سے بیدار ہوگیا تھا۔

"خبردار جو آواز نکالی۔" راجا کسی جانور کی طرح صوفے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ راجا نے اس مرد پر پستول کی نال سیدھی کی ہوئی تھی، اس کا مکمل چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔

"کک، کک، کون ہو تم لوگ؟" اس آدمی کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"تیرے باپ۔" اس دفعہ بلا بولا تھا۔ "چل جلدی بتا، یہاں تیرے علاوہ اور کون رہتا ہے اور تمام زیور اور تجوری والا مال کہاں رکھا ہے؟" بلا اس طرح بول رہا تھا جیسے اپنا قرض مانگ رہا ہو۔

"میری بیوی رہتی ہے میرے ساتھ، خدا کے لیے آپ کو جو چاہیے وہ لے لیں، لیکن میری بیوی کو اور مجھے کچھ نہ کہیں۔" وہ آدمی تقریباً رونے لگا تھا۔

اتنے بڑے آدمی کو یوں روتا دیکھ کر بلا کی ہنسی چھوٹ گئی۔ "ارے لومڑی کی اولاد روتا کیوں ہے؟ تجھے کچھ نہیں کہیں گے اگر تو چپ چاپ اپنا سب کچھ ہمارے حوالے کردے گا۔"

"بلا تو جا اس کی بیوی کو لے آ، کہیں وہ ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کردے۔" راجا نے پستول تانے بلا کو کہا اور بلا اس کمرے کی طرف چل دیا، جہاں سے یہ آدمی باہر نکلا تھا اور کچھ دیر بعد ہی ایک لڑکی ہواس باختہ کمرے سے باہر آئی، جو شاید سو رہی تھی اور اس کے پیچھے بلا تھا۔

"ارے یہ کیا، یہ تو نائلہ ہے۔" راجا سب کچھ بھول سکتا تھا، لیکن ان آنکھوں کو نہیں بھول سکتا، جن میں راجا کے لیے پیار بسا ہوا تھا۔ نائلہ پہلے سے بہت بدلی ہوئی تھی، مگر اس کی آنکھیں ویسی ہی تھیں۔ لاؤنج میں آتے ہی نائلہ نے بھی راجا کو پہچان لیا۔ اگرچہ راجا کا چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، مگر نائلہ نے بھی اسے اس کی آنکھوں کی وجہ سے پہچان لیا تھا۔

"راجا تو؟" اچانک نائلہ کے منہ سے نکلا اور راجا نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ ابھی وہ داخلی دروازے سے باہر نکل ہی تھا کہ پولیس وین کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ پولیس نے چاروں طرف سے عمارت کو گھیر لیا تھا۔ راجا اور اس کے ساتھیوں نے پولیس کا مقابلہ کیا، اسی دوران ایک پولیس اہلکار نے فائر کیا اور راجا کو سیدھی دل کے مقام پر گولی لگی۔ اس مقابلے میں راجا کے دو ساتھی مارے گئے، لیکن بلا نے راجا کو وہاں سے نکال لیا، کچھ دور جا کر بلا نے راجا کو بٹھا دیا۔ راجا نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس دوران راجا کا بہت خون بہہ نکلا تھا۔ راجا اب اور نہیں جینا چاہتا تھا، اس لیے اس نے بلا کو پانی لانے کو کہا۔ جب بلا راجا سے کچھ دور چلا گیا تو راجا نے اپنے ہی ریوالور سے اپنی کھوپڑی میں سوراخ کردیا، کیوں کہ جس کے لیے وہ جیتا تھا، جب وہ ہی اس کی نہ رہی تھی تو پھر جینے کا فائدہ کیا تھا؟ بلا نے راجا کا تمام روپیہ پیسا بینک سے نکلوایا اور راجا کی میت کے ساتھ راجا کے گھر چلا گیا۔ راجا واپس گھر آ تو گیا تھا، مگر مردہ حالت میں۔ راجا کی ماں نے بیٹے کی لاش دیکھ کر دل خراش چیخ ماری اور غش کھا کر گر پڑی، کیوں کہ اس کے دل کا راجا اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

☆......☆

دیارِ غیر سے زندگی کی تصویریں

جنت نظیر میرا کشمیر

عروبہ عدنان

کشمیر کی وادیوں میں جنم لیتی بہادری کی عظیم داستان

گلزار بابا کی پتھرائی ہوئی آنکھیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں، جن میں موجود بے چینی اور اضطراب مجھے واضح نظر آ رہا تھا۔ میں سہمی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بابا کے پاس آ گئی۔ اس وقت میرے دل کا جو حال تھا وہ میں اور میرا خدا ہی جانتا تھا۔ میں بے حد دکھی اور بے چین تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہتا تھا، مگر صرف آنکھیں ہی رو رہی تھیں۔ وہ میری دسترس میں جو نہ تھیں۔ میرا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

گلزار بابا "جاں کنی" کے عالم میں تھے۔ میں جانتی تھی وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے؟ کچھ پوچھنا چاہتے تھے؟ میں آئی ہی اسی لیے تھی۔ مجھے یہ ہمت ان کے پیار اور خلوص نے دی تھی۔ مجھے خبر ملی تھی کہ گلزار بابا مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، مگر وہ خود بے حد بیمار ہیں، چل بھی نہیں سکتے۔ ان کے دل کا مرض اب اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ وہ مزید کوئی صدمہ برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے اور آج تو ان کا حال بے حد خراب تھا۔ بی پی بالکل نہ ہونے کے برابر تھا۔ ڈاکٹر نے بھی جواب دے دیا تھا۔ بس روح کا رشتہ ٹوٹا نہ تھا، شاید انہیں میرا ہی انتظار تھا اور اسی لیے مجھے بلایا بھی گیا تھا۔ وہ بے چینی سے بنا سر کبھی دائیں اور کبھی بائیں تک رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ نہایت بے چینی سے بولے۔

"آؤ بیٹا آج تمہیں سچ کا ساتھ دینا ہے۔ جو کچھ دل میں موجود ہے سچائی کے ساتھ بول دو، تاکہ میں سکون سے جان دے سکوں۔ میرا بیٹا سچا مجاہد تھا کہ نہیں؟"

میں نے جواب دیا کہ گلزار بابا! ذیشان ایک سچا دلیر اور نڈر مجاہد تھا۔ اس نے خدا کے حکم کی تعمیل کی اور سچائی کی راہ میں لڑتے ہوئے خدا کے لیے جام شہادت نوش کیا۔ یہ سراسر الزام اور جھوٹ ہے کہ وہ کشمیری بھائیوں کی مخبری کرتا تھا اور انہیں نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ کل اس نے تن تنہا چار فوجیوں کو للکارا تھا اور ان سے مقابلہ بھی کیا تھا۔ ان ظالموں کے پاس خودکار ہتھیار تھے اور تعداد میں بھی زیادہ تھے، مگر ذیشان کے پاس صرف ایک ہی گن تھی، جس سے وہ پل کے آس پاس کے علاقوں کی حفاظت کرتا تھا۔ وہ طاقت کے نشے میں چور ان کافروں پر ٹوٹ پڑا تھا، جو کہ ہم سب لڑکیوں کی عصمت کو پامال کرنے کے درپے تھے۔ اگر وہ اس وقت اس مقام پر موجود نہ ہوتا تو آج یا تو ہم بہت بری حالت میں ہوتے یا پھر مر چکے ہوتے۔ بدمست ہاتھی کی طرح وہ نشے میں دھت اور منہ سے اول فول بک رہے تھے۔ ہم لڑکیاں تو ان ظالموں کو دیکھ کر بری طرح سہم گئی تھیں۔



میں نے دائیں بائیں مدد کے لیے نظر دوڑائی تو میری نظر ذیشان پر پڑی، وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اسے آواز دے ڈالی۔

"ذیشان! ہمیں ان ظالموں سے بچاؤ۔" یہ آواز سن کر وہ بھی چونک پڑے اور اسے للکارنے لگے۔ ذیشان کے پاس ایک گن تھی۔ وہ ہمارے لیے ڈھال بنا ہوا تھا اور ہمیں اس نے ایک درخت کے پیچھے کر دیا تھا اور خود تن تنہا ان فوجیوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ وہ ہم تک پہنچنا چاہتے تھے، مگر ذیشان انہیں روکے ہوئے تھا۔ مقابلے کے دوران اس کی ٹانگ پر گولی لگی۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے اس کی ٹانگ سے خون بہتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی تھی اور ایک انڈین فوجی کو واصل جہنم کر دیا تھا۔ وہ فوجی جو تیزی سے ہماری طرف آ رہے تھے۔ وہ رک گئے، اپنے ساتھی کا حال دیکھ کر اور انہوں نے درختوں کے پیچھے پوزیشن بنالی تھی۔ ذیشان نے آہستگی سے میری طرف دیکھ کر مجھے آواز دی اور کہا۔

"نازو! جب تک ہو سکا میں انہیں روکوں گا۔ تم پل والی سائڈ سے ان لڑکیوں کو لے کر یہاں سے بھاگو۔"

میں نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں، ذیشان میں یوں نہ چھوڑ کر تمہیں جاؤں گی۔ یہ جنگی قریب ہی ہے اس کے ہتھیار سے ان ظالموں کا تمہارے ساتھ مقابلہ کروں گی۔" لیکن اس نے سخت لہجے میں جواب دیا تھا۔

"بے وقوفی کی بات نہ کرو، تم سے یہ گن اٹھ بھی نہیں سکتی، بس میری بات سنو۔ جتنا جلدی ہو سکے نکل جاؤ، ورنہ میرا اتنا کچھ کرنا کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔ اگر یہ تم لڑکیوں تک پہنچ گئے، جو یہ کر نہیں سکتے میرے جیتے جی، تو میں خدا کے آگے سرخرو نہیں ہو پاؤں گا۔ وقت بہت کم ہے جتنا جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ تم لوگ، اگر زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔"

وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا اور بابا! میں اور میری تینوں ہمجولیاں درختوں کی اوٹ لیتے ہوئے پل کی

جانب بڑھ گئے۔ وہ ظالم وحشی بے دریغ گولیاں برسا رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ ذیشان کا بچ نکلنا ناممکن تھا، مگر میں اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ میرے ساتھ میری ہجولیاں بھی تھیں جن کو بچانا اب میری ذمے داری تھی۔ میں نے اسے خدا کے حوالے کیا اور اپنی دوستوں کے ساتھ پل کے راستے شہر تک پہنچ گئی۔ بس یہی سچ ہے بابا! ذیشان فرشتوں کی طرح معصوم تھا، وہ آخری وقت تک لڑا اور ہمیں اسی نے ہی ان درندوں سے بچایا۔''

گلزار بابا یہ سب سن کر زار و قطار رونے لگے اور بس اتنا کہا۔ ''شکر الحمدللہ، اب میں سکون سے مر سکوں گا۔'' انہوں نے کلمۂ شہادت پڑھا اور آنکھیں بند کر لیں، پھر سب پکارتے ہی رہ گئے، مگر گلزار بابا نے آنکھیں نہ کھولیں۔ ان کی روح جہانِ فانی سے کوچ کر چکی تھی۔ میں نے بے دردی سے اپنی آنکھیں مسل لیں جن میں کانٹے سے چبھ رہے تھے، پھر سب میت کے انتظام میں لگ گئے اور میں اپنے گھر واپس لوٹ آئی۔

آج مجھے سب یاد آ رہا تھا۔ وہ تمام پل جو میں نے گلزار بابا کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ پہلا دن بھی جو میرا مقبوضہ کشمیر میں تھا، میں اپنے والدین کے ساتھ اپنی دادی کی وفات پر آئی تھی۔ یہ ہمارا علاقہ سری نگر کے قریب کا ہی علاقہ تھا۔ بن پورہ اس وادی کا نام تھا۔ یہ بے حد حسین وادی تھی، چاروں طرف سے بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی بالکل جنت کا نمونہ۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب پاکستان اور انڈیا کی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور کارگل کا محاذ زوروں پر تھا۔ پاکستان کی جیت یقینی نظر آ رہی تھی۔ کشمیری مجاہدین پاکستان آرمی کا ساتھ دے رہے تھے، ہر ہر محاذ پر بھارتی فوج پسپا ہو رہی تھی۔

میں کیوں کہ پہلی بار کشمیر آئی تھی، اس لیے مجھے سب کچھ بے حد حسین لگ رہا تھا۔ ایک تو کشمیر کا حسن اس کے اوپر سے موسم کی الگ سے رعنائیاں، میں تو اس حسن میں گم سی ہو گئی تھی۔ نومبر کا مہینہ چل رہا تھا۔ درختوں کے پتے راستوں کو اپنے زرد پتوں سے ڈھانپ لیتے تھے۔ لال اور زرد پتوں کا امتزاج ایک حسین منظر پیش کر رہا تھا۔ میں اس حسن کی تصویر کو اپنی نظروں میں سمو لینا چاہتی تھی۔ قدرت کے اس حسین حسن نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تک سلب کر لی تھی اور میں بالکل روبوٹ کی طرح بغیر سوچے سمجھے ان راہوں میں نکل پڑی تھی۔ میرے قدموں کے نیچے موجود پتے جو مجھے اپنی موجودگی کا ناکام احساس دلانے کی کوشش کر رہے تھے اور میں نادان اس طلسماتی ماحول کے طلسم میں ایسی جکڑی کہ یہ ہوش بھی نہ رہا کہ میرا رخ گھنے جنگل کی طرف ہو گیا ہے جہاں کئی طرح کے چھوٹے بڑے جانوروں کا مسکن تھا۔ کسی جانور کی چنگھاڑ نے مجھے واپس شعور میں دھکیلا۔ ہوش تو آ گیا پر جب دیکھا تو راستہ بھول گئی تھی۔ پیچھے پلٹ کر پہنچانے کی کوشش کرنے لگی، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور طلسم کی جگہ اب خوف نے لیا، میں رونے لگی۔ اتنے میں مجھے ایک انتہائی شفیق آواز سنائی دی۔

''رومت بیٹا! دیکھو تم تنہا نہیں ہو، میں اب تمہارے ساتھ ہوں۔''

میں نے آواز کی طرف رخ کیا تو اپنے سامنے ایک شفیق بزرگ ہستی کو دیکھا۔ لمبا قد، گورا رنگ اور باریش شخصیت، بہت جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے یہ بزرگ۔ میرے دل کو ڈھارس ہوئی۔ وہ بزرگ میرے قریب آ گئے اور بولے۔

''روؤ نہیں بیٹا، میں کوئی جن بھوت نہیں بلکہ ایک عام انسان ہوں۔'' میں جواب دیے بغیر انہیں دیکھتی گئی۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے۔

''میرے پیچھے پیچھے آؤ بیٹا، لگتا ہے تم یہاں نئی ہو۔ اس جگہ تمہیں اکیلے تو بالکل ہی نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ جگہ انتہائی خطرناک ہے۔''

میں نے پہلی دفعہ لب کھولے کہ بابا بس یہاں کے ماحول کی خوب صورتی مجھے کھینچے لے آئی، جب ہوش آیا تو راہ سے بھٹک چکی تھی۔ انہوں نے کہا۔

''شکر ادا کرو کہ میں آج یہاں تک گھر کے لیے لکڑیاں جمع کرنے اور خشک پتے ایک بوری میں بند کرنے چلا آیا، ورنہ نجانے تمہارا کیا بنتا بیٹا۔ حیرت ہے تمہیں احساس تک نہ ہوا کہ تم انجان راستے پر چلی جا رہی ہو۔ خیر میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ برف باری ہونے کو ہے۔ جب کچھ موسم میں بہتری آئے گی تو مجھے گھر کا

ایڈریس دینا، میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔''

''بند پورہ ایک چھوٹی وادی ہے جہاں سب لوگ سب کو جانتے ہیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بابا کے پیچھے چل پڑی جو اس وقت میرے لیے رحمت کے فرشتے سے کم ثابت نہیں ہو رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں ہی ہم بابا کے گھر پہنچ گئے۔ یہ پتھروں سے بنی ہوئی ایک پرانی عمارت تھی جس کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا، جو یہ بتا دے رہا تھا کہ یہ گھر آباد ہے، ورنہ آس پاس کا پورا علاقہ صرف اور صرف گھنے جنگلات سے بھرا ہوا تھا۔ بابا نے گھر کا دروازہ کھولا اور مجھے خوشگوار سا احساس ایک دم سے ہوا۔ اندر سے گھر کافی گرم تھا، شاید انگیٹھی یا کوئلہ اسٹوپ جیسی کوئی چیز جل رہی تھی۔ گرمائش ملی تو کچھ جان میں جان آئی۔ ایک چھوٹا سا بلی کا بچہ نجانے کہاں سے نکل کر آیا اور میرے پاؤں میں اپنے آپ کو رگڑنے لگا۔ میں نے اسے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ وہ مزاحمت کے بغیر آ گیا اور میاؤں میاؤں کر کے خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ بابا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولے۔

''بیٹا تم یہاں بیٹھ کر آرام کرو، میں اپنی بیگم کو تمہاری اطلاع دے کر آتا ہوں۔ تمہیں ایک گرم قہوہ کی پیالی کی اشد ضرورت ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے بابا کی طرف دیکھا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ بابا مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں وہیں ایک طرف کو لگے ہوئے بینچ پر بیٹھ گئی جس کے اوپر روئی کا گدا ڈال کر اسے آرام دہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس وقت وہ مجھے نعمت سے کم نہ لگی۔ میں واقعی بہت تھک گئی تھی۔ میں نے اب اپنے اردگرد کے ماحول کا مشاہدہ شروع کیا۔ میری گود سے وہ بلی کا بچہ اتر کر ایک طرف کو چلنے لگا۔ میں اسے بلانے لگی، مگر جب یہ دیکھا کہ جس طرف یہ بلی کا بچہ چلا جا رہا تھا، وہاں ایک میری ہی عمر کا لڑکا کھڑا اسی کو بلا رہا تھا۔ میں ٹھٹک کر رک گئی اور تھوڑی سی پزل بھی ہو گئی۔ وہ بچہ مجھے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور مجھے گھورتے ہوئے میرے سامنے سے گزر گیا۔ وہ بھی اسی طرف بڑھ گیا جس طرف وہ بزرگ گئے تھے، تھوڑی دور جاتے ہی اس بچے نے بابا کو پکارنا شروع کر دیا۔

''بابا جانی اور بابا جانی! دیکھیے آپ دروازہ کھول کر پھر آ گئے، ایک چور ہمارے گھر میں گھس آیا ہے۔'' اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا تو میں گھبرا گئی اور شرمندگی کے مارے سرخ ہو گئی، پھر بابا کی آواز آئی۔

''نہیں، بیٹا میرے ساتھ ہی یہ بچی آئی ہے۔'' انہوں نے محبت سے جواب دیا۔ میں سمجھ گئی ان دونوں میں باپ بیٹے کا رشتہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ لڑکا پھر نظر آیا، اس کے ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے۔ میں نے شکریہ کے ساتھ ایک کپ لے لیا اور خاموشی سے کھڑکی جو کہ بینچ کے نزدیک ہی موجود تھی اس سے باہر دیکھنے لگی۔ اب ماحول میں رات کی سیاہی بھی بڑھنے لگی تھی اور برف باری بھی ہلکی ہلکی شروع ہو گئی تھی۔ مجھے گھر والوں کی پریشانی ہو رہی تھی، وہ یقیناً پریشان ہوں گے۔ میں نے متفکر نظروں سے اس لڑکے کی طرف دیکھا اور بولی۔

''میرے گھر والے پریشان ہوں گے۔'' وہ لڑکا مسکرایا اور بولا۔

''شکر ہے آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔'' میں نے پریشانی اور غصے کے ملے جلے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''ہر انسان سے غلطی ہو جاتی ہے، مجھ سے بھی ہو گئی۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''مگر اتنی فاش غلطی؟ محترمہ آپ جان سے بھی ہاتھ دھو سکتی تھیں۔ کوئی بھی جنگلی جانور، چیتا، ریچھ یا ٹائیگر آپ کو سالم نگل لیتا۔'' شاید وہ مجھے ڈرا رہا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا اور غصے میں جواب دیا میں نے۔

''واہ ایسے ہی سالم نگل لیتا، آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے آپ روز یہ دیکھتے ہیں۔'' وہ ہنس پڑا اور بولا۔

''ایک تو غلطی اوپر سے سینہ زوری۔'' میں غصے میں آ گئی۔ ابھی کوئی سخت جواب دینے کو تھی کہ بابا پھر آتے ہوئے نظر آئے اور میں نے اپنا ارادہ ملتوی کیا اور صرف اس لڑکے کو گھورنے پر اکتفا کیا۔

''کیسی ہو بیٹا، اب کچھ طبیعت بحال ہوئی۔ شکر ادا کرو میں وہاں آ گیا، ورنہ کوئی درندہ یا پھر انڈین درندوں کے ہتھے تم چڑھ جاتیں۔'' ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بابا جی کی زوجہ محترمہ بھی آ گئیں۔ وہ بہت محبت سے مجھ سے ملیں اور لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے لگیں کہ میں محفوظ

ہاتھوں میں آ گئی ہوں۔ انہوں نے بابا اور ذیشان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہمیں جلد از جلد ان کی اطلاع خیریت کی ان کے والدین تک پہنچا دینی چاہیے۔ وہ بے حد پریشان ہوں گے۔"

بابا نے کہا۔ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو نیک بخت۔" اور مجھ سے میرا نام پوچھا، میں نے اپنا نام بتایا اور پھر ایڈریس بھی بتا دیا۔ گلزار بابا نے ذیشان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ ہمیں ابھی نکلنا ہوگا تا کہ ان کے والدین کو لے کر آ سکیں اور ان کی خیریت سے بھی مطلع کر دیں۔" ذیشان نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں نکل پڑے۔ اتنی دیر میں اور گلزار بابا کی زوجہ صغراں بی بی آپس میں بات چیت کرنے لگے۔

زیادہ وقت نہیں لگا۔ تھوڑی دیر میں ہی میرے والدین آ گئے۔ امی نے مجھے سینے سے لگا لیا اور صغراں بی بی کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اس پر وہ کہنے لگیں کہ "ایسا نہ کہیں نازو بھی تو ہماری بیٹی ہی کی طرح ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد میں اور امی ابو واپس گھر آ گئے۔ دادی کی وفات کے بعد اس گھر میں ہم نے کچھ عرصہ گزارنے کا فیصلہ کیا، پھر کچھ ایسا ہوا کہ ہمیں یہ جگہ بھا گئی۔ اس وادی کی خوب صورتی اور سادگی نے ہمارا دل موہ لیا اور ہم نے یہاں ہی رہنے کا ارادہ بنا لیا۔ میرے والدین نے میرا داخلہ بھی وہاں کے کالج میں کرا دیا اور میں وہاں پڑھنے لگی، مگر ابھی کچھ عرصہ ہی وہاں ہمارا گزرا تھا کہ آس پاس کے علاقوں کی طرح اس وادی کے حالات بھی خراب ہونے لگے۔ آئے دن فائرنگ اور دھماکے ہونے لگے۔ بھارتی فوجی کسی کے گھر بھی گھس کر بغیر تحقیق کیے مطلوبہ افراد کو اپنے ساتھ لے جاتے اور اگر کوئی مزاحمت کرتا یا آواز بلند کرتا تو وہ یا تو مارا جاتا یا پھر اسے بھی دھر لیا جاتا اور اگلے دن اسے آتنک وادی کا لقب مل جاتا۔

روزانہ خبر ملتی فلاح جگہ سے تشدد زدہ لاش ملی، فلاں وادی میں فائرنگ کر کے نوجوان کو مار دیا۔ بعض دفعہ تو یہ ظالم فوجی بلا اشتعال کے فائرنگ کر دیتے، بالکل ایسا ہی ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں اور میرے والد دریائے نیلم کے کنارے کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک بھارتی فوجیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ہم سب گولیوں کی زد میں تھے۔ میرے والد نے میرا ہاتھ تھاما اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں ان بچوں کو دیکھ رہی تھی اور چلا رہی تھی کہ ان کا کیا بنے گا کہ ایک نوجوان نظر آیا جوان بچوں کو بچانے کے لیے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ میرے والد مجھے خطرے سے دور لے آئے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے دور چلی آئی۔ ایک محفوظ مقام پر مجھے رکنے کا اشارہ کر کے وہ واپس پلٹے، اس نوجوان کی مدد کرنے کے لیے جو بچوں کو اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا۔ انہوں نے بھی دو بچوں کو اٹھایا اور انہیں محفوظ مقام پر لانے کی کوشش کرنے لگے، اتنے میں ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور ایک بارہ سالہ بچی کے مٹکے میں لگی وہ شاید یہاں پانی بھرنے آئی تھی۔ وہ ڈر کر رونے لگی۔ اس نوجوان نے بچی کا ہاتھ تھاما اور ایک طرف دوڑ لگا دی تو بچی نے جانے سے انکار کر دیا اور اپنے بھائی کی طرف اشارہ کیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا، مگر وہ اسے اپنے ساتھ نہ لے جا سکی۔ ظالموں کی ایک گولی اس کے بھائی کی گردن میں پیوست ہو گئی اور وہ وہیں گر پڑا۔ اس بہادر نوجوان نے بچے اور بچی دونوں کو گود میں اٹھا لیا اور گولیوں کی بوچھاڑ میں ان دونوں بچوں کو خطرے سے دور لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں میرے والد بھی آ گئے اور انہوں نے بچے کو تھام لیا۔ محفوظ جگہ پہنچ کر انہوں نے اور اس نوجوان نے بچے کا خون روکنے کی کوشش شروع کر دی، میں بھی وہیں آ گئی۔ میری نظر اس نوجوان پر پڑی تو میں فوراً پہچان گئی، وہ گلزار بابا کا بیٹا ذیشان تھا۔ میرے والد اور ذیشان پوری کوشش کر رہے تھے، مگر اس بچے کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنا دوپٹا پھاڑ کر اسے بچانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ایک دوپٹا اس کا خون نہ روک سکا اور آخر کار اس نے ہمارے سامنے ہی دم توڑ دیا۔ ایک ننھی کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھی۔ بچے کی بہن یہ سب دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

یہ واقعہ اور ایسے ہی بہت سارے واقعات وہاں روز کا معمول بن چکے تھے۔ یہ بھارتی درندے لوگوں پر اپنا خوف اور دہشت بٹھانا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ ہر حد سے گزر جاتے تھے۔ وہ نوجوان لڑکیوں کو ان کے گھروں سے زبردستی اٹھا لیتے یا پھر راستے سے اغوا کر لیتے اور چند دن کے بعد ان کی لاشیں وادی یا نیل کے پاس سے ملتی تھیں۔ نجانے کتنی ہی لڑکیاں اس وادی "بن پورہ" کی ان درندوں کا شکار بن چکی تھیں۔

یہ حالات دیکھ کر میرے والد نے واپس دہلی جانے کا ارادہ بنا لیا۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ بگڑتی ہوئی صورت حال اور آئے دن کی بربریت دیکھ کر کون چاہے گا ایسے ماحول میں رہے، مگر سلام ہے ان کشمیریوں کو جو یہ سب برداشت کر رہے تھے اور جھیل رہے تھے۔ میرا دل کشمیر چھوڑنے کا بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ یہاں کے لوگوں اور وادیوں سے مجھے پیار تھا، مگر والدین کے حکم کے آگے میں مجبور تھی۔ میں اب پری میڈیکل میں تھی اور آگے مزید تعلیم کے لیے مجھے یہاں سے جانا ہی تھا، سو ہم لوگ اپنا سامان بہت بددلی سے باندھنے لگے۔ میں نے والدہ سے کہا۔ امی جان میرا آج بن پورہ کے کالج میں آخری دن ہے۔ میں اپنی دوستوں کو آپ سے ملوانے لاؤں گی۔ امی نے کہا ہاں ضرور لانا۔ میں صبح جلدی اٹھ گئی اور نماز پڑھ کر وقت سے تھوڑا پہلے ہی تیار ہو گئی اور کالج پہنچ گئی۔ دل بہت اُداس تھا، اپنا آپ جو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ میری سب سہیلیاں بھی اُداس تھیں۔ میں نے سب کو خدا حافظ کہا اور چھٹی کے بعد اپنی ہجولیوں کو ملوانے میں اپنے ساتھ ہی کالج سے انہیں لے کر گھر کی جانب چل پڑی۔ گھر اور کالج کے درمیان بازار تھا۔ میری دوستوں نے کہا کہ کیوں نا کھانے کے لیے کچھ لے لیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے سموسے لیے، ابھی ہم نے پیسے ہی دیے تھے کہ وہاں کچھ بھارتی فوجی آ گئے اور ہمارے ساتھ بدتمیزی کرنے لگے۔ میں نے انہیں شرم دلائی تو ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اسے دھکا دے دیا اور اپنی دوستوں کو بھاگنے کا اشارہ کیا، کیوں کہ میں ان کے ارادے جان گئی تھی۔ اپنا ہاتھ چھڑوا کر میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ بازار کے ساتھ ہی گھنا جنگل تھا۔ ہم نے وہاں کا رُخ کیا۔ بھاگتے ہوئے میں کسی سے ٹکرا گئی۔ جب دیکھا تو وہ ذیشان ہی تھا۔ میں نے ذیشان کو کہا، ہماری مدد کرو، یہ لوگ ہمیں اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ ذیشان اس وقت کہیں سے آ رہا تھا اور اس کے پاس گن بھی تھی اس نے مجھے تسلی دی اور کہا فکر نہ کرو، اللہ نے چاہا تو یہ سب میرے ہاتھوں واصل جہنم ہوں گے۔ اب ہم گھنے درختوں کے درمیان میں تھے۔ ذیشان اکیلا تھا اس کے پاس صرف ایک گن تھی، مگر وہ مردانہ وار ان چاروں بھارتی درندوں سے لڑ رہا تھا۔ وہ ہماری ڈھال بن گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ زخمی ہو گیا تھا، مگر وہ لڑتا رہا پھر اس نے ہمیں وہاں سے نکلنے کو کہا اور مجھے اور میری دوستوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے جانا پڑا۔ ہم اپنے اپنے گھر میں چلے گئے۔ صبح خبر ملی کہ ذیشان مارا گیا، مگر یہ خبر بھی ملی کہ اس کے اوپر الزام آیا ہے کہ وہ بھارتی فوجیوں کو مجاہدین کی مخبری کر رہا تھا کہ اسے گولی لگی۔ یہ افواہ کیسے پھیلی۔ یہ پتا نہیں، مگر یہ سراسر الزام تھا۔ اس نے تو ہمیں بچاتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں گلزار بابا کے پاس بے تابانہ چلی گئی۔ وہاں پہنچی تو ان کو قریب المرگ پایا اور جب لوگوں نے بتایا کہ وہ کس وجہ سے اس تکلیف دہ کیفیت میں ہیں تو میں نے فیصلہ کیا کہ سب کچھ کھل کر بیان کر دوں گی، تا کہ ان کو اس تکلیف سے نجات ملے، جس نے انہیں اس حال کو پہنچا دیا ہے، پھر سب تفصیلات میں نے بیان کر دیں، جو کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں۔

یہ میرا مقبوضہ کشمیر میں آخری دن تھا۔ میں اپنے ساتھ بہت سی تلخ یادیں لے کر جا رہی تھی۔ ذیشان کی شہادت اور گلزار بابا کی موت۔ تمام راستے میں دعا کرتی رہی کہ یا اللہ! میرے کشمیر کو ان ظالموں کی قید سے آزادی دلا، تا کہ وہ سکھ چین سے اپنی زندگیاں بسر کر سکیں۔ آپ سب بھی ان کے لیے دعا کریں کہ خدا انہیں ان کی قربانیوں کا صلہ دے اور وہ آزادی کی زندگی گزار سکیں۔ (آمین)

☆......☆

امانت



نصرت سرفراز

ہمدردی کے دیپ جلاتی ایک خوب صورت تحریر

میرا نام فاطمہ ہے۔ دو بھائیوں اور تین بہنوں میں میرا نمبر سب سے آخری ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میرے وجود کی موجودگی اور عدم موجودگی کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ والد اور والدہ دونوں خالص دیہاتی ماحول کے ایسے اَن پڑھ والدین تھے، جن کی نظر میں بچوں کی تعداد میں اضافہ عین حکم ربی اور گھر اور باہر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے دو ہاتھوں کا اضافہ مانا جاتا تھا۔ شروع میں میرے دونوں بڑے بھائی قریبی سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے جایا کرتے تھے، مگر جلد ہی سرکاری ماسٹر کے طریقۂ تعلیم سے اُکتا گئے کہ یہ ماسٹر بچوں کو انسان کم اور مرغا زیادہ بناتے تھے، لہٰذا ان کی تعلیم بالترتیب جماعت چہارم اور پنجم سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی، لیکن خدا کی قدرت دیکھیے کہ اسی ماحول میں رہتے ہوئے میں نے نہ صرف میٹرک (سرکاری اسکول) سے کرلیا، بلکہ آج کل پرائیوٹ ایف ایس سی کی تیاری بھی کر رہی ہوں۔ اس تعلیم کے حصول میں مجھ سے زیادہ میری سب سے بڑی بہن کو کریڈٹ جاتا ہے، جنہوں نے ایک ماں کی طرح نہ صرف ہر صبح تیار کرا کے اسکول بھیجنے کی میری ذمے داری اٹھائی، بلکہ اس راہ میں آنے والی مشکلات کا حل بھی نکالتی رہیں۔ میں تاحیات اُن کی مشکور بھی رہوں گی اور دُعاگو بھی ہوں کہ اللہ تعالیٰ اِن کا مستقبل اتنا روشن کرے، جتنا انہوں نے میرے ذہن و دل کو تعلیم کی روشنی سے منور کر کے کیا ہے۔ میٹرک تک کی سرکاری اسکول کی ذمے داری تو جیسے تیسے کر کے بابا نے اٹھا ہی لی، مگر ایف ایس سی کے لیے انہوں نے صاف منع کر دیا کہ آگے تعلیم دلانا اُن کے بس سے باہر ہے۔

اس کا حل بھی باجی نے ہی نکالا۔ وہ یوں کہ گاؤں کے جن گھروں کے بچے سرکاری ماسٹر کے ستائے ہوئے تھے اور اُن کے والدین واقعی انہیں پڑھانا چاہتے تھے، باجی نے انہیں مجھ سے ٹیوشن پڑھنے پر لگا دیا۔ قدغن تو ہمارے اس عمل پر بھی خوب لگائی گئی کہ دیکھو تو بالشت بھر کی چھوکری ہے، اپنے سے لمبے لمبے لڑکوں کے سامنے بیٹھ کر اُن کو پڑھائے گی۔ اِس کے تو ماں باپ کے دیدوں میں پانی اُتر آیا ہے، مگر کیا کیا جائے گاؤں کے ماحول اور آب و ہوا کا کہ جماعت پنجم تک پہنچتے پہنچتے ہی یہاں کے لڑکے نہ صرف قد میں اپنے باپوں سے لمبے ہو جاتے، بلکہ کچھ کے تو

چہروں پر بھی جوانی کے آثار نظر آنے لگتے۔ جن چند بچوں نے شروع میں مجھ سے ٹیوشن پڑھی، وہ نہ صرف سرکاری ماسٹر کے مولا بخش سے محفوظ ہوگئے، بلکہ مُرغا بن کر لکڑوں کوں کرنے کے بجائے انسان بن کر باعزت طریقے سے اپنے تعلیمی مدارج طے کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے پاس پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیوں کی خاصی تعداد جمع ہوگئی اور اِس سلسلے کا سب سے بڑا فائدہ ہماری معاشی پریشانیوں میں سوفی صد حل کی صورت میں حاصل ہوا، جس نے بدخواہوں کی لن ترانیوں پر بھی پردہ ڈال دیا۔

مجھے تعلیم کے حصول کا جنون اور نصابی کے علاوہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا بھی بہت شوق تھا۔ اس کے لیے مجھے مواقع تو بہت زیادہ میسر نہ تھے، مگر جہاں سے جتنا ادبی مواد مل جاتا میں اسے پڑھ ڈالتی اور اسی پڑھنے کے شوق نے مجھے اپنے اِرد گرد پھیلے ہوئے واقعات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کا حوصلہ دیا اور اس حوصلے نے بھی کسی حد تک مجھے معاشی مدد فراہم کی۔

یقیناً قارئین میرا پس منظر اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے، لیکن میری کہانی تو ابھی شروع ہوئی ہے، یہ پھر کبھی سہی...... آج تو یہ چند الفاظ قرطاس پر بکھیرنے کا مقصد اپنے پاس پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں میں سے ایک بچے مظہر کی انتہائی اُداس سی صورت کے پیچھے چھپی ایک کہانی بیان کرنا ہے۔ دراصل میں نہ صرف بچوں کو پڑھاتی ہوں، نصاب کی تعلیم دیتی ہوں، بلکہ اُن کو دیگر اسلامی کہانیاں اور واقعات بھی گاہے بگاہے سناتی رہتی ہوں اور اُن کی پریشانیوں اور اُلجھنوں کا احوال سُن کر اُن کی مدد یا پھر صرف بعض اوقات زبانی کاؤنسلنگ کے ذریعے ہی اُن کی بھرپور مدد کرتی ہوں اور آج بھی یہی ہوا۔

مظہر کے اُداس اور پریشان چہرے کو دیکھ کر میں نے اُس سے پوچھا ”کیا بات ہے آج تم اس قدر اُداس کیوں ہو۔“ میرے اس سوال کا اُس نے جو جواب دیا، وہ اس قدر پُر درد اور مبنی بر سچائی تھا، کہ



میں نے سوچا یہ واقعہ ”سچی کہانیاں“ کے قارئین سے بھی شیئر کیا جائے کہ یہ سچا واقعہ زندگی میں حاصل ہونے والے اسباق میں سے ایک سبق ہے۔ اور اس کے دوست ارباز کی ذات سے متعلق ہے جو کہ جماعت نہم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ مظہر نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ”باجی کل میں جب صبح اسکول جا رہا تھا تو ابو نے مجھے ایک اسپتال کی رسید دی اور کہا کہ مظہر بیٹا اسکول سے واپسی پر اپنی امی کے خون کی رپورٹ اسپتال سے لیتے آنا، کیوں کہ تمہارے اسکول سے واپسی کے راستے پر ہی تو یہ سرکاری اسپتال پڑتا ہے، لہٰذا اسکول سے چھٹی کے بعد میں اسپتال چلا گیا۔ یہاں سرکاری اسپتال میں بہت رش ہوتا ہے۔ میں رپورٹ لینے کے لیے لائن میں لگا ہوا تھا اور اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک میری نظر ارباز پر پڑی۔ ارباز میرا ہم جماعت تھا اور بہت زیادہ شرارتی اور دوسروں کو تنگ کرکے مزہ لینے والا لڑکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ارباز ایک انتہائی بوڑھی خاتون سے باتیں کر رہا ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ اس کی دادی یا نانی وغیرہ ہوں گی، مگر چوں کہ وہ دونوں مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے تھے، لہٰذا ان دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت میں آسانی سے سُن سکتا تھا۔ وہ بوڑھی خاتون، جن کو دکھائی بھی کم دیتا تھا، وہ ارباز سے کہہ رہی تھیں۔ ”بیٹا تم یہ سو روپے لے لو، کیوں کہ سامنے والی کینٹین پر بڑا رش ہے اور میں بوڑھی جان ہوں، وہاں تک پہنچ نہ پاؤں گی اس لیے بیٹا ذرا مہربانی کرکے وہاں سے میرے لیے ایک پانی کی بوتل چھوٹی والی اور ایک بن کباب لاکر دے دو۔ میں نے ناشتے سے پہلے والا خون ٹیسٹ کرالیا ہے، اب مجھے ناشتا کرکے دوبارہ کرانا ہے۔ اگر اب میں گھر جاکر واپس آؤں گی تو مجھے بہت دیر ہوجائے گی اور ایک بڑی سڑک بھی تو کراس کرنا پڑتی ہے، اسپتال کے سامنے ہی۔ اگر تم یہ دونوں چیزیں لادو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔“

ارباز نے جی اچھا امّاں کہہ کے بڑی تابعداری سے اپنی گردن ہلائی، جیسے کہ وہ بہت ایمان داری سے بڑی بی کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت شرارتی ہے، ضرور یہ بی امّاں کو چکمہ دے کر نکل جائے گا اور پھر ہوا بھی یہی۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھی امّاں سے وہ سو روپے لے کر کینٹین کے رش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے باہر مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ جب تک میری رپورٹ لینے کی باری آچکی تھی۔ میں نے رپورٹ جیب میں رکھی اور باہر کی طرف بڑھا تو میری نظر بوڑھی خاتون پر پڑی، جو حلیے سے بہت غریب دکھائی دیتی تھیں اور اب وہ بہت پریشان نظر آرہی تھی، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ رونے کے قریب تھی اور بار بار کینٹین کی جانب دیکھ رہی تھی کہ جہاں رش مزید بڑھ گیا تھا۔ میرے دل میں اچانک ایک خیال آیا کہ صبح ابا نے جو سو روپے لنچ اور کرائے کے لیے مجھے دیے تھے، وہ میری جیب میں پڑے ہیں، کیوں نہ میں اُن روپوں سے اِس بوڑھی خاتون کی مدد کردوں، جو بہت پریشان نظر آرہی ہیں۔ میرا کیا ہے، میں تو اکثر ہی پیسے بچانے کے لیے پیدل گھر چلا جاتا ہوں۔ اپنے دل میں یہ خیال آتے ہی میں جلدی سے کینٹین کی جانب بڑھا اور پانی کی چھوٹی بوتل اور بن کباب لے کر اُن بوڑھی خاتون کی طرف بڑھا اور دونوں چیزیں اُن کو تھماتے ہوئے بولا۔ امّاں رش بہت زیادہ تھا، اس لیے دیر ہوگئی۔ یہ لیں آپ کی چیزیں اور یہ رہے آپ کے بقایا چالیس روپے۔ میرے ہاتھ سے چیزیں اور بقایا روپے لیتے ہوئے بوڑھی امّاں نے مجھے بہت ساری دعائیں دیں کہ بیٹا اللہ تم کو بہت خوشیاں دے، جگ جگ آباد رہو، خوب پڑھو اور بڑے آدمی بنو اور میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اِن بوڑھی اماں نے مجھے ارباز ہی سمجھا اور اِن کو اس کی شکل یاد نہیں رہی تھی۔ اس لیے وہ مجھے وہی لڑکا سمجھ کر دُعائیں دیتی رہیں، جب کہ ارباز تو کب کا اُن کے سو روپے لے کر رفو چکر ہوچکا تھا۔ بہر حال میرا مقصد دکھاوا تو تھا نہیں، میں نے تو محض انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت یہ کام سر انجام دیا تھا۔“

مظہر مجھ سے بولا! ”باجی آپ نے ہی تو ایک دن بتایا تھا کہ صرف اُن کو ہی دینا ثواب کا کام نہیں جو مانگ کر کھاتے ہیں، بلکہ اُن کو دینا بھی ثواب کا کام ہے جو کسی مصیبت میں گرفتار ہوں، خود دار ہوں، مانگ نہ رہے ہوں اور کسی کی مدد کرنے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ اُسے بتایا جائے اور جتایا جائے، بلکہ نیکی کے یہ کام تو انسان اللہ تعالیٰ کے لیے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ بہر حال مجھے گھر پہنچنا تھا۔ میں جلدی سے باہر نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر پہنچا اور رپورٹ اپنی امی کو پکڑائی اور کمرے میں جاکر اگلے دن جو میرا ریاضی کا ٹیسٹ تھا، اُس کی تیاری کرنے لگا۔ چوں کہ اپنے اس ہفتے کا پورا جیب خرچ تو میں خرچ کرچکا تھا، اس لیے اب مجھے صبح اسکول بھی پیدل ہی جانا تھا اور لنچ کے پیسے بھی نہ تھے، مگر میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنے پیسے بلا مقصد نہیں گنوائے۔ اگر ایک دن پیدل چلنا پڑے اور لنچ نہ کروں، تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

مظہر مجھ سے کہہ رہا تھا ”باجی آج صبح جب میں اسکول پہنچا تو نوٹس بورڈ پر لگا ہوا تھا کہ آج کا ٹیسٹ کینسل ہوگیا ہے، کیوں کہ کل شام اُن کی کلاس کا ایک طالب علم جلد بازی میں روڈ کراس کرتے ہوئے ایک ٹریکٹر کے نیچے آکر جاں بحق ہوگیا اور آج اُس کی دعائے مغفرت کے لیے قرآن خوانی رکھی گئی ہے۔ کلاس کے تمام طلباء اور اسٹاف ممبرز سے شرکت کی درخواست ہے۔ نیچے طالب علم کا نام لکھا ہوا تھا اور یہ نام پڑھ کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور کل صبح کا اسپتال والا سارا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ نوٹس کے نیچے بڑے بڑے حروف میں طالب علم کا نام لکھا تھا۔ ارباز علی خان“

یہاں تک یہ واقعہ سُنا کر مظہر ہچکیوں سے رونے لگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور امانت میں خیانت کرنے جیسی لعنت سے دور رکھے۔ ضروری نہیں کہ ہر بُرے عمل کا انجام دنیا ہی میں مل جائے، لیکن اس جیسے چند واقعات دکھا کر خالقِ کائنات نے انسانوں کے لیے درِ عبرت ضرور کھول رکھا ہے۔

☆......☆

بکھرا موتی چن لیا

شازیہ گل

رانگ نمبر کے ذریعے زندگی کا حسین روپ پانے والی ایک زندہ کہانی

آج تک آپ نے دور جدید کی ایجادات کے استعمال کے منفی نتائج کی کہانیاں پڑھی ہوں گی، مگر آج جو کہانی میں سنا رہی ہوں وہ ایک سچی کہانی ہے اور میں شکر گزار ہوں، دور جدید کی ایجاد جسے موبائل کا نام دیا جاتا ہے۔ آپ بھی حیران ہوں گے کہ موبائل کو تو معاشرے میں زہر قاتل سمجھا جا رہا ہے، تو جوانوں کے لیے۔ اسے وہ لوگ بھی بُرا کہتے ہیں جو اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتے۔

ہوا کچھ یوں کہ میں یعنی شازیہ گل آٹھویں کلاس میں تھی۔ میں اس وقت بھی ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی تھی۔ میں نے ایک کہانی پڑھی جس کا عنوان تھا (خاموش صدا) وہ مجھے بہت اچھی لگی اور میرے دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلی، یا خدا کتنا اچھا ہو اگر مجھے بھی کوئی ایسا ہی اَن دیکھا، انجانا انسان ملے اور بنا دیکھے وہ مجھ سے محبت کرنے لگے، شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔

اس دن میں بہت اُداس تھی۔ میرے امی ابو میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ بھائی مجھ سے 10 سال بڑا تھا اور امی کے مرنے کے دو سال بعد بھائی کی شادی ہو گئی تھی۔ بھابی سخت مزاج تھیں، ہر وقت لڑنا جھگڑنا ان کی عادت تھی۔ آج بھی وہ مجھ سے لڑی تھیں۔ میں امی کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ مجھے یاد ہے امی مجھے بہت پیار کرتی تھیں اور ان کے بعد میں اپنے دل کی باتیں صرف اپنی کلاس فیلو نبیلہ کو بتاتی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، اس لیے میرا اور نبیلہ کا رابطہ صرف موبائل پر ہوتا تھا۔ میں نے نبیلہ کو sms کیا، چونکہ میں غصے میں تھی۔ بھابی کی بعض باتوں سے مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں میسج نبیلہ کے نمبر سے ملتے جلتے ایک اور نمبر پر کر دیا تو رات میں مجھے کالز آنی شروع ہو گئیں، تب مجھے اپنی غلطی کا احساس تو ہوا، مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے موبائل سائلنٹ کر دیا کہ کہیں بھابی کو پتا چلا تو اور ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔ پہلے ہی وہ میرے موبائل رکھنے کے خلاف تھیں، مگر بھائی نے میری فرمائش پر مجھے لا دیا تھا۔

وہ 10 جولائی 2007ء کی رات تھی، مسلسل کال آ رہی تھی، مگر میں ریسیو نہیں کر رہی تھی، ڈر رہی تھی کہ نجانے کون ہو، سوچا صبح ساتھ والی باجی کے گھر جا کر خود ہی کال کر کے منع کر دوں گی اور سوری کر کے بات ختم کر دوں گی، کیوں کہ ابھی تو چھٹیاں ہیں، مگر چھٹیوں کے بعد تو میرا موبائل گھر پر ہی ہوگا، کیوں کہ موبائل اسکول لے جانے کی پرمشن نہیں تھی، اس لیے مسئلہ نہ بن

جائے۔ خدا خدا کر کے رات گزری، صبح ہوئی تو میں ساتھ والی باجی کے گھر گئی۔ وہاں جا کر کال ملائی۔ دوسری طرف کال ریسیو ہوئی۔ نیند میں ڈوبی آواز۔

”ہیلو! السلام علیکم۔“

”جی! وعلیکم السلام! جی کس سے بات کرنی ہے؟“ دوسری طرف سے کال اٹھانے والے نے کہا۔



میں نے کہا۔ ”جی دیکھیں سر! مجھے آپ سے ہی بات کرنی ہے۔ سوری دراصل کل مجھ سے غلطی سے آپ کے نمبر پر میسج سینڈ ہو گیا تھا، مگر آپ رات بھر بار بار کال کر کے مجھے پریشان کرتے رہے۔ دوسری طرف سے کہا گیا! ”دیکھیں مس! میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کون ہے جس نے مجھے میسج کیا ہے، بہر حال اب میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ ہاں ایک ریکوسٹ ہے کہ پلیز آپ اب مجھ سے دوستی کر لیں۔“

تو میں نے جواب دیا کہ ”سوری میں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی۔“

تو کہنے لگا۔ ”دوستی نہیں کرتی تو نہ سہی، پلیز آپ مجھ سے انسانیت کے ناتے بات کر لیں۔ ہم ایک دوسرے سے دُکھ سکھ تو شیئر کر سکتے ہیں۔“ نجانے کیوں دل نے کہا کہ اس پر اعتبار کر لو، میں نے اس کی دوستی قبول کر لی۔ اس نے اپنا نام ارشاد بتایا۔ پیار سے سب اسے گل کہتے ہیں۔ گل کے بھی امی ابو فوت ہو چکے تھے، بہنیں شادی شدہ تھیں۔ بھائی بھی اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔ گل نے اپنے دوست کے گھر رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ اس کے دوست سنی کے ماں باپ نے اسے بیٹا بنایا ہوا تھا اور واقعی وہ حقیقی ماں باپ سے بڑھ کر محبت کرتے تھے۔

اس کی زندگی بھی کچھ میری طرح ہی تھی۔ وہ آر کے کام کا بہترین کاریگر تھا۔ گل کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی، جو کسی بھی لڑکی کو اپنے سحر میں گرفتار کر سکتی تھی۔ سو مجھے بھی اس کی آواز نے اپنی طرف کھینچنے پر مجبور کیا۔ ایک دن دوستی ہوئی، دوسرے دن بنا دیکھے اس نے مجھ سے محبت کا اظہار کر دیا اور تیسرے دن کہنے لگا۔ کیا آپ مجھ سے شادی کرو گی۔ میں تو حیران رہ گئی۔ میں نے کہا۔ "گل آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، نہ میں آپ کے بارے میں جانتی ہوں۔ بنا جانے آپ اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔" تو گل کہنے لگا۔

"سچی محبت شکل صورت نہیں دیکھتی، یہ تو روح کی محبت ہوتی ہے، ہاں اگر آپ مجھے دیکھ کر پسند کر کے شادی کرنا چاہتی ہو تو پھر اور بات ہے۔"

میں نے کہا! نہیں میں بھی شکل وصورت کی قائل نہیں، ہاں یہ فکر ہے کہ آپ میرے گھر والوں سے رشتہ کیسے مانگو گے، تو اس نے کہا آپ مجھے اپنا صحیح پتا تو بتاؤ، آپ رہتی کہاں ہو؟۔

جب میں نے اپنے گاؤں کا نام بتایا تو وہ کہنے لگا۔

"ارے واہ وہاں تو میرا ایک دوست بھی رہتا ہے۔" جب اس نے دوست کا بتایا تو میں حیران ہوئی، کیوں کہ جو نام وہ بتا رہا تھا وہ میرے بھائی کا نام تھا۔

میں نے کہا" سیل نمبر بتاؤ۔" تو کہنے لگا۔ تم کیا کرتی ہو۔ میں نے کہا جو نام آپ نے بتایا ہے وہ میرے بھائی کا ہے، پھر جب اس نے سیل نمبر بتایا تو واقعی وہ میرے بھائی کا نمبر تھا۔ میں نے کہا کہ آپ تو میرے ہی بھائی کے دوست ہیں اور شاید اتفاق بھی اسی کو کہتے ہیں۔ یہ سن کر تو وہ بہت خوش ہوا۔

پھر تو روز وہ بھائی سے باتیں کرتا۔ اس نے بھائی کو پشاور آنے کی دعوت دی۔ بھائی نے اسے اپنے گھر آنے کی، پھر عید قریب تھی۔ اس نے آنے کا وعدہ کیا، شاید تقدیر میرا ساتھ دے رہی تھی۔ بھائی کا یہ واحد دوست تھا جسے بھائی اپنے گھر لے کے آئے۔ بھائی نے بھابی کو کہا کہ میرا بہت اچھا دوست بہت دور سے آرہا ہے، اس لیے کچھ اچھے سے تیاری کرنا۔ تقریباً دو ڈھائی بجے کے قریب بھائی اسے لے کر گھر آئے۔ اس سے پہلے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا۔ بھائی نے مجھے آواز دی۔ شازی چائے لے کے آؤ۔ میں نے چائے لا کر رکھی تو اس نے دھیرے سے نظریں اٹھائیں۔ وہ میری سوچ سے بھی کہیں زیادہ پیارا تھا۔ میں بھی اسے بہت اچھی لگی۔ بس ایک دن وہ رکا اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہ چلا گیا۔ دوسری بار اپنے بڑے بھائی اور بھابی کو لے کر آگیا۔ انہوں نے میرے رشتے کی بات کی۔ میرے بھائی نے سوچنے کا ٹائم مانگا اور پھر کچھ ماہ بعد ہماری منگنی ہوگئی۔ اس دوران ہماری روز فون پر بات ہوتی رہی۔ میں نویں کلاس میں پہنچ گئی تھی۔

وہ رات 11 بجے کال کرتا تھا تو بات کرتے کرتے صبح 7 بج جاتے تھے۔ میری پڑھائی ڈسٹرب ہونے لگی تھی۔ میں اسے منع کرتی کہ ایک گھنٹا بات کیا کرو، مگر اس کا دل ہی نہیں بھرتا تھا، بات کرنے سے۔ اسی طرح میں نے میٹرک کر لیا اور میری شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور یوں میں رخصت ہو کر اپنے ساجن کے گھر آگئی۔

میرے سسرال میں سب بہت اچھے ہیں۔ میری نندیں، دیور، دیورانیاں سب لوگ بہت پیار کرنے والے ہیں۔ ساس سسر اور ماں باپ کی کمی تو سنی کے ماں باپ نے پوری کر دی۔ انہیں ہم بھی ماما، پاپا کہتے ہیں۔

میری شادی کا پانچواں سال ہے اور خدا کا شکر ہے ہماری زندگی روز اول کی طرح حسین ہے۔ گل کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ہمارے دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ ذیشان اور حجاب۔ ذیشان چھوٹا ہے اور حجاب 3 سال کی ہونے والی ہے۔ ہمارا گھر ہماری جنت ہے۔ گل نے میرے ہی گاؤں میں میرے لیے گھر بنایا ہے۔

مجھے ایک صحیح سے اتنا پیارا جیون ساتھی مل گیا، مگر یہ اس صبر کا پھل ہے جو میں نے بھائی کے ظلم وستم برداشت کر کے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا۔

گل کا ملنا تو میرا نصیب تھا، مگر میں نے اس کے سوا کبھی کسی رانگ نمبر کو نہیں ریسیو کیا۔ آج میری زندگی مثالی زندگی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ پلیز میرے لیے دعا کریں کہ خدا ہماری زندگی کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

☆......☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں، ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

☐ کلثوم فوزیہ۔ کراچی

☆ بیٹی کلثوم! مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تمہیں تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔

☐ نعمان۔ کراچی

☆ بیٹے نعمان، تم چاہتے ہو کہ تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جائے، لہٰذا صرف جواب دے رہا ہوں۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 3-3 تسبیح پڑھو، ''یا رحمٰن'' مدت ایک ماہ ہے۔

☐ ن م۔ اسلام آباد

○ بابا جی السلام علیکم۔ میری شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ والدین کا دباؤ زیادہ تھا۔ جب سے شادی ہوئی ہے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ گھر میں لڑائی جھگڑا زیادہ رہتا ہے۔ میں بہت پریشان رہتا ہوں۔ اپنی بیوی کو طلاق دے دوں، دوسری شادی کرلوں۔ والد نہیں چاہتے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دوں۔ میرے والد نے میری بیوی کو بہت سمجھایا لیکن وہ کسی کی بات نہیں سنتی۔ اب میں حالات کی وجہ سے بہت اُکتا گیا ہوں۔ کیا میرے حالات کبھی ٹھیک ہوں گے بابا جی! پلیز کچھ ایسا وظیفہ اور تعویذ دیں کہ میری دوسری شادی بھی ہو جائے، میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ کیا میں دوسری شادی کرلوں؟

☆ بیٹے ن م۔ تمہارا برتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ اب تمہاری بیوی ضدی ہوگئی ہے۔ تمہارے ذہن میں یہ بیٹھا ہوا ہے کہ تمہاری شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ فی الحال نبھانے کی کوشش کرو اور نماز پنجگانہ کو معمول بناؤ۔ دوسری شادی کے بارے میں نومبر 2014ء کے بعد سوچنا۔ تم بھی اپنے رویے میں نرمی پیدا کرو۔ ممکن ہے حالات ٹھیک ہو جائیں۔ ہر نماز کے بعد یاحی یاقیوم 300 بار پڑھو۔

☐ زبیدہ شاہنواز۔ گھوٹکی

○ پیارے بابا جی! میرے شوہر پچھلے 7 سالوں سے انگلینڈ میں تھے، اب واپس آگئے ہیں، اب یہاں کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ پلیز استخارہ کرکے بتایئے کہ دوبارہ بیرون ملک جانا بہتر ہے یا نہیں؟

☆ بیٹی زبیدہ! بیرون ملک جا کر کاروبار کرنے کا امکان کم ہے۔ تمہارے شوہر کو یہیں کاروبار کرنا چاہیے۔ گیس یا تیل سے منسلک کاروبار تمہارے شوہر کے لیے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ 2014ء کے آخر میں احتیاط برتو بھروسہ کرنے میں محتاط رہو، مالی طور پر سے نقصان یا دھوکے کے امکانات ہیں، مالی لین دین میں حقائق کا صحیح تجزیہ کرو۔ تمہارے شوہر سمجھ دار اور محنتی ہیں، کاروبار کرنے میں مالی ترقی کی نشان دہی ہے مگر نماز کی پابندی کرو۔ یالطیف یا کریم کا ورد ہر نماز کے بعد بکثرت کرو۔ مزید کامیابی کے لیے آفس سے تعویذ منگوالو۔

☐ محتشم علی۔ ٹنڈو آدم

○ بابا جی! میں کاروبار کر رہا ہوں۔ 4 سال سے نقصان ہو رہا ہے کیا میں اس کاروبار کو جاری رکھوں یا کاروبار کو تبدیل کرلوں۔ میں یہ کاروبار ایک دوست کی شراکت میں کر رہا ہوں۔ نقصان کی وجہ سے ہم دونوں پریشان ہیں۔ ہمارے حالات کب ٹھیک ہوں گے۔ میرے لیے مناسب وظیفہ تجویز کر دیں۔ اس وظیفے کو کب اور کس طرح کرنا چاہیے؟

☆ بیٹا محتشم! تمہارے حالات ظاہراً ٹھیک لگ رہے ہیں۔ کاروبار کے سلسلے میں حقائق کا تجزیہ کرو اور اس کاروبار کو جاری رکھو۔ حالات حاضرہ کے تحت اپنے کاروبار میں جدت پیدا کرو۔ اگلے 6 ماہ اہم ہیں۔ اخراجات کو قابو میں رکھیں۔ دھیرے دھیرے مالی طور سے حالات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ کاروبار کی وسعت کے لیے نماز کی پابندی کرو۔ نماز مغرب کے بعد سورۂ واقعہ کی تلاوت کرکے پانی دم کرو اور کاروبار کی ترقی کے لیے آفس سے تعویذ منگوالو۔

☐ مائرہ۔ حیدرآباد

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم میرے شوہر نے مجھ سے پوچھے بغیر دوسری شادی کرلی۔ 4 سال ہو گئے ہیں مگر میرے اولاد نہیں ہوئی۔ میرے شوہر کا برتاؤ میرے ساتھ صحیح ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے شادی صرف اولاد کی وجہ سے کی ہے۔ مجھ سے یہ شادی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ کوئی وظیفہ، تعویذ بتائیں کہ میں بھی اولاد کی خوشی دیکھ سکوں۔

☆بیٹی مائرہ! میانہ روی سے کام لو، صورتحال بہتر ہو رہی ہے، مثبت پہلو کو مدنظر رکھو اور حالات سے سمجھوتہ کرو۔ نماز پنجگانہ معمول بناؤ حالات ٹھیک ہو سکتے ہیں، خود اعتمادی سے کام لو۔ نماز کی پابندی کرو اور ہر ماہ ایک مخصوص رقم کسی ضرورت مند کو صدقے کی مد میں دیا کرو۔ نماز عصر کے بعد سورۃ الفجر دو بار پڑھنا معمول بناؤ۔ 41 دن تک اور حالات کی بہتری کے لیے آفس سے تعویذ منگوا لو۔

□ احسان الرحمٰن۔ حیدر آباد

○ بابا جی! الیکٹریکل انجینئر ہوں 5 سال میں نے پرائیویٹ ملازمت کی ہے۔ گورنمنٹ کی ملازمت کی ہے۔ گورنمنٹ کی ملازمت کے لیے کوشش کی، اس کے علاوہ 12 جگہ انٹرویوز دیے لیکن گورنمنٹ کی اچھی ملازمت ملنے میں ناکامی ہوئی۔ اب نوکری چھوڑ کر الیکٹرک اسٹور کھول لیا ہے، کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ کچھ ایسا وظیفہ دیں کہ اچھی ملازمت مل جائے۔

☆بیٹے احسان الرحمٰن! اچھی ملازمت کے لیے کوشش جاری رکھو اور اپنے اسٹور کو بھی چلاتے رہو۔ نماز کی پابندی کرو سورۃ واقعہ ہر نماز عشاء کے بعد ایک بار پڑھو۔ بہتر حالات اور اگلے برس تک مالی ترقی کی نشاندہی ہے۔ ترقی کے لیے آفس سے تعویذ منگوا لو۔

□ ارسلان احمد۔ شیخوپورہ

○ بابا جی۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، وہ اسکول ٹیوشن پڑھنے جاتا ہے، اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا، وہ شرارتیں زیادہ کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا دھیان پڑھائی میں زیادہ لگے۔ اس کا نام محمد سمیر احمد ہے۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ نام ٹھیک نہیں ہے، دوسرے میری آمدنی بہت کم ہے۔ میرے حالات کب ٹھیک ہوں گے۔ بچے کا بھی پڑھائی میں دل لگے۔

☆بیٹے ارسلان۔ تمہارے بیٹے کا نام ٹھیک نہیں ہے، اس کا نام تبدیل کر کے "نوید" رکھ دو، یہ بہتر اور مناسب ہے۔ غیر دانستہ طور سے تمہارا برتاؤ بیٹے کے ساتھ ٹھیک نہیں، اس کی ہر بات ماننا ٹھیک نہیں، پڑھائی کے لیے اسے وقت کی پابندی کراؤ۔ ذرا سختی کرو، نام کی تبدیلی سے بھی فرق پڑ سکتا ہے۔ تمہارے کاروبار کے لیے تعویذ لکھ دیا ہے۔ آفس سے منگوا لو۔ آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے، نماز کی پابندی کرو، سب کچھ بہتر ہو جائے گا۔

□ اُم اصغر۔ ساہیوال

○ بابا جی! میرا بھائی 7 سال سے گڈز ٹرانسپورٹ یعنی ٹرک کے ذریعے سامان تجارت مختلف شہروں میں لے جانے کا کام کرتا ہے۔ اکثر مالی پریشانی رہتی ہے، کچھ فائدے کے بعد نقصان ہو جاتا ہے، اکثر مالی پریشانی رہتی ہے۔ وہ اپنا کاروبار تبدیل کر رہے ہیں، استخارہ کر کے بتایئے کہ کون سا کام مفید رہے گا۔ پولٹری فارم، ریسٹورنٹ یا بیرون ملک ملازمت کی کوشش ...... بابا جی اسی ماہ جلدی جواب دیجیے، ابھی تک بھائی کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے، بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے۔ پلیز دعا فرمائیں۔

☆بیٹی ام اصغر! بھائی جو کام کر رہا ہے وہی مناسب ہے۔ گڈز ٹرانسپورٹ کا کام جاری رکھے، اپنے ٹرک کو کسی کو ٹھیکے پر دے دے یا فروخت کر دے، صرف سامان تجارت کی بکنگ کا آفس برقرار رکھے اور کمیشن پر دوسرے ٹرانسپورٹر کے ذریعے سامان تجارت کو بھجوائے، اگر ٹرک فروخت کر دے تو زیادہ بہتر ہے۔ پولٹری فارم یا فوڈ ریسٹورنٹ چلانا تمہارے بھائی کے لیے نقصان دہ ہے۔ تمہارا بھائی دوسروں پر بھروسہ آسانی سے کر لیتا ہے۔ ایک جگہ بیٹھ کر کمیشن کا کام آسانی سے کر سکتا ہے۔ بیرون ملک جانا بھی ٹھیک نہیں ہے، بھائی سست اور لاپروا ظاہر ہو رہا ہے، قیاس آرائی زیادہ کرتا ہے۔ ممکن ہے سامان کی بکنگ کا کام شروع کرنے میں دقت کا سامنا ہو۔ نماز کی پابندی کرے اور صدقہ خیرات کرتا رہے۔ آفس سے تعویذ منگوا لو۔

□ م س۔ چیچہ وطنی

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم 4 سال سے نیٹ کے ذریعے ایک لڑکے سے رابطے میں ہوں۔ ہماری لڑائیاں بھی ہوتی ہیں اور مناتی ہمیشہ میں ہوں کیوں کہ وہ مجھ سے بات نہیں کرتا تو میرا رو رو کر برا حال ہو جاتا ہے اور کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، یہاں تک کہ گھر والے بھی برے لگتے ہیں۔ شدید غصہ آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسئلہ میری فیملی کی طرف سے ہے، ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی نہیں ہوتی۔ بابا جی! وہ مجھ سے جنت میں ملنے کا خواہشمند ہے، پلیز کچھ ایسا وظیفہ بتایئے کہ میرے گھر والے مان جائیں۔

☆بیٹی! تمہاری تحریر سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اصل مسئلہ تمہارے ہی ساتھ ہے۔ لڑکے نے جنت میں ملنے کی خواہش ظاہر کر کے یہ قبول کر لیا کہ اس دنیا میں ملنا ممکن نہیں۔ تم بھی خود کو سنبھالو۔ آنسوؤں پر قابو پاؤ اور یہ مان لو کہ شادی سے پہلے بار بار منانا آسان جبکہ بعد میں ایک بار بھی منانا مشکل ہوتا ہے۔ شدید غصہ، گھر والوں سے بیزاری، غیر معمولی ضد، چڑچڑاپن، کچھ اچھا نہ لگنا خاص طور پر گھر والے، غلط اندازے، یہ سب ظاہر کر رہے ہیں کہ تمہارے ساتھ ذہنی صحت کا مسئلہ ہو رہا ہے۔ ایسے لوگ نہ خود خوش رہتے ہیں نہ دوسروں کو رہنے دیتے ہیں۔ جذباتی عدم توازن یقیناً تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اپنے رویے پر قابو پانے کے لیے حقائق کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ ذہنی سکون کے لیے نماز کو خشوع و خضوع سے پڑھو ہر نماز کے بعد یاسلامُ کی دو دو تسبیح پڑھو۔ تعویذ آفس سے منگوا لو اور اسے اپنے تکیے میں سی لو، خدا رحم کرے گا۔

□ ذوالقرنین۔ چکوال

○ بابا جی! السلام علیکم میرا مسئلہ صرف آپ حل کر سکتے ہیں۔ ہم صرف دو بھائی ہیں۔ محلے میں چچا رہتے ہیں، ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی بہت خوب صورت ہے۔ اس نے خاندان میں اور باہر کتنے ہی لڑکوں سے دوستی کر رکھی ہے، پروا نہیں کرتی، راتوں کو گھر والوں کو چھوڑ کر نکل جاتی ہے، کوئی جاننے والا اس کو تنہا سڑکوں پر گھومتے دیکھ کر گھر لے آتا ہے۔ اب گھر میں تالا ڈال کر رکھتے ہیں تو شور کرتی ہے۔ اس کی عمر 20 سال کے قریب ہوگی، بچوں کی طرح چلا چلا کر رونے لگتی ہے، اس کی حرکتوں کی وجہ سے کوئی اس سے شادی پر تیار نہیں۔ چچا نے میرے والد سے ذکر کیا ہے مگر میں بھی ایسی لڑکی کو نہیں اپنانا چاہتا۔ کبھی اُس پر ترس بھی آتا ہے، ایک مرتبہ تو ہماری چچی نے اُس کے ہاتھ، پیر باندھ دیے اور کمرے میں بند کر دیا پھر بھی اس نے چیخنا چلانا نہیں چھوڑا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اُس پر ظلم ہو رہا ہے۔ میری امی کہتی ہیں شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ پلیز بابا جی! بتایئے میں کیا کروں، کوئی ایسا تعویذ دیں کہ یا تو وہ ٹھیک ہو جائے گا یا یہ رشتہ خود ختم ہو جائے۔

☆بیٹے ذوالقرنین! ایک لڑکی کا بغیر کسی سبب کے راتوں کو باہر نکل جانا اور سڑکوں پر گھومنا، لڑکوں سے بے تکلف ہونا، چیخنا چلانا وہ بھی بچوں کی طرح......! یہ سب ظاہر کرتا ہے کہ اُس کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ ایک طرف تم نے لڑکوں سے دوستی کرنے کا ذکر کیا تو دوسری طرف وہ تنہا سڑکوں پر گھومتی ہوئی ملی، اس بات سے بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کو اپنے عمل پر کنٹرول نہیں ہے اور چیخنے چلانے کا بھی شعور نہیں کیوں کہ جب دماغ ہی ٹھیک طرح کام نہ کر رہا ہو تو ایسی لڑکی پر ظلم و تشدد کر کے اپنی مرضی نہیں کروائی جا سکتی۔ ذہنی مریضوں میں لڑکیاں ہوں یا لڑکے، شادی ان کا علاج نہیں ہوتی کیوں کہ یہ لوگ پہلے ہی بے شمار مسائل کا شکار ہوتے ہیں، شادی کے بعد اور زیادہ مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اسے فی الحال اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ والدین اور بہن بھائی خیال رکھیں۔ آفس سے تعویذ منگوا لو اور اسے تکیے میں سی دو۔ اس بچی کی والدہ ہر نماز مغرب کے بعد ایک بار سورۃ الفجر کی تلاوت کر کے دم والا پانی اسے پلائیں یہ عمل 41 دن کرنا ہے۔

□ رخشندہ۔ لاہور

○ پیارے بابا جی! میں نے حال ہی میں ایک نجی اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہے۔ 15 دن کی ٹریننگ کی۔ اس میں مجھے کئی لوگوں سے شکایات ہوئیں۔ میں نے ذکر کیا تو لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے جبکہ پرنسپل نے میری حمایت کی۔ اب کئی لڑکیاں مل کر آپس میں باتیں کرتی ہیں اور میرے آنے پر خاموش ہو جاتی ہیں، نہ میرے ساتھ بیٹھتی ہیں نہ مجھ سے بات کرتی

ہیں۔ اتنا عجیب لگتا ہے کہ یہ اسکول چھوڑ دوں۔ کہیں اور جا کر دیکھوں شاید وہاں اچھے لوگ ملیں۔ بابا جی پلیز مجھے ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں ان میں سب باتوں کا سامنا کرسکوں۔

☆بیٹی رخشندہ! تم کہیں بھی چلی جاؤ، دوسروں کے تعاون کے بغیر تربیت حاصل کرنی بے حد مشکل ہوگی۔ کہیں پر بھی تمام لوگ پسند کے مطابق نہیں ہوتے۔ لہٰذا شکوہ شکایت نظر انداز کرکے سیکھنے اور کام کرنے کے مواقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ جلد ہی تم یہ بات سمجھ جاؤ گی کہ دوسروں کی شکایات کرکے محض وقت ضائع کرنا ہے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ نمازِ عصر کے بعد یا فتاح کی تین بار تسبیح پڑھ لو، اللہ کرم کرے گا۔

□ عینی شرف۔ حیدرآباد

○ پیارے بابا جی! میں ایک ایسے مسئلے پر آپ سے مدد چاہتی ہوں، جو میں صرف آپ ہی کے آگے بیان کرسکتی ہوں، میں ایک ایسے لڑکے کے بارے میں بات کررہی ہوں جس نے میری خاطر زہر کھالیا تھا۔ اس دوا کی شیشی پر صاف صاف لکھا تھا کہ یہ زہر ہے یعنی وہ میرے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔ میں اس کی محبت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اعلیٰ تعلیم ہونے کے باوجود اپنے والد سے کہہ دیا کہ اگر میں شادی کروں گی تو اسی سے ورنہ نہیں کروں گی۔ والدہ بھی میری ضد کے سامنے خاموش ہوگئیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ منگنی کے فوراً بعد اس لڑکے نے مجھ سے بدتمیزی کی۔ میں نے منگنی ختم کرنے کی بات کی تو وہ مجھے قتل کی دھمکی دینے لگا حالاں کہ میرا منگنی توڑنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اب میرا حال اس قدر خراب ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ بات ختم کرنا چاہتی ہوں اور آئندہ اس لڑکے کی شکل سے بھی خوف محسوس ہوگا، ملنے کے تصور پر گھبراہٹ ہوتی ہے۔ بتایئے میں کیسے اس مصیبت سے چھٹکارا پاؤں؟

☆بیٹی عینی! حقیقت یہ ہے کہ لڑکے نے تمہاری خاطر زہریلی دوا نہیں کھائی بلکہ اس کو ایسا کرنا ہی تھا کیوں کہ اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں، یہی وجہ ہے کہ اب بدتمیزی کررہا ہے۔ قتل کی دھمکی معمولی نہیں، وہ اپنی بات منوا کر بھی رویے پر قابو نہ پاسکا اس لیے ایسے لڑکے سے رشتہ جوڑنا اپنی زندگی خراب کرنا ہے۔ موجودہ خوف اور گھبراہٹ عارضی ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنا تمہارے اختیار میں بھی ہے۔ تم پابندی سے نماز ادا کرو اور یا شکور کی دو تسبیحات ہر نماز مغرب کے بعد 21 دن تک پڑھو۔ اللہ کریم کرے گا۔

□ فاخرہ۔ کراچی

○ السلام علیکم بابا جی! میں پہلی دفعہ آپ کو خط لکھ رہی ہوں اور یقین ہے کہ آپ اس کا جواب ضرور دیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری بہن جس کا نام شاکرہ ہے، وہ کچھ عجیب و غریب حرکتیں کرتی ہے۔ اس کے دونوں علاج کروائے بلکہ ڈاکٹری علاج تو ابھی بھی چل رہا ہے۔ روحانی بھی ہوا تھا مگر اس پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ اکثر رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور دیوار پر زور زور سے لاتیں اور گھونسے مارتی ہے اور بہت غلیظ قسم کی گالیاں دیتی ہے۔ ہر وقت ہر کسی سے اسے بدبو آتی محسوس ہوتی ہے۔ دن میں بھی یہی صورت حال رہتی ہے۔ میری والدہ اس کی وجہ سے بہت ٹینشن میں رہتی ہیں۔ پلیز، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر بتادیں کہ اس کو کیا پرابلم ہے؟ یہ بیماری 7,8 سال سے ہے۔ پلیز، علاج بتادیں۔ بابا جی! ہم آپ کے مشکور رہیں گے۔

☆بیٹی فاخرہ! اللہ تمہاری بہن کو مکمل شفاء عطا فرمائے۔ والدہ سے کہو، بعد نماز فجر اور عشا 11-11 بار سورۃ الناس پڑھیں اور پانی پر دم کرکے بیٹی کو پلادیں۔ بہن سے کہو وہ خود بھی بکثرت سورۃ الناس پڑھا کرے۔ یہ عمل ایک ماہ کرو پھر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ گلزار بی بی۔ لالہ موسیٰ

○ بابا جی! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ میں اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف سے بہت پریشان ہوں، اس کو ضد ہے کہ وہ پاکستان میں کچھ نہیں کرے گا بلکہ باہر جا کر نوکری کرے گا۔ کئی دفعہ لندن اور امریکا کے لیے اپلائی کیا مگر کچھ نہ ہوا۔ بہت پیسے بھی برباد ہوئے۔ اب منہ لٹکائے بیٹھا ہے کہ سعودی عرب جاؤں گا۔ بابا جی! کہیں بھیجنا کیا آسان ہے؟ پھر سعودی عرب میں تو نوکریاں بھی نہیں ملتیں، وہاں کا تو قانون ہی بہت سخت ہے۔ آپ کوئی ایسا عمل بتائیں جس کی برکت سے اُسے عقل آجائے اور وہ ہمیں پریشان کرنا چھوڑ دے۔ اُس کے رویے کی وجہ سے گھر کا ماحول بہت خراب رہتا ہے۔ والد تو اُس کی شکل ہی نہیں دیکھنا چاہتے۔ میرے لیے یہ بڑی مشکل صورتِ حال ہے۔ وظیفہ میں کروں گی۔ اگر تعویذ دینا چاہیں تو وہ بھی منگوالوں گی۔

☆بیٹی گلزار! مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ ہے مگر بیٹی...... اس معاملے کو سمجھ داری سے حل کرو۔ بے شک بیٹے کا رویہ غلط ہے مگر ہے تو وہ بچہ ہی، اس کو محبت اور نرمی سے سمجھاؤ۔ والد صاحب سے بھی کہو اس طرح اولاد کو نہیں چھوڑا جاتا۔ بہت بڑی نعمت ہے اللہ کی اور امانت بھی ہے پھر ماں باپ کا فرض ہے، ہر لمحے اولاد کی تربیت کرنا۔ اس کا بے جا ضد کرنا ہی ثابت کرتا ہے کہ وہ بے عقل ہے پھر تم لوگوں نے بھی کسی حد تک اس کا ساتھ دیا لہٰذا اب اس کو سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا۔ بیٹے کا سب سے اچھا دوست اس کا باپ ہوتا ہے لہٰذا وہی اس کو نرمی اور محبت سے سمجھائے۔ تم حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔ وظیفے کی مدت ایک ماہ دس دن ہے۔ تم ہر نماز کے بعد 99،99 بار پڑھو۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ

اول و آخر درود شریف 9،9 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ زرینہ۔ کھاریاں

☆زرینہ بیٹی! اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھنے والے ہی ہمیشہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ تم بھی اس ذات باصفات پر پختہ یقین رکھو گی تو ہمیشہ کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ نماز پنجگانہ کی پابندی کرو۔ ہر نماز کے بعد کثرت سے استغفار پڑھا کرو۔ وہ قادر مطلق تمہاری ہر جائز مراد ضرور پوری فرمائے گا۔ دل کی تمام گہرائیوں اور خلوص کے ساتھ اس کی بارگاہ میں دعا کرو۔ وہ باری تعالیٰ اپنا کرم فرمائے گا۔ ایک آزمودہ وظیفہ تمہارے لیے تجویز کررہا ہوں۔ یہ وظیفہ 14 دفعہ بعد نماز عشاء 11 دن تک پڑھو۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝

یہ وظیفہ چاند کی ابتدائی تاریخوں میں شروع کرنا اور وظیفے کے اختتام پر اس مہربان مالک کے حضور انتہائی خشوع و خضوع سے اپنی حاجت بیان کرنا۔ رب رؤف و رحیم تمہاری جائز مراد پوری فرمائے گا۔

□ صغریٰ۔ پاکپتن

☆صغریٰ بیٹی! سب کچھ اس ذات باری کی مرضی سے ہوتا ہے۔ ہم عاجز و گناہ گار بندے اس کی مصلحت سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں ہمیشہ بہتر ہی کرتا ہے۔ اگر ہم سب کچھ اسی پاک بے نیاز ذات پر چھوڑ دیں تو بہت سی فکروں اور پریشانیوں سے محفوظ ہوجائیں۔ ایک بات اچھی طرح سمجھ لو کہ قرآن مجید ہمارے لیے راہ ہدایت اور ضابطہ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہماری رہنمائی کے لیے بھیجا ہے، ہمیں بھی علم کے اس خزانے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اسی میں ہماری بقا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم پنج وقتہ نماز کی پابند ہو اور قرآن مجید کی تلاوت بھی بلاناغہ کرتی ہو۔ باری تعالیٰ تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ میں تمہارے لیے انتہائی آسان اور آزمودہ وظیفہ تحریر کررہا ہوں۔ بعد نماز عشاء مندرجہ ذیل آیات کو 113 مرتبہ پڑھو اور اس غفور الرحیم سے انتہائی خلوص نیت اور مکمل یقین کے ساتھ دعا مانگو۔ ان شاء اللہ تمہاری دلی مراد پوری ہوگی۔

يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ بِنَصْرِ اللَّهِ يَنصُرُ مَن يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝

□ ثریا شاہ۔ ٹھٹھہ

○ بابا جی! میں ہمیشہ اپنے ہر مسئلے کا حل آپ سے پوچھتی ہوں اور اللہ کا بڑا احسان ہے، ہمیشہ کامیاب بھی رہی۔ دو سال قبل آپ سے اپنی شادی کے لیے وظیفہ لیا تھا، آج اپنے سسرال میں بہت خوش ہوں۔ سب لوگ بہت پیار کرتے ہیں۔ شوہر بھی بہت اچھے ہیں، وہ لندن میں ہوتے ہیں۔ بابا جی! کچھ عرصے میں، میں بھی انہی

کے پاس چلی جاؤں گی، مگر چاہتی ہوں جانے سے قبل آپ سے اولاد اور خوشگوار، کامیاب زندگی کے تعویذ لیتی جاؤں۔ بابا! میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ وہاں جا کر بھی آپ سے رابطے میں رہوں۔ جوابی لفافہ ساتھ ہے، وہاں سے رابطے کا طریقہ کار و دیگر تفصیلات لکھ دیں گے۔ مجھے ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆بیٹی ثریا! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تم مجھ سے رابطہ رکھ سکتی ہو۔ تعویذ میں تیار کردوں گا، مگر کچھ تفصیل درکار ہے، لہٰذا براہ راست خط لکھ دیا ہے۔ اللہ حامی وناصر ہو۔

□ نور زمان۔ کوئٹہ

o بابا جی! میں آپ کا کالم ایک عرصے سے پڑھ رہا ہوں مگر خط پہلی دفعہ لکھا ہے۔ امید ہے کہ ضرور جواب دیں گے۔ بابا جی! میں ایک پڑھا لکھا انسان ہوں، شریف گھرانے سے تعلق ہے۔ والد نے ساری عمر محنت سے کمائی کی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ والدہ، دو بہنیں اور ایک چھوٹا معذور بھائی میری ذمے داری ہے۔ میں بہت محنت کے باوجود اس حد تک نہیں کما پاتا جس کی مجھے اور میرے گھر والوں کو ضرورت ہے۔ والدہ اور بہنیں بھی کچھ نہیں کہتیں، مگر میں خود سمجھتا ہوں، اس لیے چاہتا ہوں کہ کسی طرح باہر نکل جاؤں۔ آپ مجھے وظیفہ دیجیے تا کہ میری خواہش پوری ہوسکے۔

☆بیٹے نور! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ یقیناً پیسا بہت اہم ہے، مگر سب کچھ نہیں۔ انسان کو انسان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم باہر چلے جاؤ گے تو تمہارے گھر والوں کو کون سنبھالے گا؟ والدہ ہیں، بہنیں ہیں، معذور بھائی ہے۔ بیٹے! آج کل کے دور میں لوگ صحت مند لوگوں کی ذمے داری نہیں لیتے پھر بھائی معذور ہے۔ سوچو، تمہارے گھر کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔ مایوس مت ہو۔ اللہ تمہیں اپنے ملک ہی میں وافر رزق عطا کرے گا۔ مانگو تو سہی۔ نماز فجر یا نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن ترجمے کے ساتھ پڑھو اور دعا کرو، مدت ایک ماہ ہے۔

□ شہناز۔ جہلم

o تمہاری خواہش پر مسئلہ شائع نہیں کیا جارہا۔

☆بیٹی شہناز! تمہارا طویل اور تفصیلی خط پڑھا۔ بیٹی! تمہیں اس سے قبل بھی وظیفہ دیا گیا تھا جسے تم نے درست طریقے سے نہیں کیا۔ کوئی بھی وظیفہ پڑھنے کے لیے اولین شرط ہے۔ نماز پنجگانہ کی پابندی! اگر اول وقت میں نمازوں کی ادائیگی کرو تو افضل ہے۔ کوشش کرو کہ کوئی نماز کسی بھی حال میں قضا نہ ہونے پائے۔ خدانخواستہ انتہائی مجبوری کی حالت میں قضا ہو بھی جائے تو قضا ضرور پڑھ لیا کرو۔ دوسری شرط ہے تمام فضولیات اور مکروہات سے پرہیز، یعنی جھوٹ، غیبت، فحش گوئی، موسیقی، فلم بینی وغیرہ سے مکمل پرہیز۔ تیسری شرط ہے خلوص نیت، یعنی اس مہربان مالک سے جو دعا بھی کرو، کامل اور پختہ یقین کے ساتھ کرو اور اس مالک کل کی ذات سے امید رکھو کہ وہ تمہاری دعا ضرور قبول کرے گا۔ ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرو۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ''یاحیّ یاقیوم'' کا ورد کیا کرو۔ تمہارے لیے انتہائی آزمودہ اور موثر عمل تجویز کررہا ہوں۔ درج بالا شرائط پوری کرنے کے بعد ہر روز بعد نماز فجر 100 مرتبہ ''سورۂ اخلاص'' کا ورد کرو۔ ورد کے بعد اس مالک حقیقی کی بارگاہ میں گڑگڑا کر انتہائی خشوع وخضوع سے اپنی حالت بیان کرو۔ اس عمل کی مدت 11 روز ہے۔ خلوص نیت شرط ہے۔ اللہ رب العزت اپنے کسی بندے کو مایوس نہیں کرتا۔ ایک مہینے بعد مجھے صورت حال سے آگاہ کرنا۔

□ علیزے۔ پشاور

o بابا جان! میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کا سمجھانے کا انداز بالکل گھر کے بڑوں جیسا ہے۔ ہم سب گھر والے آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ بابا جان! میں انٹر میں پڑھتی ہوں۔ چھ مہینے پہلے تک میرا رنگ بہت صاف تھا، چہرے پر کوئی دانہ بھی نہیں تھا مگر اب میرا رنگ بھی روز بہ روز کم ہوتا جارہا ہے اور چہرہ بھی دانوں سے بھر گیا ہے۔ میں نے آپ کی دوائی کے بارے میں پڑھا ہے۔ پلیز مجھے منگوانے کا طریقہ بتادیں اور کیا کھانے پینے میں بھی کچھ احتیاط کرنی ہوگی؟ میں آپ کے جواب کا شدت سے انتظار کروں گی۔

☆بیٹی علیزے! دوا میں تیار کردوں گا، اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے براہ راست خط لکھو، خط میں اپنی

عمر اور وزن ضرور تحریر کرنا۔ جو بھی احتیاط کرنی ہوگی، وہ میں دوا کے ساتھ ہی ارسال کروں گا۔

□ روبی ہاشم خان۔ ہزارہ

o بابا جی! میں نے اس سے پہلے بھی آپ کو کئی خط لکھے مگر جواب نہیں ملے۔ شاید خط آپ تک پہنچتے ہی نہیں۔ میں بہت اذیت سے گزر رہی ہوں۔ میری شادی گھر والوں اور میرے شوہر کی مرضی سے ہوئی۔ شادی کے کچھ دن تو سکون سے گزرے مگر پھر لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے۔ بابا جی! پہلے تو میں بھی جواب دیتی تھی مگر اب نہیں دیتی، میرے شوہر حد سے زیادہ گندی زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ میرے کردار پر بھی کیچڑ اچھالتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں اور مارنے سے بھی باز نہیں آتے، بالکل عورتوں کی طرح طعنے دیتے ہیں، جو چیز میں سوچ بھی نہیں رہی ہوتی، اس کا الزام لگا دیتے ہیں۔ بابا جی! میرا ایک بیٹا ہے، اس کی وجہ سے بھی مجھے بہت تنگ کرتے ہیں کہ میں بچے کا خیال نہیں رکھتی، حالاں کہ بابا جی! انہیں خود بچے کی ضروریات کا ہوش نہیں رہتا۔ مجھے بار بار کہنا پڑتا ہے کہ دودھ چاہیے یا کپڑے بنادیں۔ اس پر بھی منہ بناتے ہیں۔ بابا جی! آپ کو یہ سب لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میرے لیے اب ایسی زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ آخر میری بھی کوئی عزت ہے، عورت ہونا یا بیوی ہونا باعث ذلت تو نہیں؟ آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟

☆بیٹی روبی! تمہارا مسئلہ آج کل ہر دوسرے گھر کا ہے۔ مردوں کی زبان بہت خراب ہوگئی ہے۔ اصل میں باہر کی ناکامیوں کا بدلہ وہ اس طرح لیتے ہیں۔ عورتیں تو گھر میں ہوتی ہیں، انہیں باہر کے حالات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جس آدمی سے جیسا سلوک روا رکھتے ہیں، وہی وہ اپنے گھر کے ساتھ رکھتا ہے، لہٰذا سمجھ جاؤ کہ جس کو باہر عزت نہیں ملتی، وہ گھر میں بے ہودہ رویہ رکھتا ہے۔ جس شخص کی لوگ عزت کرتے ہیں، وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی عزت دیتا ہے۔ یہ سادہ سا اصول ہے۔ تم وہی چیز سامنے والے کو لوٹاؤ گی جو تمہارے پاس ہوگی، لہٰذا بیٹی! تم مستقل مزاجی اور صبر سے اس مشکل کا سامنا کرو۔ ہر شخص اپنا نہیں ہوتا اور ضروری نہیں کہ بروں سے تعلق توڑ لیا جائے۔ انہیں سدھارنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ تم زبان درازی مت کیا کرو چاہے بات کتنی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ چپ ہو جایا کرو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۂ یٰسین پڑھو اور دعا کرو۔ بیٹی! مجھے یقین ہے کہ اللہ تمہارے شوہر کو ضرور عقل دے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ راشدہ۔ ملتان

o بابا جی! میں بہت ہمت کرکے آپ کو اپنا مسئلہ بتارہی ہوں۔ آپ یقین کیجیے، میں نے یہ بات آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ میں اپنے چچازاد بھائی کو بہت پسند کرتی ہوں اور وہ بھی مجھے بہت پسند کرتا ہے۔ ہمارے گھر والے اس رشتے پر راضی نہ تھے، لہٰذا ہم دونوں نے بہت مجبوری میں انتہائی قدم اٹھایا اور کراچی جا کر کورٹ میرج کرلی۔ وہ کراچی ہی میں جاب کرتا ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بہن کے گھر کراچی گئی تھی۔ بابا جی! میں جانتی ہوں کہ آپ کو یہ بات پسند نہیں آئے گی مگر میں مانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ شادی کے بعد میں واپس آگئی۔ ہم انتظار کررہے تھے کہ حالات ٹھیک ہوں تو گھر والوں کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ بابا جی! اب حالات یکدم تبدیل ہوگئے۔ میں امید سے ہوں، وہ ڈاکٹر کے پاس جانے سے منع کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ قتل ہے، مگر بابا جی! آج نہیں تو کل گھر والوں کو پتا چل جائے گا پھر کیا ہوگا؟ میرے بھائی مجھے قتل کردیں گے۔ خدا کے لیے مجھے بچالیں۔ یہ آپ کا ہم تینوں پر احسان ہوگا۔

☆بیٹی راشدہ! تم پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی ہو پھر ایسی حرکت کیوں کی؟ گھر والوں کو دھوکا دیا، اپنے آپ کو مشکل میں ڈالا اور اب قتل جیسا گناہ کرنے جارہی ہو؟ کتنی غلطیاں کرو گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ حالات بہت نازک ہیں، مگر ایک حل ہے بیٹی! مزید غلطیاں کرنے کے بجائے اب سچائی اپنی والدہ کو بتادو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حالات سنبھال لیں گی۔ تمہیں ضرور برا بھلا کہیں گی، وہ ان کا حق ہے۔ کام بھی تم نے انتہائی جاہلانہ کیا ہے مگر بہرحال ماں ہیں۔ تمہاری اور خاندان کی عزت بچالیں گی۔ جس قدر جلدی ممکن ہو، مجھ سے تعویذ منگوالو اور پھر والدہ سے بات کرلو۔ بکثرت توبہ استغفار پڑھا کرو۔ مجھے جلدی جلدی حالات سے آگاہ کرو۔

□ روشنی حنیف۔ خانیوال

○ بابا جی! میں مالی طور پر بہت پریشان ہوں۔ شوہر حد سے زیادہ غیر ذمے دار ہیں۔ ایک دن کام پر جاتے ہیں، باقی چھ دن گھر میں پڑے سوتے رہتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ مار پیٹ، گالم گلوچ۔ اس وجہ سے بچے بھی خراب ہو رہے ہیں۔ بابا جی! میں کیا کروں؟ بچوں کی خاطر گزارا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ بچوں کی ہی خاطر شوہر کو چھوڑنا چاہتی ہوں تاکہ اکیلے رہ کر ان کی تربیت تو کر سکوں۔ پیٹ تو ابھی بھی خالی ہی رہتا ہے۔ بعد میں بھی رہے گا، مگر یہ اطمینان تو ہوگا کہ ہر وقت کوئی گندی گندی گالیاں تو نہیں دے رہا۔ میں خود ان پڑھ ہوں، کسی سے آپ کو خط لکھوا رہی ہوں۔ مجھے رسالے میں ضرور جواب دیں۔

☆ بیٹی روشنی! جن حالات سے تم گزر رہی ہو، یہ حالات بہت عام ہوتے جا رہے ہیں۔ یقیناً ہر برائی کی اصل وجہ دین سے دوری ہے۔ بہرحال بیٹی! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد بازی مت کرو۔ بچوں کو محبت سے سمجھاؤ۔ بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں، جیسا بھی ہے، ان کا باپ ہے، ان پر اس کی عزت فرض ہے۔ اگر انہیں آج یہ سکھاؤ گی کہ باپ غلط ہے اور اس کو چھوڑ دینا ہی ٹھیک ہے تو کل وہ تمہاری کسی بات پر اختلاف کر کے تمہیں بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ لہٰذا غلط بات مت سکھاؤ۔ مشکل حالات میں اللہ سے مدد مانگو، وہ سب کی سنتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ الْمُسْتَجَابَةِ
الْمُسْتَجَابِ لَهَا دَعْوَةِ الْحَقِّ وَكَلِمَةِ التَّقْوٰى
اَحْيِنَا عَلَيْهَا وَاَمِتْنَا عَلَيْهَا وَابْعَثْنَا عَلَيْهَا
وَاجْعَلْنَا مِنْ خِيَارِ اَهْلِهَا اَحْيَاءً وَّاَمْوَاتًا

مندرجہ بالا آیت ہر نماز کے بعد 33 بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ شمع۔ واہ کینٹ

○ بابا جی! میں آپ کے توسط سے اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ اللہ انہیں دنیا کی تمام نعمتیں عطا فرمائے اور آخرت میں بھی بلند درجہ دے۔ جس کڑے وقت میں عزت اور بھرم کے ساتھ میری مدد کی، میں اور میرے بچے ہمیشہ ان کے مقروض رہیں گے۔ آپ ہمارے سروں پر سلامت رہیں۔ آپ کی موجودگی میں بھی کچھ لوگ براہ راست مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں سے معذرت کرتی ہوں۔ غریب ضرور ہوں مگر عزت دار ہوں۔ بابا جی! اب مجھے یقین ہو گیا کہ میری ماں سچ کہتی تھیں کہ اللہ کی دنیا میں اچھے لوگ باقی ہیں۔ اللہ آپ کو بہت سکھ دے اور ان کو بھی جن کی وجہ سے میرے بچوں کے آنسو پونچھ گئے۔

☆ بیٹی شمع! بس اللہ پر بھروسا کرو۔ بے شک دنیا میں ابھی اچھے لوگ ہیں جو صلے کی پروا نہیں کرتے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ انسان کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ صلہ تو اللہ ہی دیتا ہے۔ ایسے لوگ یقیناً نیک کے نیک بندے ہیں اور جنت میں گھر بناتے ہیں۔

□ روحانہ نواب۔ سیلسی

○ محترم جناب بابا جی! السلام علیکم۔ اللہ آپ کو صحت، تن درستی دے۔ (آمین) میں ایک اہم مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ محترم! میرا ایک ہی بھائی ہے جو پانچ سال سے شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی نے پہلے دن سے ہی میرے والدین کو کچھ نہیں سمجھا۔ بھائی، والدین کا بہت فرماں بردار ہے۔ ان کا بہت خیال رکھتا ہے، لیکن اس کی بیوی زیادہ وقت میرے والدین کے ساتھ معمولی باتوں پر لڑتی رہتی ہے۔ وہ لڑائی دیکھتا بھی ہے لیکن بیوی کو کچھ نہیں کہتا، نہ ہی اسے منع کرتا ہے۔ اور اس کی طرف داری بھی کرتا ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میری والدہ صاحبہ کو ایسا کچھ پڑھنے کو دیں کہ بھائی کی بیوی لڑائی کرنا چھوڑ دے اور ان کی عزت کرے اور بھائی، والدین کا فرماں بردار ہی رہے اور بیوی کی بے جا حمایت نہ کرے۔ آپ یہ بھی بتائیں کہ اس نے بھائی پر کچھ عمل وغیرہ تو نہیں کروایا ہے؟ کیوں کہ وہ ہر وقت بڑبڑاتی رہتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرا خط ضرور شامل کریں گے اور اس کا جواب جلد دیں گے۔ میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ والدہ کا، بھائی کا اور بھابی کا نام لکھ رہی ہوں۔

☆ بیٹی روحانہ! اللہ تمہارے گھر سب اطمینان و سکون رکھے۔ تمہاری بھاوج کوئی عمل نہیں کر رہی ہے۔ یہ ہر گھر کی اپنی تربیت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ بڑوں کی عزت کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔ تم یہی سوچ لو، جس عورت کو اس کے گھر سے اچھی تربیت نہیں ملی، تمہارا بھائی اس کو کیسے درست کر دے گا؟ بہرحال درگزر کرو معاملات کو، اگر بھائی سے محبت ہے۔ اس کی صحت و سلامت کے لیے دعا کرو۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھو۔

[illegible]

اول و آخر درود شریف پھر دعا کرو۔ معاملات میں بالکل خاموش رکھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ محمد خان۔ دادو

○ بابا سائیں! السلام علیکم! گزشتہ سال آپ نے مجھے جو وظیفہ بتایا تھا، اسے پڑھنے سے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت اور تندرستی برقرار رکھے اور آپ کو طویل عمر عطا فرمائے۔ (آمین) تاکہ آپ اسی طرح خلق خدا کی خدمت کرتے رہیں۔ بابا سائیں! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ بس تا عمر آپ کو دعائیں دیتا رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں سے اب مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔

☆ بیٹے محمد خان! میرا شکریہ ادا کر کے مجھے گناہ گار مت کرو۔ میں تو اس رحمٰن و رحیم کا عاجز و گناہ گار بندہ ہوں۔ اس رحمٰن و رحیم کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے تمہارا مسئلہ حل کیا۔ نماز کی طرف سے غافل مت ہو جانا۔ زیادہ افضل تو یہ ہے کہ تمام نمازیں باجماعت ادا کیا کرو۔ اپنی نیک کمائی سے ہر ماہ حسب توفیق و استطاعت خیرات کر دیا کرو اور کوشش کرو کہ تمہاری ذات سے ہمیشہ دوسروں کو فائدہ ہی پہنچے۔ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہارا مسئلہ حل کیا ہے، تم بھی اس کے بندوں کے کام آؤ۔ اپنے اردگرد نظر ڈالو، تمہیں ایسے لوگ مل جائیں گے جو اپنی سفید پوشی کے بھرم میں کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے۔ میرے پاس بھی ایسے بہت سے مستحقین آتے ہیں۔ میں حتی المقدور ان کی مدد بھی کرتا رہتا ہوں کیوں کہ اللہ کی راہ میں خیرات کرنے سے رزق میں بے پناہ برکت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆......☆

سخن آباد

غزل

تیری زلفوں کا خم بنا لایا
دل کو مشقِ ستم بنا لایا
دیکھ کے صورتِ برہم تیری
اپنی آنکھوں کو نم بنا لایا
لوگ رکھتے ہیں سر کو قدموں میں
میں تو سر کو قدم بنا لایا
حسرتِ دید لیے آنکھوں میں
تیرے آنسو قسم بنا لایا
دل کی باتیں نہ جو سمجھ سکے
میں بھی ایسا صنم بنا لایا
تو نے مارے تھے پیار سے پتھر
میں تو دل کا زخم بنا لایا
میں بھی تبریزی اس کی چاہت کو
اپنی ہستی کا غم بنا لایا

شاعر: ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی، کراچی

انتظار کے پل

انتظار کے وہ پل
جو میں
تیرے انتظار میں گزارتا ہوں
سچ پوچھو تو
زندگی کا حاصل لگتے ہیں
کیوں کہ!
تیرا انتظار
میری زندگی کا حاصل ہے

شاعر: نعمان خان نیازی۔ میانوالی

غزل

ہم کو احباب ہمارے نہیں جینے دیں گے
قربتوں کے یہ سہارے نہیں جینے دیں گے
ایسا لگتا ہے کہ ہنستے ہیں مرے حال پہ سب
یہ چمکتے ہوئے تارے نہیں جینے دیں گے
راکھ ہوجائے گا دل ختم نہ ہوگی وحشت
جلتے بجھتے یہ شرارے نہیں جینے دیں گے
رفتہ، رفتہ سبھی ہوجائیں گے احباب جدا
لوگ اس خوف کے مارے نہیں جینے دیں گے
دفن کرکے ہی انہیں چین ملے گا نیر
لوگ تو گور کنارے نہیں جینے دیں گے

شاعر: نیر رضوی۔ کراچی

غزل

محبت کے زخموں کو تازہ کرو گے
اگر واپسی کا ارادہ کرو گے
سکوں نہ ملے گا یقیں ہے تمہیں بھی
مجھے رات دن بس پکارا کرو گے
چلو جون تم کاٹ لو گے اکیلے
دسمبر میں کیسے گزارا کرو گے
الجھنے لگو گے مجھے یاد کرکے
جو زلفوں کو اپنی سنوارا کرو گے
مری یاد میں پھر چبھن دل میں ہوگی
جو تم چوڑیوں کو اتارا کروگے
تو پھر معاف تم کو کرے گا نہ عادل
اگر تم لڑائی دوبارہ کرو گے

شاعر: عادل حسین، کراچی

زندگی کا حاصل

دن تو کسی طور گزر جاتا ہے جاناں!!
مگر رات کی خامشی
تیری یادوں کا شور لیے
ہمارے دل ودماغ میں
محفل سجائے رکھتی ہے
اور ہم!!
یادوں کے دریچوں پر سفر کرتے ہوئے
دور...... بہت دور نکل جاتے ہیں
مگر جب پلٹ کر دیکھتے ہیں تو!
آنکھیں اشک بار اور......
وجود کرچی کرچی ہوکر بکھرنے لگتا ہے
کیا یہی زندگی کا حاصل ہے؟

شاعرہ: ثمینہ ناز، اورنگی۔ کراچی

غزل

جو دل سے ہمیں بھلا دیتے ہیں
پیار میں خوب ہمیں سزا دیتے ہیں
پی کے زہر تنہائیوں کا ہم لوگ
تجھے اپنا دکھ پھر سنادیتے ہیں
سلگتے خواب تھے اندھیری تھی رات
کچھ لوگ اپنی پہچان کرادیتے ہیں
آس کا کوئی پھول کھلا نہ گلشن میں
لوگ گزری ہوئی باتوں کو ہوا دیتے ہیں
گرگئے ہیں خود اپنی نظروں میں جاوید
لوگ مفلس جان کے دعا دیتے ہیں

شاعر: اسلم جاوید۔ فیصل آباد

بہت تکلیف دیتے ہیں

سرد موسم، سرد لہجے بہت تکلیف دیتے ہیں
بدلتی رت، بدلتے لوگ بہت تکلیف دیتے ہیں
بہار آکے پیڑوں کو سجایا نہ کرے کہ اس کے بعد
خزاں میں یہ گرتے پتے بہت تکلیف دیتے ہیں
پل میں اپنا بنالینا پھر اچانک ہی چلے جانا
جدائی کے وہ لمحے بہت تکلیف دیتے ہیں
خوابوں کو خواب رہنے دو ان پر یقیں نہ کرو!
نہ ہو تعبیر جن خوابوں کی بہت تکلیف دیتے ہیں
ملتے ہیں پیار سے دلوں میں بغض رکھتے ہیں
منافق لوگ دنیا کے بہت تکلیف دیتے ہیں

شاعرہ: شائستہ جمال

کیا تم بھول گئے ہو

کیا تم بھول گئے ہو سب کچھ!
سرد رتوں میں شام سے تک
اک دوجے کو تکتے رہنا
منہ سے پھر بھی کچھ نہ کہنا
اکھیوں سے بس باتیں کہنا
سچ سچ سب کچھ بھول گئے ہو!
وہ بچپن کی میٹھی یادیں
مل کر رہنے کی وہ باتیں
کیا تم بھول گئے ہو سب کچھ!
پورے چاند کی پوری رات کو
بالوں میں پھر انگلی پھیر کے
مجھ کو میٹھے گیت سنانا
سچ سچ سب کچھ بھول گئے ہو!

شاعر: آصف ریاض۔ جھنگ

التجا

روح کا جو زخم ہے
یہ ناسور بن جائے گا
التجا ہے وقت تجھ سے...... تھم جا
یہ بندہ مر جائے گا

شاعر: مرزا یاسر بیگ، کراچی

سکھ، چین کھو کر......

آسان نہیں ہوتا ہے لکھنا
دنیا سے پڑتا ہے لڑنا

غم کو سمیٹ کے اپنے اندر
جھولی میں پڑتا ہے بھرنا
چند دنوں کا روگ نہیں یہ
گر گر کے پڑتا ہے سنبھلنا
جو اتنی بھی بات سمجھے نا
سکھ اور چین کو کھو کے پھر بھی
جیتے جی پڑتا ہے مرنا

شاعر: مہر نسیم۔ لاہور

آنکھیں، جھیل اور کنول

جاناں تم تو جانتے ہو
وجہ!
میری تنہائی کی
یوں دربدر بھٹکنے کی
جگ ہنسائی کی
کہ تیرے بعد جاناں
کوئی تجھ سا ملا ہی نہ پایا
کہ تم تو تھے مانند کنول
اور میری آنکھوں کی جھیل تو
کب کی سوکھ چکی ہے
پھر دوسرا کوئی کنول
کھل ہی نہ پایا

شاعر: شاہد فراز۔ حیدر آباد

غزل

پتھر دل ہیں پتھر لوگ
ایسے ملے ہیں اکثر لوگ
لفظوں سے وہ مارتے ہیں
ہنس ہنس کر یاں خنجر لوگ
سچا کون ہے، جھوٹا کون
ظاہر ہوں گے کمتر لوگ
کیونکر اپنا چنتے ہیں
جھوٹوں کو یہ رہبر لوگ
فٹ پاتھوں پہ کاٹتے ہیں
راتیں اپنی بے گھر لوگ
ہم بھی کرتے پیار نوید
مل جاتے گر بہتر لوگ

شاعر: نوید سہیل لاکھو۔ ہوسڑی

غزل

تو بنی ہے جب سے میری زندگی
مل گئی ہے اس جہاں کی ہر خوشی
تھا کبھی ویران اس دل کا نگر
تیرے آنے سے ہوئی ہے روشنی
جب سے تھاما ہے تمہارے ہاتھ کو
ہر کسی سے ہوگئی ہے دشمنی
تم کسی کے درد کو سمجھو گے کیا
تم نے دیکھی ہی نہیں ہے مفلسی
اے امیر شہر کچھ تو خوف کر
لوگ اب کرنے لگے ہیں خودکشی
اپنے مطلب سے یہاں ملتے ہیں سب
کون کرتا ہے کسی سے دوستی
کب تلک آخر سہیں گے ہم ترا
یہ تغافل، یہ ستم، یہ بے رخی

شاعر: ریحان آفاق۔ حیدر آباد

غزل

منزل میری کہاں ہے راہوں سے پوچھتی ہوں
پاؤں کی چھول کیسے خاروں سے پوچھتی ہوں
افسردگی نے اب تو لاچار کردیا ہے
بچھڑے سکوں کا مسکن آہوں سے پوچھتی ہوں
معلوم یہ تو ہے ہی ہوگی سحر بھی لیکن
راتوں کو چمکتے ہوئے تاروں سے پوچھتی ہوں

شاعرہ: عصمت پروین عظمٰی۔ کراچی

غزل

دل میں اپنے ملال رکھا ہے
پھر بھی خود کو سنبھال رکھا ہے
بھول جاؤں میں کس طرح تجھ کو
تیری یادوں کو پال رکھا ہے
اشک ہم نے چھپا کر آنکھوں میں
رخ پہ جاہ و جلال رکھا ہے
نشہ مے کا نہیں فقط، ساقی!
آنکھ میں بھی کمال رکھا ہے!
اُس کی یادوں سے آج بھی فائق
کوچۂ دل اُجال رکھا ہے

شاعر: عمران فائق۔ کامل پور موسیٰ، اٹک

اے جان

اے جان
میری پہلی محبت ہو تم
اب لوٹ آؤ نا؟
مجھے تم بن زندگی ادھوری ادھوری سی لگتی ہے
کہیں یہ تمہاری ناراضگی
اور مجھ سے خفا خفا رہنا
مجھے موت کی نیند نہ سلا دے

شاعر: موزشاہد حسین۔ خب چوکی

غزل

جیون کی ہر پریم کہانی تیرے نام
میری ہر اک درد نشانی تیرے نام
میرے ہر اک لفظ میں تیری صورت ہے
لمحہ لمحہ شام سہانی تیرے نام
میرا ہر اک نقش تمہارا اُجلا پن
جذبوں سے بھرپور جوانی تیرے نام
میری سوچ یہ کہتی ہے تم میرے ہو
میرے پیار کی بات پرانی تیرے نام
کمرے میں خاموش پڑا سا رہتا ہوں
ان آنکھوں سے بہتا پانی تیرے نام
میں نے ساجد اب یہ اکثر لکھتا ہے
دریا کی ہر ایک روانی تیرے نام

شاعر: ملک عاشق حسین ساجد۔ ہیڈ بکائی، مظفر گڑھ

جاتے لمحوں کی صدا

جاتے لمحوں کی صدائیں
کس سفر میں ہیں ابھی تک
دل کی دھڑکن مضطرب ہے
میری آنکھوں میں تُو نے لکھ دیا ہے
وہ منظر جو کبھی دیکھا نہیں
کہیں رنگین گال مرجھا رہے ہیں
کہیں اپنے بچھڑتے جا رہے ہیں
سنو!
جاتے ہوئے پل کی صدائیں
کبھی فرصت ملے تو غور کرنا

شاعرہ: نگہت اکرم۔ لاہور

اب تو جانم ہوش میں آؤ

بڑے بھیامان بھی جاؤ، چھوٹے بھیامان بھی جاؤ
قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ
بجلی ہے نہ پانی ہے، کمر توڑ گرانی ہے
وہی پہلے جیسی کہانی ہے
مزے لوٹو اور مال بناؤ، قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ
خواب ہوئے سب چکنا چور، ڈیزل، پیٹرول پہنچ سے دور
گیس نے کیا بہت رنجور
ہوسکا نہ کوئی سجاؤ
قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ
مریں بیچارے، بھوکے ننگے، عیش اڑائیں لچے لفنگے
ڈاکو، لٹیرے اور مسٹنڈے
خدا را اور نہ لوٹی پاؤ
قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ
سنبھلنا کوئی نہ سلیقہ ہے، وہی طور طریقہ ہے
اپنا سب کچھ امریکہ ہے
اب تو جانم ہوش میں آؤ
قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ

شاعر: ڈاکٹر صغیر احمد۔ بڑا گواہ، جہلم

سنگِ ملامت

میجر (ر) امتیاز حسین ملک

وقت کے ہاتھوں چت ہوجانے والے ایک کرنل کی داستانِ ملاصیات

اسلام آباد کی خاص چیزوں میں سے ایک اس کے پارک ہیں۔ پارکوں سے میری مُراد صرف بڑے پارک مثلاً راول جھیل پارک، شکر پڑیاں یا دامنِ کوہ وغیرہ ہی نہیں، بلکہ وہ چھوٹے چلڈرن پارک، گرین ایریاز اور جاگنگ ٹریک وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں، جن کا اس کے طول و عرض میں جال سا بچھا ہوا ہے۔ یہی چھوٹے چھوٹے پارک یہاں کے شہریوں کی تفریح کا اصل سامان ہیں، جن سے بچے، بوڑھے، جوان اور خواتین سب ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسلام آباد بجا طور پر ان پر فخر کرسکتا ہے، کیوں کہ یہ سہولت پاکستان کے کسی اور شہر میں نہیں ہے۔ میں I/10 سیکٹر میں رہتا ہوں، جو اسلام آباد کا سب سے گیا گزرا سیکٹر سمجھا جاتا ہے، لیکن یہاں بھی صورت حال یہ ہے کہ میری چھوٹی سی گلی کے مغرب میں بھی پارک ہے اور مشرق میں بھی۔ مشرقی گلی والا پارک تو خیر کافی بڑا ہے، اس لیے کہ یہ دو سب سیکٹرز کے درمیان گرین ایریاز میں واقع ہے۔ اس گرین ایریا میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس طرح کے تین چلڈرن پارک ہیں، جن کے اردگرد جاگنگ ٹریک بنا ہوا ہے، لیکن مغربی گلی کا پارک صحیح محلے کا پارک ہے۔ یہ پارک اس طرح بنایا گیا ہے کہ درمیان میں پارک ہے جس کے اردگرد چاروں طرف سڑک اور پھر مکانوں کی قطاریں ہیں، جن کا رُخ پارک ہی کی طرف ہے، پارک کے گرد لوہے کی باڑ لگی ہوئی ہے جس میں چاروں طرف ایک ایک راستہ نکلتا ہے۔ پارک کے عین درمیان میں مخالف سمتوں میں کراس کرتے ہوئے دو فٹ پاتھ ہیں جو پارک کو چار حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ چاروں حصّوں میں مختلف قسم کے جھولے لگے ہوئے ہیں۔ باڑ کے اندر چاروں طرف اور جھولوں کے ساتھ لوہے کے بنچ لگے ہوئے ہیں۔ بارش اور دھوپ سے بچنے کے لیے پارک کے دو کونوں میں لوہے کی چھتریاں لگی ہوئی ہیں۔ جس کے نیچے بھی بنچ لگے ہوئے ہیں، جہاں بیٹھ کر لوگ موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے ڈبل اسٹوری گھر ہیں، جن سے پارک ہر وقت نظر آتا رہتا ہے۔

ان گھروں میں چوں کہ صحن نہیں ہیں، اس لیے یہ کمی بھی اسی پارک سے پوری کی جاتی ہے۔ بعض گھر تو اس سے پکا صحن ہی کا کام لیتے ہیں۔ خواتین نے چوں کہ زیادہ وقت گھر میں ہی گزارنا ہوتا ہے، اس لیے اس سے صحیح فائدہ بھی وہی اُٹھاتی ہیں۔ مثلاً بچہ روئے تو پارک کا چکر لگوالیتی ہیں۔ زیادہ روئے تو جھولا بھی جھلا دیتی ہیں، بچے تنگ کریں یا ان سے بیزار ہوں تو پارک بھیج دیتی ہیں، میاں بیوی کو پیار محبت یا لڑنے جھگڑنے کے لیے تنہائی نہ ملے تو بچوں کو پارک بھیج دیا جاتا ہے۔ خواتین کی صبح، دوپہر اور شام چھتریوں کے نیچے کچہریاں یوں لگتی ہیں، جیسے کہ ڈاکٹروں نے نسخے میں لکھ دیا ہو۔ صبح بچوں کو اسکول اور شوہروں کو آفس بھیج کر، دوپہر کو کام کاج سے فارغ ہوکر اور شام کو بچوں کے کھیل کود اور اپنے تفریح کے پیریڈ میں کچہریاں لگتی ہیں۔ اس پارک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ یہاں کا ''ہائیڈ پارک'' ہے، جہاں خدمات کا کھل کر اظہار کیا جاسکتا ہے۔

مرد حضرات کا داخلہ تقریباً بند ہے اس لیے خواتین کو کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں۔ لڑائی جھگڑے کے میچوں کے لیے بھی یہ کھلی فضا اور وافر مواقع مہیا کرتا ہے۔ اس پارک میں عورتوں کی کثرت کے سبب مردوں کا داخلہ یہاں خود ہی بند ہوگیا ہے۔ انہیں کسی نے روکا نہیں ہے، خواتین نے اسے اتنا اپنا لیا اور ہر وقت اتنی تعداد میں موجود ہوتی ہیں کہ مرد خود ہی میدان چھوڑ گئے ہیں۔ کوئی اکا دُکا نظر آ بھی جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کسی کا مہمان ہے۔ اس بے چارے کو بھی اس بری طرح سے گھورا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ آنے کی جرأت نہیں کرتا۔

پارک بھی خوب صورت ہے، لیکن اس کا اصل حسن تتلیوں کی طرح دوڑتے بھاگتے بچے اور رنگ برنگے ہوا میں لہراتے آنچل ہیں۔ ان ہی کے دم سے اس کی ساری رونق ہے۔ ان ہی کی وجہ سے قلفی، فالودہ، پھٹے، چاٹ چھولے، لچھے بڑے اچھے کی ریڑھیاں اور آئس کریم کی سائیکلیں بھی آجاتی ہیں۔ چوں کہ پارک کے اردگرد گھر ہی گھر ہیں، اس لیے مرد چاہے اندر نہ آئیں لیکن وہ اس کے اردگرد نظر آتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی بچوں کو بلانے تو کبھی بچوں والیوں کو، کبھی کسی کے رونے کی آواز سن کر اور کبھی کسی روتے کو چپ کرانے مردوں کے چکر لگتے ہی رہتے ہیں۔ ویسے بھی محلے داری ہے، سب ہی ایک دوسرے کو تھوڑا بہت تو جانتے پہچانتے ہی ہیں۔ کون فجر کی نماز کے لیے جاتا ہے اور کون صبح سویرے سیر یا جاگنگ کے لیے، سب جانتے ہیں۔

''گڈی'' بھی اس پارک کی مانوس چیز ہے۔ اتنی ہی جتنے اس کے جھولے، چھتریاں یا بنچ، سب ہی اسے پہچانتے ہیں، لیکن شاید کسی اور نام سے، مجھے تو اس کا اصل نام پتا بھی نہیں ''گڈی'' تو میں نے اس کا نام اس کی فطرت اور عادتوں کو دیکھ کر رکھ لیا ہے، اس کی زندگی میں اتنی باقاعدگی ہے کہ اگر کسی دن وہ نہ آئے یا دیر سے آئے تو سارا پارک حیران ہوتا ہے، پھر جس دن وہ آتی ہے تو لوگ ہی نہیں درخت اور جھولے بھی پوچھ رہے



ہوتے ہیں۔ ”خیر تو تھی؟“ صبح سویرے وہ پارک کے اندر کے لمبے فٹ پاتھ پر شمالاً جنوباً سیر کرتی ہے، پھر ایک مخصوص جھولے (پینگ) پر جھولا جھولتی ہے۔ اس کا وقت، اس کی جگہ، اس کا رُخ، اس کی رفتار اور اس کا لباس ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مجھے تو ہر لحاظ سے وہ فوجی لگتی ہے، لباس بھی یونیفارم سا لگتا ہے۔ شکل کی قبول صورت ہے، رنگ کھلتا، گندمی، قد درمیانہ، جسم قدرے فربہ، آنکھیں خوبصورت اور چال سپاہیانہ ہے۔ اصل چیز اس کے ڈسپلن اور جھولے سے لطف اندوز ہونے کا اسٹائل ہے، جس کی طرف بندہ توجہ دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سیر سے تھک کر جب وہ جھولے پر جا بیٹھتی ہے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہے۔ اس کا جھولا بھی مخصوص ہے، اس کے علاوہ میں نے اسے کسی اور جھولے پر نہیں دیکھا، چھٹی والے دن اس کے ساتھ ایک دو اور بھی کم عمر لڑکیاں ہوتی ہیں، لیکن یہ اسی مخصوص جھولے پر ہی ہوتی ہے۔ جھولتے ہوئے جب اس کے گلے میں لٹکا دوپٹا اور اس کی پونی ہوا میں لہراتے ہیں تو پارک میں اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ جھولے پر رہتی بھی بڑی دیر تک ہے، وہ کچھ گنگناتی بھی رہتی ہے، لیکن پتا نہیں کیا۔ وہ جھولے پر زیادہ سے زیادہ اوپر جانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن کبھی کھڑے ہو کر پینگ نہیں چڑھاتی۔ وہ جھولے پر بہت مسرور نظر آتی ہے، اس کی ہر ادا سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی ہے۔ کئی دفعہ میں نے اسے جھولے پر موبائل پر باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ اُڑنے کی شوقین لگتی ہے، میں نے اسی لیے اس کا نام ”گڈی“ رکھا ہوا ہے۔ میری آج تک اس سے بات نہیں ہوئی، یہ تو بس راستے کے ایک منظر کی طرح سے ہے جو بندے کو اچھا لگے تو اسے دیکھنے کو دل کرتا ہے۔ دیکھنے کو رُک بھی جاتا ہے اور جس دن نہ دیکھے کوئی کمی سی بھی محسوس کرتا ہے۔

ایک روز پارک کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے گڈی کے پاس ایک شخص کو کھڑے دیکھا تو میں چونکا۔ کوئی کچھ کہنے یا بلانے آیا ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا، گو کہ کوئی ایسی عجیب چیز نہیں تھی، لیکن چونکا دینے والی چیز اس شخص کی شکل و صورت تھی، جو مجھے کافی مانوس سی لگی۔ کچھ دیر وہیں رُک کر میں اسے دیکھتا رہا، لیکن یاد نہ آیا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔ جب احساس ہوا کہ لوگ میرے اس طرح دیکھنے کو محسوس نہ کر رہے ہوں تو میں آفس چلا گیا۔ آفس پہنچ کر پھر تسلی سے ذہن پر زور دیا تو یاد آ گیا کہ یہ تو کرنل انور خان کا فارم منیجر تھا، لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شکل اس سے ملتی ہو، اس لیے گڈی سے تصدیق کرنے کا فیصلہ کیا۔

انور خان کے منیجر کو دیکھ کر مجھے بہت کچھ یاد آیا۔ سارا دن ذہن میں گزرے ہوئے واقعات کی فلم سی چلتی رہی۔ گڈی کے گھر کا پتا نہیں تھا، اس لیے دوسرے دن کا انتظار مجبوری تھی۔

دوسری صبح جب میں گڈی کے پاس گیا تو وہ جھولے پر ہی موجود تھی۔ مجھے قریب کھڑے دیکھ کر اس نے جھولا روک دیا اور پوچھا۔

”جی انکل، کوئی کام ہے مجھ سے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کل آپ کے پاس ایک صاحب کھڑے تھے، ان کی شکل مجھے کافی مانوس سی لگی تھی، لگتا ہے ان سے تمہاری پرانی ملاقات ہے۔ وہ کون تھے اور کیا کرتے ہیں؟“ میں نے ایک ہی سانس میں سارے سوال کر ڈالے۔

”پہلے فوج میں رہے، پھر ایک ایگریکلچر فارم کے منیجر رہے اور اب گھر پہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔“ گڈی نے اطمینان سے جواب دیا۔ بس مجھے اتنی ہی معلومات کی ضرورت تھی۔ تصدیق ہو گئی کہ وہ انور خان کا منیجر ہی تھا۔ میں نے گڈی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔ تصدیق کیا ہوئی یادوں کی بارات ہی چل پڑی۔ بارات گڈی کے جھولے سے اسے اور اس کے والد کو لے کر چلی تو سیدھی لاہور جا پہنچی، پھر وہاں سے کرنل انور کو بھی ساتھ لیا اور کوئٹہ پہنچ گئی، پھر وہاں سے گھومتی گھامتی واپس گڈی کے جھولے پر آ گئی، چلیے آپ کو بھی بارات کے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

لاہور کا پوسٹنگ آرڈر آیا تو میں ساہیوال میں نیشنل گارڈ میں تھا۔ کسی پنجابی کے لیے لاہور کی پوسٹنگ خوشی کی خبر ہوتی ہے، لیکن میرے لیے یہ کئی اور لحاظ سے بھی اچھی خبر تھی۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ کسی اچھی جگہ کی پوسٹنگ کے بعد عموماً پوسٹنگ نسبتاً ”ہارڈ ایریا“ یعنی

مشکل اور دور کی جگہ ہوتی ہے، اس لحاظ سے ساہیوال سے لاہور پوسٹنگ بڑی اچھی تھی۔ دوسرا پنجابی ہونے کے باوجود میں نے آج تک لاہور کو ٹھیک طرح سے نہیں دیکھا تھا، بس مسافروں کی طرح آتے جاتے ہی دیکھا تھا، گویا میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ پنجاب میں کہتے ہیں ”جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔“ اس پوسٹنگ سے مجھے پیدا ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ نزدیک ہونے کی وجہ سے وہاں جانا اور شفٹ کرنا بھی آسان تھا۔ گھر سے قریب ہونے کی وجہ سے دُکھ سکھ میں شرکت بھی آسان تھی۔

رپورٹ کرنے سے پہلے یونٹ سے رابطہ ضروری تھا، تاکہ پتا چلے کہ گھر مل جائے گا یا نہیں، تاکہ فیملی کی شفٹنگ کے متعلق فیصلہ کیا جا سکے۔ شادی شدہ لوگوں کے لیے فیملی کی شفٹنگ بھی بڑا مسئلہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے لیے بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ رابطہ کیا تو پتا چلا کہ گھر تو مل جائے گا لیکن یونٹ کوئٹہ جانے کی تیاریوں میں ہے۔ آرڈر مل چکے ہیں اور دو مہینے تک کوئٹہ روانگی ہے، گویا پوسٹنگ لاہور کی نہیں بلکہ کوئٹہ کی تھی، لاہور کا تو بس بیچ میں محض نام ہی تھا۔ اب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں خود اکیلا لاہور چلا جاؤں اور فیملی بعد میں ڈائریکٹ کوئٹہ چلی جائے، لیکن میں چونکہ پہلے ایک دفعہ ملٹری اسپیشل ٹرین میں سفر کر چکا تھا، اس لیے ہم نے پہلے فیملی کے ساتھ لاہور جانے اور پھر یونٹ کے ساتھ ملٹری اسپیشل میں کوئٹہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ملٹری اسپیشل ٹرین میں سفر کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ ویسے بھی اس میں سوائے نام کے اور کچھ بھی اسپیشل نہیں ہوتا، کیوں کہ اس میں کوئی بھی جدید سہولت میسر نہیں ہوتی۔ اس میں ایئرکنڈیشنڈ یا لوئر ایئرکنڈیشنڈ وغیرہ کا کوئی ڈبا نہیں ہوتا۔ فرسٹ کلاس ہی سب سے اعلیٰ درجہ ہوتا ہے۔ لیکن اسے ملٹری اسپیشل صرف اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ملٹری کو لانے اور لے جانے کے لیے ہی مخصوص ہوتی ہے اور اس میں سویلین لوگ سفر نہیں کر سکتے۔ اصل میں اسے اسپیشل اس میں سفر کرنے والے بناتے ہیں، چوں کہ اس میں سارے اپنی ہی یونٹ کے لوگ ہوتے ہیں، اس لیے یہ سارا سفر ہی پکنک بن جاتا ہے، ورنہ تو سہولتوں کا فقدان اسے سفر سے ”سفرنگ“ بنا دیتا ہے۔

ساہیوال سے لاہور چھوٹا سا سفر ہے، اس لیے ٹرین سے جانا مناسب نہ تھا۔ سامان کا جانا ہی مسئلہ تھا، اس لیے اسے ٹرک سے لے جانے کا فیصلہ کیا گیا، بقول ڈاکٹر یونس بٹ ”سفر میں سب سے بھاری سامان بیوی ہی ہوتی ہے۔“ لیکن ہم نے انہیں کار ہی میں لے جانا مناسب سمجھا۔ مقررہ تاریخ پر میں نے اکیلے ہی یونٹ میں رپورٹ کی، گھر وغیرہ ٹھیک کرایا اور پھر کوئی ہفتہ بھر بعد فیملی کو بھی لاہور شفٹ کر لیا۔ ہمارا یہ ہفتہ آفیسرز میس میں گزرا۔ بال بچوں کے ساتھ کافی عرصہ گزارنے کے بعد چھڑوں کے میس میں رہنا بھی بڑی عیاشی ہوتی ہے، شادی کے بعد تو یہ موقع کم ہی نصیب ہوتا ہے اور پھر یہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے والی بات ہوتی ہے۔

یونٹ جانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی، ہم بھی لگ گئے۔ میں اس سے پہلے کئی یونٹوں میں سروس کر چکا ہوں، اس لیے یونٹ کی زندگی کوئی نئی چیز نہیں تھی، لیکن اس یونٹ میں مجھے کچھ عجیب سی گھٹن اور خوف کی فضا محسوس ہوئی۔ سب لوگ مجھے خوف زدہ سے اور جلدی میں محسوس ہوئے، جیسے کوئی لاٹھی لے کر ان کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ مجھے یہاں کوئی بھی خوش دلی اور شوق سے کام کرتا ہوا نظر نہ آیا، بلکہ مجھے تو ایسا لگا کہ جیسے لوگ مجبوراً کر رہے ہوں۔ اس لیے کام بھی یہاں ”ڈنگ ٹپاؤ“ یعنی وقت گزاری کے طور پر ہی ہو رہے تھے۔ اگر شوق اور جذبہ نہ ہو تو کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی وجہ بھی جلد ہی معلوم ہو گئی۔ اس کی اصل وجہ یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل انور احمد خان تھے، جنہیں لوگوں کو اذیت میں مبتلا رکھنے میں شاید مزا آتا تھا۔ میں نے انہیں کسی سے بھی سیدھے منہ بات کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔ وہ اپنے سے جونیئر کو تو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔

فوج میں طریقہ ہے کہ ہر نئے آنے والے افسر کا کمانڈنگ افسر سے انٹرویو ہوتا ہے۔ انٹرویو تو ہمارا بھی ہوا تھا لیکن عجیب و غریب، خوامخواہ کی کشیدگی کے ماحول میں جیسے کوئی پرانی ناراضگی ہو۔ ذرا بھی اپنائیت اور خوشی کا اظہار نہ کیا گیا تھا۔ لہجہ بالکل روکھا اور خشک جیسے مجبوراً ملے ہوں۔ گردن ایسی اکڑی ہوئی جیسے اس میں سریا فٹ ہو، یہی ماحول یونٹ میں ہر طرف نظر آیا۔ مجھے تو یقین

نہیں آتا تھا کہ صرف ایک شخص کی وجہ سے پوری یونٹ کا ماحول اتنا کشیدہ ہوسکتا ہے، لیکن آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

جب کوئی ملٹری یونٹ کسی کینٹ سے رخصت ہوتی ہے تو اسے بڑے پرتکلف اور متاثر کن انداز میں ''بینڈ باجے'' کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ بینڈ باجا تو خوشی کے موقع پر بجایا جاتا ہے، یہ تو الوداعی پروگرام ہے، اس میں پھر بینڈ باجا کیسا، کہیں یونٹ سے جان تو نہیں چھڑائی جارہی تھی، لیکن ہر موقع کے لیے ملٹری بینڈ کی علیحدہ دھن ہوتی ہے۔ اگر خوشی کی ہے تو غم کی بھی ہے، استقبالیہ ہے تو الوداعی بھی ہے۔ ایسے موقع پر الوداعی دھنیں بجائی جاتی ہیں۔ یہ الگ چیز ہے کہ ان الوداعی دھنوں پر بھی لوگ ناچتے ہیں۔ اس یونٹ کا بھی پلیٹ فارم پر ہی سارا الوداعی پروگرام ہوا۔ پُرتکلف چائے وغیرہ دی گئی۔ اس میں شرکت کے لیے کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب کچھ ہوگیا تھا بس آخری مرحلہ رہ گیا تھا، وہ تھا رخصت کرنے والوں اور رخصت ہونے والوں کے ہاتھ ہلانے اور خدا حافظ کہنے کا، لیکن یہ مرحلہ کافی لمبا ہوگیا۔ ٹرین چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہم رخصت ہونے والوں سے زیادہ تو رخصت کرنے والے بے چین ہوں گے، کہیں ٹرین چلے تو وہ بھی فارغ ہوکر گھروں کو جائیں یا کوئی اور کام کریں۔

ملٹری اسپیشل کا یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ نام تو اس کا اسپیشل ٹرین ہے، لیکن ترجیحات میں یہ سب سے آخر میں آتی ہے۔ پہلے عام مسافر ٹرینیں گزاری جاتی ہیں، پھر جب سب گزر جاتی ہیں تو پھر اس کی باری آتی ہے۔

سب کی طرح فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے کرنل صاحب بھی ٹرین کے چلنے میں تاخیر کی وجہ سے سخت بے چین تھے، بلکہ وہ دوسروں سے زیادہ مضطرب تھے۔ وہ شاید اپنی طبیعت کے علاوہ اپنے مہمان کی وجہ سے بھی بڑی خفت محسوس کر رہے ہوں، جو انہیں رخصت کرنے آیا ہوا تھا۔ یہ ادھیڑ عمر کا لمبا چوڑا اور قدرے موٹا سا شخص تھا، جسے ہم میں سے کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ شلوار قمیص پر واسکٹ پہنے اس شخص کو اس کے ضرورت سے زیادہ عاجزانہ اور خوشامدانہ رویے کی وجہ سے سب نے ہی نوٹ کیا۔ اسی شخص کو میں نے آج گڈی کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے ڈبے کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر کرنل صاحب نے روانگی میں تاخیر کی وجہ معلوم کرنے کے لیے کہا۔ میں نے پتا کیا تو اسٹیشن والوں کے پاس بڑا آسان سا جواب تھا کہ فلاں ٹرین آرہی ہے وہ گزر جائے تو چلاتے ہیں۔ یہی جواب میں نے کرنل صاحب کو بتادیا۔ کرنل صاحب کی حالت کا سب کو اندازہ تھا، وہ کس قدر خون کے گھونٹ پی رہے ہوں گے، لیکن کر ہی کیا سکتے تھے۔ کس کو جھاڑیں، کس کی بے عزتی کریں، یہ کوئی فوج تو تھی نہیں کہ ان کی تھانیداری چلتی اور ریلوے والے ان کے ماتحت تو تھے نہیں جن پر وہ رعب جھاڑتے، خدا خدا کر کے ٹرین چلی تو دونوں طرف سے ہاتھ ہلائے گئے۔ خدا حافظ اور خدا ہی حافظ کے جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ہم لوگ مسکراہٹوں کے سائے میں روانہ ہوئے۔

ٹرین تیسرے دن آرام سے روتی سسکتی کوئٹہ پہنچی، کیوں کہ ریلوے والوں کو کوئی جلدی تھی اور نہ ہی ہمیں، اس طرح کے دیر سویر سے ہماری صحت پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ دیر ہو بھی جاتی تو نہ ریلوے والوں کا کچھ بگڑتا تھا نہ ہمارا۔ یہ تو ایسا سفر تھا کہ جس کی منزل کہیں بھاگ کر نہیں جاسکتی تھی، بلکہ یوں کہیے کہ خود ہمارا سفر ہی منزل تھا۔ ریلوے والوں کو پتا تھا کہ وہ ملازم سرکار کے ہیں۔ اگر یہ سفر، یہ ڈیوٹی ختم ہوگئی تو کوئی دوسری شروع ہوجائے گی، پھر ہم نے بھی تو وہاں یہی کچھ کرنا تھا جو ہم ٹرین میں کر رہے تھے۔ وہاں بھی پریڈیں ہی تھیں، یہاں بھی پریڈیں ہی ہیں۔ یاد رکھیں فوج بھی آغاز سے انجام تک پریڈ ہی رہتی ہے، راستے میں جہاں بھی کھانے کا وقت ہوتا، ٹرین سائیڈ پلیٹ فارم پر روک دی جاتی۔ کھانا پکتا اور پھر منظم طریقے سے سب کو کھلایا جاتا۔ یہ سب کچھ بھی پریڈ ہی کی طرح ہوتا تھا، پھر کھانے پینے کے بعد ریلوے والوں کو بتا دیا جاتا تھا کہ ہم لوگ روانگی کے لیے تیار ہیں تو وہ ٹریفک اور موقع دیکھ کر ٹرین پھر سے روانہ کر دیتے۔

ٹرین روکنا ہمارے اختیار میں تھا، لیکن چلانا ریلوے والوں کے اختیار میں۔ ویسے تو لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے بہت سے پروگرام وغیرہ بنے تھے، لیکن سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ٹرین جہاں بھی رکتی کوہ گراں بن جاتی، پھر وہاں سے اس کا چلنا بھی جاں سے گزرنا ہی ہوتا۔

سفر کے دوران وقت گزاری کے لیے کرنل صاحب کے سوا سب ہی ڈبوں میں تفریحی پروگرام چلتے رہے۔ اس میں آفیسر فیلڈ میس خاص طور پر متحرک رہی۔ ہر یونٹ میں ایک فیلڈ میس ہوتی ہے جس کا کام جنگ، جنگی اور تربیتی مشقوں اور سفر وغیرہ میں افسروں کے طعام اور تفریح وغیرہ کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ تفریح کا بھی کافی سامان ہوتا ہے، مثلاً ٹیلی ویژن، وی سی آر، تاش، ڈرافٹ اور شطرنج وغیرہ۔ اس کے علاوہ اگر کہیں جانا ہو تو سفر اور علاقے کی ضروریات کے مطابق اور چیزیں بھی رکھ لی جاتی ہیں۔ اس سفر کے دوران اسے بھی خدمت کا خوب موقع ملا۔ کرنل صاحب البتہ نہ خود ڈبے سے باہر نکلے اور نہ کسی نے ان کے ڈبے میں جانے کی جرأت کی، لیکن ٹرین روکنے اور چلانے کے لیے ان سے اجازت اگر لی جاتی تھی یا پھر پروگرام میں اگر کوئی تبدیلی ہوتی تو انہیں رپورٹ کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں موبائل فون وغیرہ تو ہوتے نہیں تھے، اس لیے متعلقہ اسٹاف کو رپورٹ کے لیے خود جانا پڑتا تھا۔ وقفوں کے دوران میس اسٹاف انہیں کھانا اور چائے وغیرہ ڈبے میں ہی دے جاتا۔ اگر انہیں کچھ کہنا ہوتا یا کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ فیلڈ ٹیلی فون پر کہہ دیتے تھے۔ اس طرح وہ بھی خوش تھے اور ہم بھی، وہ بھی آرام سے تھے اور ہم لوگ بھی، اس موقع پر مجھے ضمیر جعفری کا شعر یاد آتا ہے.....

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
وہ بھی ہے آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے

کوئٹہ میں استقبالیہ پروگرام بھی ویسا ہی پُرتکلف تھا جیسا کہ لاہور کا الوداعی پروگرام تھا، بس فرق تھا تو صرف چہروں کا یا چائے کا اہتمام کی جگہ کا۔ کوئٹہ میں چائے کا انتظام پلیٹ فارم کی بجائے یونٹ کے اپنے علاقے میں کیا گیا تھا۔ لاہور سے کچھ عرصہ پہلے بھیجی گئی ایڈوانس پارٹی نے رہائش وغیرہ کا یہاں سب انتظام کیا ہوا تھا۔ استقبالیہ پروگرام کے بعد سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ فیملیز شروع میں اکٹھی رکھی گئیں، پھر جیسے جیسے گھر ملتے گئے، لوگ اپنے اہل خانہ کو شفٹ کرتے گئے۔ جب ہماری باری آئی تو ہم بھی شفٹ کر گئے۔ یونٹ میں سب افسروں اور ان کے گھر والوں کے درمیان بہت قریبی تعلقات ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں بالکل رشتے داروں کی طرح ہوجاتے ہیں۔ یہاں بھی ہم سب گویا رشتے دار ہی بن گئے تھے اور لوگوں کا ایک دوسرے کے یہاں بالکل اسی طرح آنا جانا تھا جیسے رشتے داروں میں ہوتا ہے، سوائے کرنل صاحب اور ان کی فیملی کے۔ انہوں نے خود ہی فاصلہ اتنا رکھا ہوا تھا یونٹ میں بھی اور گھروں میں بھی۔ اہل خانہ میں تو فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی مشکل سے ہی تھے۔ ان کی بیگم بھی ہماری بیگمات سے ایسے ہی ملتیں جیسے کمانڈنگ افسر ہوں۔

فوج میں دستور ہے کہ جو بھی نیا افسر یونٹ میں آئے تو اسے اپنی فیملی کے ساتھ کمانڈنگ افسر کے گھر ایک دفعہ ضرور جانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کا آنا جانا تعلقات کی نوعیت پر ہے۔ دستور کے مطابق ہم بھی کرنل صاحب کے گھر گئے، لیکن یہ ہمارا پہلا اور آخری وزٹ ثابت ہوا۔ اس کے بعد نہ کبھی میرا دل ان سے ملنے کو چاہا اور نہ ہی میرے اہل خانہ کا اور قریباً سب ہی افسروں کے ساتھ یہی صورتِ حال تھی۔ یہ بھی دستور ہے کہ اگر کوئی افسر اہل خانہ کے ساتھ کمانڈنگ افسر کے گھر جائے تو جواباً کمانڈنگ افسر کو بھی اس افسر کے گھر جانا ہوتا ہے، لیکن ہمارے کمانڈنگ افسر نے کبھی اس کی زحمت ہی نہ کی۔

سنا ہے کہ انہوں نے مہمانوں کو دو درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یونٹ کے افسر اور عام لوگ نچلے درجے میں آتے تھے، جن سے وہ باہر لان میں یا ایک عام سے کمرے میں ملتے تھے، جبکہ بڑے لوگوں اور سینئر افسروں کے لیے ایک خاص ڈرائنگ روم مخصوص تھا۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے یونٹ میں نیچے سے اوپر تک سب ہی نے اظہارِ نفرت کے لیے ان کے مختلف نام رکھے ہوئے تھے۔ کوئی انہیں ''مشکی'' کہتا تھا تو کوئی ''کالا ناگ'' اور کوئی ''فرعون'' سب ہی نام ان کی رنگت، اکڑی ہوئی گردن اور ان کے رویے کی وجہ سے معروف تھے۔

یونٹ میں ہر روز گیارہ بجے ''ٹی بریک'' ہوتا ہے، جس میں سب افسر اکٹھے چائے پیتے ہیں۔ ایک دن ٹی بریک کے دوران ان کا بھی کوئی بے تکلف دوست آیا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہ بھی ''بے تکلف'' موڈ میں تھے، جو

وہ عموماً بہت کم ہوتے تھے۔ باتوں باتوں میں ان کے لاہور کے فارم کی بات چھڑی، جو چلتے چلتے ان کے لاہور ریلوے اسٹیشن پر آئے مہمان تک جا پہنچی۔ کرنل صاحب نے بتایا کہ وہ ان کے لاہور بارڈر پر واقع ایگری کلچر فارم کا منیجر تھا۔ اس کے ضرورت سے زیادہ عاجزانہ اور خوشامدانہ رویے کی بات ہوئی تو کرنل صاحب ہنسنے لگے اور پھر یوں گویا ہوئے ”اس کا رویہ اب ہمیشہ ایسا ہی رہے گا، کیوں کہ میں نے اس کا کام ہی ایسا کیا ہے کہ اس کی گردن ہمیشہ نیچی ہی رہے گی۔“ ہم نے پوچھا تو انہوں نے اس کا قصہ بڑے فخر سے بتایا۔ کہنے لگے۔

”ایک دفعہ مجھے لاہور سے اس کا فون آیا کہ میں سخت مصیبت میں ہوں، خدا کے لیے میری مدد کریں۔ میں سمجھا شاید زمین کا کوئی مسئلہ ہے، اس لیے جلدی ہی اس کے پاس زمینوں پر چلا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو اسے واقعی مصیبت میں مبتلا پایا، لیکن یہ زمین کا کوئی مسئلہ نہ تھا، بلکہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ گاؤں کے ایک بدمعاش جوان نے اس کی بیٹی کو اغوا کرلیا تھا۔ وہ اتنا طاقتور اور اثر ورسوخ والا تھا کہ یہ اس کا اب تک کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا۔ نہ تو ابھی تک اس کی بیٹی واپس ہوئی تھی اور نہ ہی اس کا بدلہ اترا تھا۔ اس مسئلے کی وجہ سے اس کی اتنی بے عزتی ہوئی تھی کہ وہ گاؤں میں چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ معاملہ واقعی بہت سنگین تھا۔ یہ صرف میرے منیجر کی ہی بے عزتی نہیں تھی بلکہ میری اپنی بھی تھی، اس لیے میں نے ایسے اقدامات کا فیصلہ کیا کہ نہ صرف لڑکی ہی واپس ہو اور میرے منیجر کی عزت بحال ہو، بلکہ علاقے میں میرا دبدبہ اور رعب بھی قائم ہو جائے، پھر ہوا بھی یہی، نہ صرف یہ کہ لڑکی واپس ہوگئی، بلکہ وہ بدمعاش بھی میرے قدموں میں آ گرا۔“ ہم نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیا جادو کیا تھا۔“ تو انہوں نے بتایا کہ ”میں نے اپنے علاقے سے بندے بلائے اور اس لڑکے کی ماں کو اغوا کرالیا۔ لڑکا خود ہی لڑکی کو لے کر میرے قدموں پر آ گرا۔“ جب ہم نے پوچھا کہ آپ نے اس بدمعاش کے ساتھ کیا سلوک کیا تو ان کی گردن اکڑ گئی اور بڑے تخریہ لہجے میں بولے۔

”کچھ بھی نہیں۔ میں نے بس اس کی ٹانگیں تڑوادیں اور باہر پھینک دیا، تاکہ ہمیشہ یاد رکھے اور اس کی ماں کو بھی چھوڑ دیا۔“ اس موقع پر ہمیں پنجابی فلم ”مولا جٹ“ کا کردار ”نوری نت“ یاد آ گیا۔ وہ بھی فلم میں ہیرو کے بھائی کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔ کرنل صاحب نے جس آرام، مزے اور فخر سے یہ داستان سنائی تھی، یوں لگا جیسے ہم سندھ کے کسی وڈیرے کی اوطاق یا جنوبی پنجاب کی کسی پنچایت میں بیٹھے ہوں۔ اس قصے کو سننے کے بعد کرنل صاحب کی دہشت تو اور بھی بیٹھ گئی، لیکن لوگوں کے درمیان ان سے نفرت اور فاصلہ اور بھی بڑھ گیا۔

کچھ عرصے بعد کرنل صاحب یونٹ سے غائب ہونے لگے۔ ویسے تو ان کی غیر حاضری مفاد عامہ میں تھی، اس لیے سب کو اچھی لگی، لیکن کچھ عجیب سی بھی لگی، پھر یہ غیر حاضریاں لمبی ہونے لگیں۔ وہ کئی کئی دن یونٹ سے غائب رہنے لگے۔ جب بھی آتے بھی تو پریشان نظر آتے۔ ان کا گرجنا برسنا بھی کم ہو گیا تھا اور آہستہ آہستہ ان کی گردن سے سریا بھی نکل گیا اور نظر بھی جھکی جھکی نظر آنے لگی۔ اب انہیں خدا بھی یاد آنے لگ گیا تھا اور عام لوگ بھی۔ یہ حال بھی ہو گیا کہ وہ لوگوں سے دعا کی درخواست بھی کرنے لگے۔ ہم لوگ ان میں اتنی بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھ کر حیران تھے، لیکن جب حقائق کا پتا چلا تو ایمان تازہ ہو گیا۔

کرنل صاحب کا اکلوتا بیٹا مری کے کسی کالج میں پڑھتا تھا۔ باپ کی طرح اس کی گردن میں بھی نہ صرف سریا فٹ تھا، بلکہ اکلوتا ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ بھی کافی خراب تھا۔ اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی، جس کے نتیجے میں اس کے ہاتھوں ایک لڑکا قتل ہو گیا۔ دونوں باپ بیٹا اس قتل کے سلسلے میں ایسے پھنسے کہ پھر کبھی نہ نکل سکے۔ کرنل صاحب نے بڑی کوشش کی، ہر طریقہ آزمایا، روپیہ پانی کی طرح بہایا، سب کچھ داؤ پر لگا دیا، لیکن کوئی بھی طریقہ کامیاب نہ ہوسکا، کیوں کہ مخالف پارٹی بھی ان سے کم نہ تھی۔ اس نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اس ایک واقعے نے انہیں توڑ کے اور برباد کر کے رکھ دیا۔ ان کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ ان کی تنی ہوئی گردن ایسی جھکی کہ پھر کبھی نہ اُٹھ سکی۔ کچھ عرصے بعد میری اس یونٹ سے باہر ٹرانسفر ہوگئی، بعد میں پتا چلا کہ کرنل صاحب نے بیٹے کی جان بچانے کے لیے اسے ملک سے کہیں باہر بھیج دیا اور خود بھی کہیں گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔

☆......☆